ISBN 1981 13

Printed in Great Britain

صفحہ

(۱۴) صلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاحیں — از پروفیسر محمد نعیم الرحمان ایم ۔ اے — ۴۰۷
(۱۵) نظم و نثر پر ایک نظر — از اصغر حسین اصغر مرتب رسالہ — .. — ۴۳۱
(۱۶) ہندستان نمبر واو کے صحیح ہے — از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم ۔ اے ۔ بی ایچ ۔ ڈی — .. — ۴۵۳
(۱۷) انتقاد (نظم) — از حضرت جوش ملیح آبادی — .. — ۴۷۲
(۱۸) کلیات میر حسن دہلوی — از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی — ... — ۵۰۵
(۱۹) شاہ بیگم — از مولوی مقبول احمد صمدانی صاحب "حباب جلیل" — ... — ۵۲۹
(۲۰) انتقاد ادب — از بابک چند عشرت ایم ۔ اے ۔ یل ۔ ٹی — ۵۵۳
(۲۱) صلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاحیں — از پروفیسر محمد نعیم الرحمان ایم ۔ اے — ۵۸۶
(۲۲) ہندستان نمبر واو کے صحیح ہے (۲) — از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم ۔ اے ۔ بی ایچ ڈی — .. — ۶۲۳

اداریہ — .. — ۱۴۴ ، ۳۲۴ ، ۴۹۷ ، ۶۴۱

تبصرے و رسید کتب — ... — ۱۶۰ ، ۲۸۳ ، ۴۷۶ ، ۶۴۶

ہندستانی

ہندوستانی اکیڈیمی کا ماہی رسالہ

جلد ۱ } جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع { حصہ ۱

اُردو اِملا

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' ایم - اے - ' پی ایچ - ڈی -

ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور اُن قاعدوں کی بنیاد صحیح اصول پر ہو - اگر قاعدے معین نہ ہوں تو زبان کی ترقی اور نگارش کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا اور اُردو اِس وقت اِسی قسم کے خطرے میں ہے - عربی ؟ فارسی ؟ انگریزی ؟ غرض کہ ہر شائستہ زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں ، ہر لکھنے والا اُن کی پوری پوری پابندی کرتا ہے - مگر اُردو والے اپنے تئیں ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں - اِملا کی خرابی یا بیضابطگی کی صورتیں جب کسی متمدن قوم کو پیش آئیں تو اُس کے زبان‌دانوں نے فوراً خرابی کی اصلاح کی - ترقی کرنے والی قومیں اِس زمانے میں بھی اپنی زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں - عام طور پر اصلاح کی ضرورت اِس لیے پڑتی ہے کہ ایک لکھنے والا اپنی رائے کو دخل دے کر ایک غلط راہ اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے بغیر تحقیق کیے ہوئے اُسکی غلطی کی پیروی کرنے لگتے ہیں - جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی وہ کتابوں اور اخباروں میں راہ پا گئی -

عوام کے لیے یہ ایک بڑی سند ہوگئی کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسی اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے - بڑی مشکل یہ ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو صحت اور اصول پر نظر رکھتے ہوں - بڑا گروہ مقلدوں یا عادت کے بندوں کا ہوتا ہے ' اور تدارک یا اصلاح کی ذمہ‌داری اہل تحقیق پر عائد ہوتی ہے - بس ایسی خرابیوں کا انسداد یوں ہی ہو سکتا ہے کہ علمی انجمنیں اپنے فرض کا احساس کر کے نہ صرف قاعدے بنائیں بلکہ ہر ممکن ذریعے سے اُنہیں عمل میں لانے کی کوشش کریں -

اِس وقت صرف چند ضروری مسئلے پیش کیے جاتے ہیں :-

(۱) مختفی ہ یا الف ؟

جہاں تک تلفظ سے تعلق ہے اُردو لفظوں میں مختفی ہ کا وجود نہیں ہے بلکہ مختفی ہ فارسی کی چیز ہے ' اردو ہندی لفظوں میں نہیں آسکتی ' لفظ کی ابتدا یا بیچ میں کبھی نہیں آتی ' آخر ہی میں آسکتی ہے - اُردو اور ہندی کی طرح فارسی کی بھی یہ ایک خصوصیت ہے کہ لفظ کا آخر حرف ساکن ہوتا ہے البتہ بعضے فارسی لفظ ایسے ہیں کہ پرانی فارسی زبان میں اُن کے آخر میں ایک ک تھا جو ک سے گ ہوا اور پھر گرگیا - اگر اُس ک یا گ سے پہلے الف تھا تو وہ بغیر کسی دقت کے قائم رہا ' جیسے پرانے لفظ اردھاک سے اردھا رہ گیا - دقت اُن لفظوں کی کتابت میں آتی جن کے آخر میں ک تھا اور اُس سے پہلے زبر اِس لیے کہ اخیر حرف پر حرکت رہ گئی اور عام قاعدے کے بموجب اُس اخیر حرف کو ساکن ہونا چاہیے تھا - مثال کے طور پر صرف ایک لفظ کو لیجئے :-

''بندہ'' - پرانی فارسی زبان میں ''بندک'' اور ''بَندَگ'' تھا -

بعد کو (یعنی اسلامی دور سے ساید کچھ پہلے ہی) گ گر گیا؛ سو ''بَنْدَ'' رہ گیا اور کتابت میں ''بَنْدَ'' اور ''بَنْد'' میں کوئی فرق نہ رہا - پہلوی تحریر میں جو پرانی کتابت (یعنی ''بندک'') جاری رہی مگر جب عربی حرف اختیار کئے گئے تو فکر ہوئی کہ آخر حرف کی حرکت کو جو تلفظ میں آتی ہے تحریر میں کیوں کر ظاہر کریں - بدیں یہ ٹھہری کہ ایک ہ آخر میں لکھیے اور اُسے زبر کی طرح پڑھیے ؛ ہ کی آواز اُس میں نام کو نہ ہو - اِسی لیے اُس کا نام ''مختفی'' پڑا اور اُس کے مقابلے میں اصلی ہ کو ''ملفوظ'' کہنے لگے - یاد رہے کہ یہ سب کچھ فارسی ہی میں ہوا - عربی میں اِن دونوں اصطلاحوں کا کہیں ذکر نہیں آیا -

فارسی لغت کی اکثر کتابوں میں ہر موقع پر اشارہ کردیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کے آخر میں جو ہ ہے وہ ''مختفی'' ہے یا ''ملفوظ'' - فارسی میں بھی املا کے متعلق بہت احتیاط برتی جاتی ہے اور کبھی کوئی وہ لفظ جس کے آخر میں الف ہے ہ سے نہیں لکھا جاتا - سو اِس کے کہ قافیے کی ضرورت سے ''آشکارا'' کو ''آشکارہ'' اور ''جارا'' کو ''جارہ'' لکھ دیا - آج سے بیس تیس برس پہلے تک اُردو والے بھی اِس کا بہت خیال رکھتے تھے -

ایک بات اور بھی اِس سلسلے میں بیان کرنے کے لائق ہے - وہ یہ کہ فارسی والوں نے جب عربی کے بہت سارے لفظ اپنی زبان میں لیے

---

* یہی گ ''بندگاں'' اور ''بندگی'' میں اور اس بدل کے بہت سے فارسی لفظوں (جیسے ''زندگاں'' - ''مردگاں'' - ''زندگی'' - ''سرمندگی'' وغیرہ) میں اپنی اصلی حالت پر رہا - آگے والے حرف نے اُسے گرنے سے روک لیا -

اسی گ کو عربوں نے ح کردیا جو بہت سے معرب لفظوں میں دکھائی دیتا ہے جیسے نرنج ، بنفسج ، نابرنج ، زنبح ، ساقترج ، کوسج وغیرہ میں - جو لفظ عربوں نے جاہلیت کے عہد میں ایرانیوں سے سرحدوں کے توسط سے لیے اُن کے آخر میں گ کے بجائے ک تھا ، پس اُن معرب لفظوں میں ح کی جگہ ہی پایا جاتا ہے جیسے جورزق ، جنبق وغیرہ میں -

تو اُن میں سے کسی کسی میں تصرف بھی کیا - اُنھیں میں سے ایک تصرف یہاں بیان کیا جاتا ہے - عربوں کے ہاں ایک حرف ہے جو بعضے اسموں کے آخر میں آتا ہے - شکل اُس کی ہ کی ہے مگر اُسے معمولاً ت پڑھتے ہیں - اِسی لیے اُس پر دو نقطے لگا دیتے ہیں . (ۃ) - جب اِس گول ہ والا کوئی لفظ کسی جملے کے آخر میں آ پڑتا ہے اور آواز ہ پر ٹوٹتی ہے تو اُس کا تلفظ ملفوظ ہ کا سا ہوتا ہے اور اُس سے پہلے زبر بھی ہوتا ہے - اکثر اِس ہ کا تلفظ گہرا نہیں ہوتا ، کس واسطے کہ آواز کا زور اُس پر ختم ہوتا ہے اور اِس وجہ سے دھیما پڑ جاتا ہے - ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ چیز اُن کی مختفی ہ سے بہت ملتی جلتی ہے ؟ اکثر صورتوں میں اُسے مختفی ہ کی طرح بولنا شروع کردیا - اور کہیں کہیں اُس کو ت قرار دے کر اِسی طرح بولنے اور لکھنے لگے - عرہ ؟ خدمہ ؟ حجہ وغیرہ ؟ کو عزت ؟ خدمت ؟ حجت ؟ بنادیا اور درجۃ ؟ مدرسہ وغیرہ کو درجہ ؟ مدرسہ - کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچوں میں ڈھال دیا جیسے اجارہ اور اجارت ؟ ارادہ اور ارادت ؟ اِضافہ اور اضافت وغیرہ - اِن لفظوں میں جہاں جہاں ہ سے ۃ ہوگئی وہ ہ مختفی ہی قرار پاگئی - یہہ مفرس لفظ فارسی سے اُردو میں آئے تو یہاں بھی اِن کا تلفظ وہی رہا جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا -

اِس طرح اُردو میں مختفی ہ فارسی اور عربی لفظوں کے ساتھہ مخصوص ہے مگر اِس ہ کی اصلیت کو لوگوں نے بھلا دیا اور خود اپنی تحریر کے لیے کوئی ہنجار قائم نہ کیا - نتیجہ یہہ ہوا کہ بد مذاقی پھیلی اور تہیت اُردو لفظوں میں بھی لوگ مختفی ہ لکھنے لگے - ہندی کے دیوناگری خط میں تو ایک अ ہے - اور اُسی کا نمائندہ اُردو میں سوا

اگر فارسی کے بعضے مصنفوں نے ہندی لفظوں کو مختفی ہ سے لکھا تو یہ تفریس نہیں - اُردو والے کسی طرح اُس کی سند نہیں پکڑ سکتے -

الف کے اور کوئی حرف ہو ہی نہیں سکتا - ہندی لفظ تو ایک طرف رہے - طرہ یہ کہ وہ عربی فارسی لفظ بھی جن کے آخر میں الف ہے ہ سے لکھے جانے لگے - یہ املا سراسر غلط ہے - قاعدہ اِس کا یوں ہے :—

۱ - ہندی لفظ ہو تو الف سے لکھا جائے (سوا بعض مقاموں کے ناموں کے جیسے آگرہ ، پٹنہ ، کلکتہ ، کس واسطے کہ یہ نام ہمیشہ سے اِسی طرح لکھے جاتے ہیں) مقاموں کے ناموں کے سوا جتنے لفظ ہیں اُن کو الف ہی سے لکھنا چاہیے ، جیسے :—

اِکا (اِسے ''یکہ'' لکھنا تو یوں بھی غلط ہے کہ تلفظ کے سراسر خلاف ہے - فارسی میں یہہ لفظ گاڑی کے معنوں میں موجود بھی نہیں - ہمارے اردو لفظ ''ایک'' سے بنا ہے نہ کہ فارسی لفظ ''یک'' سے - اِسی طرح ''موم بتی کا اِکا'' - ''تاس کا اِکا'' - زیور جسے عورتیں صرف ایک ہی تار پر باندھتی ہیں اور اُس میں ایک ہی بڑا نگینہ ہوتا ہے - جس میں زیادہ نگینے ہوتے ہیں اُسے ''تو نگا'' کہتے ہیں) ، اکیلا ، اُتولا ، باجا ، باجرا ، بادلا (ایک قسم کا بیس کبڑا) ، باڑا (''امام باڑا'' وغیرہ مرکبوں میں بھی آتا ہے) ، بتوا ، بتوارا ، بجنا ، بجکانا ، بجھڑا ، بجھونا ، بجھیرا ، بلبلا ، بنجارا ، بھانجا ، بھتیجا ، بھروسا ، بھیڑیا ، بانگا ، باورچی ، بِنا (بسان کے معنوں میں) ، بَتّا ، بِتّا ، پِتا (باپ) ، تُتلا ، تتیلا ، تتاخا ، تتارا ، تتّھا ، تجتاوا ، پڑاقا ، تسینا ، تارا (جسے فارسی میں ''ستارہ'' کہتے ہیں) ، تایا (جیسا ، جو باپ سے عمر میں بڑا ہو) ، جارا (گھاس وغیرہ) ، جیورا ، جرائیما ، جرجا ، جرسا ، جکارا ، جِلّا ، جھالا ، جَھلّا ، جِھلّا ، داسا ، دُپٹا ، دُپلا (دو

ملک والا۔ ایک مصنوعی لگ جسے بلور کے دو ٹکڑوں کو ملا کر بناتے ہیں)، دُخَما (یعنی دو خم والا نیچہ)؟ دگلا؟ دھکا؟ دھوکا؟ ڈورنا؟ ڈرہخما (یعنی ڈیڑھ خم والا نیچہ)؟ راجا؟ سرونا؟ کنھّا؟ کوئلا؟ کھلونا؟ لڑاکا؟ مہینا؟ مبلا؟ نانا (رشتہ داری)۔ یاد رہے کہ مذکر صفتیں بھی الف ہی سے صحیح ہیں؟ جیسے جاہلا؟ دبنگا؟ بھلا وغیرہ۔

اِسی طرح وہ لفظ بھی جو یورپ کی زبانوں سے آئے ہیں؟ جیسے بِلاّ (بلغا وغیرہ کے معنوں میں)؟ ڈراما؟ ورما؟ کمرا؟ مارکا (نشان) وغیرہ اور یہی حال اُن لفظوں کا ہے جو فارسی یا عربی سے نکلے تو ہیں مگر خود اُن زبانوں میں اُن کا وجود اِس ہیئت میں نہیں ہے: جیسے بدلا؟ بے فکرا؟ تو دولتا؟ کتابیا (کتاب والا)؟ ترفیا (ترف والا)؟ خاصا (''اچھا خاصا'' تورا کے معنوں میں)؟ بعضا (= بعض)؟ مسالا؟ ملیدا (ف۔ ''مالیدہ'')؟ دستنا وغیرہ۔

[خاصا (جمع۔ خاصے اور مونث خاصی) اور بعضا (بعضے؟ بعضی) میں آخر کے الف یائے کو ہ سے ظاہر کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ جن معنوں میں ''خاصہ'' فارسی میں استعمال ہوتا ہے؟ اگر اُنھیں معنوں میں استعمال ہو تو البتہ اُس کو ہ سے لکھنا ٹھیک ہوگا۔ مسالا ہر معنے میں س اور الف سے لکھنا چاہیے۔ (۱) ''گرم مسالا''۔ (۲) ''مسالا'' (گوتا کناری وغیرہ)۔ (۳) ''مسالا'' (کسی چیز کے اجزا یا ضروریات اور لوازمات وغیرہ)۔ ''مصالح'' لکھنا یوں غلط ہے کہ یہہ ''مصلحت'' کی جمع ہے۔ ہمارے لفظ کو اِن معنوں سے اصلا تعلق نہیں۔ مزید، بر آں

یہہ کہ تلفظ بھی مختلف ہے - یہی حال "مصالحہ" کا ہے - "مصالحہ" کے معنے ہیں "لڑنے والے فریقوں کے درمیان صلح" - ملیدا کا تلفظ بھی فارسی "مالیدہ" سے بدل گیا ہے اور اُس نے ایک خاص مفہوم اختیار کر لیا ہے بس اِسے بھی اُسی طرح لکھنا چاہیے جس طرح ہم بولتے ہیں - دستنا اور فارسی "دست پناہ" میں بھی معنے اور تلفظ دونوں بدلے ہوئے ہیں - "دست پناہ" فارسی میں "حملے" کے معنوں میں نہیں بولا جاتا بلکہ اُس کے معنے ہیں "دستانہ" -]

اُن لفظوں کے آخر میں بھی الف ہی لکھنا چاہیے جو ایک اُردو اور ایک فارسی یا عربی جز سے بنے ہیں: جیسے "درہ خما" (یعنی وہ جگہ جس میں درہ خم ہو)؟ "ریماہا"، "جھماہا"، "بجریگا"، "سنریگا" وغیرہ -

اِس سے یہ ایک کلیہ ہاتھ آیا کہ جب کسی اور زبان کا لفظ اُردو میں دوسرے معنے اور اُسی کے ساتھ دوسرا تلفظ اختیار کر لے تو اُس کا املا تھیک اُردو لفظوں کی طرح ہونا چاہیے -

۲ - جو لفظ خود فارسی ہی میں الف سے لکھے جاتے ہیں وہ ہرگز ہ سے نہ لکھے جائیں - اِن لفظوں کی تفصیل یہ ہے —

(الف) وہ جامد اسم یا صفت جن کے آخر میں الف ہے اور حرف اصلی کی حیثیت رکھتا ہے: جیسے اردھا، آسنا (چکی)، آسجارا، آسنا، دورنا، چلنا، پارسا، جارا (ایک قسم کا پتھر)، دارا، درا (گھنٹا، "بانگ درا")، دلاسا، دوبالا، دوپٹا، سپنا ("دیو سپنا" یعنی دیو کی سی

سکل والا)؛ سارا (''خالص''، جیسے ''عمر سارا'' میں)؛
سورما (سور + ما ـ ما کے معنے ہیں دکائی ہوئی چیز ـ یہ
لاحقہ کہانوں کے بہت سے ناموں میں آتا ہے ـ)؛ سیوا
(''فصیح'' کے معنوں میں جیسے ''سیوا زبان'' مگر
ڈھنگ اور حرکات و سکنات کے معنوں میں جو لفظ ہے
وہ ''ہ'' سے لکھا جاتا ہے ''سیوہ'')؛ باسنا؛ فرنا؛ گندنا ـ

(ب) فارسی فعلوں سے بنے ہوئے اسم فاعل اور صفت مشبہ وغیرہ؛
جیسے دونا؛ بینا؛ بینا؛ دانا؛ زینا؛ نذیرا؛ جویا؛ گویا؛
جہان آرا؛ جان فزا؛ جان فزا؛ دل کشا؛ صبر آزما؛
ہوش ربا وغیرہ ـ

(ج) بعض لفظ جن کے آخر سے کوئی حرف گر کر الف رہ گیا ہو؛
جیسے ما (ماے)؛ خدا (خداے)؛ ما (ماے)؛ وغیرہ؛ یا جیسے
آوا (''آواز'' کا مخفف)؛ اُفتا (''افتان'' کا مخفف) وغیرہ ـ

(د) وہ لفظ جو ہا زیادہ کر کے جمع بنے ہوں؛ جیسے صدہا،
ہزارہا، دلہا وغیرہ ـ

(ہ) بعض لفظ یا نام جن کے آخر میں بیار یا خوار یا بدا
کے لیے الف بڑھا دیا گیا ہو؛ جیسے بارآرا (یعنی بارآری)؛
بسیرا؛ رکنا؛ طالبا؛ حافظا؛ سعدیا وغیرہ ـ

[یاد رکھنے کی بات ہے کہ ''سمیعا'' ایک قسم کا خط
ہے جسے مُلّا سمیعا نے ایجاد کیا تھا اِس لیے ''خط سمیعا''
مشہور ہوا ـ اُسے ''سمیعہ'' یا ''شمعہ'' لکھنا غلط ہے ـ]

۳ ـ ترکی لفظ جو فارسی اُردو میں مستعمل ہیں اور جن کا املا
الف ہی سے ہونا چاہیے :ـــ

آلتمغا؛ تمغا؛ طغرا ـ اِس لیے ''تمغۂ سرافت'' اور

"طغرۂ سلطانی" غلط ہوگا - صحیح "بمغاے شرافت"
اور "طغراے سلطانی" ہے -

۴ - عربی کے جو لفظ خود عربی ہی میں الف سے لکھے جاتے ہیں
اُن کو ۂ سے لکھنا صحیح نہیں - وہ الف ہی سے لکھے جائیں - اِن لفظوں
کی تفصیل یہہ ہے :—

(الف) وہ اسم جو افتعال یا استفعال کے وزن پر مصدر ہیں اور
اُن کے آخر میں الف کے بعد ایک ہمزہ ہے - یہہ ہمزہ
اُردو میں گر جاتا ہے اور الف رہ جاتا ہے؛ جیسے :—
ابتدا، اجتبا، ارتضا، اربعا، اصطفا، اقتدا، اکتفا،
التوا، امتلا، ابتہا، استثنا، استدعا، استسقا، استعفا،
استغنا، استفتا، استمرا، استقصا، استنجا، استیلا وغیرہ -

(ب) یہہ لفظ جن میں سے بعضے اسم جامد ہیں اور بعضے صفت -
اِن کو بھی ۂ سے لکھنا غلط ہے —
حلوا، سقّا، سہلا ("نرگس سہلا")، عزا ("شاعر عزّا")،
بیضا ("ید بیضا")، مُحیا، مُدارا، مُداوا وغیرہ -

(ج) بعض مذکر نام الف پر ختم ہوتے ہیں - اِن میں سے بعض
کے آخر میں ایک ہمزہ بھی تھا سو وہ اُردو میں گر چکا،
اور بعضوں کے آخر میں ہمزہ تھا ہی نہیں صرف الف تھا -
ۂ اِن میں سے کسی میں نہ تھی :—
زکریا، زکریا، عادیا، مسیحا وغیرہ -

(د) بعضے مونث ناموں کی حالت بھی یہی ہے —
زہراء (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نام)؛ [1]، سارا، حوا وغیرہ -

---

[1] "زہرہ" اِس سے مختلف ہے - ایک ستارے کا نام زُہرہ ہے - کبھی بیٹیوں کا
نام اِس مناسبت سے بھی رکھا جاتا ہے -

(ہ) بعض جمعیں* جیسے بقایا، برایا، بنایا، رعایا، عطایا وصایا، ہدایا وغیرہ۔

(و) بعض متعلق فعل جن کی تنوین فارسی اور اردو میں گر گئی ہے: جیسے اصلاً، ظاہراً۔

(ر) اِن لفظوں کے آخر میں الف مقصورہ تھا، جسے عربی کے قاعدے سے یوں (ی) لکھتے ہیں، مگر فارسی اور اُردو میں اُس کے لیے ایک معمولی الف لکھتے ہیں۔ ہ سے اِن لفظوں کو لکھنا سراسر غلط ہے۔—

بقایا، بقایا، ماجرا، مدعا، معمّا، مرثیا، مفتیا، منشا، دعوا، بقوا، مصفّا، مطلا، معرا وغیرہ

[بعض لوگ عربی املا کی تقلید میں "دعوا" اور "بقوا" یا "مرثیا" اور "منشا" کو الف مقصورہ کے ساتھ لکھتے ہیں جو جائز ہے۔ مگر اُردو میں سیدھے سادھے الف کو ترجیح ہونا چاہیے۔

فائدہ۔ بعضے عربی یا فارسی لفظ ایسے ہیں کہ اُنکے آخر میں ہ آتی ہے مگر جب اُن کی جمع بناتے ہیں تو اُس متحرکی ہ کو الف سے بدلنا ضروری ہوجاتا ہے: یعنی اُن تمام مونث اسموں اور بعضے مذکر اسموں کی جمع میں ہ کو الف سے بدل کر جمع کی علامت لگاتے ہیں: جیسے "تبوہ" سے "تبوائیں"، "تیوا ہوں" و "دایہ" سے "دایائیں"، "دایا ہوں"، "فتحنہ" سے "فتحنائیں"، "فتحناؤں"، "قابلہ" سے "قابلائیں"، "قابلاؤں" وغیرہ اور "جلیسہ" سے "جلیساؤں"، "علّامہ" سے "علاماؤں"۔

---

* تفصیلی بحث کے لیے دیکھو رسالہ اُردو اورنگ آباد مارچ ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۴۱ - ۲۴۲ -

[بعض لوگ "بھوں" ، "دایوں" وغیرہ بولتے اور لکھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ۔]

اِن تمام تصریحات سے واضح ہو گیا کہ اُردو کا خاص حرف الف ہے اور ہر موقع پر ہمیں اُسی کو کام میں لانا چاہیے سوا چند فارسی اور عربی لفظوں کے جن کا املا ہ سے ہے (اور اس ہ کی آواز الف کی سی ہے)۔ اب جن عربی یا فارسی لفظوں کے آخر میں ہ ہے اُن کو بھی ہم بعض حالتوں میں ہ کی جگہہ الف سے لکھتے ہیں ۔ اِن میں سے ایک حالت تو اوپر بیان ہو چکی ۔ دو اور حالتیں اور بھی ہیں —

(۱) جب قافیے میں مختفی ہ ، الف کے مقابل ہو تو اُس مختفی ہ کو لکھنے میں الف سے بدل دینا چاہیے ، جیسے

غافلہاے بے حیا کا قِلا کیا ۔

(۲) ایسے لفظوں میں جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں اور اُن کی غیریت محسوس نہیں ہوتی ، ہ کی جگہہ الف لکھنا جائز ہے ، جیسے "مرہ" کی جگہہ "مرا" ۔

(۳) ایسے الفاظ جن میں اُردو والوں نے کوئی تصرف کر لیا ہو ، جیسے "دوماہہ" سے "دُماہا" ۔ "دُخما" (یعنی دوجم والا) وغیرہ ۔

(۲) مختفی ہ یا ے ؟

(الف) مختفی ہ پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کی جمع میں تو لوگ باقاعدہ ، آواز کے مطابق ، لکھتے بھی ے ہی ہیں ۔ جیسے "دو بچے کھیل رہے تھے" ۔ مگر جب وہی لفظ واحد منحرف حالت میں ہوتے ہیں اور تلفظ اُن کا وہی ہوتا ہے جو جمع قائم کی حالت میں ہوتا ہے تب بھی

اکثر لوگ اُن کو ہ سے لکھتے ہیں - یہ کسی طرح درست نہیں - اُنہیں لکھنا بھی ویسے ہی چاہیے جیسے وہ بولے جاتے ہیں ' یعنی یوں —

'' وہ چھٹے درجے میں پڑھتا ہے '' - '' میں مدرسے جاتا ہوں '' - '' اُس بچے نے اِس معمے کو حل کرلیا '' - '' سیر کے بنچے میں بڑی طاقت ہوتی ہے '' - '' اِس واقعے سے سب کو عبرت ہوئی '' -*

(ب) پانچ کے عدد کو لوگ عام طور پر '' چھہ '' مختفی ہ کے ساتھ لکھتے ہیں ' حالانکہ اس لفظ کا فصیح تلفظ '' چھے '' ہے - پس کوئی وجہ نہیں کہ اِسی طرح نہ لکھا جائے -

(ج) '' کیوں کر '' کی جگہ اگلے وقتوں میں '' کیونکے '' بولتے تھے اور ے کے ساتھ لکھتے تھے - ایک دوسرا لفظ ہے '' کیونکہ '' (یعنی '' کیوں کہ '' جس میں '' کہ '' کا بیانیہ ہے) - لوگوں نے '' کہ '' اور ''کے'' کے معنوں میں فرق نہ کرکے '' کیونکے '' کو '' کیونکہ '' بنا دیا اور ڈراے استادوں میر' سودا' درد' وغیرہ کے دیوانوں میں '' اصلاح '' فرما دی - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہہ اصلاح نہیں' تصحیف ہے - ''کیونکر'' کے معنے میں ''کیونکے'' اب تحریری زبان سے تو گویا خارج ہو گیا ہے لیکن بعض شہروں کے لوگ بول چال میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں - پس نہ صرف ڈراے استادہ کے کلام میں بلکہ بول چال کی بنا پر اِس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اِس لفظ سے کہیں نہ کہیں

---

* دیکھو ایضاً صفحہ ۲۵۳ - ۲۵۴ -

دُھار ہوں گے - اِس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ''کر'' کا قائم مقام ہو تو ''کے'' اور نہیں تو ''کہ'' لکھا جائے ، جیسے

نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بد عہدی—(غالب)

(۳) نونِ غُنّہ -

بعضے لفظ ، جن میں نون غنہ ہے ، کئی طرح سے لکھے جاتے ہیں - اُن میں سے صرف اُسی طرز کو اختیار کرنا چاہیے جو تلفظ میں سب سے زیادہ قریب ہو - ''گُنْوا'' - ''گُنواں'' ، ''گُواں'' ، ین طرح سے لکھتے ہیں - اِن تینوں میں بہتر ''گُنْوا'' ہے (اور ''گُنْوے'' ، ''گنْووں'') ، اِسی طرح ''دھنْوا'' (اور ''دھنْوے'' - ''دھنْووں'') - ''گانْو'' (جمع : ''گانْؤوں'') - ''جھانْو'' - ''آنْو'' - ''دانْو'' (جمع : ''دانْؤوں'') ، ''تانْو'' (جمع . ''تانْؤوں'') -

اِس طرح پر ''کدواں'' - ''دھنواں'' - ''کواں'' - ''دھواں'' ، ''تاوں'' ، ''گاوں'' ، ''داوں'' ، ''جھاوں'' وغیرہ صورتیں ترک ہو جائیں گی -

البتہ : ''ڈھلواں'' ، ''گنھواں'' ، ''جوڑھواں'' اور ترتیبی گنتیاں جیسے ''ساتھواں'' - ''ساتواں'' - ''آٹھواں'' - ''نواں'' - ''دسواں'' وغیرہ اور ''ساتھویں'' - ''ساتویں'' (مونث) وغیرہ درست ہیں -

گنتی کے لفظوں میں (۱۱ سے ۱۸ تک) آخر کا حرف ہ ہے - بعضے لوگ اُن کے آخر میں اں لکھ دیتے ہیں - اس لیے کہ بعض جگہوں میں

؛ بعض لوگوں کو اس پر اصرار ہے کہ ''کنواں'' وغیرہ لکھنا چاہیے - اِس لیے کہ اِس لفظ کے پہلے اور دوسرے دونوں بول غنہ رکھتے ہیں - لیکن جمع میں ایسا نہیں ہے - غنہ پہلے ہی بول میں ہے اور دوسرا پہلے سے گرنا منادر ہوگیا ہے -

''گیاراں'' ، ''باراں'' وغیرہ بولتے ہیں - اور جو لوگ ''گیارا'' ''بارا'' بولتے ہیں وہ کبھی کبھی اُسی طرح لکھہ بھی جاتے ہیں مگر یہ درست نہیں، کس واسطے کہ اِن لفظوں میں ہ اصلی اور ملفوظ ہے - پس اِن گنتیوں کو ہ کے ساتھہ لکھنا چاہیے - یعنی ''گیارہ'' - ''بارہ'' - اب جس کا جی چاہے وہ ''گیارا'' یا ''گیاراں'' بول لے - یہ وہی بات ہے کہ ''ہوا'' کو بعض جگہ ''وا'' بولتے ہیں مگر اِس طرح لکھہ نہیں سکتے -

بعض لوگ ''دونوں'' کو ''دونو'' بغیر ''ں'' کے لکھتے ہیں - یہ غلط ہے - صحیح ہے ''دونوں'' جیسے ''تینوں'' - ''چاروں'' - ''پانچوں'' - ''چھیوں'' - ''ساتوں'' وغیرہ -

جمع منادا کے ساتھہ کبھی کبھی لوگ ایک ''ں'' بھی لکھہ دیتے ہیں یعنی ''اے لڑکوں!'' - یہہ درست نہیں ؛ بغیر نون کے لکھنا چاہیے ؛ جیسے ''اے لڑکو!'' - ''صاحبو!'' -

جھوٹ کہتا نہیں، میں، سچ جانو،

کافرِ عشق ہوں، مسلمانو!—(فلن لکھنوی)

(۴) ہمزہ (ء) -

(الف) اِس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ ہمزہ، الف کا قائم مقام ہے- جس جب دو حرف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو اُن کے بیچ میں ہمزہ آسکتا ہے، نہیں تو نہیں - اِس لیے ''آؤ'' ، ''جاؤ'' ، ''گئے گاؤ'' - ''دو لڑکے آئے'' ، - ''آپ آئے'' ؛ ''میں آؤں، تو کیا لاؤں؟'' ؛ ''میں چاہتا ہوں کہ آرام سے سوؤں'' وغیرہ میں ہمزہ لکھا جائے ؛ مگر ''بناؤ سنگار'' ، ''بھاؤ بتاؤ'' ، ''بھاؤ'' ، ''گھاؤ'' ''کڑھاؤ''

میں ہمزہ کا کچھ کام نہیں - اِسی طرح ''گائے'' ، ''چائے'' ، ''رائے'' ، ''ہائے'' میں بھی ہمزہ نہ چاہیے اور یہی حال ''دیو'' اور ''سیو'' اور ''رہو و رہا'' وغیرہ کا ہے - اِن لفظوں میں الف ے الف و یا ے و مل کر ایک آواز دیتے ہیں اِس لیے اُن کے بیچ میں ہمزہ کی گنجائش نہیں -

(ب) ''لیے'' (دونوں معنوں میں) ''اُس نے دو سو روپئے دیے اور دو گھوڑے ''لیے'' - ''اُس نے اپنے لئے چار جوڑ موزے لیے اور اپنے بھائی کے لیے ایک ہی جوڑ'' - ''سیکڑوں دیے جل رہے ہیں - دیوالی کی بہار ہے'' -

اوپر کے جملوں میں دیے اور لیے کی بہت سی مثالیں آگئیں - ہمزہ کہیں نہیں آنا چاہیے - ''چاہیے'' ، ''دیجیے'' ، ''لیجیے'' وغیرہ میں بھی ہمزہ نہیں بلکہ ے ہے - اِسی طرح ''تھالیوں'' ، ''گالیوں'' وغیرہ میں -

ہمزہ اُسی وقت آئے گا جب اُس سے پہلے زبر ہو - اگر اُس سے پہلے زبر ہوگا تو ے آئے گی یعنی ''گئے'' میں ہمزہ ہے مگر ''کیے'' میں ے -

(ج) جہاں ہمزہ لکھنا ضروری ہے وہاں لوگ اکثر کاہلی کے مارے اُسے چھوڑ جاتے ہیں ؛ جیسے

''پچھوؤں'' کو ''پچھوں'' بلکہ کبھی ''پچھوں'' -
''لکھنئو'' کو ''لکھنؤ'' - ''ہندوؤں'' کو ''ہندوں'' یا ''ہندوں'' - یہ درست نہیں -

(۵) ں ب اور ن ب -

جب کسی لفظ میں نون غنہ کے بعد ہی ب ہو تو یہ دونوں حرف

مل کر م کی آواز دیتے ہیں ؛ جیسے آب سے آم (جس کی تصغیر "امبا" کا تلفظ "امبا" بلکہ "امبا" ہوتا ہے) ، تب سے تم ، سنب سے سم - ان لفظوں کو م ہی سے لکھنا چاہئے - فارسی عربی لفظوں زنور - تنورہ - سنہ - گنبد - جنب میں جو ساکن ن ہے وہ تلفظ میں م ہو جاتا ہے مگر لکھا ن ہی جاتا ہے - البتہ جب "گنبد" سے اُردو والوں نے "گُمبد" بنایا اور اُس کی تصغیر "گُمبی" - تو ان دونوں لفظوں کو م ہی سے لکھنا پڑا - اس قاعدہ سے نکلا کہ فارسی عربی کا لفظ ہو تو املا میں اُنہیں زبانوں کی پیروی کی جائے نہیں تو م لکھا جائے -

(۶) ذ یا ز ؟

فارسی اور اُردو لفظوں میں ذ اور ز کے لکھنے کے متعلق ہمارے ملک میں بڑا اِختلاف ہے - سب سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی نے ایک خط میں* جو انھوں نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا ؟ یہ خیال ظاہر کیا کہ ذ عربی کے مخصوص حرفوں میں ہے - اس لیے فارسی لفظوں کو ز سے لکھنا چاہیے نہ کہ ذ سے - ادیبوں اور شاعروں کے گروہ میں یہ مسئلہ مدتوں زیر بحث رہا اور اب بھی کبھی کبھی یہ بحث چھڑ جاتی ہے -†

---

* یہ خط "موعظۂ حسنہ" میں درج ہے -

† سنہ ۱۹۰۵ع اور سنہ ۱۹۰۶ع میں رسالہ "ریاض الملک" دہلی ، میں اِس پر مسلسل بحث ہوتی رہی - سنہ ۱۹۰۷ع میں رسالۂ "عالم گیر" ہردوئی ، کے ایک مضمون پر غالباً یہ سلسلہ ختم ہوا اور گونہ بے لطفی کے ساتھ - پھر "ریاض الملک" کے تمام مضمون کو جو اس بحث سے متعلق تھے جناب وصل بلگرامی نے ، کہ رہی اس بحث کے چھیڑنے کے ذمہ دار تھے - رسالہ "مرقع" لکھنؤ بابت اپریل و مئی سنہ ۱۹۲۸ع میں اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا - باوجود ایسی تفصیلی بحث کے فارسی میں ذ کے ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ دبا ہی رہا -

واقعہ یہہ ہے کہ د عربی کے ساتھہ مخصوص نہیں ہے اور حقیقت میں ت بھی مخصوص نہیں - یونانی اور قدیم ایرانی زبانوں میں اِن دونوں حرفوں کی آوازوں کا وجود تھا - چنانچہ عربی زبان میں جو لفظ یونانی یا فارسی سے لئے گئے ہیں اُن میں یہ دونوں حرف ملتے ہیں۔ یہہ سمجھنا صحیح نہیں کہ "اُستاد" کی د پر عربوں نے تصرف کر کے ایک نقطہ لگا دیا - اصلیت یوں ہے کہ اُنہوں نے ایرانیوں سے "اُستاد" ہی سنا اور اُسی طرح بولنے اور لکھنے لگے - جوں ایرانیوں کی زبان میں بعد کو وہ د ، ذ ہوگئی - اِس لیے کہ اِسلامی زمانے میں بلکہ شاید اُس سے کچھہ پہلے ہی ت اور د کی آوازیں زبان سے جاتی رہیں - ہر ت ، د ہو گئی مگر اِنے گئے لفظوں میں د کا تلفظ ز سے بدل گیا - لیکن اُن لفظوں کو لوگ ایرانی عادت کے مطابق ذ ہی سے لکھتے رہے جیسے "آذر" - "گذشتن" - "بذیرفتن" - "بذرو" - "کاغذ" - ایک "گذند" ایسا لفظ ہے جو دونوں طرح سے بولا اور لکھا جاتا ہے یعنی "گذند" اور "گزند" - ہندوستان میں لوگوں نے اِس لفظ کی اِسی دوسری صورت سے "گمر" بنا لیا اور اُس کی تصغیر "گمری" ہوئی - ایران کے بعض مقامات میں "بذرو" کی جگہ "بدو" اور "کاغذ" کی جگہ "کاغد" بھی سنا جاتا ہے - خلاصہ یہ ہے کہ اِن فارسی لفظوں میں اگر آواز کا لحاظ کیجیے تو ز ہے اور قدیم زبان اور کتابت کو مانیے تو ذ -

اُردو میں "گزر" اور "گزار" اور اُس کے مشتقات کو زیادہ تر ز ہی سے لکھتے ہیں اور یہہ کچھہ بے جا نہیں مگر ذ بھی اِن لفظوں میں صحیح اور جائز ہے "آذر" اور "کاغذ" کو ہمیشہ اور "بذیرا" وغیرہ کو اکثر ذ سے لکھتے ہیں اِن کو یوں ہی رہنے دینا چاہیے - اِن

---

* کسی آئندہ موقع پر تفصیل کے ساتھہ اِس مسئلے پر بحث کی جائے گی -

فارسی لفظوں کے علاوہ جن لفظوں میں د آتی ہے وہ عربی سے آئے ہیں - اب چاہے وہ تہیت عربی ہوں یا کسی اور زبان سے عربی میں مستعار - ایسے لفظوں میں عربی اِملا کی پیروی لازم ہے گو کہ آواز کے لحاظ سے اُردو میں ایک اکیلی ز ہی ذ ، ض اور ظ کی قائم مقام ہے -

چند عربی اور فارسی لفظوں کا غلط اِملا رواج پا گیا ہے ؛ البتہ محتاط لوگ اُس سے پرہیز کرتے ہیں - اُن لفظوں میں سے یہ مثالیں زیادہ اہم ہیں —

(۱) "بحر رخّار" کو بعض کم سواد لوگ "بحر دخار" لکھتے ہیں - غالباً اِس دھوکے میں کہ "رخّار" ، "دخیرہ" سے بنا ہوگا - اصلیت یوں ہے کہ "رخار" کو "دخیرہ" سے اصلا تعلق نہیں بلکہ "رُخار" کے معنے ہیں "تہہ اُمنڈتا ہوا (سمندر) " یا چڑھا ہوا (دریا) " -

(۲) "ذکی" اور "زکی" اپنی اپنی جگہ پر دونوں صحیح ہیں - مگر لوگ "زکی" کے محل پر بھی "ذکی" لکھا کرتے ہیں - یعنی "زکی الدین" یا "محمد زکی" کسی کا نام ہو تو اُس کو زھی سے لکھنا چاہیے - اس لیے کہ "زکی" کے معنے ہیں "پاک" اور "ذکی" کے معنے "تیز فہم" بھی ہیں اور "قابل ملامت" بھی -

(۳) "زکریا" کو بعض لوگ غلطی سے ذ سے لکھتے ہیں بلکہ بعضے تو یہ سنم کرتے ہیں کہ "ملازم" میں بھی ذ لکھہ دیتے ہیں -

(۴) "آزوقہ" - عربی لفظ نہیں ہے فارسی ہے اور اُس کا املا ز سے صحیح ہے - غلطی سے لوگ ذ سے لکھہ دیتے ہیں اور یہہ غلطی فارسی کتابوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے -

(۵) ''آزر'' (حضرت ابراہیم کے چچا کا نام) ز سے ہے اِسے فارسی لفظ ''آذر'' سے کوئی تعلق نہیں ۔

(۶) '' داب '' ۔ عربی لفظ ہے ، جس کے معنے ہیں '' نفس '' یا '' نفس نفیس '' یا '' شخص '' ۔ '' برادر '' یا '' قوم '' وغیرہ کے معنے نہیں ہیں ۔ اِن معنوں میں جو لفظ اُردو میں بولا جاتا ہے وہ حقیقت میں سنسکرت کے لفظ '' جاتِ '' سے نکلا ہے ۔ ہندی میں ت کا کسرہ اِس وجہ سے گر گیا کہ کسی لفظ کا آخر حرف متحرک نہیں ہو سکتا ۔ اُردو والوں نے ج کو ز کی آواز سے بدل دیا ۔ چاہیے تھا کہ اِس لفظ کو ز سے لکھتے ۔ لیکن عربی لفظ '' داب '' کے دھوکے میں اِس کو بھی د ہی سے لکھنے لگے ۔ اِس غلط طریقے کو یقیناً ترک کرنا چاہیے اور جہاں '' برادر '' '' قوم '' وغیرہ کے معنے ہوں وہاں ز ہی سے لکھنا چاہیے جیسے '' زاب ناب '' ۔ '' زاب جماعت '' '' زاب زاب '' ۔ '' وہ زاب کا برہمن ہے '' ۔ '' اُس کی زاب کھڑی ہے '' ۔

(۷) عربی کا ایک لفظ '' ذرہ '' ہے (جس کی ز پر تشدید ہے) ۔ اِس کے معنے ہیں ''کسی چیز کا بہت چھوٹا ٹکڑا'' ۔ اُردو میں یہہ لفظ بولا جاتا ہے اور اِنہیں معنوں میں بولا جاتا ہے ۔ مگر اِس کے علاوہ ایک اور لفظ بھی ہے جو صرف صفت یا متعلق فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جس کے معنے ہیں '' تھوڑا '' ۔ اِس کی ز پر تشدید نہیں اور تیسرا حرف آ ہے ۂ نہیں ؟ مگر بعض لوگوں کو اصرار ہے کہ چوں کہ اِس لفظ کے ادا ہونے کا باعث

عربی لفظ "درہ" ہوا ہے اِس لیے اِسے بھی ذ ہی سے لکھنا چاہیے - یہ نہیں دیکھتے کہ تلفظ میں ایک چھوڑ دو دو تصرف ہوے - معنوں میں فرق ہو گیا - یوں کہنا چاہئے کہ اُردو نے نہ ایک بالکل نیا لفظ پیدا کیا - پھر کوئی وجہ نہیں کہ ز سے نہ لکھا جاے - ادیبوں اور شاعروں کے رایوں میں اختلاف ہے - کچھ لوگ کہتے ہیں ذ سے لکھو، کچھ لوگوں کا قول ہے کہ اِس کا املا ز ہی سے صحیح ہے اور ذ سے غلط - اصولاً ز کو ترجیح ہے - اِس لیے کہ اب عربی لفظ "درہ" سے اِسے نہ تلفظ کی رو سے کچھ واسطہ رہا اور نہ معنے کی جہت سے - بلکہ "زرا" تہیت اُردو لفظ ہو گیا -

(۷) ص یا س ؟

فارسی والوں نے اپنی زبان کے بعض لفظوں کو عربی حرفوں سے لکھنا شروع کر دیا - اس لیے کہ ہم آواز لفظوں کا ایک دوسرے سے امتیاز ہو سکے - "صد" ، سو کے معنے میں ، حقیقت میں س سے ہے ؟ مگر اِس کا رواج ایسا متواتر ہے کہ اب غلطی کی اصلاح کچھ ناممکن سی ہو گئی ہے - "شصت" (ساٹھ) دونوں طرح سے لکھا جاتا ہے - اِس لیے اگر اُردو میں کبھی اِس فارسی لفظ کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو سست لکھنا بہتر ہوگا -

"مسالا" کی بحث اوپر آچکی ہے (دیکھو الف اور مختصی ہ کا بیان)-

(۸) ط یا ت ؟

فارسی اور ترکی کے بعض لفظ کسی نہ کسی وجہ سے ت کے بجاے کبھی ط سے بھی لکھے جاتے ہیں - جیسے "طاس" - "طمغدن" -

"طشت" ۔ "طوطی" ۔ محتاط لوگ ت ہی سے لکھتے ہیں اور ہم کو یہی املا اختیار کرنا چاہیے یعنے "تس"۔"تشب" ۔ "تستری" ۔ "توتیا" ۔ "توب" ۔ "تماچا" ۔ "تمار" کو "طمار" بھی لکھتے ہیں ۔ ہم کو "تمار" اختیار کرنا چاہیے ، سوا اِس کے کہ یہہ لفظ "اُڑنے والا" کے معنوں میں استعمال ہوا ہو ۔

(۹) کچھہ اور لفظ ۔

بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ وہ صحیح لکھے جاتے ہیں لیکن اُن کا غلط املا بھی ایک حد تک رائج ہو گیا ہے ۔ اُن میں سے چند خاص توجہ کے قابل ہیں —

صحیح املا	معنے	غلط املا
اردحام	ہجوم ۔ بھیڑ	اردھام ۔ اردھام ۔ اردحام
اسراف	فضول خرچی	اصراف
تباشیر	تبس لوحن	طباشیر
تریاق	زہر کا مارگ	طریاق
تلاطم	سمندر یا دریا کا بھیڑے مارنا	طلاطم
توتیا		طوطیا
دواب	روشنائی کا برتن	داواب
عوض	بدلا	عیوض
مرہم	زخم کی دوا	مرحم ۔ ملہم
مُسرف	فضول خرچ آدمی	مصرف
مع	ساتھہ ۔ سمیت	معہ

قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تعلقات

از پروفیسر محمد حبیب (آکسن)

ہمارے زمانۂ وسطیٰ کی بادشاہی ایک خالص دنیاوی سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی ۔ شاہی اقتدار کی بنیاد میں اسلامی قانون نہیں، بلکہ ایرانی روایات کار فرما تھیں ۔ شاہان و سلاطین دہلی اصولاً نہایت احتیاط سے اپنے فرائض مذہبی اور اپنے دینی عقیدے میں تفریق و امتیاز رکھتے تھے ۔ جہاں تک کہ قانون عامہ کا تعلق ہے، اُنہوں نے شریعت کا دباؤ نہ جبر روا نہیں رکھا ۔ وہ صرف امیرالمؤمنین نہ تھے بلکہ مثل بادشاہوں کے اپنی تمام رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ رکھتے تھے ۔ یہ جبر ہے جو غائر توجہ کی مستحق ہے اور جو ایک طرف زمانۂ وسطیٰ کے عصبیت و عربی قومی احساس، اور سیاسیات کے مکمل دنیاوی ہو جانے کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری طرف سلطنت دہلی (اور صرف سلطنت دہلی) کی تمام رعایا میں جمعیتی رواداری کی وسعت پذیری کو نمایاں کرتی ہے ۔

سلاطین دہلی اور ہندوؤں کے مابین، ان کے ممالک محروسہ میں رشتۂ اتحاد، عقیدہ و مذہب نہ تھا ۔ بلکہ صرف بادشاہ و رعایا کا تعلق تھا جسے طرفین اپنے اپنے مقام پر اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ بادشاہ کو اپنی ہندو رعایا کی روحانی تحاب سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ اس کی کوئی اخلاقی ذمہ‌داری محسوس کرتا تھا، نہ سوال اس کے فیصلے کے لئے نہ تھا ۔ جب تک وہ (ہندو رعایا) اس کی واجبی فرماں برداری کا حق ادا کرتی رہتی، وہ بالکل مطمئن ہوتا تھا ۔

ہندو؟ ہر چند کہ بادشاہ کے سیاسی معاملات میں اعانت کے لئے تیار رہتے تھے لیکن اپنے معتقدات میں کسی قسم کی مداخلت روا نہ رکھتے تھے ترکی حملوں کا سیلاب؟ جب اتنا فاتحانہ دور ختم کر چکا تو حکومت کی امکانی پالیسی تمام رعایائے مملکت کے لئے "رواداری" تسلیم کر لی گئی - سلطنت دہلی کے تمام طول و عرض میں ہندوؤں کی عبادتگاہیں دوامی امن کی حالت میں چھوڑ دی گئیں - اقدام مظالم کے وہ بس یا چار حوالے؟ جن کی طرف ہمارے مؤرخین اشارہ کرتے ہیں؟ بجائے "رسم عام" کے ثبوت کے؟ اس کے عدم ثبوت پر شاہد ہیں کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کو گھوڑوں پر سوار ہونے اور تیر وغیرہ چلانے کی اجازت نہ تھی اور جلوس نکالنے، نہان اور پوجا پاٹ کرنے کی عام ممانعت تھی مگر یہ داستانیں، اصل ماخذوں، کے غلط مطالعہ کے باعث تیار ہوئی ہیں -

---

؟ مثلاً ضیاءالدین برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے، "علاؤالدین خلجی کے طور عمل سے "ہندو" کی حالت اتنی پست ہو گئی تھی کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکتا تھا نہ ریشمی لباس پہن سکتا تھا اور نہ اپرانی شان سے پیر چلا سکتا تھا" برنی کے بیان کے عائر نظر سے پڑھنے والے کو اطمینان ہو جائیگا کہ اس کا مطلب تمام ہندوؤں سے نہیں بلکہ ایک خاص طبقے کے ہندوؤں سے ہے جن کے خلاف علاؤالدین نے یہ طور عمل اختیار کرنا چاہا تھا اور جن کو برنی، "مقدم" "کھوت" اور "ملاہر" بتاتا ہے - مقدم کے معنے پہلے آدمی کے ہیں، کھوت غالباً فارسی لفظ 'خط' کی جرائی ہے - خط یا دستاویز کا مطلب اُس آدمی سے ہے جس نے محکمۂ محاصل میں یہ اقرار نامہ داخل کیا ہو کہ وہ اس مقام یا موضع کے محاصل ارضی کا ذمہ دار ہوگا - لفظ "ملاہر" کا ٹھیک مفہوم معلوم کرنا مشکل ہے لیکن اس میں مطلق شک کی گنجائش نہیں کہ برنی، "ہندو" سے گاؤں کا مکھیا مراد لیتا ہے - علاؤالدین نے گاؤں کے مکھیاؤں کے خلاف دو باتیں کیں - اول یہ کہ اُس نے حقوق کھوتی (وہی لگان کی اس دستوری کو جو انہیں تحصیل لگان کے صلہ میں ملا کرتی تھی) موقوف کر دیا اور تحصیل لگان کا انتظام محکمۂ محاصل یا دیوان کے نمائندوں (نوابوں) کے ذریعہ کر دیا - دوسری یہ کہ اُسنے ہدایت کی کہ تمام اراضی کا لگان، اس کی جنس کے اعتبار سے لیا جائے اور یہ کہ مالگزار کا بار کمزور پر ہرگز نہ ڈالا جائے -

یہ ظاہر اِس منصفانہ قانون نے مکھیاؤں کو سخت صدمہ پہونچایا لگان وصول کرنے والے کی حیثیت سے، وہ اِس وقت تک اراضی کا، جس کی وہ خود کاشت کرتے تھے، کوئی

ملک نائک نامی ایک ہندو جنرل ' علاؤالدین کی فوج کے میمنہ پر کمان کرتا تھا اور حضور کا راجا تاج ہزار آدمیوں کے ساتھ اس کے ہراول کی رہنمائی کرتا تھا یہہ اور اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں تو کیا ایک ایسی جماعت کے لوگ ' جنھیں گھوڑوں پر سوار ہونے اور سلحہ لگانے کی ممانعت رہی ہو ' یہ حیثیت حاصل کر سکتے تھے ؟

میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس قسم کی رائے رکھی پسند نہیں کرتا کہ تمام مملکت میں جو رواداری ہندو مذہب کے لئے منظور کی گئی تھی وہ بادشاہ کی آزاد مرضی کا نتیجہ یا یہ کہ اس کی مسلمان رعایا کا متعصب طبقہ بھی اسے پسند کرتا تھا وہ تو زیادہ تر مجبوریوں اور سخت سیاسی ضرورتوں کا تقاضا تھا - اُس زمانہ کا ہندو مذہب ' مسلح و منّظم تھا اس کے ساتھ رواداری اس لئے برتی جاتی تھی کہ رواداری کرنی ہی چاہیے تھی اور اس کے سوا کوئی اور دوسری راہ نہ تھی -

---

محاصرہ نہیں دیتے تھے بلکہ اس کے عوض رعایا ہمسایوں کو اصل مطالبے سے زائد ادا کرنے کے لئے مجبور کیا کرتے تھے -

اگر ہم تاریخ فرشتہ پر اعتماد کریں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین نے مویشی رکھنے کی زیادہ سے زیادہ تعداد معین کر دی تھی - ایک گاؤں والا ' چار بیل - (گائے یا بھینس) اور بیس بکریاں (یا بھیڑیں) رکھ سکتا تھا تاکہ چراگاہیں گاؤں کے قابو یافتہ اور سر برآوردہ لوگوں کے بیجا استعمال سے محفوظ رہ سکیں - علاؤالدین شکایت کیا کرتا تھا کہ اس کی تحت نشینی کے وقت یہ مکھیا ہاتھ جنگ کیا کرتے تھے اور محکمہ محاصل کے نمایندے جب ان کے یہاں جاتے تو وہ ان کو قید کر لیتے اور طرح طرح سے ستایا کرتے تھے آج اِس قانون نے ' جو علاؤالدین کے سپاہیوں کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں بذریعہ جبر رائج کرایا گیا ' مکھیاؤں کو محتاجی کی حد تک پہونچا دیا - وہ اپنے گاؤں پر مالکانہ حقوق کے مدعی ہو چلے تھے لیکن علاؤالدین نے انہیں کاشتکار کی حیثیت میں لا کر پست کر دیا - برنی یہہ نہیں کہتا کہ ان کو یہہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں ' ریشمی لباس نہ پہنیں بلکہ اس کے بیان کے موافق ' وہ اس درجہ غریب و محتاج ہو گئے تھے کہ آئندہ سے ان خطوط کی انھیں مقدرت ہی نہیں رہ گئی تھی - بد قسمتی سے اس فقرے نے بڑی غلط فہمی پیدا کردی لیکن اُس پڑھنے والے کو کوئی دشواری نہیں پیدا ہوسکتی ' جو حسب بیان برنی علاؤالدین خلجی کی دیگر اصلاحات کے ساتھ اِس کا بھی مطالعہ کرتا ہو -

گو مکھیاؤں میں اکثریت ہنود ہی کی تھی لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان میں بہت مسلمان بھی تھے - علاؤالدین کا طرزِ عمل ان سب کے خلاف تھا -

(فارسی متن صفحات ۲۹۶ - ۲۸۲)

سنہ ۱۲۹۱ ع میں سلطان جلال الدین خلجی نے رنتھنبور کا محاصرہ کرنا چاہا لیکن اُسے نا قابل تسخیر پاکر اُس نے فوج کو پسپائی کا حکم دے دیا - جس وقت ساہی بزم مشاورت میں اس پر بحث شروع ہوئی تو اس کے بھتیجے ملک احمد حبیب نے اس حکم کی سختی سے مخالفت کی اس نے اعتراضاً کہا "اگر شہنشاہ رنتھنبور کو بغیر فتح کئے واپس ہوئے تو لوگوں (کے دلوں) سے آپ کا احترام کم ہو جائے گا - حضور والا، سلطان محمود اور سلطان سنجر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کیوں نہیں فرمائے ؟ وہ جو دین اسلام کے ستون تھے اور جنھوں نے دنیا فتح کرکے رکھدی - آپ ان کی مہمات وفتوحات (کی مثالوں) سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے" سلطان نے ہنس کر جواب دیا "صاحبزادے ! محمود اور سنجر کے اسلحہ بردار اور نقارے تک مجھ سے ہزار درجہ بہتر اور معزز تھے میں ، کہ عارضی بادشاہت کے ایک فریب برس مغالطے کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا ، ان کاموں کی انجام دہی کا جواب تک کیوں کر دیکھ سکتا ہوں جنھیں اُن بڑے بڑے فرماں رواؤں اور فاتحوں نے تکمیل کو پہونچا دیا ؟ میں کیا اور میری بادشاہی کی شان و طاقت کیا ، جو میں اُن کاموں کے لئے کوشش کروں جنھیں محمود اور سنجر نے کر دکھایا ہے ؟ بیوقوف ! تو دیکھتا نہیں کہ ہندو ، روزانہ میرے محل کے سامنے سے سنکھ بجاتے اور ڈھول پیٹتے ہوئے جمنا کے کنارے اپنے بتوں کو پوجنے کے لئے گزرتے ہیں، وہ میری آنکھوں کے سامنے اپنی کفر کی رسمیں مناتے ہیں، میری اور میرے ساہی اِقتدار کی تحقیر کرتے ہیں - میں اگر ایک حقیقی مسلم بادشاہ ہوتا تو کیا میں اُن کو یوں کھلے دیتا اس طرح صاف کپڑے پہننے دیتا ، اور ان کو بے جگری کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان ، سیخی مارتے دیتا ؟ شرم ہے میرے لئے اور میری بادشاہی کے لئے ! میرا نام ہر جمعہ کے خطبے میں پڑھا جاتا ہے ، جھوٹے خطیب

مجھے حامئي دين كہہ كر پكارتے ہيں - ليكن ميرے دين كے دشمن ہيں كہ ميري دارالخلافہ ميں اور ميري آنكھوں كے سامنے ' عيش و عشرت اور شان و شوكت سے زندگي بسر كر رہے ہيں اور اپني دولت و خوش حالي كے باعث ' مسلمانوں سے گُستاخانہ طور پر اظہار تفاخر كرتے ہيں - وہ كُھلے بندوں ڈھول بجا كر اپنے بتوں كو پوجتے ہيں اور اپني كافرانہ رسوم كو انجام ديتے ہيں - شرم ہے ميرے لئے ! ميں اُن كو اُن كے عيش و عشرت اور فخر و غرور ميں چھوڑے ہوئے ہوں اور اُن چند ٹكوں پر قناعت كيے ہوئے ہوں جو وہ خيرات كے طور پر مجھے دے دیتے ہيں -''

يہ بھي ايک متحمور و نابوان تعصب كي آخري كرشمہ و زادي ؟ جلال الدين ' جس كا عام احساس اس كي دينيات سے بلند پر واقع ہوا تھا - دھلي واپس آيا لیكن ہندوؤں كے خلاف اُس نے كوئي كارروائي نہيں كي - محمود غزنوي كا زمانہ رخصت ہو چكا تھا اور اب وہ دوبارہ واپس نہيں آسكتا تھا - سلاطين و شاہان دھلي ' نہ طيب خاطر يا نہ جبر و اكراہ ' اُنہيں شرائط پر تخت نشين ہوا كرتے تھے جو ہندوؤں كے لئے قابل قبول ہوتے -

وہ غير رواداري ' جس كي جلال الدين خلجي ہدايت كرتا تھا مگر عملاً جس پر كاربند نہ ہوتا تھا ' يقيناً اسلام كا كوئي جزو نہيں ہے - وہ مسلمان ' جو غير رواداري كو اپنا فرض سمجھتے تھے انہوں نے قطعاً اسے كو متحمور پايا - متعصبوں كے ليے ايذا دھي ايک طرح كي خيالي خير ہو گئي جسے عملي لوگوں نے تصورات كے كركري خانے ميں ڈال ديا -

ايک غير ملكي اور مطلق العنان شخص مثلاً سلطان محمود (جس كي حمايت ميں ايک منظم فوج كي طاقت ہو) تو ضرور پر امن شہروں

---

1 ضياءالدين برني كي تاريخ فيروز شاہي - فارسي متن صفحہ ۲۱۶ -

کو لوٹ کر اور مال غنیمت لاد کر لے جا سکتا تھا - لیکن سلاطین دھلی کے لئے جو اپنی ھندو رعایا کے لگان ان کی فوج اور مادی طاقتوں کے آسرے پر تھے اس طرح کا طرز عمل نا ممکن تھا - ان کے لئے ورنہ دارانہ معرکوں کا مفہوم ایک ناگزیر تباھی ھوتا - وسط ھند میں اندا دھی کے معروضہ واقعات انگلیوں پر گنے جاسکتے ھیں لیکن جب ان کی جانچ زیادہ قریب سے کی جاتی ھے تو وہ جماعتی مظالم نہیں بلکہ افراد کی بے انصافیوں کے واقعات ٹھہرتے ھیں اور کم از کم اُس عہد کے لوگ بھی ایسا نہیں سمجھتے تھے - یہہ عجیب بات ھے کہ قرون وسطی کے سیاسی یا مذھبی لٹریچر میں ؟ مسلمانوں کے خلاف ھندو قوم کے مقابلہ کے خفیف ترین آثار بھی نہیں پائے جاتے ؟ لیکن اس کی یہہ وجہ نہیں ھے کہ ھندو اس کے لئے تیار نہ تھے یا مقابلہ کے قابل نہ تھے - نہیں ! وہ تو اپنی جنگ جوئی اور سوق جدال کے لئے بدنام تھے لیکن ھندوستان کے زمانۂ وسطی کی متعدد لڑائیوں میں سے کسی ایک لڑائی میں بھی ھم قوموں کی تقسیم مذھبی (اعتبار سے) نہیں پاتے - افغانی سپاھیوں کا ایک دستہ ؟ - جنگ ترائن میں رائے پتھورا کی سرکردگی میں لڑا تھا - مسلمانوں کی ایک زیادہ سپاہ نے پانی پت کی لڑائی میں مرھٹوں کی مدد کی تھی - مگر اصلی ھندو مسلم جنگ در اصل کبھی نہیں ھوئی -

اگر ھم ھندوستان کے زمانۂ وسطی کی تاریخ ' صحیح طور پر سمجھ لیں تو ھم اِس عدم حقیقی اور نامعقول تصور کو ایک ھی مرتبہ اور ھمیشہ کے لئے خارج کردینگے کہ " غیر ملکی فاتحین کی ایک جماعت ' ایک پُر امن و بے ضرر آبادی پر حکومت اور نہ جبر حکومت کر رھی ھے " اس قسم کی رائے کی تائید کے لئے اصل ماخذوں میں شہادت کا ایک ٹکڑہ اور ایک لفظ بھی موجود نہیں ھے -

اس میں شک نہیں کہ مسلمان تاریخوں نے ' ھندو راجاؤں سے جنگ

کي ليکن اُس سے زائد مرتبه وہ دوسرے مسلمان بادشاهوں سے بھی لڑے -
اسي طرح ايک جنگ ميں ايک راجپوت کے ليے جس سے سلطان دهلي سے
جنگ هوئی تهي ، تقريباً ايک سو راجپوت ، راجستان کے فرقه وار حاکيروں
ميں قتل کئے گئے تھے - هندو مذهب بهرصورت پوری طرح مسلح تها اور
هندوستان کے زمانۂ وسطیٰ کی حکومت ؟ دو مستعد اور جنگجو جماعتوں
میں، ایک رفیق کار کی حیثیت رکھتی تھی - شہنشاہ ایک مسلمان تھا اور
اس لیے کہ ہندو مذہب ذات در ذات منقسم تھا، مسلمانوں کی حیثیت
قوی‌ترین اور متحدہ اقلیت کی سی ہوگئی تھی - اور چھترپوں بلکہ
برهمنوں سے تعداد میں بڑھی ہوئی تھی - اگر ہندو مذہب میں ، مساوات
اور جماعتی جمہوریت کی روح موجود ہوتی، جو زمانۂ وسطیٰ میں ، اسلام
کی نمایاں خصوصیت تھی، تو یقیناً معاملات اس سے مختلف ہوتے !

لیکن ان سلاطین کی رواداری، نہایت سختی سے ان کی مملکت کے
اندر محدود تھی - ایک مرتبہ وہ یا ان‌کی سپاہ ، اگر ساتھی سرحد سے باہر
نکل جاتی تو ان تمام رواداریوں بلکہ اعلیٰ احساسات و انسانیت تک کو
بالائے طاق رکھ دیا جاتا ، متعصبانہ جوش ، جو باہر تو انتہائی تشدّد کے
ساتھ بھڑک اُٹھتا تھا ، ملک کے اندر بھی جبر قابو میں رکھا جاتا تھا -
سلطان محمود کی جارحانہ سختی، اگر ملک کافور کی اس تعدی سے ، جو
دکن میں ہوئی ، بڑھ چڑھ کر نہیں تو برابر ضرور تھی - کھلے ہوئے
واقعات سے انکار کرنا بےفائدہ ہے - قرون وسطیٰ کا ایک مسلمان مورخ بھی
ایسا نہیں ہے جس نے مندروں ، بتوں اور بے مثل صنعتی یادگاروں کی
اُس تباہی کے ذکر کرنے میں کمی کی ہو ، جو دہلی کی فتح‌یاب سپاہ
کے پیچھے پیچھے ہوتی جاتی تھی - وہ خود ان افسوس‌ناک کامیابیوں
پر فخر کرتے تھے اور (اسی لیے) ان کے چھپانے، میں انہوں نے کوئی کوشش
نہیں کی - یہ بالکل صحیح ہے کہ مندروں اور عبادت‌گاہوں کی تخریب

مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہے اور ایک مذہب کی حیثیت سے ' اسلام کا ابدارہ اُن ارباب سیاست کے کارناموں سے نہ کرنا چاہیے جنھوں نے قرون وسطیٰ کے اوائل میں اُسے اس غلط طور پر پیش کیا (لیکن اسی کے ساتھ) یہ حقیقت بھی فراموس نہ کرنی چاہیے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ' رسوم بھی مختلف ہوتے رہتے ہیں - اُس زمانہ کے مسلّمہ روایات کے بموجب دشمن کی عبادت‌گاہ کی غارت گری ؟ جنگ کے جائز اعمال میں سمجھی جاتی تھی -

جب منگولیا کے خانہ بدوشوں نے ؟ مسلمانوں کی سر زمین وسط ایشیا ؟ ایران اور افغانستان پر حملہ کیا تو اپنی فتوحات کا کلی طریق کار ؟ مساجد اور کتب‌خانوں کی تخریب و غارت‌گری سمجھا - شہاب‌الدین غوری کی فتح ہندوستان ؟ یا ملک کافور کا حملۂ دکن ؟ اُن ہنگاموں سے بسنہ غنیمت معلوم ہوگا جو سلجوقیوں ؟ عربوں اور تاتاریوں نے ایران کے شہروں اور موضعوں میں برپا کیے - جنگ تختوں کا کھیل نہیں ہے - ذی فہم ملکۂ سبا نے کہا تھا - " بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی تخریب کرتے ہیں اور وہاں کے عزیزترین شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں " یہی خیال و جذبہ تھا جس نے ایک ہی بادشاہ کی دو رعایا میں ؟ باوجود اختلاف مذہب ؟ رواداری کی اجازت دی - اور اسی نے غیر ملکیوں کے جبر و تعدی کو ؟ ہم‌مذہب ہونے کی صورت میں بھی روا رکھا - اہل ہند نے ؟ با وجود اپنی غیر معمولی سبک خیالی کے ؟ اکثر اخلاقی زندگی کے دیگر اُصولوں میں ؟ اسے کو غیر مخلص ثابت کیا - تُرک اور خلجی سپہ‌سالاروں کی سپاہ ؟ ہندوؤں اور مسلمانوں ؟ دونوں پر مشتمل تھی چنانچہ ؟ ہند میں مندروں کے انہدام میں ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا - اُس زمانہ کی لوٹ مار کی اصل غرض ؟ سونے

* قرآن مجید سورۂ نمل رکوع ۱۸ -

جائدادی کی حرص و ہوس بھی - بت شکنی کا ادعائے دُرفریب تو محض
باہر کی "واہ وا" کے لئے تھا - مملکت سے باہر ہندوؤں کے خلاف مُہم تو
سپہ سالاروں کے لئے ایک خالص کار و باری قسمت آزمائی تھی اور اُس زمانہ
کے اقتصادی حالت نے اُسے تجربہ کار مہمنسوں کی مجلس کے ہاتھوں میں
دے دیا تھا جو جمع اموال کی سب سے بڑھ کر نفع بخش صورت تھی -
تجارتی منافع ؟ ایک مدت سے ہندستان کو پھونکنا چلا آ رہا تھا -
قیمتی دھاتیں ملک میں آہستہ آہستہ جمع ہوتی جارہی تھیں
اور بے شمار عقیدتمندوں کے خلوص کی بدولت بڑے بڑے مندروں میں
جگہ پاتی جا رہی تھیں - ہندستان ایسے وراثتی ملک میں ؟ گاؤں والوں
کو لوٹنے میں ؟ سوا سخت تکروں کے اور کیا حاصل ہو سکتا تھا - چنانچہ
ان سخت تجربات کے لئے نہ ہندوؤں نے کوشش کی اور نہ مسلمانوں نے -
قرون وسطی کی تقریباً تمام مہمات میں ؟ معمولی سپہری اور دیہاتی بالکل
امن کی حالت میں چھوڑ دئے گئے - اصل مطلب مندروں اور اُس کی
روایتی دولت سے تھا اور اُس کی بھی اصل غرض مذہبی تعصب نہیں بلکہ
مالی ہوس تھی - اگر ہندوؤں کے مندر بھی مسلمانوں کی مسجدوں کی
طرح سادہ اور نہ معمولی ہوتے تو نہ محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ کرتا
اور نہ علاء الدین خلجی اپنی فاتح سپاہ کو دکن روانہ کرتا !

قرون وسطی کے لوگ ؟ مسلح اور سرکش تھے وہ ایک ایسی مرکزی
بادشاہت کی اعانت کیوں کرتے ؟ بلکہ کیوں اس کو گوارا کرتے جب وہ
بادشاہت، نہ تو ان کے استحقاق وراثتی کے اعتبار سے مناسب تھی اور نہ قانون
مذہبی کی کتابوں کے رو سے ؟ بدتر حال لوگوں نے سلطنت کے لئے کام کیا اور لڑتے
مرے — وہ تقریباً اُس کے لئے کوئی نہ کوئی امید اور اعتماد ضرور رکھتے ہو گے
اور اُس نظام کو گوارا کرنے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی اخلاقی احساس و شعور
بھی رکھتے ہونگے جس کے لئے وہ اپنی بڑی قربانیاں کرنے کو تیار تھے -

पुस्तकालय

محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُس نے یہاں متعدد
ریاستیں پائے جو مغرور تھے اور باہم غیر متحد اور ہندوستانیوں
کی تسخیر کے لیے ان کے لشکر آزمائش میں صرف ایک گرتی ہوئی
سلطنت کی یاد باقی رہ گئی تھی - سلاطین دہلی ؟ ملک کو متحد کرنے
میں کیوں کامیاب ہوئے جب ان کے ہندو تیسینوں کے لیے یہ کام سخت
دشوار ثابت ہوا تھا ؟ تقدیر کا فیصلہ ؟ انسانی ہی ہاتھوں کے توسط سے اپنے کو
نمایاں کرتا ہے - دانستہ یا نادانستہ طور پر ؟ لوگوں کے دلوں میں ؟ شاہان
دہلی کو اپنے مخالفین پر ترجیح دینے کے کچھ وجوہ ضرور موجود ہونگے -
غلامانہ جماعت کا ہونا تو ایک طرف ' ہندوستانی بڑے سورما تھے اور
سرکش تھے اور بہت سے متحملے تو تیار تھے کہ اس طرح کے اول موقع پر اپنے
کو کام میں بھی لائیں - اس زمانہ میں سمجھدار لوگ ' ظلم سے نہیں بلکہ
بد نظمی سے زیادہ خائف تھے - اول اول یہ امر ' ابتدائی طور پر دھیں نہیں
کر لینا چاہیے کہ سلطنت کا وجود ؟ در اصل خلجیوں کے اتفاق کے ساتھ
شروع ہوا ؟ غلام بادشاہوں کی حکومت محض ایک دھوکا اور سوانگ تھی ؟
یا ایک بلند عمارت تھی بے بنیاد' جو اکثر عربیں کے تھپیڑے سے شروع ہوتی
اور دہلی کے تاب تباہی پر ختم ہو جاتی تھی - ہندوستان کو متحد کرنے
کا کام ؟ بد خو اور آپس مزاج علاؤالدین خلجی نے کیا جس کے بعد سے
قومی اتحاد کا تخیّل' لوگوں کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوا - بلوے ہوئے
بغاوتیں اور خانہ جنگیاں ہوئیں - ہم نے لڑائیاں بھی کیں اور مارا بھی
لیکن حالت امن یا زمانہ جنگ ؟ کسی حالت میں بھی ہم نے اس
حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ ہم ایک ہی گھر کے رہنے والے ہیں اور
ہم کو ایک حکومت رکھنی چاہیے عام اس سے کہ اس کی ماہیت کیسی
ہی ہو -

قطب یہ چاہتی تھی کہ ہمالیہ کے جنوبی حصہ کی زمین' ایک

قسم کے لوگوں کا ملک ہو اور فطرت کا یہ مقصد، مذہب و صنعت کے
ذریعہ سے تکمیل کو پہونچ گیا - شمال مغربی کوہستانی درّوں کو عبور
کرکے، ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں اول اول جس مسلمان نے قدم
رکھا تھا اُس سے بھی صدیوں پیشتر، ہمارے دھرمی اور تمدنی اتحاد کی
بنیاد رکھی جاچکی تھی - یہ بڑا کام، بڑے ہی دھندوں کے کرنے کا تھا -
مندروں اور جاتیوں کے ضوابط میں، ویدوں کے رسموں اور ذہنوں میں،
رامائن اور مہابھارت کے قصوں میں، بودھ مذہب کے روادارانہ فلسفے میں،
اور منو کے قانون میں ہم وہ قومی آداب پاتے ہیں جنھوں نے آریہ ورت کے
سر زمین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناقابل تقسیم بنا دیا - اگر یہ
عظیم الشان کام، اس سے پہلے انجام نہ پاجاتا تو اکبر اور علاؤالدین کا
انتظامی بندوبست، اخلاقی مضبوطی سے محروم رہ جاتا اور اُن کی
سلطنتیں بھی، سکندر کی سلطنت کی طرح، چندروز ثابت ہوتیں -

ہندو مسلم صوفیہ نے، سادہ یا دانستہ، اسے عظیم المرتبت ہندو
تیسینیوں کے نفس وقدم کی پیروی کی - ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ
یہ سخت ناانصافی ہوگی کہ اُن کا اندازہ اُن کے اُن بادشاہوں کے چال
چلن سے تو کیا جائے جس کے وہ کسی طرح ذمہ دار نہ تھے - لیکن اُن کے
مذہبی پیشواؤں، اُن کے صناعوں، اور اُن کے شاعروں سے بے توجہی کی جائے
جو اُن پر ان سے کہیں زیادہ اثر رکھتے تھے - اُس وقت کے جمہور مسلمان
(اور آج کل کے بھی) متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے - سائنسی تحقیق
کو صوفیہ کے ملفوظات کا ایک سرسری مطالعہ اس امر کا یقین دلا سکتا ہے
کہ مغل حکمرانان ہند، اُن کی زوراتہ زندگی، کسی بلند منشاء کو نہیں
نظر رکھنے کی بجائے ایک افسردہ کن افلاس کی حالت میں گذرتی تھی -
اُن کے سروں پر ہمیشہ جہت بھی میسر نہ آتی تھی اور شکم سیر ہوکر
کھانا تو ایک نادرالوقوع واقعہ سمجھا جاتا تھا - یہ محدود کامیابی، جو

اسلام نے ہندوستان میں حاصل کی وہ اپنے بادشاہوں اور ارباب سیاست کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے فقرا و مشائخ کی — بدولت کی ایک نئے مذہب کے لیے اس کی تمام باتوں کا انحصار اس کے طریقۂ تبلیغ پر ہے ۔ اسلام اگر اس ملک میں، سوا عربی کے متحمند جاہ پرستوں کے، کوئی اور طرز نہیں اختیار کرسکتا تھا تو یہاں کے قلیل لوگ بھی اس کو قبول نہیں کر سکتے تھے، لیکن اسلام، اپنے نمائندے ان سے کہیں بہتر اور شریف تر رکھتا تھا یعنی وہ، جو شاہی درباروں اور فوجی قیام گاہوں کی فضا سے بہت دور، مسکین لوگوں کی طرح، خاکسارانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس نبی (صلعم) کی سنت کے متوالی تھے "جس کا فقر اس کے لیے باعث فخر تھا" ۔

ہندو مذہب نے اپنے وسیع المشرب تعطلۂ خیال سے، ان مسلمان صوفیہ کو اپنے رسموں میں داخل کر لیا اور جذبات ہمسایگی نے بہت جلد بڑھ کر ایک مشترکہ سلسلہ بزرگوں کا تیار کر دیا ۔ یہی تیرھویں صدی عیسوی میں تھا اور آج بھی یہی باقی ہے !

غرض اس طرح، ترکوں کے لا حاصل تعصب کی جگہ، ایک بارہ پر مگر بلند تر فلسفے نے حاصل کرلی چنانچہ ایک صبح کو شیخ نظام الدین اولیا[1] نے جو زمانۂ وسطی کے زبردست صوفیہ میں تھے، اپنی خانقاہ کی چھت پر چڑھے تو کچھ ہندوؤں کو دیکھا کہ وہ اپنے بتوں کو پوج رہے ہیں ۔ ایک مسلمان کے لیے یہ بات عجیب تھی کہ وہ ایک آزاد مخلوق کو اس حالت میں دیکھے کہ وہ اُس بُت کی پرستش کر رہی ہو جسے اُس نے اپنے ہی ہاتھوں سے پتھر سے تراش کر بنایا ہو ۔ لیکن شیخ مذکور کے فلسفے نے کافری کو بھی اپنے روادارانہ آغوش میں لے لیا ۔ آپ نے فرمایا : "ہر

---

[1] ارشاد تھا "الفقر فخری" ۔

قوم کي (الگ الگ) ایک جابر راہ ، ایک مذہب اور ایک پرسنل لا ہے - *

یہہ بھی ہمارے مذہبي سمجھوتے کي حقیقي بنیاد ورون وسطی میں! اور یہ سمجھوتا بھي ایسا تھا جسے ہندستان کے بڑے بڑے اصحاب فکر، بڑے بڑے اہل علم، اور بڑے بڑے ارباب سیاست نے تسلیم کر لیا تھا - ہماري تمام تر رضامندي کي بنا میں، اختلاف کرنے کي رضامندی کارفرما تھی - ہم میں سے ہر ایک کے لیے اپنا عقیدہ، سب سے اچھا اور سب سے بہتر تھا - ہندو کو ایک اچھے ہندو، اور مسلمان کو ایک اچھے مسلمان ہونے کي، آزادانہ طور پر، اجازت تھي - گویا اسلام، اس مُلک میں بالکل ایک دوسرا نظام تخیل تھا جو بہت سے مخالف نظریوں کو گوارا کیے ہوئے تھا - ایک ایسي ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی)، جو ساج در ساج فرقوں میں مُنقسم ہو، مُسلمان کی حیثیت، صرف ایک ''مزید فرقہ'' کي سي ہو گئی تھي - یہ نیا مذہب، ہندستاني قومیت کی وسیع تجددئیوں پر محتوي اور مُشتمل تھا - اُس لیے سیاست میں، اپنے ملکي لوگوں کی قیادت، ایک مسلمان کے لیے آسان ہو گئی - یہ (نیا) مذہب، دراصل مذہب کے مفاد میں بھی جلد جلد داخل ہونے لگا - مسلمانوں کی عام جماعت نے (جو ہندو مذہب چھوڑکر داخل اسلام ہوئی تھی) گو مسجد کے لیے اپنا مندر ترک کر دیا لیکن اپنے روایتی رسوم کے تبدیل کرنے کا اُسے خیال بھي نہیں آیا —

---

* ہر قوم راست راہے - دینے و قبلہ گاہے- جس پر امیر خسرو نے جو اس وقت موجود تھے یہ مصرع اضافہ کیا ع

من قبلہ راست کردم بر سمت کجکلاہے -

اس مصرع میں اس واقعہ کي طرف اشارہ تھا کہ اس وقت سمت کي کلاہ ، پیشانی کی طرف ترچھي ہو گئي تھي - یہہ واقعہ نورتن جہانگیری میں منقول ہے -

ہندستانی مسلمانوں میں، اربہ ورب کے قدیم رسموں کا رواج، آج بھی ایک بدنام کُن اور نا قابل انکار واقع ہے - ہندستان کے کسی ایک طبقے کو بقیہ لوگوں پر حکومت کرنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی چنانچہ مسلمانوں نے، بڑھ کر تھک وہی حیثیت اختیار کرلی جو اُن سے پہلے راجپوتوں کو حاصل تھی - اگر ایک مسلمان سپہ سالار اپنی انتظامی و سیاسی قابلیت کی بنا پر اپنے کو کار آمد اور ناگزیر ثابت کر سکتا تھا تو (اہل ملک کو) اس کے اختیار و اقتدار کے تسلیم کر لینے میں کوئی سخت اعتراض نہ ہوتا تھا -

لیکن ما بعد کے دو اسباب نے ایک مرکزی حکومت کے قیام و استحکام کو اور زیادہ نا گزیر اور گوارا بنا دیا (۱) ایک تو منگولیا والوں کا خروج (۲) دوسرے ہندوستان کی دیہاتی جماعتوں کی بد نظمی -

خلجیوں کے خروج سے تقریباً ساٹھ برس پہلے، منگولیا والے، ہندوستان کی سرحد پر خطرے کی طرح منڈلا رہے تھے - انھوں نے ترکستان، ماوراءالنہر*، ایران اور افغانستان کے تمام زرخیز شہروں کو غارت کر دیا تھا اور پنجاب میں لاہور تک بڑھ آئے تھے - (اس وقت) ہندو اور مسلم دونوں یکساں طور پر خطرے میں تھے کیونکہ منگولیا والے مسلمانوں کے جانی دشمن تھے - انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب کے تمام مرکزی مقامات کو بنیاد و برباد کر ڈالا تھا - اسی طرح وہ ہندوؤں کے بھی دوست نہ تھے، اُن کی زبان ناقابل فہم، اور ان کے اطوار و عادات سخت ناگوار تھے - وہ جہاں گئے وہاں کی عورتوں کو، عام اس سے کہ وہ ادنیٰ طبقے کی ہوں یا اعلیٰ طبقے کی، اُنھوں نے کنیزیں بنا لیا اور ان کی حالت، موت سے بھی زیادہ سخت اور سقیم بنا ڈالی -

---

* آکسس (دریائے آموں) اور جیکسرٹیز کے درمیان کی زمین - اور جیکسرٹیز کے آگے کی زمین ترکستان ہے -

وہ بچوں کو بے دردی سے قتل کر ڈالیے، قتل عام اور خونریزی سے انھیں مسرت ہوتی (اس طرح) دو نسلوں تک ایک تاریک اور مہیب بادل، آسمان پر گھرا ہوا تھا اس وقت وہ آدمی، یا آدمیوں کا وہ گروہ، جس نے منگولیا والوں کو راستے ہی میں روک دیا، یقیناً ناقابل انکار طور پر ہندوستان بھر کے لوگوں کے شکریے کا مستحق ہوا ہوگا دوسرے یہ کہ دیہاتی جماعتوں کا جمہوری نظام، شہاب الدین کے حملے سے صدیوں پہلے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا - قانون اور رواج کی جگہ جبر و قوت نے لے لی تھی - ایسی ہمہ گیر بدنظمی کے زمانے میں مکھیاؤں اور مقدم لوگوں نے یہ دیکھ کر، کہ کوئی زبردست طاقت ان کی سرپرستی کرنے والی ہے، گاؤں پر خود مختارانہ قوت قائم کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی - اور غریب کاشتکار رعایا کو بے رحمی کے ساتھ ستانا شروع کر دیا تھا - (ایسی حالت میں) صرف ایک مضبوط مرکزی حکومت کا قیام ہی کاشتکاروں کو مکھیاؤں کے چنگل سے رہائی دلا سکتا تھا -

نہ یہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھے جنھوں نے منگولیا والوں کو مار بھگایا - اور ملک کے نظام محاصل کو از سر نو درست کیا چنانچہ جہاں بے قاعدگی کی یہ کمزوری بھی وہاں اس امن کے بساط کی وجہ، کچھ تو اسلامی بھی اور کچھ دونوں جماعتوں کے حالات کا اقتضا تھا - علاؤ الدین خلجی کی تخت نشینی سے پہلے کسی وقت بھی ہندوؤں کا ایک زبردست حملہ، سلطنت دہلی کو خاک میں ملا سکتا تھا - لیکن (علاؤالدین کے عہد میں) مسلم ارباب سیاست نے، یقیناً اپنے رفیقوں سے بڑھ کر، دور اندیشی اور ہوشیاری دکھلائی - ان کے گزشتہ تلخ تجربات نے انھیں منگولیا کے حملہ آوروں کے خلاف ایک سخت اور کامیاب مقابلے کا اہل بنا دیا اور چونکہ رسم و روایات کے بندھنوں سے وہ بستہ آزاد تھے اس لئے اُن انتظامی اور مالی اصلاحات کے تجویز اور نافذ کرنے کے قابل ثابت ہوئے جس کی ملک کو ضرورت تھی -

ہندوؤں کی سرداری کی باگ ' راجپوتوں کے قبضہ میں آ گئی تھی جو اس درجہ غیر متحد اور باہمی خانہ جنگیوں کے سابق تھے کہ نہ وہ اندرونی انتظامات کے لئے لوگوں کو متفق کر سکتے تھے اور نہ بیرونی مدافعت کے لئے ' اور نہ پھر راجستان کا دیگرار ہی اس قابل تھا کہ ہندوستان کی سلطنت وہاں تعمیر یا پامال کی جا سکتی !

---

* اُردو زبان کے لغت

(از سید مسعود حسن صاحب رضوی ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی)

یوں تو ملک کے مختلف حصوں میں طرح طرح کی بولیاں بولی جاتی ہیں مگر اُن میں زبان کا درجہ صرف اُنھیں کو حاصل ہے جن کے صرف و نحو کے قاعدے بن چکے ہیں ؟ لغت مرتب ہو چکے ہیں ؟ فصاحت اور بلاغت کے معیار قائم ہو چکے ہیں ؟ اور جن میں کتابوں کا کافی ذخیرہ بھی موجود ہے - اُردو بھی ایک زمانے میں صرف ایک بولی ہی تھی- لیکن ترقی کرتے کرتے اب زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے - اور کم سے کم اِس حیثیت سے ہندستان کی سب زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے کہ اُس کے بولنے اور سمجھنے والوں کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع ہے -

اُردو کی اِس ترقی کے ذریعے بھی وہی ہیں جو اُوپر بیان کئے گئے - اِس لئے اُردو زبان کی تاریخ میں یہ باب خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے کہ اُس کی تنظیم اور تہذیب کب سے شروع ہوئی - اور اب تک اس سلسلے میں کیا کیا کوششیں ہوتی رہیں - اِس غرض کے لئے ضرورت ہے کہ لغت - قواعد اور بلاغت کی کتابیں اور اُن کی ترتیب اور فہرستیں سامنے موجود ہوں -

اِسی طرح اُردو ادب کی تاریخ کے لئے مختلف علموں اور فنوں کی کتابوں اور اُن کی تاریخ فہرستوں کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے یہہ کتابوں کے ذخیرے اور فہرستیں جسقدر مکمل ہونگی اُتنی ہی زبان اور ادب کی تاریخ بھی مکمل ہوگی -

---

* یہ مضمون اکیڈمی کی گذشتہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا -

عام طور پر لوگوں کو علم نہیں ہے کہ اُردو میں ہر علم و فن پر کتنی کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں - اور اکثر لوگ تو اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُردو کا کتابی سرمایہ بہت ہی حقیر ہے - اگر مختلف مضمونوں کی تمام کتابوں کی فہرستیں مرتب ہو جائیں تو یہ غلط فہمی دور ہو جائیگی - اور اُردو کا اعتبار اور وقار بہت بڑھ جائیگا -

اِنھیں خیالوں کو سامنے رکھ کر میں نے کئی سال ہوے اِس کام کی ابتدا کر دی تھی اور اُردو لغتوں کی فہرست بنانا شروع کر دیا تھا - افسوس ہے کہ مجھے اس فہرست کو مکمل کرنے کی فرصت نہ مل سکی - بہر حال اب رسالہ "ہندستانی" کے اڈیٹر صاحب اور اڈیٹوریل بورڈ کے سخت اصرار سے مجبور ہوکر یہ فہرست اِسی غیر مکمل حالت میں پیش کی جاتی ہے - دُھن کے پکے لوگ ایسی فہرستوں کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھ لیں اور ایک مضمون کی فہرست مرتب کرنا اپنا فرض قرار دے لیں تو اُردو کی ایک بہت بڑی خدمت انجام پا جائے -

مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب مرحوم نے اردو کی کل کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی کوشش کی تھی اُن کی اِس کوشش کا نتیجہ "الفہرست" کی صورت میں دنیا کے سامنے آچکا ہے - اول تو یہ ایک آدمی کے کرنے کا کام ہی نہ تھا - دوسرے اِس کتاب کی تالیف اور ترتیب میں جو سہولت پسندی اور بے احتیاطی برتی گئی ہے اُس کا کسی قدر اندازہ اِس فہرست کو اُس کتاب کی فہرست لغات سے مقابلہ کرنے پر ہو جائیگا - بہر حال "الفہرست" جس غرض سے مرتب کی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور اُردو کتابوں کی فہرست کی جتنی ضرورت پہلے تھی اُتنی ہی اب بھی باقی ہے -

اِس فہرست میں ایسی کئی چیزوں کا ذکر ہے جن تک بہت کم نگاہوں کی رسائی ہوئی ہوگی اور بعض تو ایسی ہیں جن کا دیکھنا کیسا

اب تک اُن کا نام بھی نہ سنا گیا تھا اِن نادر چیزوں میں سے اندر میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں ۔

یہہ اُردو لغتوں کی فہرست ہے لیکن میں نے اِس کو صرف اُنہیں کتابوں میں محدود نہیں کیا ہے جن میں اُردو لفظوں اور محاوروں وغیرہ کے معنی اُردو ہی میں بتائے گئے ہیں ۔ بلکہ اُن تمام کتابوں کو شامل کر لیا ہے جن میں اُردو زبان کے لفظوں اور محاوروں کے معنی کسی زبان ؟ میں یا کسی زبان کے لفظوں اور محاوروں کے معنی اُردو زبان میں دئے گئے ہیں ۔ دوسری قسم کی کتابیں بہت کم ہیں اور اُن کا اِس فہرست میں شامل کیا جانا کچھہ بہت مناسب بھی نہیں معلوم ہوتا ۔ مگر چونکہ میرا مقصد یہہ ہے کہ ہر فن کی اُردو کتابوں کی فہرست مکمل تیار کی جائے اور اِن کتابوں کی جگہ کسی اور فہرست میں نہیں نکلتی اس لئے اسی فہرست میں داخل کر لی گئیں کیونکہ اگرچہ وہ اُردو زبان کے لغت نہیں ہیں لیکن لغت ہیں اور اُردو زبان میں ہیں ۔

میری خواہش تو یہ تھی کہ ہر لغت کے مؤلف کا نام ۔ تالیف کا زمانہ ؟ کتاب کا حجم اور اُس کی خصوصیتوں کا ذکر کروں ۔ اِس لئے جتنی کتابوں تک میری پہونچ ہو سکی اُنہیں غور کی نظر سے دیکھا اور اپنے کام کی جتنی باتیں مل سکیں لے لیں ۔ لیکن جو کتابیں میرے دسترس سے باہر تھیں اُنکے بارے میں جو کچھہ بھی کسی ذریعے سے معلوم ہوسکا اُسی پر قناعت کرنا پڑی ۔ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جنھیں میں نے خود دیکھا ہے لیکن اُن کے مؤلف اور تالیف کے زمانے کا پتا کسی طرح نہ لگ سکا ۔ بہر حال جہاں کہیں میں کُل ضروری اطلاعیں بہم نہیں پہونچا سکا وہاں ہمیشہ مجبوری کا عالم تھا ۔ میری کاہلی یا بے احتیاطی کو اِس میں دخل نہیں ۔

کتابوں کی ترتیب ان کی تالیف کے زمانے کے لحاظ سے قائم کی گئی ہے ۔ لیکن جن کتابوں کی تالیف کا زمانہ معلوم نہیں ہو سکا اُنہیں آخر میں بلا ترتیب درج کر دیا ہے ۔

جن چند لفظوں کا حال مولوی عبدالحق صاحب مرحوم اپنے اُردو "اورنگ آباد" کے اُس مضمون سے لیا ہے جس کا عنوان ہے ۔ "اہل دکن نے اُردو زبان کی کیا خدمت کی" اُن کا نشان ختم کرکے قوسین میں ع + ح لکھ دیا ہے ۔

(۱) خالق باری

حضرت امیر خسرو کو جس طرح اور بہت سی چیزوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے ؟ اسی طرح اُردو کا سب سے پہلا لغت لکھنے کا فخر بھی اُنہیں کے لئے ہے ۔ اب تک اُردو کا کوئی ایسا لغت دستیاب نہیں ہوا جو خالق باری سے زیادہ قدیم ٹھہرے ۔ مولانا آزاد مرحوم "آب حیات" میں لکھتے ہیں ۔

"خالق باری جس کا اختصار آج تک نحویوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں بھی" ۔

افسوس ہے کہ خالق باری کا کوئی بہت قدیم نسخہ نہ ملا جو اِس قول کی تصدیق کر سکتا ۔ مجھے جو پرانے سے پرانا نسخہ ملا ہے اُس کی تاریخ تحریر ۱۳ شعبان ۱۲۱۷ھ ہے یعنی اُس کی عمر سوا سو برس سے کچھ زائد ہے ۔ مگر کتاب کی تصنیف کو کوئی ساڑھے چھ سو برس ہو چکے ہیں اِس لئے یہ نسخہ بھی قدیم نہیں کہا جا سکتا ۔

عام طور پر مشہور ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے مگر جو لوگ تحقیق کی دھن میں کسی بات کو بغیر کافی ثبوت کے نہیں

مانتے - اور کسی بات کی سہرت کو اُس کی صحت کی دلیل نہیں جانتے اُنہیں اِس میں بھی شک ہے لیکن خالق باری کے اُردو لفظوں اور فقروں کی قدامت امیر خسرو کا ہندی اور فارسی دونوں پر عبور رکھنا امیرخسرو کی ایجاد جبر طبیعت اور کتاب کی آخری بیت میں امیر خسرو کے تخلص کا نہایت حسن سے آنا یہ سب باتیں عام رائے کی تائید کرتی ہیں -اور امیر خسرو ہی کو خالق باری کا مصنف ثابت کرتی ہیں -

خالق باری ایک منظوم لغت ہے جس میں فارسی عربی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ جو روز مرہ کی بات چیت کے لیے ضروری تھے جمع کر دیے گئے ہیں - اِس طرح کا منظوم لغت امیر خسرو کی ایجاد نہیں ہے - سنسکرت میں ایسے لغت خالق باری سے بہت پہلے تصنیف ہوچکے تھے - فارسی میں بھی کم سے کم ایک ایسی ہی کتاب اِس سے پہلے ضرور موجود تھی - اور اُس کو جو عام مقبولیت ہندوستان میں ابھی کچھ دن پہلے تک حاصل تھی وہ نہیں بتاتی ہے کہ امیر خسرو کی نظر سے وہ کتاب ضرور گزری ہوگی - مدری مراد کتاب نصاب الصبیان سے ہے جو ابو نصر محمد بدرالدین فراہی نے ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں تالیف کی تھی - یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ امیر خسرو کو خالق باری لکھنے کا خیال اِسی کتاب کی بدولت پیدا ہوا ہو نصاب الصبیان کی طرح خالق باری میں بھی مختلف بحروں میں بہت سے قطعے ہیں - یہ مشابہت بھی میرے خیال کی تائید کرتی ہے - امیر خسرو کی ہر تصنیف کی طرح خالق باری بھی بہت مقبول ہوئی - اِس کے بعد اُسی طرز کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں مگر با وجود اس کے کہ وہ رائج الوقت زبان میں ہونے کی وجہ سے خالق باری سے کہیں زیادہ مقبول تھیں - اور خالق باری کی قدیم زبان نوشتے

والے تو در کنار پڑھانے والے بھی نہ سمجھ سکتے تھے - پھر بھی اُن کتابوں کو وہ قبول عام نصیب ہوا جو خالق باری کو چھ سو برس سے زیادہ حاصل رہا -

خالق باری کے طرز کی جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن کا مقصد بالعموم یہہ تھا کہ ہر وقت استعمال میں آنے والے لفظ یکجا کر کے نظم کر دیے جائیں کہ نحوی کو اُن کے یاد کرنے میں آسانی ہو - مگر خالق باری غالباً نحوی کے لیے نہیں لکھی گئی تھی - امیر خسرو کے زمانے میں جنگیوں کی یلغار و یاراج نے ایران و توران کو زیر و زبر کر دیا تھا - اُن کے جدال و قتال سے تنگ آکر ہزارہا ایرانیوں اور تورانیوں نے ہندستان میں پناہ لی تھی اِن لوگوں کو ہندستانیوں سے بات چیت کرنے میں بڑی دقت پڑتی تھی - نہ وہ اِن کی بات سمجھتے تھے نہ یہ اُن کی - قیاس کہتا ہے کہ اسی دقّت کو دور کرنے کے لئے امیر خسرو نے فارسی اور ہندی کے ضروری ہم معنی الفاظ یکجا کر کے نظم کر دیے ہونگے -

جس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے امیر خسرو نے خالق باری تصنیف کی تھی وہ ضرورت اب باقی نہیں رہی - نہ پرانا طریقہ تعلیم باقی رہا - اِس لیے خالق باری کی شہرت عوام میں روز بروز کم ہوتی جائیگی - لیکن اب ادبی تحقیق کا ذوق اور زبان اردو کی تاریخ جاننے کا شوق بڑھتا رہا ہے اِس لئے خواص میں اِس کی وقعت دو حیثیتوں سے بڑھتی جائے گی ایک یہ کہ اِس میں آج سے چھ سو برس پہلے کی اُردو کے نمونے موجود ہیں - اور دوسرے یہہ کہ یہہ اُردو کا سب سے پہلا لغت ہے -

خالق باری کی وجہ تسمیہ تو ظاہر ہے - جس طرح شیخ سعدی شیرازی کا پند نامہ اور شیخ علاءالدین خراسانی کا ترجیع بند اپنے

اسے ابتدائی لفظوں کی بنا پر کریما اور مامقیماں کے نام سے مشہور ہو گئے - اُسی طرح خالق باری کے ابتدائی دو لفظ اُس کا نام قرار پاگئے - لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خود امیر خسرو نے اِس کتاب کا نام کیا رکھا تھا - اتنا بتانا ضرور چاہتا ہے کہ آج سے کوئی تین سو برس پہلے بھی یہ کتاب خالق باری ہی کے نام سے مشہور تھی - اللہ خدائی (نمبر ۴ فہرست ہذا) جس کا ذکر آگے آئیگا ۱۰۶۰ھ کی تصنیف ہے اِس کے مصنف تجلی نے کتاب کی مختصر منظوم تمہید میں یہ شعر بھی لکھا ہے :—

ساید از لطف و رحمت باری

روح خسرو بمانم یاری

اِس شعر میں امیر خسرو کی روح سے مدد مانگی ہے اور اِس کے پہلے مصرعے کے آخری لفظ سے خالق باری کی طرف اشارہ کیا ہے اِس کے علاوہ خود اپنی تصنیف کا نام اللہ خدائی رکھا ہے اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں بھی امیر خسرو کا ہندی و فارسی منظوم لغت موجود تھا اور اُس کا نام بھی خالق باری ہی تھا - تجلی نے جس طرح منظوم لغت لکھنے میں خالق باری کا انداز اختیار کیا اُسی طرح اُس کا نام بھی خالق باری کے طرز پر اللہ خدائی رکھا - ورنہ ظاہر ہے کہ کتاب کا یہ نام رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی - کیونکہ اِس نام کو کتاب سے کوئی مناسبت نہیں ہے - خالق باری کے تمام مطبوعہ نسخوں میں ۱۹۲ بیتیں ہیں لیکن جو پرانا قلمی نسخہ میرے پاس ہے اُس میں یہ بیت نہیں ہے - بیت

راہ سائل طریق دہقان

ارنہ بہو گا مارگ جان

اِس طرح اُس میں صرف ۱۹۱ بیتیں ہیں - دل میں ابتدائی تین بیتیں نمونے کے طور پر لکھتا ہوں -

خالق باری - سرجن ہار واحد ایک - بدا کرتار
رسول پیمبر - جان نبیتھہ یار دوست - بولی - جا اتھہ
اسم اللہ - خدا کا ناؤں گرما ہے دھوپ - سایہ ہے چھاؤں

(۲) بحرالفضائل في منافع الافاضل -

یہہ فارسي زبان کا لغت ہے جس کو محمد بن قوام کرجي نے ۷۹۵ ھ میں تالیف کیا - اس کتاب کی دو جلدیں ہیں - پہلی جلد میں فارسي کے لفظ اور اصطلاحیں ہیں - دوسری جلد میں پہلي جلد کے صیغے چودہ بابوں میں ہیں - آخري باب کا عنوان یہہ ہے :—

"در بعضے الفاظ ہندوی کہ در نظم ہندوي استعمال کنند"

یہ گویا اُن ہندی لفظوں کا لغت ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کي زبان پر چڑھہ گئے تھے -

(۳) قصیدہ در لغات ہندی

یہہ قصیدہ خالق باری کے طرز پر لکھا گیا ہے - اِس کے مصنف حکیم یوسفي ہیں - حکیم صاحب ہراۃ کے رہنے والے تھے - تاتر بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان میں موجود تھے - بہت سي کتابیں اُن کي تصنیف سے ہیں - منجملہ اُن کے طب یوسفی ، رسالہ نبض، رسالہ فاروزہ ، رباعیات یوسفي وغیرہ مدتوں طب کے درس میں داخل رہیں - یوسفي کو نظم پر وہ قدرت حاصل ہے کہ طبي مسئلے اور نسخے وغیرہ نہایت صفائي سے بے تکلف نظم کرتے چلے جاتے ہیں - مدرسے کتب خانے میں اُن کے رسالوں کا ایک بہت قدیم مجموعہ ہے - اُس میں ایک مختصر سي مثنوی بھي "مذمت

نحل و نعمل " میں ہے ایک قصیدہ ہے جس میں دواؤں کے نام عربی و فارسی میں نظم کیے ہیں اور کہیں کہیں اُن کے خواص بھی لکھہ دیے ہیں - اِسی مجموعے میں " قصیدہ در لغات ہندی " بھی ہے اور جس رسالے میں یہ قصیدہ ہے اُسی میں ایک قصیدہ حسطان صحب کے اُصول میں بھی ہے جو سہنساہ بابر کے نام معنون کیا گیا ہے - عنوان کی عبارت یہ ہے —

" این قصیدہ است در حفظ صحت مزین بنام حضرت بادشاہ - سکندر حشمت سلیمان جاہ - تاج تخت عالم آرائے - عدو بند قلعہ کشائے طراز کسوت سلطنت و فرمان روائی ' نگین خاتم عظمت و کشور کشائی - قوت بازوئے مسلمانی - فروغ دیدۂ جہانبانی - خورشید روشن رائی - خسرو ممالک آرائی " -

آنکہ اورا رسد سرافرازی شاہِ جم قدر بابرِ غازی
کف او ابرِ سحاب آمد رائے او رشک آفتاب آمد
تابعِ رائے اوست فوج ملک مسند قدر اوست اوجِ فلک
فلک آمد نثار او قاہر خرد از مدح او بود قاصر
تا جہاں باشد ایزد متعال داروس بر سریر عز و جلال

ظاہر ہے کہ اِس نظم کی تصنیف کو کم سے کم سوا چار سو برس ضرور ہو چکے ہیں اِس " قصیدہ " کا پہلا شعر یہہ ہے —

نام ہر چیزے بہ ہندی بشنو از من اے پسر
خاصہ نامِ ہر دوائے نفع برداری مگر

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کل دواؤں اور بہت سی ضروری چیزوں کے نام ہندی میں بتانا چاہتا ہے لیکن میرے پاس اِس قصیدے کے صرف ۴۴ شعر ہیں اور اُن میں دواؤں کے نام بہت ہی کم ہیں ممکن ہے

کہ پوری نظم طویل ہو اور یہ صرف اُسکا ایک حصہ ہو ذیل میں چند شعر نقل کیے جاتے ہیں ۔—

بُل تکلم باشد و گُل کر نگو یعنی سخن
بول

شکر فرماید ترا آنکس کہ گوید شکر کر

حیب و کن آمد زبان و گوش و داری ریش داں
حیبھہ کاں داڑھی

موج را می خوان بروت و کانہ کور و بہرہ کر
مونچھہ کانا بہرا

کال پوست و پر مغز و استخواں گویند ہاد
کھال ہاڑ

انگولی انگشت باشد انگوتہ انگشت بر
اُنگلی انگوٹھا

ہست پیشانی منہ سینہ چھتی دست است ہت
ماتھا چھاتی ہاتھہ

موہ روئے و حل رواں شو نت بنشیں دک نگر
منہ پیٹھہ دیکھہ

گوسفند آمد بھر بز بکری و اوٹ اُشتر است
بھیڑ اونٹ

بلد گاؤ و فیل ہاتی کورہ اسپ و گدہ خر
بردہ ہاتھی گھوڑا گدھا

بمر ہندی املی السی بود تخم کتان
املی

مندوہ نوعی ز ارزن دان و گندہ بیشکر
مڈوہ گنڈا = گنا

ریسم ابریسم بود - کالا سیاہ اُجلا - سفید

سرمہ کاجل - مرج فلفل - سعد موتہ - عود اگر

مانک و موتی بود - یاقوت و مروارید لیک

کہربا باسد کتور و روپہ نقرہ سونہ زر
روپا سونا

(۴) اللہ خدائی

اِس کتاب کا نام ہی بتاتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب امیر خسرو کی تقلید میں خالق باری کے طرز پر لکھی ہے "سب تالیف" میں خود بھی اِس کا اعتراف کیا ہے - لکھتے ہیں —

بعد ازاں سر کنم بیانِ سخن فصلہ گرد آورم زخوانِ سخن

بہرِ مرغ سخن نہادم دام مددے خواستم ز روحِ نظام

شاید از لطف رحمتِ باری روح خسرو نمایدم یاری

تا مگر فکرتم تمام آید طائر معنی ام بدام آید

خالق باری نو حصہ میں اوپر لکھہ چکا ہوں کریما اور مامقیماں کی طرح اپنی ابتدائی لفظوں سے موسوم ہو گئی - بہت ممکن ہے کہ امیر خسرو نے اِس کا کچھہ اور نام رکھا ہو - مگر اللہ خدائی کا نام خود مصنف کا تجویز کیا ہوا ہے - خاتمہ حاشیے میں کہتے ہیں —

چوں بفضل خدائے گشت تمام

کردم اللہ خدائی اش را نام

اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کتاب اِس نام سے مشہور نہیں ہو سکتی تھی اِس لیے کہ اِس کی پہلی بیت میں یہ لفظ موجود ہی نہیں ہیں -

اِس کتاب کے مؤلف شاہ جہانی عہد کے کوئی بزرگ ہیں اُن کا تخلص تجلّی ہے اور تصنیف کا زمانہ ۱۰۶۰ھ خود کہتے ہیں —

در ضمیرم چوں ایں ہوس افزود
سال ہجری ہزار و شصت نمود

کل کتاب میں ڈھائی سو بیتیں ہیں - ابتدا کی چند بیتیں یہ ہیں —

ہے صمد پاک اور احد یکتا — جان اُم‌القری کو تو مکتا
اب پدر تات - والدہ مائی — ہست آجوی برادر و بھائی
جد دادا - عمو بود چاچا — قول در لفظ ہندوی تاچا

(۵) تحفۃ الہند

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کو ہندوؤں کے علموں کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا - چنانچہ کوکلناتھ جاں کی فرمائش سے میرزا محمد ابن فخرالدین محمد نے یہ کتاب تالیف کی - مؤلف نے اِس کا دیباچہ اپنے زمانے کے رنگ کے خلاف اور اورنگزیب کی طبیعت کے موافق نہایت مختصر لکھا ہے - میں اُسے یہاں نقل کئے دیتا ہوں کہ کتاب کی تالیف کا سبب اور مضامین کی فہرست خود مؤلف کی زبان سے سن لیجیے —

"الحمد للہ رب‌العالمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین اما بعد - چنیں گوید مسبب بادۂ ہذیان نیحد میرزا محمد ابن فخرالدین محمد کہ در عہد میمنت مہد جد تو کشورستان - خدائگان قضا فرمان - نیر اوج صاحبقرانی اختر برج کورگانی - شہنشاہ خورشید کلاہ

گردون سریر ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بادشاه عالمگیر خلد الله تعالی ملکه و سلطانه - افاض علی العالمین بره و احسانه - حسب الاشارت با بشارت وزارت و امارت مرتبت - ابهت و اقبال منزلت - رضیع شاه جم جاه سکندر مکان کوکلتاش خان برای مطالعه همایون بندگان سپهر بار والا تبار مرکز محیط سلطنت کبری مرکز (؟) دولت عظمی در علوم متداولهٔ هندیان - جروی چند پرداختم و آن را به تحفة الهند موسوم و مشهور ساختم و آن مشتمل است بر مقدمه و هفت باب و خاتمه -

۱—مقدمه در بیان مصطلحات حروف تهجیه هندیه و علم خط و ذکر اشکال حروف مذکوره از مفردات و مرکبات و بعضی قواعد کلیه -

۲—باب اول—در علم پنگل یعنی علم عروض اهل هند -

۳—باب دوم—در علم پُنگ یعنی علم قوافی اهل هند -

۴—باب سوم—در علم النکار یعنی علم بیان و بدیع اهل هند -

۵—باب چهارم—در علم سنگار رس یعنی علم عاشقی و معشوقی و بیان احوال عاشق و معشوق -

۶—باب پنجم—در علم سنگیت یعنی علم موسیقی اهل هند وغیره -

۷—باب ششم—در علم کوک یعنی علم اقسام زن و مرد و صحبت داشتن و معاشرت با زنان -

۸—باب هفتم—در علم سامدریک یعنی علم فراسه که علامات خیر و شر در انسان از آن معلوم شود -

۹—خاتمه در ذکر لغات و مصطلحات و کنایات اهل هند - من الله توفیق والرشاد منه المبدا و الیه المعاد -

میں نے اِس کتاب کو اِس فہرست میں صرف اُس کے حاشیے کی

وجہ سے جگہ دی ہے کیونکہ اِس میں "لغات ومصطلحات و کنایات اہل ہند" کا ذکر ہے کتاب تحفۃالہند - اب نہایت کمیاب ہے - اس لیے مجھے نہایت افسوس رہا کہ اِس کا جو قلمی نسخہ مجھے دستیاب ہوا وہ ناقص ہے - باب ششم کا زیادہ حصہ اور "خاتمہ" پورا غائب ہے - لیکن قدیم قلمی کتابوں کے جس ذخیرے میں سے یہ نایاب نسخہ مجھے ہاتھ آیا تھا اُسی میں ہندی اور فارسی کا ایک لغت بھی نکل آیا مگر نہ مصنف کا نام معلوم ہو سکا نہ کتاب کا نہ تصنیف کے زمانے کا پتا لگ سکا نہ تحریر کی تاریخ کا - میں اِسی کوشش میں تھا کہ کسی طرح اِن میں سے کسی بات کا سراغ لگ جائے کہ یکایک خیال آیا کہ کہیں یہ تحفۃالہند کا خاتمہ نہ ہو اب جو میں نے غور کرنا شروع کیا تو خیال صحیح نکلا - اِس کی صحت کے چند ثبوت ذیل میں لکھتا ہوں —

(۱) یہ لغت اور تحفۃالہند دونوں کتابیں ایک ہی کاتب کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں - اگرچہ دونوں کتابوں کی جسامت میں فرق ہے مگر خط ایک ہے -

(۲) تحفۃالہند کے خاتمے میں مؤلف نے جو کچھ لکھنا چاہا تھا وہی یعنی "لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند" اِس لغت کا موضوع ہے -

(۳) بعض لفظوں کے معنی اِس لغت میں بھی دیے گئے ہیں اور تحفۃالہند میں بھی - یہ معنی جن عبارتوں میں لکھے گئے ہیں اُن میں ایسی لفظی مشابہت موجود ہے - جو یہ دلالی ہے - کہ دونوں عبارتیں ایک ہی قلم سے نکلی ہیں مثلاً "کوک" کے معنی لغت میں یوں لکھے ہیں .—

"نام علمے است در معرفت اقسام زن و مرد و فن مباشرت" اور تحفۃالہند میں کوک کی تعریف یوں دی ہے —

"علم کوک یعنی معرفت اقسام زن و مرد و صحبت داشتن و
مباشرت کردن با زنان"

لفظ "سنگیت" کے معنی لغت میں یوں لکھے ہیں -
"علم موسیقی را نامند و آن مشتمل است بر راگ و تال
و نرت یعنی نغمۂ و اُصول و رقص" -

اور تحفۃالہند میں "سنگیت" کی تعریف میں لکھا ہے —
"عموماً مجموعۂ راگ و تال و نرت یعنی نغمۂ و اُصول و رقص و
خصوصاً بمعنی نغمہ باشد"

لفظ رومانچ کے معنی لغت میں یہ بتائے ہیں :—
"در اصطلاح اہل سنگار رس نام "بھاوے" است و آں
"بھاوے" باشد کہ از شوق و خواہش صحبت نائک
نائکا را تشعریرہ پیدا شود و موئے برا بدام بیع کند"

اور تحفۃالہند میں علم سنگار رس کے تحت میں "بھاؤ" کے
اقسام بیان کرتے ہوئے "رومانچ" کی تعریف یوں
کرتے ہیں .—
"آں حالتے بود کہ از استیلائے شہوت و غلبۂ شوق صحبت نائک
مُوئے بر اندام نائکا بایستند و تشعریرہ واقع شود -

لفظ "ابھرن" کے معنی لغت میں یوں لکھے ہیں :—
"بمعنی زیور و ہر ہست و آرایش بود و آں باصطلاح انسان
(یعنی اہل ہند) دوازدہ است و در علم سنگار رس
تفصیل ذکر نمودہ شد" اِس عبارت کا آخری جملہ
یعنی "در علم سنگار رس تفصیل ذکر نمودہ شد"
صاف ظاہر کرتا ہے - کہ اِس لغت کا مصنف علم سنگار رس کا بیان

اِس سے پہلے کر چکا ہے - اور لغت کا دیکھنے والا اس بیان کو پڑھ بھی چکا ہے اِس لئے بارہ ابھرنوں کی دو بارہ تفصیل ضروری نہیں ہے - صرف اُس بیان کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے - عبارت کے انداز سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علم "سنگار رس" پر مصنف نے کوئی علیحدہ کتاب نہیں لکھی تھی کیونکہ اگر مصنف اپنی کسی دوسری کتاب کا حوالہ دے رہا ہوتا تو اوپر نقل کئے ہوئے جملے میں "سنگار رس" کی جگہ اُس کتاب کا نام ہوتا یا اس معنی کے لفظ ہوتے کہ "وہ کتاب جو میں نے علم سنگار رس میں لکھی ہے" - اگر "سنگار رس" ہی کو کتاب کا نام فرض کر لیں تو بھی "علم سنگار رس" کی جگہ "کتاب سنگاررس" ہونا چاہیے اور ان سب باتوں پر نظر کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لغت کسی ایسی کتاب کا ایک جزو ہے جس میں علم سنگار رس کا بیان بھی اِس سے پہلے موجود ہے اب ذرا کتاب تحفۃالہند کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اُس کا باب چہارم علم سنگار رس کے بیان میں ہے - اور "خاتمہ" میں "لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند" کا ذکر ہے جو اِس لغت کا موضوع ہے - سکی طبیعت والے تو اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید کوئی اور کتاب بھی ایسی ہو کہ اُس میں علم سنگار رس کا بیان بھی ہو اور لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند کا ذکر بھی ہو اور یہ لغت اُسی فرضی کتاب کا ایک جزو ہو - لیکن اگر اِس طرح کے شبہوں کو دخل در معقولات کا موقع دیا جائے تو شاید ہی کوئی بات کبھی ثابت ہو سکے بہرحال ادبی تحقیق کے سلسلے میں جس طرح کے ثبوت بالعموم کافی سمجھے جاتے ہیں ان پر نظر کر کے میرے نزدیک یہہ بات ثابت ہے کہ یہہ لغت تحفۃالہند کا "خاتمہ" ہے جسے میرزا محمد ابن فخرالدین محمد نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں تالیف کیا تھا -

اِس لغت میں ہندی لفظوں کا تلفظ اور اُن کے معنی فارسی میں دیے گئے ہیں - کل لفظوں کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب ہے - اگرچہ اِن میں بہت سے لفظ ایسے ہیں جو اردو میں گھل مل نہیں سکے - لیکن بہت سے لفظ ایسے بھی ہیں جو قدما کے کلام میں پائے جاتے ہیں مگر اب متروک ہو جانے کی وجہ سے اُن کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہے - اردو کے دوسرے لغتوں میں اول تو یہ لفظ ملتے ہی نہیں ہیں اور اگر ملتے بھی ہیں تو اُن کے صحیح تلفظ اور لغوی معنی معلوم نہیں ہو سکتے - ان کے علاوہ رائج‌الوقت الفاظ بھی بہت ہیں -

تحفۃالہند کا جتنا حصہ میرے پاس ہے اُس کی ضخامت ۲۲۲ صفحے ہے اور اس کے ' خاتمے ' کا حجم ۴۴ صفحے ہے - ہر صفحے میں اوسطاً ۲۲ سطریں ہیں اور خط بہت جلی ہے -

(۶) فرینسس کَس ایم نیورنی سس کا لغت

مؤلف ایک اطالوی مسیحی تھا جو ہندستان میں تبلیغ مذہب کی غرض سے آیا تھا - اُس نے ۱۷۰۴ ع میں ہندستانی زبان کا ایک لغت لکھا تھا (ع - ح) -

(۷) جان جُو شُوا کِتلر کا لغت

مؤلف پروشیا کا باشندہ تھا - دلندیزوں نے اِس کو اپنا سفیر بنا کر شاہ عالم کے دربار میں بھیجا تھا - چند سال ہندستان میں رہ کر پھر ۱۷۱۶ ع میں ایران کا سفیر ہو کر چلا گیا - اُس نے ہندستانی زبان کا ایک لغت عالباً لاطینی زبان میں لکھا تھا - (ع - ح) -

(۸) غرائب اللغات

یہہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری - عجائب اللغات (دیکھو نمبر ۹ فہرست ھذا) کے دیباچے سے صرف یہہ پتا چلتا ھے کہ اِس کے مؤلف فاضل اجل مولوی عبدالواسع ھانسوی ھیں اور نوادرالالفاظ (دیکھو نمبر ۱۰ فہرست ھذا) کے دیباچے سے یہہ معلوم ھوتا ھے کہ اِس لغت میں وہ ھندی الفاظ جمع کر دیے گئے ھیں جن کے عربی یا فارسی یا ترکی مترادفات لوگوں کو بالعموم معلوم نہ تھے - مؤلف نے ھندی لفظوں کو اصل لغت قرار دے کر اُن کے معنی فارسی میں اور مترادفات عربی فارسی یا ترکی میں دیے ھیں -

(۹) عجائب اللغات

مؤلف نے دیباچے میں اِس لغت کی تالیف کا حال یوں لکھا ھے "میگوید اضعف عبادالله العلی متعلم فاضل الفهم اجمیری دہلوی کہ چوں بعضے از معانی و مضامین بہ لسان ھندی از زبان مردم شنیدہ میشد و اکثر از مبتدیان در حسب و جوئے فرس آنہا حیران و سرگردان می گشتند - بنابران - بقدر فہم خود فارسی آنہا از نسخۂ جہانگیری و فرہنگ طب شہابی - و عرائب اللغات تصنیف افاضت پناہی مولوی عبدالواسع ھانسوی حفظه الله تعالی عن الافات والدواھی انتخاب نمودہ در این اوراق معدودہ مُندرج ساختم و ابواب مطابق ادائل حروف ھندی جدا جدا بر داختم و استشہاد بعضے لغات از اشعار معتبر از ھر جا بہزار بکاپو بر منصہ بیان انداختم و نام این عجائب اللغات نہادم" -

اس عبارت سے معلوم ھوتا ھے کہ یہہ لغت غرائب اللغات کے بعد اور نوادرالالفاظ سے پہلے تالیف کیا گیا تھا ووہ مؤلف جان آررو کی تحقیق سے

بھی فائدہ اُٹھایا - مؤلف نے مولوی عبدالواسع کے نام کے بعد جو دعائیہ فقرہ لکھا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عجائب اللغات کی تالیف کے وقت زندہ تھے -

میرے کتب خانے میں اِس لغت کا جو نسخہ موجود ہے وہ مکمل کتاب نہیں ہے - بلکہ اصل کتاب کا انتخاب منتخب عجائب اللغات کے نام سے ہے اور صرف ۴۶ صفحوں پر ختم ہوگیا ہے - ہر صفحے میں سترہ اٹھارہ سطریں ہیں -

(۱۰) اُردو لغت مؤلفہ خان آرزو

یہ لغت علامۂ شہیر سراج الدین علی خان آرزو کی تالیف ہے اِن کی علمی و ادبی قابلیت اور اِن کی جلالت قدر کے جاننے والے ابھی اِتنے موجود ہیں کہ اُن کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں - مگر ان کے اُردو لغت کے سلسلے میں صرف اِتنی بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خان آرزو - میر تقی میر کے ماموں اور اُستاد تھے - مرزا رفیع سودا کو بھی اُن کی شاگردی کا شرف حاصل تھا -

مؤلف نے دیباچے میں اِس کتاب کا "سبب تالیف" یہ لکھا ہے -

"میگوید فقیر سراج الدین علی آرزو تخلص کہ یکے از فضلائے ہندوستان کتابے در فن لغت تالیف نمودہ مسمیٰ بہ عرائب اللغات و لغات ہندی کہ فارسی یا عربی یا ترکی آں زبان زد اہل اس دیار کمتر بود در آں با معانی آں مرقوم فرمودہ - چوں اکثر در بیان معنی الفاظ تساہلے و سہوے بہ نظر آمد لہذا نسخۂ در اس باب بقلم آمد - در ہر جائے کہ سہو و خطائے معلوم کرد اشارت بداں نمود - نیز آنچہ بطبع ناقص این کمال دوست در آمد بر آں افزود - و چوں در عرائب اللغات رعایت حرف ثانی نبود بر آوردن لفظ قدرے مشکل می نمود ازیں باعث مراعات مذکور نیز بعمل آمد" -

اِس لغت کا جو قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں ہے وہ ۱۲۴۰ ھ کا نقل کیا ہوا ہے اِس کا حجم ۳۰۲ صفحے ہے اور ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں - خاتمہ پر یہہ عبارت لکھی ہوئی ہے - "تمام شد کتاب عرائب اللغات من تصنیف سراج الدین علی خان المتخلص بہ آرزو بہ دارالسلطنت لکھنؤ بتاریخ نانر دھم شعبان المعظم روز پنجشنبہ سنہ یک ہزار و دوصد و چہل " - مگر دیباچے کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اِس کتاب کا نام عرائب اللغات نہیں ہے یہ مسلم ہے کہ خان آرزو نے الفاظ ہندی کا ایک لغت نوادرالالفاظ کے نام سے لکھا تھا - اغلب ہے کہ یہہ وہی لغت ہو - خان آرزو اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھنؤ میں نواب سخاع الدولہ کی سرکار میں ۳۰۰ روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے تھے اور یہیں سنہ ۱۱۶۹ ھ میں کوئی ۶۸ برس کی عمر میں انتقال کیا - اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لغت اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اول میں لکھا گیا تھا -

(۱۱) دَیوِدَ مِل کا لغت

دیودَ مل کے مضامین کا مجموعہ سنہ ۱۷۴۳ ع میں شایع ہوا تھا اُس میں لاطینی - ہندستانی اور فارسی کا ایک مختصر سا لغت بھی شامل تھا - (ع + ح) -

(۱۲) فرگُسَن کا ہندوستانی لغت

یہہ ہندوستانی انگریزی لغت پہلے پہل سنہ ۱۷۷۳ع میں شایع ہوا تھا - (ع + ح) -

(۱۳) شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان

یہہ کتاب مرشد آباد کے نواب امیرالملک شمس الدولہ سید احمد علی خان

بہادر دوالفقار جنگ کی فرمایش سے مرزا جان طپش نے ۱۲۰۷ ھ میں تالیف کی تھی - اِس تالیف کی غرض دیباچے کی اِس عبارت سے ظاہر ہوتی ہے کہ " نسخہ مشتمل بر توضیح اصطلاحات دیار دھلی و دور مرۂ فصحاے اُردوے معلی انجہ در بعضے اشعار منظوم می گردد و فہم دور و ستان و ہر آنانکہ در امصار بعید واقع اند نادراک کُہنس نمی رسد بریور تالیف آراستگی یابد تا مطالعۂ آں انواع کنایت را صراحت بخشد وبر طالبان اس فن کار آساں گردد " -

مؤلف نے اُردو محاوروں کے معنی فارسی میں بیان کیے ہیں اور ہر محاورے کی سند میں اساتذہ کے شعر پیش کیے ہیں - یہہ کتاب نہایت قابل قدر ہے اِس میں بہت سے ایسے محاوروں کے معنی دیے ہوئے ہیں جو متقدمین کے کلام میں موجود ہیں مگر اب متروک ہو گئے ہیں اور جن کے معنی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے مثلاً کسی کی آس دینا - آنکھوں میں آنی - تسرام لینا - توجہہ پکڑنا - درجت کا ناؤں آ لگنا پانوں چل جانا وغیرہ - مدرسے کتب خانہ میں اِس کتاب کا جو نسخہ ہے وہ ۱۲۲۶ ھ میں مطبع آفتاب عالمتاب - مرشدآباد میں چھپا تھا اور سو صفحوں میں تمام ہوا ہے -

کتاب الفہرست کے مؤلف نے اِس لغت کے مؤلف کا نام مرزا جان طپش کی جگہ مرزا جان عیش لکھہ دیا ہے - تذکرہ طور کلیم میں لکھا ہے کہ مرزا جان کا اصلی نام اسمعیل تھا - لکھنؤ میں مرزا جہاندار شاہ کی رفاقت میں رہتے تھے اس کے بعد بنگالہ میں نواب شمس الدولہ کی سرکار سے متعلق ہوگئے تھے - سنسکرت زبان خوب جانتے تھے - مہر درد کے شاگرد تھے اور زیادہ تر قطعے کہتے تھے -

(۱۴) انگریزی ہندوستانی لغت مولفہ ڈاکٹر گلکرسٹ

یہ لغت اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھا گیا اور فورٹ ولیم کالج کے مطبع میں چھپا - (ع + ح) -

(۱۵) ھندی عربی آئینہ

اِس کتاب میں اُن عربي لفظوں کي جدولیں دی گئي ھیں جن کا ھندستانی زبان سے تعلق ھے - یہہ کتاب بھي فورٹ ولیم کالج کے مطبع میں سنہ ۱۸۰۴ ع میں چھپی تھی - (ع + ح) -

(۱۶) کپتان جوزف ٹیلر اور ڈاکٹر ھنٹر کا ھندستانی انگریزي لغت

کپتان ٹیلر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ھندستانی زبان کے پروفیسر تھے - انھوں نے اپنے استعمال کے لیے ایک ھندستانی انگریزي لغت مرتب کیا تھا - ڈاکٹر ھنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے فاضل فاضل ھندستانیوں کي مدد سے اس لغت پر نظر ثاني کر کے اس کو پہلي مرتبہ سنہ ۱۸۰۸ ع میں کلکتہ میں چھپوایا -

(۱۷) انگریزی ھندوستاني لغت مرتبۂ ڈاکٹر ھیرس

ڈاکٹر ھیرس کا یہہ لغت سنہ ۱۸۱۱ ع سے پہلے تالیف ھو چکا تھا اس لیے کہ کپتان ٹامس روبک نے اپنے لغت کي تالیف میں اس سے مدد لي تھی اور ان کا لغت سنہ ۱۸۱۱ ع میں شائع ھوا تھا - اس لغت کے علاوہ ڈاکٹر ھیرس نے ھندستاني اور دکھن کا ایک نہایت ضخیم لغت تیار کرنے کا سامان کیا تھا - نہایت محنت اور کوشش سے قابل ھندستانیوں اور دکھنیوں کي مدد سے اس لغت کے لیے مواد فراھم کیا تھا مگر اس کام کو مکمل تک پہنچانے نہ پائے تھے کے موت آ گئي - جتنا مواد وہ فراھم کرچکے تھے وہ کئي ضخیم جلدوں میں سما سکا تھا - یہ قلمي جلدیں انڈیا ھاوس کے کتب خانے میں رکھہ دي گئي ھیں -

جان شیکسپیر نے اپنے لغت کی تالیف میں اس مواد سے بہت فائدہ اٹھایا ۔ ڈاکٹر ہنرس کا قیام مدراس میں تھا ۔

(۱۸) فرہنگ اصطلاحات جہازرانی

اِس فرہنگ کے مؤلف کپتان تامس روبک ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے ۔ اس میں جہاز کے مختلف حصوں کے نام ۔ جہازرانی کے اصطلاحات اور بحری فوج کے قواعد کے الفاظ دیے گئے ہیں ۔ یہہ کتاب سنہ ۱۸۱۱ ع میں چھپی تھی ۔ (ع + ح) ۔

(۱۹) ہندستانی انگریزی لغت مؤلفہ کپتان تامس روبک

اِس میں وہ الفاظ و محاورات جمع کیے گئے ہیں جو ہندستانی زبان کی مروجہ کتابوں میں موجود تھے مؤلف نے اِس کتاب کی تدوین میں گلکرسٹ ، ہنٹر اور ہنرس کے لغتوں سے بھی مدد لی ہے ۔ یہ کتاب بھی سنہ ۱۸۱۱ ع میں چھپی تھی ۔ (ع + ح) ۔

خزینۃالامثال

یہ عربی ، فارسی اور اردو مثلوں کا مجموعہ سید حسین شاہ حسینی کا مرتب کیا ہوا ہے ۔ اِس کی ترتیب یوں ہے کہ ہر حرف کے تحت میں پہلے عربی پھر فارسی اور پھر اردو مثلیں لکھی گئی ہیں ۔ عربی مثلوں کا ترجمہ بھی فارسی میں مولوی نواب علی نے کر دیا ہے ۔ یہہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع نظامی ، لکھنؤ ، میں ساٹھی زمانے میں چھپی تھی ۔ میں نے اس کا جو نسخہ دیکھا ہے وہ مطبع نولکشور ، کانپور ، میں سنہ ۱۸۹۲ ع میں چھپا تھا اور اس کا حجم ۲۵۵ صفحے ہے ۔

اس کتاب کی تالیف کا زمانہ ٹھیک معلوم نہیں - لیکن حقیقت کی بنا پر کتابیں اور میرے کتب خانے میں ہیں یعنی صنم کدۂ چین - حذف عشق اور ہست گلزار جو ۱۲۰۹ ھ ۱۲۱۱ ھ اور ۱۲۲۵ ھ میں ترتیب وار لکھی گئی ہیں - اس سے یہہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خزینۃالامثال بارھویں صدی ھجری کی ابتدا میں یعنی اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری یا انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی چند سالوں میں تالیف ہوئی -

(باقی آیندہ)

تذکرۂ خسرو کے تمہیدی صفحات

جہانگیر کی بدایس

(از مولوی مقبول احمد صدیقی ' صاحب حباب حلدل)

عشق از وریاد ما ہنگامہ ہا بعمر کرد
ورنہ اس بزم حموساں ہیچ عوغاے نہ داست

رندہ حاوند مورخ ، لالہ سحان راے حو بہادر ساھی دربار سے بندرابن داس کے ممتاز خطاب سے سرفراز تھے ، اپنی مستند و نفیس کتاب خلاصۃالتواریخ[1] میں لکھتے ھیں کہ ھندو راجاؤں سے قرابت و یگانگی پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے ھمایوں کو پیدا ھوا تھا - یہہ عظمت و سطوت والا بادساہ جب سفر ساھی افواج سے

---

[1] "مذکر المناسی لالہ سحان راے بھنڈاری" لکھے جاتے ھیں - ساھزادہ محمد معظم (ساہ عالم) کے معرف و معتمد دیواں تھے ، تلوار اور قلم دونوں کے دھنی - ۱۰۹۵ ھ (۱۶۸۴ ع) میں کول کنڈے کی لڑائی میں زخمی ھوئے تھے - حسن لیاقت کی وجہ سے ساھزادہ اُن کو بہت عزیز رکھتا تھا - عالمگیر کے یہاں ھی اُن کو شرف و اعتبار حاصل تھا ذات کے کھتری تھے ، بیالہ ملک پنجاب کے رھنے والے - (امراے ھنود صفحہ ۱۳۷۹ - ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ع) میں فوت ھوئے - منتخب اللباب جلد دوم (ص ۲۱۱) اور قاموس المشاھیر جلد اول (ص ۱۳۲) میں بندرابن داس بہادر ساھی کے نام سے ان کا ذکر ھے - مقدمہ رقعات عالمگیر (مطبوعہ ۱۹۳۰ع) میں ان کی سکونت پیدائش تحریر ھے - در اصل اس غلطی کی ذمہ داری ایلیٹ صاحب کی تاریخ ھند (جلد ھفتم صفحہ ۵) اور قاموس المشاھیر (جلد اول صفحات ۲۸۲ و ۲۸۳) پر ھے - پروفیسر قدرس نے سحان (س ح ا ن) کو سبحان (س ب ح ا ن) لکھ دیا ھے - سبحان اللہ -

[2] اس کے متعدد قلمی نسخے میری نظر سے گزرے ھیں اخبار یا خاتمہ کتاب میں فاضل مگر منکسر مزاج مصنف نے اپنا یا کتاب کا نام کہیں نہیں لکھا جن کتابوں میں اس کا حوالہ ھے اِس کو "خلاصۃالتواریخ" لکھتے ھیں - دیباچہ مآثرالامرا (صفحہ ۴) میں بھی اِس کا نام خلاصۃالتواریخ اور عہد عالمگیر کی تصنیف بتایا ھے - مسٹر بیل نے آرینٹل بیاگرافی کی ڈکشنری (صفحہ ۷۳)

شکست کھاکر سکستہ حالی میں ایران پہونچا ہے تو شاہ طہماسپ صفوی نے اس مملوک الحال و غریب الدیار مگر عظیم المرتبت مہمان کی بڑی تعظیم و تکریم کی - سامان شان خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا - زیادہ قیام سے بے تکلفی بڑھی تو اثنائے گفتگو میں شاہ کی زبان سے یہہ نکلا کہ جب تاتر نے ہندستان فتح کیا تھا تو اگر اُسی ہنگامہ اور اُسی سلسلہ میں وہاں کے بڑے بڑے عمائد اور زمینداروں سے رشتہ و پیوند کسی طور سے قائم

میں "بندراس" کی کتاب کا نام "لب التواریخ" لکھتے ہیں - یہ دوسرے بندراس تھے ، بھارا مل کے بیٹے - جو دارا شکوہ کا دیوان تھا اور جس کو شاہ جہاں نے "راے" کا خطاب دیا تھا - باپ کے مرنے پر بیٹے کو عالمگیر نے رہی اعزاز بخشا - اُس کی "لب التواریخ" میں شہاب الدین غوری سے لے کر ۱۱۰۱ ھ (سنہ ۱۶۸۹ ع) تک کے حالات مندرج ہیں - یہ "لب التواریخ ہند" بھی کہلاتی ہے - غلط فہمی سے بچنے کے لیے ، اس قدر اور لکھہ دینا چاہتا ہوں کہ "لب التواریخ" دو اور بھی ہیں - ایک امیر یحیی بن عبداللطیف الحسینی کی ، جو سنہ ۹۲۸ ھ (سنہ ۱۵۴۱ ع) میں تالیف ہوئی اور جس کا تذکرہ مآثرالامرا اور حاجی خلیفہ میں ہے - دوسری ، مدرس سکندر وزیر قلندر کی یادگار ہے -

منشی سجان راے نے آئین اکبری کے طور پر ابتدائے آفرینش یا آغاز عالم و عالمیان سے لے کر سال چہلم جلوس عالمگیر یعنی ۱۱۰۷ ھ تک ہندستان کی نہایت اچھی تاریخ لکھی ہے - صوبوں ، علاقوں ، شہروں ، اور قصبوں کے حالات بھی بیشتر ضرورت لکھے ہیں - یہ اُس عہد کا خاصا "امیریل گزیٹیر" ہے جو دو برس کی سعی و محنت سے تیار ہوا تھا - خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ یا خلاصہ جان گلکرسٹ صاحب کی فرمایش سے میر سید علی افسوس نے اردو میں کیا تھا - آرایش محفل نام ہے - انگریزی پریس مبجز ہنری کورٹ کے قلم سے آراستہ ہوا - خلاصۃ التواریخ مطبوعہ (دہلی سنہ ۱۹۱۸ ع) میں باوجود سعی و اہتمام بعادلہ قلمی نسخوں کے کچھہ نقص رہ گئی ہیں -

منشی صاحب کے مخطوط (۱۱۰۷ ھ تک) کا مجموعہ خلاصۃ الکاتب ہے -

* صفحہ ۳۶۰ - نسخہ قلمی کتب خانہ عالیہ صدیقیہ مولوی حکیم سید منظور احمد صاحب معمور -

کر لیتا تو خوب ہوتا - نازک موقعوں پر اس سے امداد و اعانت ہوتی؟ امور سلطنت میں خلل نہ آنے پاتا - ضرورت کے وقت یہی تاج رشتے مضبوط طنابیں بن جاتے - تحملہ کی صحبت بھی اور دل در حوت - ہمایوں نے آنکھ سے دو بدن قطرے ٹپکادیے اور کچھ جواب نہ دیا - ایک مدت بعد وہ لوٹ کر ہندستان آیا اور اپنے باپ کا فتح کیا ہوا ملک خاندان سوری سے چھین لیا مگر یہہ خیال اُس کے دل و دماغ در ہمیشہ مستولی رہا - تمام موت آخر تک یہا - کتب خانہ کے زینہ سے پھسلا اور جان عزیز جان آفرین کے سپرد کی - جس عزم کو کہ ہمایوں قلت فرصت اور ناگہانی موت کی وجہ سے عمل میں نہ لا سکا تھا اُس کو اُس کے سعادت مند اور صاحب تدبیر جانشین اکبر نے پورا کیا - وصیت کے موافق تخت نشین ہونے کے بعد ہندستان کے دیگر زمینداران کو وصلت و تعویذ کے لیے تعویذ بھیجے - اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ مسلم و اقبال کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں -

تم جسے یاد کرو؟ پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدا دی کبھی ہو دروا؟ نہ خدا یاد رہے

---

* خان بہادر سید محمد لطیف - تاریخ آگرہ - صفحات ۲۰۷ و ۲۸۴ - و تاریخ ہند از مسٹر ٹی لاؤس صفحہ ۹۸ - "آگرہ میں تین دن" از لیفٹننٹ کرنل ایچ اے ٹیوبل - صفحہ ۲۹ -

فارسی مورخوں نے خواہ مسلمان ہوں خواہ ہندو، کمال راستی و درستی سے کام لیا اور اس تصویر کے دونوں رخ دکھا دیے ہیں - جہاں وہ یہہ لکھتے ہیں کہ :--

(۱) سال بست و نہم دختر عفت سرشت راجہ بھگونت داس را با شاہزادہ سلیم پیوند زیبوگانی دادند - مآثرالامرا جلد دوم - صفحہ ۱۳۰ -

(۲) اودے سنگھہ عرف موتا راجہ (مارواڑ) کی ' ماں سمی ' (نال متی) نامی لڑکی سلیم کے عقد میں آئی - جس سے سلطان خسرو متولد ہوا - مادر جلد دوم - صفحہ ۱۸۱ -

آزاد دهلوی نے دربار اکبری میں اسی گفتگو کو "ہندوؤں کے ساتھ انایت" کے عنوان سے اپنے شیریں انداز اور دلکش عبارت میں نہ تبدیل دربار نقل کیا ہے - امرائے ہنود میں† بھی پیرایہ بدل کر ایسا ہی لکھا ہے -

---

(۳) راجے کلیان مل زمیندار بیکانیر ، صبیہ برادر خود را داخل پرستاران محل سرائے خسروانی ساختہ سر رشتہ اختصاص دست آورد - ماثر جلد دوم - صفحہ ۱۴۸ -

(۴) سال سی و یکم صبیہ رائے رائے سنگھہ بیکانیری بعقد ازدواج شاہزادہ سلیم در آمدہ بر منزلِ او آمد - ایضاً - ص ۱۵۱ -

(۵) ۹۸۴ ھ (سنہ ۱۵۷۶ ع) میں اکبر نے راجہ بیر برادر رائے لون کرن کو راجا ترنگر پور کے پاس بھیجا - راجا اپنی بیٹی حرم سرائے شاہی میں داخل کرنا چاہتا تھا مگر بعض وجوہ سے رکا ہوا تھا - اُس کے پہونچتے ہی رانی کو خوش خوش روانہ کر دیا - دربار اکبری - صفحہ ۲۹۷ -

(۶) سال سوم جلوس جہانگیری میں راجہ مہا سنگھہ ولد راجہ جگت سنگھہ پسر کنور مان سنگھہ کچھواہہ کی بہن کے لئے آسی ہزار روپیہ ساچق (تحائف بدل شادی) بھیجکر داخل محل کی گئی - راجہ مان سنگھہ نے ساتھہ ہاتھی بطریق جہیز پیش کئے - ماثر ج ۳ - ص ۱۷۵ -

(۷) سال چہارم راجہ بر سنگھہ دیو ، بندیلہ کی بیٹی اُس کے عرس کرنے پر خسروی (بادشاہی) محل میں داخل ہوئی - ایضاً - ص ۲۱۳ -

تو اُس کے ساتھہ اُن کو یہہ تحریر کرنے میں بھی باک نہیں ہوتا کہ راجگان اودے پور نے مسلمانوں و لڑکی دینے کا ننگ گوارا نہیں کیا - یہ بھی لکھتے ہیں "گویند کہ صبا یائے راجہائے راٹھور و کچھواہہ داخل محل بادشاہان تیموریہ شدہ اند اما او دوم ہادا ، ایں نسبت را ہیچ کس قبول نہ کردہ" - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جہانگیر نے بعد تخت نشین ہونے کی خواہش کی تھی کہ جگت سنگھہ پسر راجہ مان سنگھہ کی لڑکی کو داخل سلطان محل شاہی کرے مگر رائے بھوج پسر رائے سرجن ہادا جو اُس کا نانا (پدر مادر) تھا راضی نہ ہوا - بادشاہ کو نا گوار بھی گزرا - خیال تھا کہ واپسی کابل پر اُس کی تنبیہ کی جائے گی مگر قضائے الٰہی سے رائے بھوج اسی سال فوت ہو گیا - ماثر جلد دوم - صفحہ ۱۴۱ -

* صفحہ ۶۱ -

† صفحہ ۳۸ -

چنانچہ سب سے پہلے خود اس کے مسکوے عالي میں اس ملک کے حکمران خاندانوں میں کي دو شاهزادیاں داخل هوئیں - ایک حسن خاں* میواتي کي دختر نیک اختر - دوسري - راجہ بہارا مل† کچھواهہ والي جے پور کي خوش سلیقہ اور باتمیز بیٹي‡ - اسي راجہ کے نسبت جہانگیر اپنے ترک§ میں کہتا هے "اول کسے کہ از راجپوتان کچھواهہ شرف بندگي پدر من دریافت راجہ بہارا مل بود - در راستي و درستي اخلاص و نسبت شجاعت از قوم خود امتیاز تمام داشت" -

---

* یہہ خلاصۃالتواریخ کي روایت هے - مآثرالامرا میں لکھا هے کہ حسین خاں میواتي کے چچا زاد بھائي جمال خاں نے اپني بیٹي اکبر کو خود آکر بیاہ دي تھي - "جمال خاں عمزادہ حسن خاں میواتي کہ از زمینداران معتبر هندوستان بود درصبغہ داشت - چوں ملازمت رسید کلاں را بادشاہ در حبالہ عقد خود آوردہ و دوم را بہ مرام خاں تزویج نمود - (جلد اول - صفحہ ۶۹۳) صبیہ بہ نمي دختر (غیاث)

† بہارا مل، بہاري مل اور پورن مل بھي کہلاتا تھا - اس نے ۹۳۳ ھ (سنہ ۱۵۲۷ ع) کے قریب بابر کے زیر سر خاصت خم کیا تھا - اکبر سے بھي درستہ اور خیرخواهانہ مراسم و تعلقات تھے - مورخین لکھتے هیں کہ سب سے پہلے اسي نے اپني بیٹي کي شادی اکبر سے کر دی تھی (تاریخ هند از تري لاوا ص صفحہ ۹۸ - نیز دیگر تواریخ مندرجہ بالا و ما بعد) بہارا مل اور اُس کا بیٹا بھگوان داس یکساں اعلیٰ مراتب فوجي و ملکي پر پہونچ گئے تھے اور سلطنت کے مقرب و بارسوخ امیر تھے - مسٹر ٹیل راجہ کا نام بہاری مل بتاتے هیں - امراے هنود (صفحہ ۷۴) میں بہارا مل لکھا هے - دربار اکبری (ص ۳۴۰) میں تحریر هے کہ راجہ بہارا مل راجہ ابتیبر اُس وقت کچھواهہ خاندان کا چراغ روشن کرنے والا تھا -

‡ مریم زماني کہلاتي هے - اصلي نام کسي مورخ نے نہیں لکھا - مفتاح التواریخ (ص ۳۰۹) میں سلطانہ رکیہ بیگم تحریر هے ۹۶۹ ھ (سنہ ۱۵۶۱ ع) میں زینت بخش محلات هوئي تھي آگرہ میں اپنے بیٹے جہانگیر کے عہد میں سنہ ۱۰۳۲ ھ (سنہ ۱۶۲۳ ع) میں وفات پائي - جہانگیر نے اُس کي قبر در بہشت آباد سکندرہ میں، نزدیک مقبرہ اکبر، گنبد و عمارت بنوائي جو "روضۂ مریم" کے نام سے مشہور هے - اِس میں پادریوں کا چھاپہ خانہ مدت سے هے (گزٹ هینڈبک آف کس - صفحہ ۴۸) -

§ صفحہ ۷ نسخہ مطبوعہ قدیمہ علي گڈھ -

شاہ نواز خاں* لکھتے ہیں کہ "در قصبہ سانگانیر راجہ بہارامل با اندرے از خویشاں بہ تقبیل بساط سرافراز گشتہ بانواع عواطف بایہ قدس افزود راجہ از درست فکری و دور اندیشی خواست کہ خود را از زمرہ زمینداران بر آوردہ ؟ در مخصوصان درگاہ بادشاہی انسلاک دہد خواہش نمود کہ صبیہ خود را داخل حرم سرا نماید - بادشاہ قبول فرمود - راجہ بسر انجام این نسبت دستوری نگرفت - و ہنگام معاودت در منزل سانبھر صبیہ عفت سرشت را بہ ترک تمام بدولت سرائے بادشاہی فرستاد و خود در منزل رین با بھگونت داس پسر و کنور مان سنگھہ نور اُو بشرف ملازمت اختصاص یافت"۔

[قصبہ سانگانیر میں؟ راجہ بہارا مل اپنے بہت سے عزیز و اقارب کے ساتھہ حاضر ہوا - اس کے ساتھہ بڑی مہربانیاں کی گئیں عزت و مرتبہ بڑھا - راجہ نے عقل مندی اور دوراندیشی سے خواہش کی کہ زمینداروں کے طبقہ سے نکل کر بادشاہی لوگوں کے حلقہ میں آجاؤں - بیٹی دینا چاہی - بادشاہ نے قبول کی - راجہ نے اس نسبت کی انجام دہی کے لیے اجازت نامی - واپس آکر سانبھر کے مقام پر پورے اہتمام و احتشام کے ساتھہ لڑکی کو بادشاہ کے دولتخانہ بھیج دیا - اور لشکرگاہ رتن میں خود معہ بھگونت داس اپنے بیٹے اور کنور مان سنگھہ دونے کے حاضر ہوکر سلام و آداب بجالایا -]

نامور مورخ اسٹینلے لین پول کا بیان ہے کہ "سنہ ۱۵۶۲ع میں بھگوانداس کا باپ راجہ بہاری مل؟ والی امبیر و مورث مہاراجگان حال جے پور بادشاہ کے حضور میں بجا آوری آداب کے لیے حاضر ہوا تو اُس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی اور اُس کی بیٹی کو جو بڑی عالی جنس لڑکی تھی جہاں پناہ نے قبول فرمایا - وہ محل سرائے سلطانی کی خواتین میں داخل ہوئی - اکبر

---

* مآثرالامرا - جلد دوم - صفحہ ۱۱۳ -

اپنی اعمام زادیوں ؟ رقیہ و سلیمہ ؟ سے شادی کر چکا تھا مگر اس راجپوت شاہزادی کے ساتھ شادی کرنے سے ایک نئی مصلحت شناسی (پالسی) کا آغاز ہوا - * ان کے بعد حسب ضرورت و مصلحت اکبر نے اور راجپوتنیوں سے بھی شادی کی - مثلاً راجہ بیکانیر کی لڑکی وغیرہا - †

کون کہہ سکتا ہے کہ اس رائے پر عمل کرنے میں دانشمند اکبر نے غلطی کی یا عجلت فرمائی - اُبھرنے والی قوموں اور جماعتوں کو اس قسم کے تعلقات بغیر چارا نہیں ہوتا - دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ میدان ترقی میں قدم رکھنے والے اور عروج پانے والے انسان؟ جن کی زبان پر "ملک خدا تنگ نیست؟ پائے مرا لنگ نیست" ہوتا ہے؟ اپنی اولاد کو مختلط النسل ہونے سے بچا نہیں سکتے - ہندستان ؟ کے سات کرور مسلمانوں میں کے بہت سے معزز اور محترم خاندان ایسے ہی مسلمان و ہندو یا ملکی و غیر ملکی قرابتوں کی یادگار ہیں - ہمارے زمانہ کی وہ ہونہار جماعت جو اینگلو انڈین کہلاتی ہے ؟ دو مختلف قوم اور رنگ کے انسانوں کے اتحاد کا نتیجہ ہے - اکبر کیا کرتا - "بابر جب ہندستان آتا ہے تو مسلمانوں کی حرم سرائیں ہندستانی عورتوں سے بھری ہوئی تھیں اور مسلمانوں کی ظاہری کثرت پر "دوغلے" یا "ادھیڑ" یا "دوسلا" ہونے کا اطلاق ہوتا تھا - ‡ "ملک و ملت کی پابندیاں یا جماعتی خصوصیات مانع نہ تھیں - اکبر کہنے کو "مغل" تھا جو عربی زبان میں "منگول" کو کہتے ہیں - ہندستان آکر یہ لفظ اُس کے لیے یا اُس کے اُن بھائیوں کے لیے رہ گیا تھا جو بابر کے اخلاف و اولاد تھے - یہ شاخ تورک میں بعض اوقات "بابری" کہلاتی ہے -

---

* ہندوستان کی قرون وسطیٰ کی تاریخ - از اسٹینلے لین پول - صفحہ ۲۵۱ -

† " - صفحہ ۲۵۷ -

‡ " - صفحہ ۱۸۹ -

تاتر بھی "مکسڈرس" یا مخلوط النسل تھا یعنی باپ کی طرف سے "ترک" اور ماں کی جانب سے "منگول" - وہ مُغل کے نام سے حد درجہ نفرت کرتا بلکہ چڑھتا تھا - *

سر ولیم سلی مین† لکھتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو یہہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "ہندوستان میں ہماری سلطنت پر زوال اس وجہ سے آگیا کہ ہمارے سلاطین کی رگوں میں راجپوتی خون باقی نہیں رہا تھا" - اس میں شبہہ نہیں کہ ہندستان کے راجپوتوں کے خون سے بہتر کوئی خون ہی نوع آدم کی رگوں میں موجزن نہیں رہا ہے - " یہہ وہی بات ہوگی اگر بالفاظ دیگر یہہ کہدیا جائے کہ کوئی قوم خود یا جس کو اُس سے سابقہ پڑتا ہے، کسی خون کو اپنے سے بہتر نہیں مانتی - یہہ اختلاف محض تخیل پر مبنی ہے اور تخیل کی قوت تمام اقوام بشر افراد میں یکساں دائر و سائر ہے - برتن لوگوں کو دیکھہ لیجئے کہ اپنے خون کو دنیا میں سب سے اچھا سمجھتے رہے جب تک کہ رومن، اسکاٹ اور سیکسن لوگوں کے ہاتھہ سے مغلوب نہ ہوئے - سیکسن ذین کہتے تھے کہ ہمارا خون دنیا بھر سے بہتر ہے - اُن کے اس زعم کو اور نارمن لوگوں نے توڑا - نسل انسانی کی تاریخ بھی ہے -

مسٹر ونسنٹ اِسمتھہ کا خیال اس بارہ میں یہ ہے — ‡

"یہہ تو تسلیم ہو سکتا ہے کہ راجپوتی خون کے ملنے سے دہلی کے شاہی خاندان کی جسمانی ترکیب ضرور تبدیل ہوگئی تھی -

---

* - ہندوستان کے تیموری وسطی کی تاریخ - از اِسپینسر لین پول - صفحہ ۱۹۷ -

† - سیاحت و تذکرے (ریپلس اینٹری کلکتہ نس) - صفحہ ۳۲۱ -

‡ - ٹوٹ - صفحہ بالا -

لیکن دودمان تیمور کی شکست و زوال کو فرمانروا سلاطین کی رگوں سے راجپوتی خون کے رخصت ہو جانے پر محمول یا منسوب کرنا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا - سلطنت تو اورنگ زیب کی وفات سے بہت پہلے رخصت ہونا چاہتی تھی - حالانکہ اورنگ زیب نے خود دو ہندو بیبیاں ساتھی تھیں؟ اپنے بیٹے معظم (بہادر شاہ) کی شادی ایک ہندو شاہزادی سے کی تھی اور یہی اس کے آبا و اجداد کا دستور تھا -

لین پول نے بھی اپنی "ہندوستان کے مغل شہنشاہوں اور اُن کے سکوں کی تاریخ" میں یہی لکھا ہے -

آزاد دہلوی دربار اکبری† میں دانایان فرنگ کا یہہ قول نقل کرتے ہیں "انسان کی طبیعت میں داخل ہے کہ جس چیز سے خود پیدا ہوا ہے اسی چیز کی نسل پر وہ شوق کا جوش اور رغبت کا ولولہ نہیں ہوتا جو غیر جنس پر ہوتا ہے - دیکھو خچر میں گھوڑی سے زیادہ زور ہوتا ہے -"

امرائے ہنود‡ میں لکھا ہے "اکبر مورخین کی یہہ رائے ہے کہ مسلمانوں کا اپنی مفتوح قوم کو امور سلطنت میں دخیل کر کے محکومیت کے درجے سے بڑھانا اُن کی سلطنت کی تباہی و بربادی کا باعث ہوا -"

اس بارہ خاص میں مسٹر وسنٹ اِسمتھ کا قول فیصل § ہے - "یہہ حیرت نہیں ہے کہ سلطنت دہلی کو زوال آیا - حیرت تو یہہ ہے کہ وہ اتنے دن کیسے ٹھہری" -

---

' صفحہ ۱۸ -

† صفحہ ۷۸ -

‡ صفحہ ۴۶ -

§ مباحث و تذکرے (اردو میں) نوٹ صفحہ ۴۲۱ -

اس موقع پر میں فرانس کے ہمہ‌دان و ہمہ‌گیر مصنف، مشہور مستشرق و فلسفی، نامور مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی رائے بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں جو عربوں کے تنزل و زوال کے اسباب میں سے ایک قومی سبب اُن کا غیر اقوام کے ساتھ میل جول اور شادی بیاہ بتاتے ہیں - فرماتے ہیں —

"ان مختلف اقوام . ازدواج و امتزاج کی وجہ سے عربی خون کی خاصیت بہت جلد بدل گئی"

"ایک ہی ملک میں مختلف اقوام کا گھل مل جانا ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے - تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ حکومت کے قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ فاتح قوم مفتوح قوم سے ازدواج و امتزاج نہ کرے - عربیوں نے اس کا کبھی خیال نہ کیا - رومیوں نے کچھ دنوں اس کا خیال رکھا اور اُن کا تنزل اُسی دن سے شروع ہوا جس دن اُنھوں نے اس امر کا ملحوظ رکھنا چھوڑ دیا -"

"عرب برابر اُن اقوام سے جن کے ساتھ رہتے رہے ازدواج و امتزاج کرتے رہے اس ازدواج و امتزاج سے اُن کے قومی خصائص کا تلف ہو جانا ایک لازمی امر تھا محض یہہ امتزاج اقوام اُن کے تنزل کے لیے کافی تھا -"

ان اقتباسات میں "عربوں" کی جگہ آپ "مغلوں" پڑھیں اور دیکھیں کہ کیا یہہ کلیہ حرف بہ حرف ماوراءالنہر کے تیمور، ہندستان کے مغلوں پر صادق نہیں آتا - ان کے مٹنے اور زوال کا باعث کیا ہوا - ؟ یہی غیر قوموں سے ازدواج و امتزاج، نسلی خصوصیات کا مٹ جانا یا حکیمانہ زبان میں "فساد خون" -

---

۱ تمدن عرب - صفحات ۴۴۹ - ۵۴۰ - ۵۵۱ بالترتیب -

اُسی مردم‌خیز، علم دوست سر زمین کے ایک دوسرے شرق نواز عالم موسیو سدیو کی مشہور "تاریخ عرب" سے واضح ہے کہ بنی‌اسرائیل کا طرز تمدن اور آئین معاشرت اس کا مانع تھا کہ مغلوب و فاتح اقوام کی عورتوں سے تناسلی اختلاط قائم کیا جائے - اس بارہ میں یہود کی تاریخوں کو مطالعہ فرمائے اور اُمت موسوی کے عروج و زوال سے سبق حاصل کیجئے -

فلسفہ تاریخ کا یہہ ایک سادہ مگر ضروری مسئلہ ہے جو حوالہ قلم کر رہا ہوں - تاہم اندیشہ ہے کہ بعض تارک اور تعریج تسند دماغ اس دماغی ورزش کے متحمل نہ ہو سکیں گے - اس تحت سے سرگراں ہوں گے - مجھے معذرت کی ضرورت نہیں - تذکرہ و تعرب کو تاریخ سے وہی نسبت ہے جو افراد کو اقوام سے یا ارکان و انصار کو جماعت سے ہوتی ہے - شاہزادہ خسرو ایسے ہی ازدواج و امتزاج کا نتیجہ تھا - اِس لئے یہ تحت یہاں ناگزیر تھی - ع - گر تو نمی پسندی معذور دار مارا -

تار آمد - سر ولیم کی روایت† ہے کہ یہہ جے نوری ملکہ بڑی دوراندیش و ہوش‌مند تھی - شوہر کے نزدیک اسکے مشوروں کی بڑی وقعت تھی - مسٹر ولسنت اسمتھہ اس پر‡ اضافہ کرتے ہیں "کچھہ شبہہ نہیں کہ ہندستان کے باشندے زیر بار منت و احسان رہیں گے کہ اکبر کے عہد دراز میں اُن کو جو فلاح و رفاہ نصیب ہوئی وہ اسی انتہا درجہ کی پاکیزہ عورت کی بدولت تھی - اس کا اثر نہ صرف شوہر پر تھا بلکہ دوراندیش و مدبر وزرا بھی اس کے فاضلانہ مشوروں اور صلاحوں سے متمتع و مستفید ہوتے تھے -

---

* صفحہ ۳۷۰ -

† سیاحت و تذکرے (ریمبلس اینڈ ری‌کلکشنس) - صفحہ ۴۲۹ -

‡ سیاحت و تذکرے (ریمبلس اینڈ ری‌کلکشنس) - صفحہ ۴۲۹ - نوٹ

جسے امید نہ تھی فراغت خوب پھلی پھولی - اس سے ایسی بہت سی شاخیں پھوٹیں جنھوں نے ہندستان میں مغلوں کی سلطنت کی بنیاد کم از کم ایک صدی آیندہ کے لیے راسخ کر دی - مغلوں کے محترم حرم میں آکر اس نیک نہاد رانی نے اپنا رنگ ڈھنگ نہیں بدلا تھا - لیکن اپنے بادشاہ سرتاج اور اُس کی نسل کے لیے صفحۂ دہر پر بہت سے گہرے نقش اور نہ مٹنے والی یادگاریں چھوڑ گئی ہے - مورخین اس کا نام بتانے سے قاصر ہیں تاریخ و آگاہی کی دنیا اُس کو "مریم زمانی" کے خطاب سے جانتی ہے - یہ صحیح ہے کہ کچھ دن تک اس کی آغوش بھی اولاد کی دولت سے خالی رہی - دو بچے † ہوئے اور جاتے رہے - کبھی کبھی یہ آرزو یا حسرت خود اکبر کو بھی بہت ستاتی تھی - وہ بارہا خدا کے مقبول اور برگزیدہ بندوں کی خدمت میں حاضر ہوا - ودمنوسی کی - نذریں دیں - التجائیں کیں - دعائیں کرائیں - مزارات پر حاضری کسی کی - مگر ہر بات کے لیے وقت مقرر ہے - ۹۷۶ھ (سنہ ۱۵۶۸ع) میں آگرہ کے قریب سیکری فتح پور‡ کے

---

† بدایونی اور یزدانی بیاگر فی کل دکھری - صفحہ ۱۷۲ -

‡ ہنتر بک اگرہ و تاج از ہیویل - صفحہ ۱۰۸ -

‡ فتحپور سیکری ضلع آگرہ میں ایک مشہور مقام ہے - صاحب مآثرالامرا (جلد دوم - صفحہ ۵۵۴) لکھتا ہے کہ یہ جگہ پہلے بیابان کے تعلق تھی - جب ہمایوں نے اس علاقہ میں رانا سانگا پر فتح پائی تو اظہار تشکر میں سیکری (سیس کے ساتھ) نام بدل دیا - جہانگیر کی پیدائش کے بعد یہ اس جگہ کی مقبولیت اور خوبی و عظمت کا معترف ہو کر اکبر نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا - سیخ کی درگاہ اور مسجد و شہرپناہ اور عظیم الشان وسیع و رفیع عمارات و محلات تعمیر کرائیں - اب وہ ناسازگار بادشاہ ہوئی - پورے شہر پر آبادی کی نوبت کبھی نہیں پہونچی - یہ عمارتیں اب سیاحان عالم کی زیارتگاہ رہ گئی ہیں - حالی پڑی ہیں اور سرکار عالیہ برطانیہ کی توجہ اور نظر التفات سے اچھی حالت میں ہیں - ترک جہانگیری کے دیباچہ (صفحہ ۲) میں لکھا ہے کہ قصبہ سیکری اکبرآباد (آگرہ) سے بارہ کوس ہے —

اللہ - اللہ ! کبھی اس شہر سے کیسے گائے جاتے تھے - سیخ فیضی وغیرہ غزلیں کہتے تھے

نسیم حور ملک ز فتحپور می آید - کہ با ساہ من از راہ دور می آید

ایک مرتاض و خدا رسیدہ بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتی کی دعا کی برکت سے شجر مراد بار آور ہوا - قرار داد کے موافق† وضع حمل کے زمانہ

---

* ترک کا دیباچہ نگار (صفحہ ۴) لکھتا ہے کہ شیخ سلیم بڑے خدا پرست اور درویش تھے لوگ اُن کی مقبولیت دعا کے قائل تھے - اُن کا نسب نامہ سات واسطہ سے شیخ فرید شکر گنج تک پہونچتا تھا جو پنجاب میں پاک پتن کی خاک میں آرام فرما رہے ہیں اِنہیں کے پوتے شیخ علاءالدین کو دربار جہانگیری سے اِسلام خاں خطاب عطا ہوا تھا - جو ۱۰۱۷ھ (سنہ ۱۶۰۸ع) میں گورنر بنگالہ مقرر ہوئے تھے - شیخ سلیم نے ۲۴ حج کئے تھے - "شیخ الاسلام لقب تھا - ۲۹ رمضان ۹۷۹ھ (۱۵ فروری سنہ ۱۵۷۴ع) کو رحلت فرمائی - باوجود اختلاف مذہب و عقائد اکبر مورخین نے اِن کی بڑی تعریف کی ہے شمس العلما آزاد دہلوی کی دربار اکبری (ص ۷۹۴) اور ترک جہانگیری کے انگریزی ترجمہ پر بوریج صاحب کا نوٹ (ص ۸۱) اور کرنیل نیویل کی تحریر (آگرہ میں تین دن - صفحات ۸۷ و ۸۸ و ۱۱۰) نیز مسٹر ٹنسلے لیس پول کی تاریخ (ص ۴۷۱) ملاحظہ طلب ہے -

شیخ سلیم نے دیار عرب میں مدتوں سیاحت کی تھی - وہاں "شیخ الہند" کے لقب سے مشہور و معروف تھے - ہندوستان واپس آئے تو موضع سیکری میں بالائے کوہ - بنائی سے متصل مسجد و خانقاہ بنواکر مجاہدہ و ریاضت میں مصروف ہو گئے - اِتفاق دست یہ پیش آیا کہ اکبر کے (جو چودہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا تھا اور چودہ برس اور گزر چکے تھے یعنی اٹھائیس سال کی عمر ہو گئی تھی) - کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا - شیخ کے حالات سن کر اور دیکھ کر آرزوئے معروضہ ظاہر کی اور مدد و دعا کا طالب ہوا - شیخ نے اسکو تین بیٹوں کے پیدا ہونے کی بشارت دی - اسی زمانہ میں آثار حمل نمایاں ہوئے اور آپ کی کرامت و خوشخبری پوری ہوکر رہی - "شیخ ہندی" سے سال وفات (۹۷۹ھ) نکلتا ہے - (مآثرالامرا جلد دوم ۵۵۵ - و - دربار اکبری ص ۷۹۲) - سر ولیم سلی میں اپنی کتاب (کے صفحات ۴۲۲ لغایۃ ۴۲۴) میں شیخ سلیم کو بڑی تعظیم و ادب سے یاد کرتے اور لکھتے ہیں کہ اس "نہایت متبرک عمر رسیدہ بزرگ" کا سن اُسوقت چھانوے سال کا تھا - مسٹر بوریج (اپنے نوٹ صفحہ ۷۱ میں) لکھتے ہیں کہ شیخ کی رحلت کے وقت جہانگیر دو برس سات مہینہ کا تھا - وہ بیل صاحب اور حدائقۃالاصفیا (جلد اول ص ۴۳۵) کا حوالہ دیتے ہیں -

† آگرہ میں تین روز - از کرنیل نیویل - صفحہ ۸۸ -

کے فرسب خوش نصیب ہندو ملکہ، اس مسلمان ولی کے دائرہ قدس میں بکمال عقیدت و اخلاص پہونچا دی گئی† - شیخ کی

---

* مسٹر بیورلی کا خیال ہے کہ جہانگیر کی ماں غالباً ایک مسلمان خاتون سلیمہ سلطان بیگم تھی - جو ہمایوں کی بہن کی لڑکی اور بیرام خاں کی بیوہ تھی - مسٹر بیورلی ہمارے زمانہ کے مستند اور محتاط تاریخ نویس گزرے ہیں - مغیرل ہیجنداس و ہیج میور اور اُن سے متعدد مباحث پر مواسلت رہی ہے - مآثرالامرا کے انگریزی ترجمہ میں موصوف نے میری ناچیز خدمات کا حوالہ دیا ہے میں نے اُن کی تحقیق اور اُن کی رایوں کو اکثر صحیح اور قریں قیاس پایا ہے - مگر اس موقع پر یہ عرض کرنا ناگزیر ہے کہ اُن کو غالباً "سلیمہ" اور "سلیم" دونوں ناموں کے التباس سے یہہ غلط فہمی ہوئی ہے - ورنہ فارسی کی تمام پرانی تاریخیں اسی چےپوری ملکہ "مریم زمانی" کو جہانگیر کی ماں بتاتی ہیں - سلسلہ سلطان کے نسل سے اکبر کے صرف دو بچے ہوئے تھے - ایک شاہزادہ حاتم بیگی، دوسرا سلطان مراد - مسٹر ولیم نیل نے مفتاح التواریخ (ص ۹ . ۳) میں لکھا ہے کہ "ولادت جہانگیر از بطن سلطانہ رکیہ بیگم صبیہ راجہ بہاری مل بوقوع آمدہ" - ظاہر ہے کہ یہاں حدیجۃالزمانی رقیہ سلطان بیگم سے مراد نہیں جو مرزا ہندال کی بیٹی اور اکبر کی سب سے پہلی بیوی تھی (تاریخ ہندوستان - جلد ہفتم از شمس العلما (مولوی ذکاءاللہ خاں بہادر - ص ۳) قرینہ چاہتا ہے کہ "دیگر رکیہ" ہندی کی "دو رکیہ" ہوگی یا کوئی اور نگڑا ہوا نام ہوگا - مسٹر ونسنٹ اسمتھ بھی اشتباہ ظاہر کرتے ہیں - (نوٹ زیر تحریر سلی مین صاحب - ص ۴۳۰) - سر ولیم سلی مین "ملکہ جو دہ بائی" کو جہانگیر کی ماں بتاتے ہیں (؟) - (سیاحت نامہ اور تذکرے صفحات ۴۲۳ و ۴۲۹ جلد اول مسٹر ہیویل، ہنٹر نے آگرہ و تاج (ص ۱۰۸) اور لفٹننٹ کرنیل نیویل، آگرہ میں تس دس، (ص ۲۹) اور خاں بہادر سر محمد لطیف، سی - آئی - ای، اپنی تاریخ آگرہ (انگریزی صفحہ ۲۹) میں اسی "مریم زمانی" یا جودہ پوری شاہزادی کو جہانگیر کی ماں لکھتے ہیں - بکنورل آگرہ (آگرہ مصور - ص ۵) اور "آگرہ میں تین دس" صفحہ ۸۸ اور ڈنکن صاحب کی مرمہ و مصححہ ہنٹر نے آگرہ، صفحہ ۱۹ میں بھی یہی تحریر ہے -

† دیباچہ ترک - ص ۲ - خلاصۃالتواریخ صفحہ ۳۶۱ -

منزل‌گاہ کے قریب* اس کے قیام و راحت کے شاہانہ مکان تعمیر ہوا جو اب تک موجود اور رنگ‌محل سے موسوم ہے - ۱۷ ربیع‌الاول† ۹۷۷ھ‡ (یکم ستمبر سنہ ۱۵۶۹ع) کو بدھ کے دن سلیم کی چلہ‌گاہ کے نیچے وہ بچہ پیدا ہوا جس کے انتظار میں نہ صرف دودمان تیموریہ بلکہ سارے ہندوستان کی نگاہیں بےچین و مضطرب تھیں - یہہ ہمایوں کا پوتا تھا - راجہ بہاری مل کچھواہہ کا نواسا؟

سایہ نواز جاں بنائے ہیں کہ ایسے موقعوں پر تعمیر مکان اچھا سگون سمجھا جاتا ہے - (مآثر - ج ۲ ص ۵۵۴) -

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ مآثرالامرا (جلد دوم - صفحہ ۵۷۳) میں موجود ہے جو اسوقت یاد آ گیا -

شیخ ضیاءاللہ، سلیم مشہور خوب کوالیاری کے پوتے، بڑے عالم و فاضل اور درویش قانع و کامل تھے - بادشاہی نوکری یا دربار کا تعلق پسند نہیں کیا - گوشہ میں سکونت اختیار کرلی تھی - جائیداد و سامان تعمیر کرایا تھی - اکبرلاہور میں ہرنوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا کہ کسی ہرن کا سینگھ اُس کے ایک نازک مقام پر لگ گیا - اس سے سخت تکلیف و اذیت تھی - اطراف و جوانب سے عمائد و اکابر عیادت کے لیے آئے مگر شیخ ضیاءالہند نے حضور نہ کی - بادشاہ نے ابوالفضل سے اسکا تذکرہ یا شکوہ کیا - ناچار بیچارے لاہور پہونچے - اتفاق وقت کہ شاہزادہ دانیال کی ایک حرم حاملہ تھی - بادشاہ نے فرمایا کہ وضع حمل کے وقت شیخ کے مکان پر پہونچا دی جائے - ہرچند شیخ صاحب نے عذر کیا - پذیرا نہ ہوا - اور اِس حصہ کو وہاں لے آئے - شیخ کا تعمیر اِس بارہ میں سچا اور نفس‌الامری تھا - اُنہوں نے زندگی سے بیزار ہو کر ایک حصہ بیت خلا دیدی -

* - مآثرالامرا - جلد دوم - صفحہ ۵۷۱ -

† - خلاصۃالتواریخ - ص ۳۶۱ - و ترک جہانگیری صفحہ اول -

‡ - میرے ترک کے نسخہ میں غلطی سے ۹۹۷ھ چھپا ہے - ملا عبدالحمید نے بادشاہ نامہ میں سنہ ۹۷۷ھ صحیح لکھا ہے -

راجہ بھگوانداس کا بھانجا اور مان سنگھہ کا بھوبھی زاد بھائی
ان بزرگ کے استمرار و ارشاد سے اُن ہی کے نام نامی پر

---

* - سچ سلیم چشتی کو تمام مورخوں نے ' مسلمان ہوں یا ہندو ' یا اینگلو انڈین ' بڑی عظمت و توقیر سے یاد فرمایا اور اُن کی کہن‌سالی گوشہ نشینی اور خداداتی و خدا پرستی کا سچے دل سے اعتراف کیا ہے - مگر بعض مختار یورپین اہل قلم ایسے بھی ہیں جنہوں نے افسوس ہے کہ اس ولادت کے بارہ میں ناپاک و ناشایستہ خیال ظاہر کیے ہیں - اِن کو نقل کرکے اپنے قلم کو گندہ کرنا کون پسند کریگا - جن حضرات کو ایسے جذبات تعصب و آلودگی سے بدمزہ ہونا گوارا ہو ' مسٹر ایچ‌جی کین ' سی - آئی - ای - ایم اے کی آگرہ ہینڈ بک صفحات ۵۸ و ۹۰) اور جنرل گاڈفریے چارلس منٹے ' گورنر جرسی کا ڈائری سالہ سیاحت نامہ ہند (سنہ ۱۸۲۷ و سنہ ۱۸۲۸ع) موسوم بہ ہندوستان کے قلم اور پنسل کے نقوش (صفحہ ۳۰) ملاحظہ فرمائیں - قلم اور تلوار کا دھنی جنرل اس بد کمانی و کج انکاری کا الزام اوروں کے سر رکھہ کر بظاہر اپنی برأت مگر حقیقت دبی زبان سے اُن کی تائید کرتا ہے - کسی تاریخ نویس کا نام نہ لینے سے خود اُس کے دل کا چور کھل جاتا ہے - سایہ ' وطن سے دور ' مگر وطن کی محبت سے چور ' دور اندیش منٹے کا دھیان باہر کے کسی عالیشان قصر و ایوان کی جانب گیا ہوگا - ورنہ بدنصیب ہندوستان تو سایستگی و تمدن کی ان برکتوں سے آج بھی محروم ہے - اس حقیقت سرشت سر زمین کی تاریکی اور یہاں والوں کی کوتہ نظری جو چار سو برس پہلے رہی ہو گی ' برس ہے - میں یقین نہیں کر سکتا کہ کوئی باہوش ' ذی فہم شخص حقیقت سچ سلیم کو " جہانگیر کا حقیقی باپ " سمجھنا یا باور کرتا ہو گا لیکن اگر کوئی ایسا نابینائے مادر زاد مورخ ہو تو یاد رکھے کہ ترانوے چورانوے برس کے بوڑھے کے اولاد ؟ اگر ہو سکتی ہے تو خالص روحانی قوت سے ہو سکتی ہے - انسان کے ظاہری قوا اس عمر میں معطل اور ازکار رفتہ ہو جاتے ہیں - ایسے پیر زادی کو جواں ؟ اور اپنی جوانی کی قدرداں ؟ راجپوت جوں والی ؟ ہندوستان بھر کی ملکہ ؟ سوائے ادب و عظمت ؟ احترام و عقیدت کے اور کس نگاہ سے دیکھی گی -

مسٹر ونسٹ اسمتھہ اپنے نوٹ (مندرجہ سیاحت نامہ ر بدکرہ سلیم ں صاحب - حصہ اول - صفحہ ۴۳۲) میں بجا لکھتے ہیں " مسٹر کین کی ہینڈ بک اگرچہ ایک فاضل شخص کی تالیف ہے ؟ پھر بھی وہ گائڈ بک ہے - ہمیشہ صحیح اور ٹھیک نہیں

مرزا سلیم ! نام رکھا گیا -

یمن و برکت کے لیے حضرت شیخ نے اپنی بیٹی سے دودھ† پلوایا - اکبر نے خوشی خوشی اپنی سب منتیں پوری کیں - حتیٰ کہ سلطان الہند خواجہ اجمیر کے مزار پر انوار پر پیادہ پا | گیا اور وہ تمام بندگانہ اور حضر

ہو سکتی - البتہ اس قسم کی جیسی کتابیں معمولاً ہوتی ہیں اُن سے زیادہ معلومات کی ہے - ''

میں آگاہ ہوں کہ یا جبر انگریز و سیاح اس کتاب کی ''اپنی ہی'' وقعت فرماتے ہیں - مگر اسکا کیا علاج ہے کہ ایسی ہی کتابیں عوام کے ہاتھوں میں جاتی اور بجائے گائیڈ اور رہنما ہونے کے لوگوں کی گمراہی اور غلطی میں پڑنے کا ذریعہ ہوتی ہیں

* خلاصۃالتواریخ قلمی - صفحہ ۳۶۱ - ترک جہانگیری صفحہ اول - سیاحت نامہ سلیمیں - ص ۴۲۳ -

جہانگیر لکھتا ہے کہ قیاصرہ روم (سلاطین ترک) میں بھی سلیم نام کا ایک بادشاہ تھا - اس لیے اشتباہ سے بچنے کے لئے یہ فرق کر دیا گیا تھا ترک میں لکھا ہے کہ شاہزادہ کا نام ''سلطان سلیم'' رکھا گیا تھا (صفحہ اول)

| دربار اکبری - صفحہ ۷۹۳ -

| شاید ہمارے زمانہ کے نازک طبع و نفیس مزاج لوگوں کو اس کے متعلق کچھ تامل ہو ؟ اس لئے کسی قدر صراحت کر دینا ضروری ہے

طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ ''بادشاہ جمعہ کے دن ۱۲ شعبان ۹۷۷ ھ (۲۰ جنوری سنہ ۱۵۷۰ ع) کو آگرہ سے اجمیر پیادہ پا روانہ ہوا - روزانہ سات آٹھ کوس طے کرتا تھا'' - (اس کو ترس صاحب نے بھی ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہندستان، جلد پنجم میں صفحہ ۳۳۴ پر نقل کیا ہے) - سر ولیم سلیمیں کہتے ہیں کہ ''وہ ہر روز تیس کوس چلتا تھا'' (سیاحت نامہ اور تذکرے - صفحہ ۴۲۳) -

کوس کی مسافت عموماً مختلف پائی جاتی ہے - صوبہ جات متحدہ میں دو میل کے برابر سمجھا جاتا ہے - ممالک مغربی و شمالی کے گزیٹیر (صفحہ ۵۶۸) کے مطابق آگرہ کا کوس بقدر پونے دو میل کے ہوتا ہے - اس لیے تیس کوس کے صرف سوا پانچ میل ہوئے - مگر مسٹر ونسنٹ اسمتھ (زیر تحریر سلیمیں) تائید کرتے ہیں کہ طبقات اکبری کا لکھنا بلا شبہہ بالکل صحیح و درست ہے - اکبر عادت درجہ مستعد و جفاکش تھا - اس کے لیے چودہ میل روزانہ چلنا کچھ مشکل نہ تھا وہ کچھ دن

کام انجام دیے جن کی ایسی جلیل‌القدر ہستی سے توقع نہیں کی جاتی تھی - اولاد سے محبت کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے مگر سلیم کے ساتھ اکبر کی اُلفت عشق و جنون کی حد تک پہونچی ہوئی تھی - جہانگیر لکھتا ہے ، کہ میرے باپ نے نہ کبھی حالت مستی ؟ نہ کبھی ہوشیاری میں؟ میرا نام بھول کر بھی نہیں لیا - محمد سلیم یا سلطان سلیم کہہ کر کبھی نہیں پکارا ؟ بلکہ وفور محبت سے ہمیشہ " شیخو بابا " یا " شیخو جی† " ہی کہا کرتا تھا - خیال رہے کہ تیموری خاندان کے ارکان (بادشاہ اور ولی عہد کو چھوڑ کر) معمولاً " سلطان کہے جاتے تھے - حتیٰ کہ مجازاً ‡ ایک کو بھی " سلاطین " کہہ دیتے تھے اگرچہ لفظاً جمع کا صیغہ ہے -

خافی خاں § راوی ہیں کہ سابق باپ نے ولیعہد مقرر کیا تو " شاہنشاہ " کا خطاب عطا کیا اور جملہ $ لوازمات بادشاہی و اسباب و سامان سلطانی مرحمت فرمائے - قلعہ آگرہ ¶ کے دیوان خاص میں تخت سنگ سیاہ پر جو قطعہ تاریخ ۱۰۱۱ ھ (۱۶۳۰ع) کا منقوش ہے ؟ اس اعلان کی تجدید یا مکرر تصدیق کی یادگار ہے -

---

اجمیر میں ٹھہرا - رمضان کے مہینے میں دہلی پہونچا - یہ سفر ۷ فروری سے ۸ مارچ تک رہا - اکبر صرف وسط فروری کے قریب اجمیر پہونچا ہوگا - اس حساب سے اس نے تقریباً تین ماہ پیادہ روی میں گزارے تھے -

* تزکی جہانگیری صفحہ اول -

† دربار اکبری - صفحہ ۷۹۳ -

‡ دربار اکبری - ثوت - صفحہ ۱۰۰

§ منتخب اللباب خافی خاں - حصہ اول - صفحہ ۲۳۰ -

$ دربار اکبری - صفحہ ۹۳ -

¶ معل تعمیر از کس صاحب - صفحہ ۱۱۶ - و آگرہ ہسٹرک بک صفحہ ۴ -

تاج و تخت پانے کے بعد شاہانہ آداب و معمول پر کار فرما ہوکر سلیم نے اپنا نام و لقب* "ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی" رکھا اور اس دارفانی سے انتقال کے بعد جنت مکانی کہلایا۔ مغلوں کی تاج میں جہانگیر ہندستان کا چوتھا شاہنشاہ تھا۔

---

* توزک جہانگیری ص ۲ - و - دیباچہ ترک ص ۲ -

قومي سيرت كي تشكيل

(از خواجه غلام السيدين ايم - اي - ڈي)

هندستانيوں كي قومي سيرت سے بحث كرنا اور اِس كي تكميل اور تربيت كے مسئله كو حل كرنا ايك مشكل اور ذمه‌داري كا كام هے - كيونكه صحيح معنوں ميں كسي جماعت كي ذهنيت اور سيرت سے اسي وقت بحث كي جا سكتي هے جب وه اِس درجه منتظم هو گئي هو كه اِس كو ايك "قوم" كها جا سكے - قوم كا لفظ بجاے خود بے شمار اختلافات كا مركز رها هے اور صاحبان فكر نے اِس كے لئے مختلف معيار اور شرائط قرار ديے هيں - اور اپنے اپنے معيار كے مطابق بعض جماعتوں كو قوميت كے حقوق سے محروم ركھا هے اور بعض كي قوميت كو تسليم كيا هے - مثلاً پروفيسر ريمزے ميور (Ramsay Muir) نے جو انگريزي مورخين ميں ايك ممتاز حيثيت ركھتے هيں اپني كتاب "قوميت اور بين‌الاقواميت" ميں قوميت كے ليے سات شرطيں بتائي هيں جن ميں سے پهلي چهه لازم نهيں هيں ليكن ساتويں لازم هے - اِن شرائط ميں مندرجه ذيل امور شامل هيں - "كسي خاص جغرافي علاقه كي سكونت - اتحاد نسل - اتحاد زبان - اتحاد مذهب - ايك كافي عرصه تك كسي مستحكم اور منتظم سلطنت كا قيام - اقتصادي مفاد كا اشتراك جس سے مشاغل اور اوقات ميں يگانگت پيدا هوتي هے اور سب سے زياده يهه كه اِس قوم كے افراد كي مشترك روايات هوں جو دُكھه درد سب نے مل جل كر جھيلے هوں اور كاميابياں حاصل كي هوں اِن كي ياد جو افسانوں اور راگوں ميں؟ اِن بڑے بڑے آدميوں كے محبوب ناموں ميں جنهوں نے گويا تمام قوم كي سعي اور نصب العين كو اپني ذات ميں جمع كر كے دكھا ديا؟ اور اِن مقدس مقاموں كے نام ميں محفوظ هوں جن ميں قومي

یادگاریں دفن ہیں ؟؟ - پروفیسر موصوف کے بیان میں یہ بات قابل غور ہے کہ وہ ابتدائی شرائط میں سے کسی کو قومیت کے لیے لازم قرار نہیں دیتے - بلکہ اِس کو ایک نفسی اور ذہنی امر سمجھتے ہیں جس کا تعلق صرف خارجی اسباب ؟ یعنی مذہب ؟ نسل اور زبان وغیرہ کے اتحاد پر نہیں بلکہ قوم کی سیرت ؟ افراد کے باہمی تعلق اور نفسی نظام پر ہے - میرے خیال میں انسان کی کوئی جماعت قوم اُس وقت بنتی ہے جب اس میں دماغی اتحاد اور یک جہتی ہو جب ایک ہی آب و ہوا اور سیاسی اور معاشرتی ماحول میں رہتے رہتے ان کے نقطۂ نظر اور فلسفۂ زندگی میں ایک حد تک یکسانیت اور یک رنگی پیدا ہو گئی ہو - میرا یہہ مطلب نہیں کہ اِس کے افراد میں اختلاف طبائع اور انفرادیت نہ رہے اور وہ سب ایک دوسرے کی نقل بن کر رہ جائیں - لیکن یہ ضرور ہے کہ اِس اختلاف طبائع میں ؟ جو بجائے خود ترقی اور تنوع کی بنیاد ہے ؟ ایک وحدت کا رنگ پایا جائے اور جو کچھہ اختلافات ہوں وہ قومی سیرت کے بنیادی اصولوں پر قائم اور انہیں کا اظہار ہوں - ان کے خیالات اور فکر کی دنیا میں جو کچھہ قیمتی اور دیرپا پیداوار ہو یعنی اُن کا ادب ، اُن کا فلسفہ ؟ اُن کا آرٹ ، ان کی تہذیب ، اور ان کا نظام تمدن ؟ اس کا اثر اور رنگ تمام افراد کی زندگی میں کم و بیش نمایاں ہو - یہ ممکن ہے کہ خود اس قوم کے افراد کو ایک دوسرے میں یہ مشابہت اور دماغی اتحاد نظر نہ آئے لیکن ایک طرف تو اس یک جہتی کا احساس ضروری ہے کہ ؟؟ ہم ایک دوسرے کے اعضا ہیں ؟؟ اور دوسری طرف دیگر اقوام کے مقابلے میں ان میں ایسی شخصیت اور خصوصیات پائی جائیں جو ان کو تمدنی اور ذہنی اعتبار سے ممتاز کریں - مثلاً ایک ہندستانی یورپ یا امریکہ یا چین یا عرب میں صاف طور پر پہچان لیا جائے نہ چہرہ شکل اور رنگ کے اختلافات کے ، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنی ذات میں بعض خاص

قدور کا حامل ہے جو اس ترکیب اور تناسب سے اور کسی ملک کے باشندے میں نہیں پائی جاتیں - کسی خاص شخص میں ان صفات کا بہت زیادہ نمایاں ہونا یا نہ ہونا اُس کی ذاتی طبیعت اور تربیت پر منحصر ہے لیکن جب قوم بحیثیت ایک منتظم جماعت کے کسی مسئلہ پر غور کرے ' یا کسی معاملہ میں قدم اٹھائے تو یہ خصوصیات اپنا اثر ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں - اس کی ایک عمدہ مثال انگریزوں کی قوم ہے جن میں قومی سیرت کی خصوصیتیں اس قدر نمایاں ہیں کہ ایک باخبر آدمی بالعموم تھوڑے سے تجربہ کے بعد بتا سکتا ہے کہ فلاں شخص انگریز ہے - امریکن یا جرمن یا روسی نہیں - مجھے یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ انگریزوں کی یا کسی قوم کی مخصوص سیرت بجائے خود قابل تعریف ہے یا نہیں - اور قومی خصوصیات کا اس قدر نمایاں ہونا کہ کوئی فرد یا قوم وسیع تر انسانی حقوق اور ہمدردی کو فراموش کردے اچھی بات ہے یا بری - اس جگہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی بڑی انسانی جماعت کی سیرت یا ذہنیت کی صحیح تصویر اسی وقت کھینچی جا سکتی ہے جب وہ جماعت اشتراک مقاصد اور قدور کی وجہ سے ایک "قوم" بن جائے -

اس لئے قومی سیرت سے بحث کرنے سے قبل ' ہمارا فرض یہہ ہے کہ ہم یہہ دریافت کریں کہ ہندستانی ایک "قوم" ہیں یا نہیں - آیا ان تینتیس کروڑ بندگان خدا میں جو اس زبردست بر اعظم میں زندگی بسر کر سکتے ہیں ' اغراض و مقاصد کا وہ اتحاد اور زندگی کے نظام اور جذبات کی دنیا میں وہ ہم‌آہنگی پائی جاتی ہے یا نہیں جو انہیں قوم کے خطاب کا مستحق بنا سکتی ہے - آیا حیات انسانی کی بعض قدور ایسی ہیں جن کو انہوں نے مدتوں سے عزیز اور محترم سمجھا ہے اور جن کا اثر براہ راست یا بالواسطہ ان کی زندگی پر ہوتا

رہا ہے - یا بے شمار انسانوں کی آبادی محض بہت سے مختلف خیال اور مختلف مقاصد گروہوں اور جماعتوں پر مشتمل ہے جو بعض اتفاقات کی وجہ سے ایک ہی جغرافی ماحول میں جمع ہو گئے ہیں اور برخلاف ان مختلف جانوروں کے گروہوں کے جو اپنی صلح پسندی اور رواداری کی وجہ سے "خوش باش گھرانے" کہلاتے ہیں یا قطرتاً ایک دوسرے کے ساتھ جنگ و جدل اور کشمکش کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں؟

(۲)

مختصر یہ کہ ہندستانیوں میں کوئی مخصوص قومی سیرت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ان کی قومی خصوصیات کیا ہیں جو ان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں؟ ان کی ذہنیت میں کون سی ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام کے پیچھے رہ گئے ہیں؟ اور کون سے ایسے امکانات ہیں جن کی صحیح تربیت سے ان کی خفتہ قوتیں بیدار اور مردہ ہمتیں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میرے خیال میں یہ کہنا غلط ہے کہ ہندستانی ایک قوم نہیں ہیں - کیونکہ یہ دعویٰ ان کی ارتقائی تاریخ کے سکھائے ہوئے سبق کو نظر انداز کرتا ہے - ہندستان میں، اور ہندستانیوں میں خود کو ڈھالنے کی، واقعات اور حالات زمانہ کے ساتھ مطابق اور ہم‌آہنگ بنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے - ہندستان نے ان تمام قوموں اور نسلوں کو یکے بعد دیگرے ضم کر لیا جو دور دراز کے مختلف ملکوں سے اِس کی میہمان نوازی کی تلاش میں یہاں پہونچیں اُس نے آنوں کو اپنے قدیم باشندوں کے ساتھ یا وجود اِن کی ذات پات کی تمیز کے، اِس طرح ملا جلا دیا کہ ایک نیا اِنسانی تائپ دنیا کی تاریخ میں نمودار ہوا - اِس کے بعد اور جو حملہ‌آور وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے وہ بھی فاتح بننے کے بعد اِس کے حلقہ بگوش غلام ہوکر رہ گئے - ہزار برس گزرے ایک بالکل مختلف نسل اور مذہب کے

لوگوں نے عرب اور ایران اور ترکستان وغیرہ سے آ کر یہاں ڈیرہ جمایا اور وہ بھی باوجود اختلاف طبائع اور اختلاف مذہب کے ہندستانی بن گئے - یعنی اُن کی ابتدائی طبیعت اور بنیادی نظر پر ایک اور رنگ چڑھ گیا جو ہندستان کے ساتھ مخصوص تھا - اُن کی طرز معاشرت اُن کے فلسفۂ زندگی ، اُن کے ادب اور آرٹ بلکہ اُن کے مذہب تک پر یہاں کا گہرا اثر پڑا - اور وہ باوجود اپنی وسیع تر ہمدردی اور اسلامی رشتۂ اخوت کے ، باوجود اصولاً "خاک ہے گرد وطن سے سر داماں میرا" کے قائل ہونے کے ، ایسے ہی صحیح معنوں میں ہندستانی بن گئے جیسے وہ آریا جو ان سے ہزاروں برس پیشتر آئے تھے - جو لوگ اِس بات کے منکر ہیں وہ تاریخ اور واقعات پر خاک ڈالتے ہیں - اور سطحی اختلافات اور عارضی اثرات کے پردے میں اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے -

اِن دونوں مختلف اور زبردست نسلوں اور تہذیبوں کے ملنے سے جو تہذیب اور تمدن پیدا ہوئی اِس کو موجودہ زمانے کی ہندستانی تہذیب اور تمدن کہہ سکتے ہیں ، جیسا کہ آگے چل کر بتاؤں گا ، اِس میں بعض ایسے خارجی اثرات مخلل ہوئے ہیں جنھوں نے توازن کو متزلزل کر دیا ہے اور جن کی وجہ سے تبدیلی اور اِنقلاب کی گرد میں آج کل ہندستانی تمدن کا اصلی چہرہ دکھائی نہیں دیتا - مگر بہر حال ہندستان کی جو کچھ تہذیب اور دماغی کارنامے اب موجود ہیں وہ نہ ہندوؤں کی تنہا جد و جہد کا نتیجہ ہیں نہ محض مسلمانوں کا عطیہ - وہ اِن دونوں کے باہمی اشتراک عمل اور تاثر پذیری کا ثمر ہیں - نہیں بلکہ اس زبردست رو میں ان بےشمار چھوٹی چھوٹی ندیوں کا قابل قدر خراج بھی شامل ہے جن کا آغاز اُن دونوں تہذیبوں کے علاوہ اور کسی سرچشمہ سے ہوا ہے - مثلاً بدھ مت کا فلسفہ زندگی ، چینیوں کا احترام حیات ، یونانیوں کی صنعت اور سپاہگری ، آریوں کا سیاسی اور معاشرتی نظم و نسق - ابتدائی باشندوں

اور خصوصاً دراوڑوں کی دست‌کاری اور منتظم فنکلہ دار زندگی - اور پھر یہہ چھوٹے چھوٹے الفاظ "ہندو تہذیب" اور "مسلمان تہذیب" خود کتنے کتنے زبردست اور متنوع اثرات اور کارناموں کے حاصل ہیں! اِن میں اِنسانی ارتقاء کے تاریخ کے کیا کیا شگوفے اور اِنسان کے ہاتھہ اور تخیل کی کیا کیا گلکاریاں نہیں بھری ہیں! "ہندو تہذیب" کا ذکر ہمارے خیال کو ایک ایسے ساداب اور متنوع باغ کی سیر کراتا ہے جس میں ایک طرف ویدوں کے زمانہ کی سیدھی، سادھی لیکن خوش باش زندگی کا نظارہ دکھاتی دیتا ہے رامائن اور مہابھارت کے معرکے ہیں اور اِن کے ساتھہ اِنسانی جدو جہد کا وہ فلسفہ جو بھگوت گیتا کے صفحات میں بھرا ہوا ہے - دوسری طرف ہندوؤں کے دور عروج کی وہ بھری متحملیں جن پر وکرماجیت صدارت کرتے تھے اور اِن کے نورتن اپنی خیال آفرینیوں اور نئی سنتھیوں سے تمام در بار بلکہ تمام ملک میں علم و فن کی شمع روشن رکھتے تھے - اسی باغ میں کہیں کالیداس کے ڈرامے ہو رہے ہیں کہیں تان سین کی موسیقی دنیا کو رقص میں تحلیل کر رہی ہے - اِس میں راجپوتی شجاعت کی داستانیں بھی مدفون ہیں - مدفون نہیں پوشیدہ ہیں اِس طرح جیسے سیتا کے تاروں میں موسیقی جو مضراب کا انتظار کرتی رہتی ہے! اور وہ تمام علوم و فنون اور دستکاریاں جو اِس تہذیب کا پھل تھیں لیکن اِس کے ساتھہ مردہ نہیں ہوئیں میرا یہہ مطلب نہیں کہ اِس تہذیب میں خامیاں نہیں تھیں - تھیں اور بہت زبردست تھیں - اِس میں اخوت مساوات اور معاشرتی عدل کی کمی تھی - جماعتوں کی اتنی تقسیم افراد کی قوتوں کو دبائے ہوئے تھی - برہمنوں نے اپنے اقتدار اور قوت کو مستقل بنانے کے لئے مذہب کو چند رسوم میں تبدیل کر دیا تھا اور خود اِنسان اور اِس کے بنانے والے کے درمیان حائل ہو گئے تھے - لیکن باوجود اِن تمام خرابیوں کے کس قدر قابل قدر تھا وہ تمدن (اور ہے

وہ تحفہ) جو "ہندو تہذیب" نے ہندستان کی "تہذیب نو" کی خدمت میں پیش کیا تا کہ وہ اِس کے اچھے عناصر کو اپنے میں جذب کر کے انسانی زندگی کا ایک حسین تر مرقع بنائے -

اور پھر "اِسلامی تہذیب" کا پُر سحر لفظ جو ایک چسم زدن میں عرب کے صحراؤں ، ایران کے مرغزاروں ، وسط ایشیا کی مہیب گھاٹیوں اور روم اور فاف اور اٹلی اور ہسپانیہ کی خوبصورت وادیوں کو تخیل کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے - اِس کی قائم کردہ جماعتوں میں خدا کی خدائی کا سکہ جما ہوا ہے - اور سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں کیونکہ خدا سب کا ایک ہے اور اُس کی مشیت سب پر یکساں طریقے سے حاوی ہے - اِس میں جماعتوں اور فرقوں اور قبیلوں میں ، امیر اور غریب میں ، کالوں اور گوروں میں سب میں مساوات ہے - خدا اور انسان دونوں کی نظر میں سب کے حقوق برابر ہیں - سب کو ایک سے مواقع حاصل ہیں - سب کا رشتہ براہ راست اپنے خالق سے ملا ہوا ہے - اس میں جہاں ایک طرف علم و ادب کا چرچا اور ہمت افزائی ہے وہاں دوسری طرف عملیت اور جہاں گیری اور جہاں بانی کی قابلیت ہے - اس میں جوش اور ولولہ اور جراہش عمل ہے جو دنیا کو اور فطرت کی بے چین اور رام نہ ہونے والی قوتوں کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں - میں پھر یہہ نہیں کہتا کہ یہہ سنگینگی اور شباب اسلامی تہذیب میں ہمیشہ قائم رہا یا جب یہہ تہذیب ہندستان پہنچی تو اس میں یہہ سب چیزیں موجود تھیں - نہیں اس میں سے بعض چیزیں زائل یا کمزور ہو چکی تھیں - شخصی قوت اور استبداد کو سوسائٹی کے مفاد اور افراد کی آزادی پر ترجیح دی جاتی تھی - روح مذہب کے بجائے الفاظ کا زیادہ احترام ہونے لگا تھا - لیکن باوجود اُن نقائص کے اس تہذیب کے تصادم نے ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک دی - کیونکہ اس کی تہذیب بجائے متحرک اور

جامد اور جامد ہو چلی تھی اور اس کے اعضا میں سستی پیدا ہو گئی تھی - اس نے سیاست اور معاشرت اور مذہب میں نئے معیاروں اور نئے قدروں کو ہندستان کی خدمت میں پیش کیا تا کہ وہ ان کی مدد سے اس نئی قومی سیرت اور قومی تہذیب کی تشکیل کرے جو ہماری اُمیدوں کی جولانگاہ ہے -

اِس لئے ہندوستان میں جو لوگ اس وقت آباد ہیں ان کی زندگی اور تہذیب کی جڑیں زمانہ ماضی میں بہت دور تک چلی گئی ہیں - ان کی تربیت ان روایات میں ہوئی ہے جو علم و فن، ادب و فلسفہ، سیاست و مذہب سے مالا مال ہیں - وہ اس ماضی کے بوجھ سے، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتے - ہم اہل امریکہ کی طرح نہیں جو ماضی کی روایتوں سے آزاد اپنے لئے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنا سکتے ہیں - ان کی ہدایت اور تمت افزائی کے لیے کوئی گہرے اور دیرپا چشمے ایسے نہیں جن سے ان کو ہمیشہ استقلال اور آئندہ کے لئے امداد حاصل ہوتی رہے - ہماری جو نئی نسل دنیا میں آئی ہے اس کو ایک نظام تمدن، ایک معیار قدروں، ایک فلسفۂ زندگی اپنے چاروں طرف نظر آتا ہے جو اس کو مخصوص طریقے سے متاثر کرتا اور اپنے قالب میں ڈھالتا ہے - ہر بچہ اس کو اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے اور ہوا کے ساتھ ساتھ اس میں بھی سانس لیتا ہے - اس لئے باوجود ان اختلافات کے جو ہندستانیوں میں، مختلف صوبوں اور مذہبوں اور نسلوں کے متعلق ہونے کی وجہ سے پائے جاتے ہیں، وہ ہندستانی، تہذیب و تمدن کے رنگ کو قبول کرتا ہے اور جب بلوغ کو پہنچتا ہے تو اس کی سیرت ایک مخصوص شکل اختیار کر لیتی ہے جو بعض نمایاں لحاظ سے مختلف ہوتی ہے - یہ سوال آگے چل کر پیدا ہوگا کہ یہ سیرت کس حد تک قابل تعریف ہے - یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ سیرت مختلف ہوتی ہے -

اس هندستاني تهذيب نے اپنے دوسرے دور عروج يعني مغلوں کے زمانے میں (جو هم سے قریب تر هے اور اسي وجه سے اس کا هم یہاں ذکر کرتے هیں) مادي اور علمي کارناموں کي جو تاریخ چھوڑي هے وہ هر طرح قابل فخر هے - میں هرگز یہه نہیں چاهتا که دور ماضي کو "عهد زریں" بناکر دکھاؤں؟ نه میري بعض وطن پرستوں کي طرح یہه خواهش هے که اپنے ملک کي هر چیز کو اچھا اور مکمل بتا کر پیش کروں - صداقت کا مطالبه اوّل هے اور وہ حب وطن اور اظہار خودي وغیرہ سب کے مطالبوں پر بھاري هے - لیکن اس دور کے کارناموں کا ذکر کرنے سے میرا مقصد یہه هے که هماري موجوده ذهنیت کے تاریخي اربعا اور پس منظر پر روشني پڑے مغلوں کے عروج کے زمانے میں هندو اور مسلمانوں کي تہذیب اور معاشرت کے تعاون نے جو هندستاني ذهنیت پیدا کي اس کا اظہار مادي زندگي میں اس خوش حالي کي صورت میں هوا جو عام لوگوں کو اِس وقت کے مقابله میں؟ نسبتاً حاصل تھي - ان بے نظیر عمارتوں میں هوا جو هندستان میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک موتیوں کي طرح تکي هوئي هے اور جن کا ساده کار اور سر تاج؟ تاج محل هے جس میں ایک نہایت اور زبردست اور حسن شناس قوم کي تخلیقي قوتوں نے اپنا انتہائے کمال دکھایا هے - اور ان مواد عامه کے انتظامات میں هوا جنھوں نے شہروں اور دیہات کي زندگي کو متمدن اور دور دراز کے سفروں کو آرام ده بنا دیا تھا؟ تہذیب و تمدن کي ترقي کے ان لوازمات میں هوا جو خوراک؟ لباس؟ طرز بود و باش؟ گفتگو اور آداب مجلس میں نئي نئي ایجادات کي شکل میں نمودار هوئے - فنون لطیفه اور صنعت و حرفت خصوصاً انتہائي باریکي رکھنے والي دستکاریوں میں انھوں نے جو کام کیا وہ اب بھي منصرف اور ماهرین فن سے خراج تحسین وصول کرتا هے - علم و فکر کي جد و جہد برابر جاري رهي - اور اگرچه سائنس میں

اُنھوں نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی کیوں کہ اس کے لیے ابھی اسباب بھی پیدا نہیں ہوئے تھے؟ جیسے اس کے کچھ ہی بعد یورپ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ادب اخلاق اور فلسفہ؟ مذہب اور تصوف؟ تاریخ اور سیرت نگاری کے میدان میں انھوں نے قابل قدر تصانیف چھوڑیں - ان کا ادب فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں ساتھ ساتھ ترقی کر رہا تھا - اور اس میں کوئی مخاصمت پیدا نہیں ہوئی تھی - سیاست مدن اور انتظام سلطنت میں انھوں نے بہت زبردست ترقی کی - کیوں کہ ہندستان جیسی وسیع مملکت کو ایک حکومت کے ماتحت لاکر اس کا یہہ نظم و نسق کرنا بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی - غرض یہہ خیال کرنا کہ حکومت برطانیہ کے اقتدار سے قبل ہندستان ایک نیم وحشی؟ نیم مہذب حالت میں تھا؟ اور اس کی تمام گذشتہ تاریخ اور کارناموں کو محض موجودہ عہد کی تمہید سمجھنا ایک سخت غلطی اور ظلم ہے - یہہ غلطی تاریخی اعتبار سے اس نوعیت کی ہے اور صداقت کے اعتبار سے اس سے بدتر جو کہ مسٹر ایچ - جے - ولز نے اپنی "تاریخ عالم" میں کی ہے یعنی یہہ کہ ابتدائے آفرینش انسان سے تماشاگاہ عالم میں جو تماشا ہوتا رہا ہے وہ محض اسی لیے تھا کہ اس کا نتیجہ اور کمال عروج "مجلس اقوام" کی شکل میں ظاہر ہو -

(۳)

لیکن تہذیبیں بھی افراد کی طرح پیدا ہوتی ہیں؟ نشو و نما پاتی ہیں؟ اور اپنا پورا عروج حاصل کرنے کے بعد نابود ہو جاتی ہیں یا ایک قسم کی معلق؟ چہ جنبد چہ بیدار؟ حالت ان پر طاری ہو جاتی ہے - تاریخ میں جو زبردست اور کمال آفریں تہذیبوں کی یادگاریں محفوظ ہیں وہ سب اسی اصول کی شہادت دیتی ہیں - یہہ محال عقلی نہیں ہے کہ کوئی تہذیب ایسی عمدہ بنیادوں پر قائم ہو؟ اور اس کی علمبردار نسلیں اور قومیں اس قدر پاک اور خاب پرور خون رگوں میں رکھتی

ہوں کہ وہ نمو اور زوال کے اس دائرہ سے نجات پاکر ایک مستقل اور پائدار صورت اختیار کر لے ۔ لیکن یہ ابھی تک محض ایک امکان عقلی ہے ۔ اس کی کوئی عملی مثال موجود نہیں ۔ اسی عام قاعدہ کے بموجب ہندستان کی تہذیب پر بھی سترھویں صدی کے بعد سے سُستی اور زوال طاری ہونا شروع ہوا ۔ اس کے اعضا اور عناصر کمزور ہونے لگے اور لوگوں کی تحقیقی قوتوں اور معاشرتی نظام دونوں نے جواب دینا شروع کیا ۔ کہیں کہیں مقامی اور عارضی سنگفتگی اور زندگی ضرور ظاہر ہوئی ۔ لیکن وہ بعض مقامی حالات پر مبنی تھی اور تمام ملک کی علمی اور معاشرتی زندگی کے اثر اور قوت بخش رد عمل سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے وہ دیرپا نہیں ہو سکتی تھی ۔ یعنی وہ ایک موج تھی جو "بیرون دریا" تھی ۔ اس لیے اس کی کوئی مستقل ہستی نہ ہو سکتی تھی ۔ مثلاً دکن کی بعض ریاستوں کی مادی خوش حالی اور علمی بیداری ۔ مغلوں کے آخری دور میں اردو ادب کی ترقی وغیرہ ۔

ہمیں اس وقت عبرتناک زوال کے اسباب سے مفصل بحث کرنی مقصود نہیں ۔ وہ بجائے خود ایک مستقل اور غور طلب مسئلہ ہے ۔ اور جب ہندستان کی تاریخ جنبہ‌داری کے اثرات سے آزاد ہوکر انصاف اور صداقت کے ساتھ لکھی جائے گی اس وقت سنجیدہ مورخ اس پر روشنی ڈالے گا ۔ تاہم یہاں اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ محض طوائف‌الملوکی اور سیاسی جتھا بندی کے بکھرجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک کی علمی اور اخلاقی زندگی بھی متزلزل ہو جائے ۔ سیاسی انقلابوں کے زمانے بعض ملکوں کی تاریخ میں نہایت زبردست علمی اور ادبی جد و جہد کے زمانے ہوئے ہیں ۔ انقلاب فرانس اس کی ایک مثال ہے ۔ انقلاب روس سے کچھ پہلے ؟ جب گویا اس معرکۃالآرا زلزلے کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی ؟ روسیوں نے جو ادبی جدو جہد کی اور جو نامور ادیب پیدا کیے وہ سب بھی

اس بات کی شہادت ہیں کہ محض ملکی بد نظمی کسی قوم کی زندگی کے اعلیٰ تر مظاہر کو برباد نہیں کرسکتی - ہندستان میں بھی ملکی بدنظمی نے اہل ہند کے تہذیب و تمدن اور علمی جد و جہد کو نقصان ضرور پہنچایا - لیکن ہندستانیوں کے علمی زوال اور عام انتشار کا تنہا سبب قرار نہیں دی جاسکتی - اس کے اسباب کو تلاش کرنے کے لیے زیادہ گہری نظر اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے -

کسی ملک کی تہذیب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ نئے خیالات کو پیدا کریں؟ ان کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر وہ ایک وسیع افادی معیار پر پورے اُترتے تو ان کو اپنے نظام زندگی میں راہ دیں - حرکت زندگی کی جان ہے اور قوموں کی زندگی میں یہ حرکت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس میں علمی تخلیق کا مادہ ہو اور وہ برابر مصروف کار رہے اور اسی حالت میں ممکن ہے جب ملک کا نظام تعلیم اور سماجی نظام دونوں بالارادہ جدت؟ اجتہاد اور تخلیق کی قوتوں کو نشو و نما کریں اور ان کو اظہار کا موقع دیں - اگر کسی ملک کا نظام معاشرت جامد اور ساکن ہوکر رہ جائے جس میں نہ افراد کی حرکت کی گنجایش ہو نہ نئے اور زندگی بخشنے والے خیالات کو سر سبز ہونے کا موقع ملے تو اس کی ہر قسم کی ترقی رک جاتی ہے - اس میں ہر نئی تحریک کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے کیوں نہ قائم شدہ صورت حالات کو بدلنے کی دھمکی دیتی ہے - افراد کو اظہار خودی کا موقع نہیں دیا جاتا - انفرادی اختلافات کو دبایا جاتا ہے - لوگ بجائے اس روشنی کو ظاہر کرنے کے جو ان میں ودیعت کی گئی ہے؟ بجائے بے خوف ہوکر ان قدرتی صلاحیتوں اور عطیوں کو کام میں لانے کے جو ان کے حصہ میں آئے ہیں سوسائٹی کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں اور محض

ایک دوسرے کی نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں - ان کو بجائے رواداری کے تعصب، بجائے وسعت خیال کے تنگ نظری، بجائے جدت اور اجتہاد کے تقلید اور کم ہمتی اور بجائے نقد و تنقید کے ادعا کا مرض لاحق ہو جاتا ہے -

گذشتہ دو صدیوں سے یہی کیفیت تھی جو رفتہ رفتہ ہندستان میں بیداہوئی شروع ہوئی اور جس نے ملک کی زندگی میں جمود، اور سُستی، اور نا امیدی کو غالب کردیا - مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے سے جوں جوں علمی افلاس زیادہ ہوتا گیا عام لوگوں میں، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ، تقلید پسندی اور قدامت پرستی کی ذہنیت بڑھتی گئی - اور بجائے اس کے کہ وہ نئے سیاسی اور اقتصادی حالات سے متاثر ہوکر اپنے لئے زندگی کے تمام شعبوں میں نئی شاہراہیں نکالتے وہ نئے علوم و فنون سے منہ موڑ کر ماضی کی مدح سرائی میں مصروف ہو ہوگئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے بغیر ماضی کو اچھی طرح سمجھے محض جذبات سے متاثر ہوکر اس کو عہد زریں تصور کر لیا - اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اس امید میں زندگی بسر کرنے لگے کہ وہ زمانہ کبھی نہ کبھی عود کر آئے گا -

اِس ذہنیت کا اظہار بہت نمایاں طرح اس مخالفت کی صورت میں ہوا جو ہندستانیوں نے بالعموم ان تحریکوں کے ساتھ کی جو راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں کے نام کے ساتھ منسوب ہیں دونوں نے اپنی اپنی جگہہ یہ محسوس کیا کہ قومی زندگی پر بہت سے ایسے تعصبات اور ترقی کو روکنے والے اثرات حاوی ہو گئے ہیں جن کو دور کرنا ضروری ہے - بعض اثرات مذہب کی آڑ لیکر کر کام کر رہے تھے، بعض سماجی زندگی پر رسوم اور پابندیوں کی شکل میں حاوی تھے، اور بعض ہر اس تحریک کی مخالفت کرتے تھے، جس کا کوئی تعلق موجودہ

زمانے سے نا مغرب کی تہذیب سے ہو - اور ان کا جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ یہہ تمام تحریکیں ہمارے قدیم تاریخی تہذیب و تمدن اور مذہب و علوم کی جڑوں کو کھوکھلی کردیں‌گی - یہی وجہ تھی کہ جب ان مصلحین نے اپنے اصلاحی خیالات کو ملک کے سامنے پیش کیا تو مختلف طبقوں اور گروہوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کو مذہب اور قوم کا دشمن اور کافر وغیرہ قرار دیا - لیکن چوں‌کہ ان کی باتیں سچی تھیں؛ دل سے نکلی تھیں اور ان کی شخصیت میں اثر اور زور تھا اس لیے وہ رفتہ رفتہ اس مخالفت کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان کے خیالات کو کچھہ عرصہ کے بعد عام طور پر قبول کرلیا گیا -

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ماضی کو پوجنے اور حال کی طرف سے بیزاری کی ذہنیت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی - اس کے بہت سے اسباب ہوئے - لیکن اس کا غالباً سب سے بڑا سبب مغربی تہذیب کا تصادم تھا - جس طرح گذشتہ زمانے میں نئی تہذیبوں کے امتزاج سے ہندوستانی تہذیب کو استحکام پہنچتا رہا اور اس میں جیات بخش عناصر جذب ہوتے رہے اسی طرح اس وقت ایک نئی تہذیب جس کی نشو و نما بالکل مختلف حالات میں ہوئی تھی بطور ایک چیلنج کے ملک کے سامنے آئی - اور چوں کہ وہ تہذیب ایک حکمراں قوم کی تہذیب تھی اس لیے اس میں قوت اور اثر کرنے کی صلاحیت تھی اور اس نے رفتہ رفتہ؛ باوجود قدامت پسندوں کی مخالفت کے؛ ہندوستانیوں کی ذہنیت اور ان کے عادات و اخلاق ان کی بود و باش پر اثر ڈالنا شروع کیا اور جب اس تحریک کے ساتھہ اقتصادی ضروریات بھی شامل ہوگئیں تو اس کا اثر اور وسیع ہوتا گیا - سرکاری نوکریوں کے لیے انگریزی زبان سیکھنا اور انگریزی مدارس میں تعلیم پانا لازمی ہوگیا - حکمران قوم کی نگاہ میں عام لوگوں کی پوزیشن کا معیار یہہ

ہو گیا کہ وہ کس حد تک انگریزی بود و باش اور طرز زندگی کو قبول کرتے ہیں - اس صورت حال کا اثر وہی ہوا جو ہونا تھا - ایک طرف اپنی تہذیب کا نظام زوال آمادہ ہو چکا تھا - دوسری طرف ایک نئی تہذیب اپنے نئے اور انوکھے خیالات سے ؟ اور دنیاوی فائدوں کی ترغیب سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی - ردّ عمل ہونا ضروری تھا - ملک میں ایک کافی بڑی جماعت ایسی پیدا ہو گئی جس نے زیادہ تر مغربی تہذیب کے صرف بیرونی اور سائنسی پہلوؤں سے خیرہ ہو کر اس کی اندھی تقلید شروع کردی اور اپنی قومی روایات اور تاریخی تہذیب کو نہ صرف فراموس کر دیا بلکہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگی اس میں کچھ اثر اس بالارادہ پروپگنڈا کا بھی تھا جو مدرسوں کی تعلیم اور ہندستان کی تاریخ کے متعلق غلط بیانیاں کر کے طلبا میں پھیلایا گیا - لیکن اس کی وجہ زیادہ تر یہی تھی کہ نئی نسل کے نوجوان اپنی تاریخ سے ناواقف تھے اور مغرب کی تہذیب اور اس کے فائدوں سے سطحی طور پر مرعوب ہوگئے تھے - یہ زمانہ وہ ہے جب نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں بالعموم ؟ انگریزی لباس ؟ انگریزی طرز معاشرت انگریزی زبان کا سوں خبط کے درجے کو پہنچ گیا تھا - یہاں تک کہ وہ اول تو اپنی زبان کو بولنا ہی ہتک سمجھتے تھے اور اگر بولتے بھی تھے تو اس میں انگریزی الفاظ کی بھر مار ہوتی تھی اور بعض اوقات اردو کے الفاظ کو بھی بگاڑ کر اس طرح تلفظ کرتے تھے جس طرح ناواقف غیر ملکی اپنے ہندستانی نوکروں سے زبان سیکھ کر بولتے ہیں - یہ وہی طبقہ تھا جس کا مذاق اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص اور ناقابل تقلید انداز میں جا بجا اپنی نظموں میں اُڑایا ہے —

مگر وہ جرگہ جسے چر گئی ہے انگریزی

نہ واں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار !

ہندستانی ذہنیت پر یہہ ملمع بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا ۔ مغربی تہذیب کے تعلق اور تصادم نے بہت سی ایسی قوتوں اور تحریکوں کو بیدار کر دیا تھا جو دوبارہ ایک نیا ردّ عمل پیدا کر رہی تھیں اور "قومیت" کے احساس کو از سر نو ابھار رہی تھیں ۔ یہہ احساس محض سیاسی نہ تھا بلکہ اس میں تہذیب و تمدن ، تعلیم و معاشرت کا خیال بھی شامل تھا ۔ اپنی حالت کی خرابی کا احساس ، مغرب کے سیاسی خیالات کا مطالعہ ، تہذیب مغرب کی سطحی چمک کا زائل ہونا اور اس کی کمزوریوں اور نقائص کا اظہار ، تمدن قدیمہ کا تاریخی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور اس کی اہمیت کی پہچان اور سب سے زیادہ سیاسی بیداری اور احساس قومیت کا احیا ، ان سب چیزوں نے مل جل کر مغرب پرستی اور تقلید کے دور کو جلد ہی ختم کر دیا اور خود موجودہ تعلیم پائے ہوئے طبقہ نے اس رجحان کی مخالفت کی جو انیسویں صدی کے آغاز تک ہندستانیوں کو ہندستانی تہذیب سے دور ہٹاتا چلا جارہا تھا ۔ اس کا اظہار زمانہ حال کے بہت سے صاحبان فکر کے خیالات اور تقریروں اور تصانیف میں ملے گا جس میں مہاتما گاندھی ، ٹیگور ، اقبال جیسے مختلف نقطہ نظر کے لوگ شامل ہیں ۔ اس جدید ترین تحریک کا بہترین اظہار اس خواہش کی شکل میں ہوتا ہے کہ ہندستان اپنی حقیقی اور اصلی روح کو دوبارہ پائے اور اپنی قومی نجات اور مستقبل کی تشکیل کے لیے ایک مفکر کی طرح دوسروں کی دریوزہ گری نہ کرے ، اقبال اس مطلب کو جا بجا اپنے اشعار میں خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے :—

ز خاک خویش طلب آنچہ کہ پیدا نیست

تجلیٔ دگرے در خورِ تماشا نیست !

اس میں شک نہیں کہ اِس "حقیقی اور اصلی روح" کے صحیح معنوں میں لوگوں کو اختلاف ہے اور اس اختلاف کا قائم رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں - کیونکہ قومیت کی تعمیر ہر شخص کے مخصوص نقطۂ نظر اور فلسفہ زندگی پر منحصر ہے اور جب تک زندگی کی اہم قدروں کے متعلق لوگوں میں اختلاف رہے گا وہ اجتماعی زندگی کے نصب‌العین کو بھی مختلف صورتوں میں پیش کریں گے - تاہم بجائے خود اس اصول کا تسلیم ہو جانا ایک اہم بات ہے کہ ہر قوم کی ترقی اور نجات خود اپنی مخصوص صلاحیتوں اور امکانات کی تربیت میں پوشیدہ ہے - دنیا میں مجموعی ترقی تہذیب و تمدن کے لیے یکسانیت کی ضرورت نہیں فطری اختلافات کو نشو و نما کرنے کی ضرورت ہے اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر قوم اپنی مخصوص روح اور اپنی مخصوص جینئس (Genius) کو تلاش کرے اور تعلیم اور اداروں کی تنظیم کے ذریعہ ان کو مکمل بنانے کی کوشش کرے - یہہ اصول ابھی تک دنیا میں تمام قوموں نے تسلیم نہیں کیا یعنی اس معنی میں کہ ان کے سوا دوسری قوموں کو بھی یہہ حق ہے کہ اپنے اپنے راستوں پر چل کر اپنی تہذیب کی نشو و نما کریں - اگر یہہ اصول تسلیم کرلیا جاتا تو عالماً وہ تمام کوشش جو ایک تہذیب دوسری تہذیب کو مغلوب کرنے کے لیے بالارادہ کرتی ہے وقوع میں نہ آئیں - بہر حال کم از کم نظری طور پر کوئی انصاف پسند اور سلیم‌العقل انسان اس اصول سے انکار نہیں کر سکتا - عملاً اس کو رہبر زندگی بنانے میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں اور بہت سی قدیم اور مضبوطی کے ساتھہ جمی ہوئیں جبلّتوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے - اور جوں جوں اس کوشش میں کامیابی اور قوموں میں مناسب رواداری اور انصاف پسندی پیدا ہوگی یہہ اصول زیادہ مضبوطی کے ساتھہ بین‌الاقوامی تعلقات میں اپنے کار فرمائی دکھائے گا -

ہندستان میں اس تحریک کے حامیوں نے بعض اوقات اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ ہر ردّ عمل کے ساتھ مبالغہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے - مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستانیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی قومی تہذیب اور مستقبل کے اداروں اور نظام زندگی کی تشکیل میں نہ داہنی طرف دیکھیں نہ بائیں طرف - بلکہ اپنی نظر کو قدیم ترین ہندستانی تہذیب مثلاً ویدک تہذیب کی طرف پھیر دیں اور ایک گم شدہ زمانے کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کریں - بعض نے اس تحریک کے اثر میں آ کر یہ کوشش کی ہے کہ ماضی کی ہر چیز کو کسی نہ کسی طرح صحیح یا غلط "علمی تحقیق" کے درجہ اچھا کر کے دکھائیں اور تاریک گوشوں کو اپنے فاضلانہ علمی دلائل کی روشنی سے منور کردیں - ایک گروہ ایسا ہے جو عہد جدید کی تمام ایجادات اور ترقیوں کو اس بنا پر رد کرنا چاہتا ہے کہ وہ انسان کی روحانی ترقی میں سد راہ ہوں گی اور اس لیے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے درمیان کوئی مفید اور نتیجہ خیز سمجھوتہ قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے -

(۴)

ہم نے ابتدا میں ہندستانی ذہنیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس سے ایک نہایت اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندستانی دماغ اور فطرت دونوں بہت رواداد اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں - ہندستانیوں کی طبیعت میں ابتدا سے یہ صلاحیت رہی ہے کہ وہ بیرونی اثرات اور بیرونی خیالات وغیرہ کو اپنے میں ضم کر کے اُن کو اپنا بنا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو قومیں ہندستان پر حملہ آور ہوئیں اور اپنی تہذیب کو بحیثیت ایک فاتح قوم کے اس ملک میں لے کر آئیں وہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد خود اس ملک کی آب و ہوا میں

رس بس گئیں - اور ملک کی عام تہذیب کے ساتھ مل کر ان کے امتزاج سے ایک نئی اور زیادہ وسیع اور گہری تہذیب پیدا ہوئی - سید راس مسعود صاحب (وائس چانسلر علیگڈھ مسلم یونیورسیٹی) نے اپنے ایک تعلیمی خطبہ میں لکھا ہے کہ جاپانیوں نے گذشتہ سو سال کے عرصہ میں جو غیر معمولی ترقی کی اور خود کو مغربی قوموں کے دوش بدوش پہنچا دیا اس میں ایک حیرت انگیز اور قابل غور بات یہہ تھی کہ انہوں نے اہل مغرب کی تمام چیزوں کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ ان کی تہذیب و تمدن سے ان چیزوں کو انتخاب کر کے لیا جو ان کی طبیعت اور قومی روایات کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی تھیں - یہہ بالکل صحیح ہے لیکن فطرتاً اِس لحاظ سے ایک ہندستانی کسی جاپانی سے گھٹا ہوا نہیں ہے - ہندستانیوں میں بھی بدرجہ اتم یہہ صلاحیت ہے کہ وہ فراخ دلی اور وسعت نظر کے ساتھ باہر کے خیالات اور تہذیب و تمدن کو قبول کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ اِس کو اس طرح ڈھالتے اور "اپنا" ہیں کہ وہ بغیر کسی تا گواری کے ان کی اپنی تہذیب کا جزو ہو جاتے ہیں - ممکن ہے اس خیال کی تردید میں میرا اوپر کا بیان پیش کیا جائے جہاں میں نے بتایا ہے کہ کس طرح ابتدا میں ہندستانیوں نے انگریزی تہذیب کی تقلید بغیر سوچے سمجھے کی اور اپنی تاریخ اور روایات کو پس پشت ڈال دیا - لیکن یہہ اِعتراض صحیح نہیں کیوں کہ وہ اِرتقاء کی سلسلہ کی محض ایک عارضی منزل تھی جس میں سے گزرنا کوئی تعجب کی بات نہیں - قوموں کی زندگی میں ' خصوصاً بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں ' تمام باتوں کے متعلق پہلے سے کوئی تفصیلی پروگرام نہیں بنایا جا سکتا جس کی پیروی کرنا سب افراد کے لئے ممکن ہو - چھوٹی اور بہت منتظم قوموں ایک حد تک انسان شاید ہو سکے کہ سوچ سمجھ کر ایک قومی

پروگرام بنایا جاوے اور اس پر بہت احتیاط کے ساتھ عمل کیا جاوے جیسا جاپان میں یا جرمنی میں کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ہندستان جیسے وسیع ملک میں ؟ جس کے ساتھ نسل انسانی کے ایک پانچویں حصے کی قسمت وابستہ ہے ؟ ایسا نہیں ہو سکتا - اس کی مجموعی زندگی اور ارتقاء کی مثال ایک سمندر کی ہے جو آگے کو بڑھتے ہوئے اپنے لیے جا بجا نئے اور مختلف قسم کے راستے نکالتا رہتا ہے - بہر حال اسی وجہ سے اول اول ؟ جب ہندستان کو مغربی تہذیب سے سابقہ پڑا اور ابتدائی تعصب جو راہ میں حائل تھا دور ہو گیا تو نئی تعلیم یافتہ جماعت کا زور اور جوش ان کو ایک طرف بہا کر لے گیا اور انہوں نے اس کی تقلید اور اس کو اختیار کرنے میں اعتدال اور سلامت روی کے حدود کو بھلا دیا - لیکن اب جب کہ ہم اس منزل سے نکل گئے ہیں اور ردّ عمل کا اثر شروع ہوگیا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم رواداری اور خود داری کے ساتھ فیصلہ کریں کہ اس نئی تہذیب میں ؟ جو بعض لحاظ سے ہمارے بنیادی اصولوں اور دستور کو چیلنج کر رہی ہے ؟ کیا چیزیں اس قابل ہیں کہ ہم ان کو قبول کریں اور کن چیزوں کو مسترد کرنا چاہیے -

یہاں تک سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میں موجودہ دور کی مغربی تہذیب کو ؟ بعض صاحبان فکر کی طرح ؟ بالکل ناقابل قبول سمجھتا ہوں میرا اعتراض محض اس اندھی تقلید کے خلاف ہے جو اکثر ہندستانیوں نے مغربی تہذیب کی اختیار کی تھی - اور یہ طریقۂ عمل کسی قوم کے لیے بھی مفید یا پسندیدہ نہیں ہو سکتا - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے مسترد کر دینا بھی ہندستانی تہذیب کے منافی ہے - مغربی تہذیب اگرچہ ایک مختلف اور اجنبی ماحول میں پیدا ہوئی ہے لیکن اس میں ایسے مفید اور قابل قدر عناصر موجود ہیں جن

سے سبق حاصل کرنا ؟ جن کو سمجھنا ؟ اور اپنے میں جذب کرنا بہت ضروری ہے - مجھے معلوم ہے کہ ملک میں ایک موثر فرقہ ایسا موجود ہے جو اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتا - اس فرقہ کا سر گروہ عالیجناب مہاتما گاندھی ؟ کو سمجھنا چاہئے اور ان کی رائے پوچھ ان کے خلوص اور خوب فکر و تدبر کے اس قابل ہے کہ اس پر احتیاط کے ساتھ غور کیا جائے - سنہ ۱۹۰۹ ع میں "جو اپنے عقیدہ کا اعتراف" انہوں نے شائع کیا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں -

"مغربی یا یورپی تہذیب کوئی چیز نہیں ہے - البتہ ایک تہذیب موجودہ زمانہ کی ضرور ہے جو سراسر مادی ہے - جب تک مغرب کے لوگوں پر موجودہ تہذیب کا اثر نہیں ہوا تھا ان میں اور اہل مشرق میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں ہندستان پر انگریزی قوم کی حکومت نہیں ہے بلکہ موجودہ تہذیب کی حکومت ہے جو ریلوے اور تار برقی ؟ تعلیمون وغیرہ کے ذریعہ حکومت کرتی ہے مشرق و مغرب کا امتزاج صرف اس حالت میں ہو سکتا ہے جب مغرب موجودہ تہذیب کو تقریباً تک سر مسترد کردے - بظاہر ان کا ملاپ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ مشرق موجودہ تہذیب کو اختیار کرے - لیکن وہ ملاپ ایک طرح کی مسلح صلح ہوگی جیسی کہ انگلستان اور جرمنی کے درمیان آج کل ہے جب کہ وہ دونوں "موت کی گھاٹی" میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس اندیشہ سے کہ کہیں ایک دوسرے کو نگل نہ جائے یہہ بات بطور ایک عام اصول کے بیان کی جاسکتی ہے کہ مادی ضروریات اور آسائشوں کے زیادہ ہونے سے اخلاقی نشو و نما کو مدد نہیں ملتی ہندستان کی نجات اس امر پر منحصر ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں ہندستان نے جو کچھ سیکھا ہے اس کو بھول جائے - ریلوے ؟ تار ؟ اسپتال ؟ وکیل ؟ ڈاکٹر اور اس قسم کی سب چیزوں کو ختم کر دینا

چاهیے اور ان لوگوں کو جو اعلیٰ طبقے کے کہلاتے ہیں بالارادہ ؟ سوچ سمجھ کر اور مذہبی خلوص کے ساتھ کسانوں کی سادہ زندگی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور یہ نہیں رکھنا چاہیے کہ یہی ایک زندگی ہے جو سچی خوشی کا سرچشمہ ہو سکتی ہے عقلمند تھے وہ لوگ جنہوں نے زندگی کی تنظیم اس طرح کی تھی کہ لوگوں کی مادی زندگی اور ضروریات محدود رہیں ۔اسی میں نجات ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسا عظیم‌الشان انقلاب ان لوگوں میں ہو سکتا ہے یا نہیں جو خوشی اور اطمینان کو موجودہ زمانے کی مجنونانہ دوڑ دھوپ اور یورش میں تلاش کر رہے ہیں - ؟؟

ان الفاظ پر ؟ جیسا کہ میں نے کہا ہے غور کرنے کی ضرورت ہے نہ صرف اس لیے کہ وہ ایک نہایت دور رس اور روشن دماغ سے نکلے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ہندوستانی ذہنیت کے ایک رخ کو ؟ اور ایک اہم رخ کو ؟ بہت وضاحت سے بیان کرتے ہیں اس خیال کے مطابق مغربی تہذیب کی بنیاد مادی خواہشات پر ہے اور اس کا انتہائی کمال مادی آسائشوں میں اضافہ کرنا اور نئی نئی چیزوں کی ایجاد - یہ تمام نئی ایجادیں اور اسباب نہ صرف ہمارے بازاروں کو بھر دیتی ہیں بلکہ ہماری روحانی ترقی کے راستہ میں بھی حارج ہوتی ہیں اور ہماری خوشی اور اطمینان کے معیاروں کو بدل کر خراب کر دیتی ہیں - ہم اپنی زندگی کی تکمیل اور مسرت کو ان خارجی اشیا میں تلاش کرتے ہیں اور فطرت کی اٹل اور دائمی قوتوں اور مناظر ؟ اور خود قلب انسانی کی گہرائیوں اور بلندیوں کو بھول جاتے ہیں اور روح ان مادی بھول بھلیوں میں پڑ کر اپنے سیدھے راستہ سے بھٹک جاتی ہے - لہذا ہمیں اس ؟ خیال سے بچ کر دوبارہ اس زمانہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے جب ہماری ضروریات کم اور زندگی سادہ تھی اور ہماری توجہ اضافی اور عارضی

چیزوں نے بنا دے دائمی اور اہم مسائل اور حقائق در رہنی تھی -

اِس میں شک نہیں کہ اگر مغربی تہذیب کے اِس وقت تک کے رجحان کو دیکھا جائے اور اُس کے سطحی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو اِس پر دست الزام اور تنقید میں بہت کافی صداقت ہے - لیکن کسی تہذیب سے تعلق پیدا کرتے وقت یہ دیکھنا کافی نہیں کہ اِس کے تاریک پہلو کس قدر تاریک ہیں کیونکہ ہم اِس کو تمام وکمال جذب کرنا نہیں چاہتے - ہمیں یہ بھی دیکھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے کہ تحقیقت مجموعی وہ کس قدر کی حامل ہے اور دنیا کے سامنے کن قابل قدر چیزوں کو پیش کرتی ہے - اِس امر پر تو موجودہ زمانہ میں نہ صرف مشرق کے صاحبان فکر کا اتفاق ہے بلکہ مغرب کے مفکرین بھی اِس امر کے قائل ہیں کہ اُن کی تہذیب پر مادیت کا رنگ غالب آگیا ہے اور آسائش جسمانی اور قوت کے حصول کی کوشش میں گزشتہ سو برس میں انہوں نے اِس قدر جد و جہد کی ہے کہ دوسری اہم اور اعلیٰ تر قدریں دور و گذاشت ہو گئی ہیں اور اگر اِس میلان کا انسداد نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ انسانی زندگی بالکل مشینی ہوکر رہ جائے گی - میں اِس خیال کی تائید میں ٹیگور کی چند سطریں پیش کرتا ہوں :—

"مغربی مغرب کا جو رخ مغرب اور مشرق کے باہمی تعلقات میں سب سے زیادہ نمایاں ہوا ہے وہ نہ صرف ہمارے لیے شک آمیز ہے بلکہ خود مغرب کی بہبود ہے - انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات اور کچھ نہیں ہوسکتی تھی - کیونکہ دراصل مختلف قوموں کے باہمی تعلقات اور میل ملاپ کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہونا چاہئے کہ کسی بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہو جو ہمیشہ کے لیے یادگار رہے جیسا کہ زمانہ قدیم میں ہندستان اور چین کے باہمی ارتباط کا نتیجہ ہوا تھا

ہم اہل ایشیا کے لیے سب سے زیادہ بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے دراعظم

میں مغرب کے ورود کے ساتھ ساتھ نہ صرف سائنس آئی ہے جو حق کا اظہار ہے اور جس کا ہم خیرمقدم کرتے ہیں بلکہ خود غرضی اور نفس پرستی کے مقاصد کے لیے سائنس کا ناجائز استعمال بھی جو اِس کو ایک بداہ گُن فوب بنا دیتا ہے ۔ جن ملکوں میں اِس کا زور ہے وہاں ایک ایسی غلط ذہنیت پیدا ہو رہی ہے جو اخلاقی اعیان کو مسترد کرتی ہے اور انہیں ایسے لوگوں کے لیے غیر مناسب سمجھتی ہے جن کو حکومت کرنے کی تمنا ہے یا جن کو محض نزاع للبقاء کے لیے تیاری کا جنون ہے ۔ وہ یہہ نہیں سمجھتے کہ زندگی کا یہ فلسفہ جو سبزوں کی دنیا کے لیے موزوں ہے انسانوں کی زندگی میں سوائے تباہی و بربادی کے اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا ۔ وہ اِن لوگوں سے سخت ناراض ہو جاتے ہیں جو اِس خیال کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ انہیں یہہ خوف ہے کہ مبادا اِس مخالفت کی وجہ سے اِن کی حیوانیت میں کمی آجائے جس کو وہ دائمی طور پر زندہ رکھنا چاہتے ۔ ۲۲

اِس تنقید میں جو کاوی وصاحب سے مغربی تہذیب کے ایک مجرد رخ کو ظاہر کرتی ہے اِس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہہ مغربی تہذیب کا صرف ایک رخ ہے اور ہم اہل مشرق کو اِس سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے ۔ لیکن اِس کو مغربی تہذیب کی مکمل تصویر سمجھہ لینا ایسی ہی غلطی ہے جیسی انگریز اور امریکن سیاح کرتے ہیں ۔ جب وہ ہندستان یا چین کے لوگوں کی زندگی کا کوئی تاریک یا قابل اعتراض پہلو دیکھہ کر تمام تہذیب و تمدن کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتے ہیں ۔ جہاں ہمارے صاحبان فکر پر یہہ فرض ہے کہ وہ ہم کو اِن خطرات سے آگاہ کریں جو مغربی تہذیب کے تعلق کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں وہاں اِن کو یہہ بھی لازم ہے کہ وہ اِس کی عمدہ اور سبق آموز باتوں کو بھی سمجھائیں تا کہ مستقبل کے تمدن اور معاشرت کی تعمیر میں ہم

اِن سے فائدہ اُٹھا سکیں ۔ موجودہ زمانے کی سائینٹیفک ایجادوں اور مکان و زمان کی تسخیر نے دنیا کو غیر معمولی سرعت کے ساتھ ایک نیا دنیا ہے ۔ ملک اور قومیں جو پچاس سال پہلے تک باہمی فاصلوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ راستوں پر ، اور ایک حد تک ایک دوسرے کے مسائل اور کامیابیوں اور کارناموں سے ناواقف ، اپنی اپنی اجتماعی زندگی کی تکمیل کر رہی تھیں اب تار برقی ، لاسلکی ، اخباروں ، تصویروں اور فلموں ، ہوائی جہازوں وغیرہ کی وجہ سے ایک انوکھے طریقہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی ہیں اب کوئی قوم یہ نہیں کرسکتی کہ بین الاقوامی تحریکوں کی طرف سے منہ موڑ کر بالکل تنہائی اور علیحدگی میں اپنی سیاسی یا عملی زندگی کی تسو ونما کرے علم ، خیال ، سائنس سب حدوں کے پار لگ گئے ہیں اور جو علمی تحقیق آج دنیا کے ایک گوشہ میں ہوتی ہے اِس کی خبر کل اخباروں کے ذریعہ دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ جاتی ہے ۔ اِس لئے نہ یہ ہمارے لئے ممکن ہے نہ مفید کہ ہم از سر نو یا مغربی تہذیب کے عطیّوں کو مسترد کر دیں اور اپنی اِس پرانی تہذیب کو بھول جائیں جس نے ماضی کے مختلف زمانوں میں اِن تمام تہذیبوں سے عناصر حاصل کئے اور جذب کئے جو آریوں کے زمانے سے لے کر آج تک ہندستان میں آتی رہیں ۔

(۵)

اب ہم مختصراً یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اپنی تہذیبی شکل اور اظہار میں مغربی تہذیب کی عمدہ اور مفید خیالات کی پرچھائیں ہے اِس ضمن میں عالباً سب سے پہلے مغرب کی سائنٹفک ترقی کا ذکر کرنا چاہئے ۔ دور حاضرہ میں سائنس کی ترقی کا سہرا مغرب کے سر رکھنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم دوسری قوموں کی تاریخی کوششوں کا اعتراف نہ کریں یا یہ بھول جائیں کہ سائنس کی ترقی اِن بے شمار شخصوں کی کوششوں کا ثمر ہے

جنھوں نے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں اکثر گم نامی اور مفلسی کی حالت میں محض للہ حق کے جذبہ سے متاثر ہو کر عملی تحقیق و تفتیش میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں ۔

ایسی احسان ناشناسی روح سائنس پر ایک صریح ظلم ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ گذشتہ دو سو برس میں سائنس کی جو باقاعدہ اور منتظم ترقی ہوئی ہے اس کی سرکردگی اور اس میں سب سے زیادہ جد و جہد یورپ ہی نے کی اور اب بھی یورپ اور امریکہ ہی اس میں پیش پیش ہیں ۔ اگر سائنس کو محض انفرادی قوت کے بڑھانے کا ایک ذریعہ سمجھا جائے تو اس کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں میں شمار کرنا غلطی ہوگی ۔ لیکن سائنس در اصل انسانی طبیعت کے اس بےچین جذبہ کی پیداوار ہے جو اپنے ماحول کی تمام قوتوں کو تسخیر کرنا چاہتا ہے ، جو خدا کے اس مقصد میں معین اور آلۂ کار ہے کہ اِنسان تمام عالم فطرت پر حاوی ہوکر اس کو اپنے اعلیٰ ترین روحانی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے ۔ اگر مشیت الٰہی کا مقتضا یہ ہوتا کہ جہاں تک ہوسکے اِنسان اپنے ماحول سے بے تعلق اور الگ تھلگ رہے تو اس کی روح کو جسم کے ساتھ مربوط اور اسکی زندگی کو قوانین فطرت اور عالم فطرت کے ساتھ مشروط نہ کرتا ۔ سائنس کی ترقی بجائے خود انسان کی روحانی ترقی ہے اور معرفت الٰہی کو زیادہ کرتی ہے ۔ یہہ ایک علیحدہ بات ہے کہ اس کے غلط اِستعمال کی وجہ سے اس نے اِنسان کو مصیبتوں اور جرائم میں پھنسا دیا ہے ۔ مغرب کے بہترین دماغ خود اس بات کے قائل ہیں کہ گذشتہ دو سو سال میں سائنس کی ترقی اس قدر حیرت ناک سرعت کے ساتھ ہوئی ہے کہ اِنسان اپنے روحانی ارتقاء ، اپنے سماجی نظام اور اپنے احساس تعاون کو اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر سکا ۔ اس کی وجہ سے ناصبر اور عاقبت ناشناس اِنسان کے ہاتھ میں بعض

بہت زبردست قوتیں آگئی ہیں جن کے جائز اِستعمال کے لیے مناسب ذہنیت اس میں پیدا نہیں ہوئی ۔ ضبط نفس، رواداری، باہمی اخوت اور انحصار کا احساس، اخلاقی اصولوں کی پختگی، یہہ سب چیزیں جب تک بہت زیادہ عام ہوکر قوموں کی سیرت کا جزو نہ بنیں اُس وقت تک ہم کو یہہ اِطمینان نہیں ہو سکتا کہ قومیں بیوقوف بچوں کی طرح اس ہتیار سے خود اپنے ہاتھہ نہ کاٹ لیں گی ۔ لیکن اس صورت حال کو تعلیم اور معلّمین کے لیے ایک بیدار کن چیلنج سمجھنا چاہیے ۔ ان کو چاہیے کہ مدرسوں اور اعلیٰ درسی تعلیم گاہوں میں اس قسم کی ذہنیت پیدا کریں کہ آئندہ نسلیں سائنس کی قوتوں کا صحیح اِستعمال کریں ۔ اِس سے یہہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہیے کہ چونکہ سائنس کی ترقی سے جنگ بہت زیادہ مہلک اور نقصان دہ ہوگئی ہے اس لیے ہمیں سائنس سے دستبردار ہو جانا چاہیے ۔ قابل اعتراض وہ ذہنیت ہے جو چیزوں کی ماہیت کے علم کو نابود بنانے میں صرف کرتی ہے وہ ذہنیت نہیں جو ماہیت دریافت کرتی ہے ۔ علاوہ بریں بقول پیغمبر اِسلام علم کے علم و حکمت (جس میں سائنس اور فلسفہ وغیرہ سب شامل ہیں) ایک ایمان والے کی کھوئی ہوئی پونجی ہیں ۔ جہاں کہیں بھی وہ ملیں ان کو حاصل کرنا چاہیے؟ ان چیزوں میں مشرق و مغرب کی تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ سائنس (اِنسانی حدود کے اندر ایسے یقینی اور منتظم علم کا نام ہے جس کا اطلاق ہر جگہ اور ہر موقع پر ہو سکتا ہے ۔ وہ ابدی حقائق کی حامل ہے اور ہم کو اس سے فائدہ اُٹھانے کا اتنا ہی حق اور ہم پر اس کی خدمت کرنے کا اتنا ہی فرض ہے جس قدر اہل مغرب پر ۔ زمانہ ماضی میں بعض علوم میں ہندوں نے خواہ کتنی ہی ترقی اور جد و جہد کی ہو اور اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں؟ جب باقی تمام دنیا میں علمی تاریکی چھائی ہوئی تھی؟

مسلمانوں نے سائنس کی خواہ کچھ بھی خدمت اور علمبرداری کی ہو؟ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں ہمارے ملک میں سائنس کی طرف سے بہت غفلت کی گئی ہے ۔ اس کا ایک دلچسپ ثبوت یہ بھی ہے کہ اگر ہمارے ملک کا کوئی ماہر سائنس کوئی علمی تحقیق کرکے اہل مغرب سے خراج تحسین وصول کرتا ہے جیسے بوس یا رامن تو ہم اور ہمارے اخبار فخر کے مارے پھولے نہیں سماتے ۔ گویا خود ہمیں تعجب ہے کہ ہمارے یہاں ایسے آدمی کیونکر پیدا ہو گئے ! اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ دوسرے مغربی ملکوں میں جہاں کی آبادی نسبتاً بہت کم ہے لیکن ہمارے ہی جیسے انسان بستے ہیں سیکڑوں آدمی ایسے ہیں جو اس قسم کی علمی تحقیقات کرتے ہیں اور اعلیٰ ترین اسناد اور اعزاز حاصل کرتے ہیں ۔ قوم کی علمی زندگی میں سائنس کے عنصر کی کمی کی وجہ سے ہماری ذہنیت میں بھی ایک مخصوص کمزوری اور نقص پیدا ہوگیا ہے ۔ تنقید ؟ صحت عمل؟ در اصل معاملات کے ہر پہلو کو سوچنا غور کرنا اور تولنا ؟ جذبات اور ذاتی میلانات کو عام اور دماغ کے تابع کرنا ؟ ۔ یہ تمام علمی صفات جو ایک مکمل سائنس کے لئے ضروری ہیں ہمارے ہاں بحیثیت مجموعی اور معاملۃً کم ہوتی جا رہی ہیں ۔ نئی تعلیم جو ہندستان میں قومی ضروریات کے لحاظ سے متشکل ہوگی وہ عام تعلیم میں سائنس کو؟ ایک اہم جگہ دے گی اور اعلیٰ تعلیم میں اس ذہنیت کی صحیح قدر کو تسلیم کرے گی جو سائنس کے صحیح اور پُر احترام مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے ۔

دوسری قابل قدر خصوصیت مغربی تہذیب کی یہ ہے کہ اس نے سائنس کو انسانی مفاد کے حصول کے لئے استعمال کیا ۔ اور مختلف اقتصادی ؟ صنعتی ، طبعی اور آمد و رفت وغیرہ کے مسائل کو حل کرنے اور آسان کرنے کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا ۔ علم اور حقیقی کی تلاش

محض بلاس کی خاطر بھی ایک نہایت ضروری جزو ہے اور اکثر ، خصوصاً گذشتہ ۔ زمانوں میں علمی ترقی انہیں لوگوں کی بدولت ہوئی ہے ۔ جنہوں نے بغیر کسی فائدہ یا دولت کے خیال کے اپنی زندگی بلاس حق کے لیے وقف کردی تھی ۔ بقول پروفیسر میکنزی کے —

"بالخصوص ہم دنیا کی تمام چیزوں کے متعلق صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہیں نہ صرف اس لیے کہ علم خود ہے ؟ نہ صرف اس لیے کہ وہ دوسری چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے بلکہ اس لیے کہ ہماری فطرت میں یہہ بات شامل ہے کہ ہم بلاس حق کریں اور بغیر جاننے کے ؟ بغیر علم کے خود باقی ممکن نہیں ۔ اور شاید اس وجہ سے بھی ؟ کہ ہم کو یہہ سمجھنا عقیدہ ہے کہ یہہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں ؟ باوجود اپنی بہت سی مشکلات اور خرابیوں کے اس قابل ہے کہ ہم اس کو سمجھیں اور جانیں ۔ "

لیکن سائنس کی ترقی ؟ محض بطور ایک کمائی علم کے ؟ کافی نہیں ۔ اس کا تعلق دنیائے آب و گل سے ہے اور اس کی طرف اس کو اپنی توجہہ پھیرنی چاہیے ؟ اس کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اس کو اپنی قوتیں صرف کرنی چاہئیں ۔ اہل مغرب نے جہاں سائنس کا استعمال بارہا اور جا بجا محض تجربتی یا خود غرضانہ طریقے سے کیا ہے وہاں یہہ بھی تسلیم کرنا لازمی ہے کہ انہوں نے اس کو مفاد عامّہ کے لیے ؟ انسانی زندگی کی تکلیفوں کو کم کرنے کے لیے ؟ اس کی آسائشوں کو بڑھانے کے لیے بھی استعمال کیا ہے ۔ اقتصادی پیداوار کے طریقوں اور اور صنعت و حرفت کے نظام میں انقلاب پیدا کر کے انہوں نے اس امکان کو ظاہر کر دیا ہے کہ اگر سماجی زندگی کی صحیح تعلیم کی جائے تو فرصت اور اس کے تہذیبی مشاغل نہ صرف دولتمندوں کی زندگی کا جزو بن سکتے ہیں بلکہ دنیا کے ہر غریب مزدور کے حصہ میں

آ سکتے ھیں - وسائل آمد و رفت اور تبادلۂ خیالات کی تکمیل کر کے انہوں نے اس خیال اور جذبہ کی پرورش کے لیے ماحول مہیا کر دیا ھے کہ تمام نسل انسانی بمنزلہ ایک خاندان کے ھے اور اس کی اجتماعی ترقی کے لیے سب کا اشتراک عمل ضروری ھے - بہت سی بیماریوں اور متعدی امراض کے لیے جیتی علاج دریافت کر کے انہوں نے لاکھوں انسانوں کو ایک ایسی زندگی سے نجات دلائی ھے جو موت سے بدتر تھی - شہروں قصبوں اور گاؤں کی صفائی اور حفظان صحت کا بہتر انتظام ؛ طباعت کی آسانیوں اور کفایت کی بدولت علم اور علمی ذخیروں کو معمولی استطاعت کے لوگوں تک پہنچانا ؛ قدرتی ذرائع کو انسان کا محکوم بنانا اور قدرتی تباھیوں سے انسان کی حفاظت ؛ یہہ سب باتیں سائنس کے صحیح اور جائز استعمال سے حاصل ھوئی ھیں - اور ھم لوگوں کو جن کے سامنے ایک وسیع اور عظیم‌الشان ملک کی تنظیم کا مسئلہ درپیش ھے اپنے اکثر مسائل کے حل کے لیے سائنس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا ھندستان کے افلاس کا ایک بہت بڑا سبب یہہ ھے کہ ھم اپنی قدرتی دولت اور ذرائع سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھاتے ؛ ھمارے جنگلوں اور کانوں اور پہاڑوں اور بہتے ھوئے دریاؤں اور زیر زمین میں جو خزانے دولت کے پوشیدہ ھیں وہ سر بمہر رکھے ھوئے ھیں ؛ ھم ان کو استعمال نہیں کرتے ؛ اس کے لیے جس قسم کی صنعت و حرفت اور انجینیری وغیرہ کی تعلیم کی ضرورت ھے وہ ھمارے ھاں بہت کم ھے - اس طرح ھمارے دیہات کی ناگفتہ بہ حالت ؛ ھمارے صحت کی خرابیاں اور روز بروز جسمانی قوت اور مدت حیات کا کم ھونا یہہ سب مسائل اس بات کے محتاج ھیں کہ ھم بہت وسیع پیمانے پر سائنس کو قومی ضروریات اور قومی زندگی کی بہتری کے لیے استعمال کریں - ماحول کو بہتر بنانا اور مادی اور جسمانی آسائشیں فراھم کرنا بجائے خود کافی

نہیں - لیکن جو لوگ موجودہ فلسفہ اور خیال کی روس سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جسم اور دماغ ؟ مادہ اور روح بالکل جداگانہ یا متضاد چیزیں نہیں ہیں اور زندگی میں اعلی قدور کو راہ دینے کے لیے اس کے مادی ماحول کا بہتر بنانا بھی ایک ضروری امر ہے - اگر انسان کی تمام توجہ اور وقت اپنے مریض جسم کی نگہداشت میں صرف ہو یا گرد و پیش کی کیفیت اور ناصاف فضا کسی شہر یا قصبہ کی تمام آبادی کی صحت خراب کردے یا صنعت و حرفت کے نئے طریقوں سے ناواقفیت آبادی کے ایک بڑے حصے کو ایسے تھکانے والے کاموں میں مصروف رکھے جو زیادہ عمدگی اور کفایت سے مشین کے ذریعہ ہو سکتے ہیں تو ہم کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ وہ قوم علمی ؟ اور اخلاقی اور تمدنی جد و جہد میں اپنی قوتوں کو استعمال کر سکے گی ؟

تیسری چیز جو ہم کو مغربی تہذیب سے اخذ کرنی ہے وہ ان کا نظم و نسق ہے - یہہ کہنا کہ خود ہمارے عہد ماضی میں ؟ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے علحدہ علحدہ بھی ؟ اور مشترک طور بھی ؟ ملکی نظم و نسق میں بہت بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں میرے خیال کی تردید نہیں ہے - - اس میں شک نہیں کہ ہم کو اپنے ماضی کے کارناموں سے عبرت اور ہمت دونوں چیزیں حاصل کرنی چاہیئں اور ماضی کی مثالوں سے قوت اور سبق لینا چاہیے - لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ ہم کو بہت زیادہ فائدہ ان قوموں کے ملکی اور معاشرتی انتظام کے مطالعہ سے ہوگا جو آج کل کے حالات میں اور کم و بیش ہمارے جیسے مسائل میں گھرے ہوئے بہت بڑے پیمانے پر اپنی اجتماعی تنظیم کر رہی ہیں - میرا خیال ہے جیسا کہ میں آگے چل کر زیادہ وضاحت کے ساتھہ ذکر کروں گا ؟ کہ ہمیں اپنے لیے نصب العین اور اخلاقی اصول تلاش کرنے کے لیے کسی اور ملک یا تہذیب کی طرف رجوع کرنے کی

ضرورت نہیں - کچھہ تو اس وجہ سے کہ ان کا تعلق قومی خصائص سے اس قدر گہرا اور قریبی ہے کہ ان کو کہیں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا - وہ قومی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ساتھہ ساتھہ نشو و نما پاتے ہیں - اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ ہندستان میں جن تہذیبوں کا امتزاج ہوا ہے ان کے بنیادی اصولوں اور اعیان میں ایسے اٹل اخلاقی اصول اور نصب العین موجود ہیں جو ہمارے آئندہ زندگی کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے ہیں - مگر اُصولوں کو تحسین اصولوں کے تسلیم کرنا اور اُن کا احترام کرنا اور چیز ہے اور ان کو افراد کی روز مرہ زندگی میں اور قوم کی مجموعی زندگی میں عملی شکل دینا اور بات ہے ہماری ایک بڑی کمزوری یہہ ہے کہ ہم ایسے اکثر اصولوں اور خیالات کو متفقہ کوشش کے ذریعہ عملی جامہ نہیں پہنا سکتے - اور اس کے لیے جس نظام کی ضرورت ہے وہ مہیا نہیں کر سکتے - ہر باقاعدہ اور کامیاب "نظام" کے لیے ؟ جیسا کہ اس کے اصطلاحی معنوں سے ظاہر ہے ؟ نظم و ترتیب کی ضرورت ہے - افراد میں "ضبط نفس" کی ضرورت ہے - اور یہہ ضبط نفس جس کو انگریزی میں ڈسپلن کے لفظ سے ادا کرتے ہیں ہماری انفرادی اور قومی زندگی میں بہت کچھہ مفقود ہو گیا ہے - ذاتی خواہشات اور مفاد کو مفاد عامّہ کا تابع کرنا ؟ سماجی زندگی کے لیے باہمی رعایت اور رواداری ؟ اشتراک عمل کی صلاحیت ؟ تحاون اور اور پالیسی در استحکام کے ساتھہ عمل کرنا اور وقتی ناکامی سے شکست نہ کھانا ؟ یہہ وہ صفات ہیں جو قوموں کو طاقتور اور منظم بناتی ہیں - اور ہمیں تعلیم کے ذریعہ ان صفات کی نشوونما کرنی ہے - جب تک یہہ صفات قومی سطح کا جزو نہ بنیں گی ہم کسی بڑے نصب العین یا ایسے اصولوں اور نصب العین کو حاصل نہیں کر سکتے - اسلام نے دنیا کو سب سے پہلے اخوت اور مساوات کا سبق نہایت صاف اور واضح الفاظ

میں بڑھایا اور اسے ابتدائی دور میں ان اصولوں کو جمہوریت کے سیاسی جامہ میں ملبوس کر کے دکھا دیا ۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے اس اصول کو سیاسی زندگی کا رہبر نہیں بنایا اور خود مختار خاندانی بادشاہیاں قائم کر دیں ۔ برخلاف اس کے یورپ کے پاس اخوت اور مساوات کا اصول اپنی موجودہ سیاسی شکل میں انقلاب فرانس اور اس کے دہنی پیش رو اور لیڈروں کے پاس سے آیا تھا اور اس کی بنیاد کسی مستحکم مذہبی یا عقیدت یا گہرے اندرونی احساس پر قائم نہ تھی ۔ تاہم یورپ اور امریکہ نے رفتہ رفتہ اس کو موجودہ سیاست کی سب سے زیادہ زوردار اور منتظم قوت بنا دیا اور اس کے لیے مناسب ادارے اور قوانین بنا دیے جنہوں نے اس کو ایک پائدار شکل دے دی ۔ اگرچہ یورپ میں کہیں کہیں اس جمہوریت کو ناکامی ہوئی ہے اور بعض لوگ اس کے عقائد سے منحرف ہیں تاہم اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ موجودہ زمانہ کی نہایت زبردست سیاسی قوت ہے ۔

اسی طرح ہندوؤں کے مذہب میں اور مسلمانوں کے مذہب میں نہایت وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ اقتصادی زندگی کی ہدایت کے لیے ایسے اصول وضع کیے گئے ہیں جن سے امیروں اور غریبوں کے درمیان ایسے تعلقات قائم نہ ہوں جو انسانیت کی شان کے خلاف ہیں اور سماجی نظام کو درہم برہم کر دیں دولت کو ایک امانت بنایا گیا ہے جس کو بہت ذمہ داری اور سمجھ کے ساتھ صرف کرنا چاہیے ۔ اس میں سے غریبوں کا حصہ نکالنا چاہیے اور ہر طرح کے بے بس اور بیکس لوگوں کی امداد کرنی چاہیے ۔ امیروں کو بھی کبھی کبھی دولت اور دنیاوی عیش اور آسائشوں کے معاملہ میں ضبط نفس اور ریاضت سے کام لینا چاہیے ۔ ان امور کی تاکید دونوں تہذیبوں کے اصولوں کا جزو ہے ۔ یہاں تک کہ ہندو مذہب

میں اس بے دان دن کی وہ مبالغہ آمیز شکل اختیار کر لی ہے جو مستحق اور غیر مستحق میں بھی تمیز نہیں کرتی اور سماجی زندگی کے مصلحتوں کو ناراض کرتی ہے - اسی طرح اسلام نے زکوٰۃ اور خمس اور خیرات کے نہ صرف اصول بیان کیے بلکہ ان کی عملی شکلوں کو بھی واضح اور معین کردیا تا کہ زود فراموش اور کمزور انسانوں کو آسانی کے ساتھ ان حقوق کو بھولنے کا موقع نہ ملے - لیکن اجتماعی زندگی کے انتشار نے اسلامی جماعتوں میں اس مقید اور قابل قدر نظم کو قائم نہیں رہنے دیا اور تمام ہندستان میں بالعموم کوئی ایسے ادارے ؟ وسیع اور قومی پیمانے پر قائم نہیں ہیں؟ جو مختلف قسم کے محتاجوں ؟ اپاہجوں ؟ بوڑھوں اور بے بسوں کی نگہداشت کریں ؟ افراد اپنی اپنی جگہ پر غیر منتظم طریقے سے کوشش کرتے ہیں لیکن وہ اس عظیم‌الشان مسئلہ کا خاطر خواہ حل نہیں کر سکتے - اس کے لیے جس مجتمعہ قومی پالیسی اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے وہ نابید ہے - برخلاف اس کے مغربی ممالک میں؟ زیادہ تر اقتصادی اور عملی مشکلات سے مجبور اور ایک عام انسانی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہوکر؟ اس معاملہ کو بہت زیادہ اہتمام اور کامیابی کے ساتھ اٹھایا گیا ہے حکومت (یعنی قوم بحیثیت مجموعی) بے روزگاروں کو روزگار سے لگانا اپنی ذمہ لیتی ہے - بیواؤں اور بوڑھوں کو پنشن دیتی ہے ؟ بچوں کی تعلیم کا نہ صرف انتظام کرتی ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ان کے اور اخراجات تو برداشت کرتی ہے اور مختلف طریقوں سے اقتصادی زندگی کی بے انصافیوں اور مظالم کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے - یہ صحیح ہے کہ ہندستان میں اس قسم کی؟ دوررس اور عالم گیر تحریکوں اور سود مند تعاون کی کمی کی ذمہ‌داری بڑی حد تک گورنمنٹ پر عاید ہوتی ہے جو قومی گورنمنٹ نہیں ہے - لیکن ملک اور قوم بھی بہ حیثیت مجموعی اس الزام اور

ذمہ‌داری سے بری نہیں ہو سکتی کہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوئی بہت کامیاب اور متحدہ کوشش نہیں کی گئی - اور یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ علاوہ ان جزوی انتظامات کے؟ جو اقتصادی نا ہمواریوں کو درست کرنے کے لیے مغرب میں کیے گئے ہیں؟ جو منظم تحریکیں موجودہ نظام سرمایہ‌داری کے مد مقابل ہوکر آج کل دنیا میں اپنا اثر پیدا کر رہی ہیں مثلاً سوشلزم یا روس کا اقتصادی نظام وہ بھی زیادہ تر مغرب کے خیالات اور قوت تنظیم کا نتیجہ ہیں - اور جب تک ہماری تعلیم اجتہاد اور جذب خیال کی قوت اور اس کے ساتھ ساتھ "قوت" پیدا نہیں کرے گی اس وقت تک ہم اپنے کو یہ حیثیت ایک قوم کے دنیا کے نئے حالات اور ماحول کے ساتھ ہم‌آہنگ نہیں بنا سکیں گے -

(۶)

امید ہے کہ مندرجہ بالا بیان سے یہ خیال پیدا نہیں ہوگا کہ میں مغرب کی اندھی تقلید کا قائل یا مغرب کی ہر چیز کا معترف ہوں میں اب تک یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ قومی سیرت کی تشکیل جو ہمیں درپیش ہے دنیا کے موجودہ حالات اور واقعات سے جاہل رہ کر نہیں ہوسکتی بلکہ ہم کو عمداً یہ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کن لحاظ سے ہمیں اپنے کیرکٹر کو خاص طور پر مضبوط کرنا چاہیے - اس غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی ضروریات کے خیال سے ہم کو بعض ان خصائص پر توجہ کرنی چاہیے جو آج کل مغرب کی ترقی یافتہ اقوام میں زیادہ نمایاں ہیں یعنی سائنس کا حصول اور اس کے ذریعہ فطرت کی تسخیر؟ انسانی مسائل کے حل کے لیے سائنس کا استعمال؟ عملیت اور نظم و نسق جو بڑے پیمانے پر قوم کی منتشر قوتوں کو ایک شیرازہ میں جمع دے اور اجتماعی تحریکوں کو اثر بنا دے - لیکن ان کے ساتھ ساتھ ہمیں بعض ان قدور کو دوبارہ زندہ کرنے کی

ضرورت ہے جو زمانہ ماضی میں ہماری خصوصیات میں شامل رہی ہیں لیکن اب کچھ مغرب کے خراب اثرات کے اور کچھ عام انتشار کی وجہ سے قومی زندگی سے مفقود ہو گئی ہیں یا ہوتی جاتی ہیں -

ان ادوار میں ایک اہم حیثیت علم کو حاصل ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی تہذیب میں ہمیشہ ایک مقدس اور روحانی ترکہ سمجھا گیا ہے - اور اس کو ہمیشہ مذہب اور مذہب کے معلمین سے ایک خاص قریبی تعلق رہا ہے - یہاں تک کہ بعض مذہب مثلاً ہندو مذہب میں ہر علم کو صرف مذہبی پیشواؤں یعنی برہمنوں کی جماعت تک محدود کردیا گیا تھا بر خلاف اس کے اسلام نے ہر علم کو خواہ وہ دینی ہو یا دُنیوی انتہائی اہمیت اور عزت دی اور بعدد انتظامات اس کا حاصل کرنا ہر شخص پر فرض کر دیا لیکن اُس زمانہ میں لوگ علم کو علم کی خاطر حاصل کرتے تھے یعنی اس کی اتنی قدر کرتے تھے کہ اس کے حصول میں عمریں صرف کردیتے تھے - ملکوں ملکوں ماہرین علم کو تلاش کرتے پھرتے تھے - اور ان کو صرف ضروری یا مفید باتیں بتانے والا ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ در حقیقت ان کو اپنا گُرو یا مرشد مانتے تھے اور ان کا غیر معمولی حد تک احترام کرتے تھے - یورپ میں ازمنہ متوسط کے بعد؟ مختلف سیاسی اور معاشرتی اثرات کی وجہ سے تعلیم کا تعلق رفتہ رفتہ مذہب سے ٹوٹ گیا - دُنیوی علم اور دینی علم میں بہت وضاحت کے ساتھ تمیز کی گئی اور علم کا افادی یا اقتصادی پہلو غالب آنے لگا - جب مغربی تعلیم ہندستان میں رائج ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان قرار پائی تو یہی خیالات زیادہ نمایاں شکل میں یہاں بھی پھیلنے لگے -

اول تو عربی؟ فارسی؟ سنسکرت جو تہذیب و تمدن اور مذہب و علوم کی زبانیں تھیں اور لوگوں کے ذہن میں ان کا مذہبی احترام تھا وہ رفتہ رفتہ تعلیم کے نظام سے کم ہوتی شروع ہوئیں اور ایک غیر ملکی

زبان جس کے ساتھ کوئی ایسے عقیدہ یا احترام کے تعلقات قائم نہیں تھے ان کی جگہ پر مسلط ہو گئی ۔ دوسرے اس نئی تعلیم کے حاصل کرنے کا مقصد؟ بلکہ اس کا اعتراف شدہ نصب العین یہی تھا کہ نئی حکومت کے لئے سرکاری ملازم اور عہدہ دار تیار کرے جو مختلف طرح کے دفتری کاموں کو انجام دے سکیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم اور تعلیم دونوں مختص افادی اور دنیوی ہوکر رہ گئے اور عام طور پر لوگوں کے ذہن اور دل سے یہ بات محو ہو گئی کہ تعلیم کے اصل مقاصد اور اعیان اس سے بہت بلند ہیں اور علم کا حاصل کرنا بجائے خود ایک قدر مستقل ہے جس کو فراموش کرنا نہایت مہلک غلطی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جو تعلیم ہمارے مدارس میں دی جا رہی ہے اس کا کوئی دیرپا اثر قومی اخلاقی اور قومی سیرت پر نہیں پڑتا ۔ اور ملک کا علمی معیار کم ہوتا چلا جاتا ہے یہ صورت حال اصلی ہندستانی تہذیب کے منافی ہے اور اس کا تدارک کرنا ماہرین تعلیم کا فرض ہے ۔

دوسرے ہندستان کے تعلیمی اور سماجی نظام کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ حصول علم میں افلاس کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا ۔ طلب صادق اور استقلال اور قابلیت کا ہونا کافی ہے ۔ جو طالب علم ان صفات کو لے کر علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلتا تھا اس کے لیے ہر طرف دروازے کھلے ہوتے تھے ۔ بڑے بڑے اساتذہ اپنی اپنی جگہ ؟ بالعموم عبادت گاہوں میں درس دیتے تھے اور وہ چشمہ سب علم کے پیاسوں کے لیے کھلا ہوتا تھا ۔ فیس؟ داخلہ؟ عمر کی قید؟ اس قسم کی رکاوٹیں نہ ہوتی تھیں ۔ لیکن جوں جوں تعلیم زیادہ منتظم ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے راستے میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں ۔ چنانچہ اس وقت ہندستان میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ملتی ہے جن کو نہ صرف آگے تعلیم پانے کی خواہش ہے بلکہ دماغی قابلیت کے لحاظ سے وہ

اس کے اہل بھی ہیں لیکن مفلسی کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کو پورا نہیں کر سکتے بلکہ بعض مرتبہ تعلیم شروع ہی نہیں کر سکتے ۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی وجہ سے بہت سی دقتیں اور مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے بعض تکلیف سے بچنا ناممکن ہے ۔ لیکن مدرسوں کی تعلیم کو محض ایک اقتصادی خرید و فروخت بنا دینا تعلیم کے روحانی عنصر کو نظر انداز کرنا ہے ۔ اگر اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ معمولی مدارس کے مدرسین کی تنخواہیں کس قدر قلیل ہیں اور ان کی سماجی حیثیت کس قدر کم سمجھی جاتی ہے تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ نہ صرف موجودہ نظام تعلیم بہت سے ذہین طلبا کو اپنے حلقۂ اثر سے باہر رکھتا ہے بلکہ جن طلبا کو داخل بھی کرتا ہے ان کے لیے بھی بہت سستی قسم کی تعلیم فراہم کرتا ہے ۔ ہمارے ماہرین تعلیم کو ایسے ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے کہ وہ نظم و نسق کی پیچیدگیوں کے باوجود تعلیم کی قدر روحانی کو قائم رکھیں اور ذہین اور علمی لحاظ سے مستحق طلبا کو تعلیم کے کسی درجہ سے بھی محروم نہ کریں ۔

تیسری خصوصیت جس کا ذکر ضمناً اوپر آچکا ہے تعلیم اور مذہب کا قریبی تعلق ہے ۔ یہ مسئلہ ہمیشہ صاحبان فکر کے درمیان اختلاف کا باعث رہا ہے کہ تعلیم کا مذہب سے کیا رشتہ ہونا چاہیے ۔ اور بالعموم مذہبی اور ملکی حکام میں جو کشمکش اس بارے میں رہی ہے اس کا نتیجہ گذشتہ سو سال میں ملکی حکام کے حق میں ہوا ہے ۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں اس وقت تعلیم، عام تر یا زیادہ تر، مذہبی گروہ کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں چلی گئی ہے ۔ یہ امر ایسا نہیں جس پر افسوس کیا جائے کیوں کہ زمانہ ماضی میں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ مذہب کے پیشواؤں نے تعلیم کو اپنے قبضہ میں لاکر ذہنی

آزادی کو مقید کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ علم کی ترقی کے راستے میں حائل ہوئے ہیں - لہذا اصولاً یہی بہتر ہے کہ تعلیم مذہبی زمرہ کے غلبہ اور تصرف سے آزاد رہے - لیکن یہ بات اس معنی میں صحیح ہے جس معنی میں یہہ کہنا صحیح ہے کہ تعلیم کو سیاسی اثر سے آزاد رہنا چاہیے یعنی کسی خاص حکومت یا پارٹی کو یہہ حق حاصل نہیں کہ وہ تعلیمی وسائل اور ذرائع کو ان کے اصل مقصد سے ہٹاکر اپنے محدود مقاصد کے لیے استعمال کرے جیسا اکثر تاریخ میں ہوچکا ہے - اس کے یہہ معنی نہیں کہ تعلیم کو روح مذہب سے، مذہبی نقطہ نظر سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے - تعلیم اور مذہب میں اس طرح کا تفرقہ پیدا کرنا کسی قوم کے لیے مفید نہیں ہو سکتا اور خود دانایان مغرب جنہوں نے بہت کوشش سے تعلیم کو پادریوں کے اثر سے نکالا تھا اب یہہ محسوس کر رہے ہیں کہ تعلیم کا رشتہ مذہب سے منقطع کر دینا ایسا ہے جیسا کسی طوفانی سمندر میں کشتی کے رسوں کو کاٹ دینا یا اس کے قطب نما کو ضائع کر دینا - اس کا اثر یہی ہوگا کہ کشتی بالکل بے مہار ہو کر ہچکولے کھانے لگے گی - زندگی کو کسی مستقل فلسفہ اور نصب العین کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے لازم ہے کہ معلم مذہب کی روح کو سمجھے اور مطالعہ کرے اور وہ احترام اور ادبی وقار کے ساتھ وابستگی جو مذہب کا مخصوص عطیہ ہے اپنے طلبا میں پیدا کرے - پروفیسر مکنزی اپنی کتاب زندگی کے بنیادی مسائل" میں مذہب اور زندگی کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"در اصل یہہ ناممکن ہے کہ ہم دنیا میں انسانی زندگی کے بنیادی مقاصد کو سمجھے بغیر سماجی زندگی کے مسائل کو خوبی کے ساتھ حل کر سکیں - انسانی زندگی کے تمام مسائل ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی ہم اچھی طرح نہیں سمجھ

سکتے جب تک یہہ نہ سمجھیں کہ انسان کیا ہے؟ کیا ہونا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے - انسانی زندگی ایک بلاس ہے بہترین چیزوں کی؟ خواہ ہم اس کو اچھی طرح سمجھہ کر کریں یا بوری طرح نہ سمجھیں؟؟ - یہہ سوال کہ ہم کیا ہیں؟ کیا بننا چاہتے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں ایسے ہیں کہ ان کا تسلی بخش جواب صرف سائنس یا فلسفہ سے نہیں مل سکتا - اس کے لیے انسان کو اس وجدانی احساس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جو اس کو مذہب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے - کیونکہ کسی سمجھہ دار انسان کے لیے یہہ ممکن نہیں کہ وہ کائنات کے دو مکمل تصور بناے ایک علمی اور دوسرا مذہبی اور وہ ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور مختلف رہیں - پروفیسر اسرائیگر جو برلن یونیورسٹی میں تعلیم اور فلسفہ کے استاد ہیں اپنی معرکۃالارا تصنیف "تعمیر انسان عنوان سیاں" (مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب) میں لکھتے ہیں —

"تعمیر انسانی کا جو نقطہ تصور کائنات کا جزو ہے وہی معرفت الہی کا سرچشمہ بھی ہے - فلسفہ کے حقائق و معارف اصل مذہب تو نہیں لیکن مذہب کی داخلی بنیاد ضرور ہیں - نظام عالم کے مقصد و منشاء کا احساس؟ خواہ وہ ہمارا دائمی سرمایہ حیات ہو یا کبھی کبھی بجلی کی طرح چمک کر ساری کائنات کا بھید ہم پر کھولے؟ مذہبی وارداب کی جڑ ہے - اور چونکہ یہی احساس ماوراالطبعیات کا سرچشمہ بھی ہے اس لیے ماوراالطبعیات بھی مذہبی ہی پر مبنی ہے - یہہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے ذہن میں دو تصور کائنات ہوں ایک مذہبی اور ایک علمی - بلکہ جب کبھی علم آخری اور یقینی نتائج تک پہونچتا ہے تو مذہبی وجدان سے علمی فکر؟ اور علمی فکر سے مذہبی وجدان پیدا ہوتا ہے - وہی ایک چیز ہے جس میں اگر

ایک عنصر غالب ہے تو مذہب کہلاتی ہے اور "دوسرا غالب ہے تو مافوق الطبعیات"۔

"نظام عالم کے مقصد و منشا کا احساس" پیدا کرنا اور انسان اور اس کی زندگی کو اس عظیم انسان مقصد سے مربوط کرنا ہی مذہب کا کام ہے اور اگر تعلیم کا تعلق مذہب سے اس معنی میں توڑ جائے کہ طالب علموں میں یہہ احساس پیدا نہ ہو اور وہ اپنی انفرادی زندگی کو اس کے وسیع تر ماحول کائنات کے ساتھہ ربط نہ دے سکیں تو تعلیم کا کام محض یہہ رہ جاتا ہے کہ وہ بعض ہنر مثلاً لکھنا پڑھنا؟ اور بعض علوم مثلاً تاریخ و جغرافیہ طلبا کو پڑھا دے - ایسی تعلیم قومی سیرت پر کوئی عمدہ اور مستقل اثر نہیں ڈال سکتی کیونکہ وہ نوجوانوں کو ان قدور سے رو شناس نہیں کرتی جو زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کر کے اس کو بلندی کی طرف لے جاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انگریزی تعلیم سو برس سے زیادہ سے رائج ہے لیکن اس نے قومی سیرت کی تشکیل میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا - بلکہ یہہ کہنا چاہیے کہ اس نے لوگوں کے ذہن میں تعلیم کو محض اقتصادی مفاد اور نفس پروری کے مقاصد کے ساتھہ متعلق کر کے قومی سیرت پر بہت برا اثر ڈالا ہے - گذشتہ زمانے کی تعلیم اب سے کم منتظم تھی اور مقابلۃً تھوڑی تعداد لوگوں کی اس سے بہرہ یاب ہوتی تھی - لیکن لوگوں کے دل میں اس کی خاص وقعت تھی جو موجودہ تعلیم کی نہیں - اور یہہ وقعت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھہ ساتھہ موجودہ تعلیم مذہب؟ قومی تمدن؟ قومی ادب اور قومی فلسفہ زندگی کی مستحکم بنیادوں پر قائم نہ ہو اور اپنے لئے انہیں سر چشموں سے ہدایت اخذ کرے -

ایک اور قابلِ قدر عنصر ہندستانی تہذیب میں اس کا جذبۂ خدمت رہا ہے اور وہ مروت اور باہمی رواداری؟ جو اپنی سب سے زیادہ مضبوط اور عمدہ شکل میں خاندانی زندگی کے اندر ظاہر ہوتی تھی - ایک فقیر جو خود باوجود فاقہ‌کشی اور ضروریات زندگی سے محروم ہونے کے سر راہ بیٹھ کر مسافروں کو پانی پلانا اپنا فرض سمجھتا ہے؟ خاندان کا ایک کمائی کرنے والا فرد جو اپنی محدود کمائی کو صرف اپنے نفس تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس کو خاندان کے ان تمام افراد کے لیے صرف کرتا ہے جو رشتہ داری یا محض یا داری کی وجہ سے اس کے ساتھ متعلق ہیں؟ ایک عالم یا مُعلّم جو ریاضت اور نفس کُشی کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن اپنے علم کی روشنی سے طالب علموں کے دیے جلاتا رہتا ہے؟ یہہ سب اُس تہذیب قدیم کی قابل احترام یادگاریں ہیں جو اب روز بروز مٹتی جاتی ہیں - مثنوی پریم چند نے اپنے قابل قدر ناول "جرگان ہستی" میں جو سبرت سور داس کی دکھائی ہے یا اپنے دوسرے ناول "نوشۂ عافیت" میں پریم سنکر کی دکھائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیب کے پیرو نمونے کس قدر اعلیٰ اخلاقی معیار رکھتے تھے اور اُن میں خدمت نوع کا جذبہ کس قدر سچا اور مضبوط تھا کہ اس کو نہ اپنوں کی احسان نا شناسی دبا سکتی تھی؟ نہ بیگانوں کی مخالفت؟ نہ ناکامی اس کو شکست دے سکتی تھی؟ نہ حکومت کی تمام قوتیں! اور ہندستان کی گذشتہ سو برس کی تاریخ میں بھی جو لوگ خدمت کا ایسا ہی سچا اور مضبوط جذبہ لے کر پیدا ہوئے مثلاً حالی؟ سر سید وہ تہذیب قدیم کی گود میں پلے تھے اور اس کی روایات کے حامل تھے - موجودہ دور میں اس جذبہ کا پیکر مجسم مہاتما گاندھی کی ذات ہے

لیکن اس میں بھی یہہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ اُنہوں نے تعلیم انگریزی پائی ہے لیکن ان کی تربیت کی تشکیل جن اثرات میں ہوئی وہ تقریباً سب کے سب گذشتہ تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ خود اپنی ہدایت کا سرچشمہ قدیم مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت گیتا ؟ بائبل اور قرآن شریف کو بتاتے ہیں اور اپنے لیے گذشتہ تاریخی رواجات سے روشنی تلاش کرتے ہیں - قابل افسوس ہے یہہ امر کہ موجودہ تعلیم کی بدولت یہہ جذبۂ خدمت لوگوں میں آئے دن کم ہوتا چلا جاتا ہے—معاملہ کے امتحانات ؟ نوکریوں کے لیے جدّو جہد خاندانی مراسم اور مراعات میں کمی ؟ خدمت نفس کی فکر ؟ یہہ سب چیزیں اس اخلاقی کمزوری کے شواہد ہیں جس نے قوم میں سب سے زیادہ خرابیاں پیدا کی ہیں - جب زندگی کا مقصد مشخص تن پروری اور انفرادی آرام اور آسائش قرار پا جائے تو قوم میں نک جہتی ؟ سلوک ؟ رواداری کا پیدا ہونا ناممکن ہے کیوں کہ پھر کوئی ایسا اصول زندگی باقی نہیں رہتا جو مختلف جماعتوں اور مفاد کو ایک مرکز پر لاکر جمع کر دے - ہندستان میں آج کل چند جماعتیں ایسی ہیں جو خدمت کے نصب العین کو پیش نظر رکھہ کر کام کر رہی ہیں - لیکن ان کی تعداد اور ملک کی آبادی کو دیکھتے ہوئے - بہت ہی تھوڑی ہے - اور دوسرے ان میں بھی اکثر نفسانی اغراض شامل ہو جاتے ہیں جو اصل مقصد کو ضائع کر دیتے ہیں - علاوہ بریں اصل خرابی تو یہہ ہے کہ یہہ جذبہ عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کی اخلاقی اور علمی قدروں میں شامل نہیں اور ان کی زندگی پر اثر نہیں ڈالتا - معاملۂ گاؤں کے قابل لوگ آپس میں زیادہ میل جول ؟ رواداری اور باہمی خدمت گذاری کے ساتھہ زندگی بسر کرتے ہیں - اور تعلیم یافتہ لوگ اپنا تمام وقت ذاتی اغراض کے لیے جد و جہد یا ایک دوسرے سے

جنگ و جدل میں صرف کرتے ہیں - وہ یہ نہیں جانتے کہ زندگی ایک بہت بڑی امانت اور عطیہ ہے اور ہم اس کی قیمت اسی طرح ادا کر سکتے ہیں کہ اپنی تمام قوتوں کو بنی نوع کی خدمت کے لیے وقف کر دیں - اس خدمت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انسان لازماً کسی بڑے عہدہ پر ہو یا خاص اثر اور رسوخ رکھتا ہو - خدمت ایک ایسا نصب‌العین ہے جس کو ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ؟ اپنے اپنے مخصوص حلقۂ اثر میں پورا کر سکتا ہے - گذشتہ زمانے میں تمام قوموں اور ملکوں میں جو مصلح اور پیغمبر ہوئے ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو خدمت قوم کے لیے وقف کر دیا تھا "قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے" اور اسی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی بدولت انہوں نے اثر پیدا کیا اور قوم کے اخلاق اور سیرت کو بہتر بنایا - بر خلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر وہ شخص جو روپیہ جمع کر لیتا ہے یا جوڑ توڑ یا خوش قسمتی یا اتفاق سے کسی اونچی جگہ پہونچ جاتا ہے وہ لازماً قابل احترام سمجھا جاتا ہے اور ہر معاملہ میں اس کو گوشہ نشین لیکن سچے خادموں پر ترجیح دی جاتی ہے - یہ نظریہ جو مغرب کے موجودہ دور مادیت سے ہندستان میں آیا ہے - ہندستان کی اصلی روح کے سراسر منافی ہے - اور ہمیں اس کو قطعاً مسترد کرنے کی ضرورت ہے - کیوں کہ دولت کو خدمت پر مقدم قرار دینے سے ہمارا سارا نظام قدور درہم و برہم ہو رہا ہے اور ہو جائے گا اور انجیل مقدس کے الفاظ میں "کیا فائدہ ہے اس سے کسی انسان کو کہ وہ اپنی روح کھو دیتا ہے اور تمام دنیا کو پا لے -

ایک اور نہایت بلند اور مقدس اصول جو ہندستان نے اپنے گذشتہ زمانے میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ احترام حیات کا اصول تھا - یعنی جان یا زندگی خدا کا عطیہ ہے اور کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس عجیب و غریب عطیے کو کسی دوسرے شخص سے

جھیں لے کیوں کہ یہی ایک ایسی چیز ہے جس کو انسانی کوشش حاصل نہیں کر سکتی - اس اصول کا اطلاق نہ صرف انسانوں کی جان تک تھا جو اُصولاً تقریباً تمام متمدن مذاہب میں قابل احترام شمار کی جاتی ہے بلکہ چھوٹے سے چھوٹے حیوان مثلاً مچھر اور ہوا اور پانی کے جراثیم کی زندگی بھی اس اصول کے ماتحت مقدس سمجھی جاتی تھی ہندو مذہب اور اس سے زیادہ بدھ مذہب اور جین مذہب نے اس امر پر زور دیا - یہاں تک کہ بہت سے لوگ ؟ خصوصاً جین مت کے پیرو اب بھی منہہ پر کپڑا باندھے رکھتے ہیں تاکہ جراثیم ہوا کے ساتھ ان کے منہہ میں جاکر تلف نہ ہو جائیں ! اور وہ موذی جانوروں کو مار نا بھی جائز نہیں رکھتے - یہہ قرین عقل ہے کہ ہم کو اس خیال کی ان انتہائی شکلوں سے اتفاق نہ ہو اور ہم احترام حیات کے اصول میں تو اس قدر غلو نہ کریں - لیکن ان باتوں کے بنیادی اصول پر ہنسنا اور اس کا مضحکہ اُڑانا ایک نہایت اہم اور قابل قدر نصب العین کی توہین ہے - اور اس کے اثرات نسل انسانی کے لیے بہت خطرناک ہیں - موجودہ زمانے میں "کسمکس حیات" اور "تنازع للبقاء" (Struggle for existence) جیسے الفاظ کی آڑ میں جو دھنیت اور تصور زندگی پیدا ہو رہا ہے اس کے اندیشہناک نتائج دنیا ایک حد تک جنگ عظیم میں دیکھہ چکی ہے اور اگر اُن کو روکا نہ گیا تو ابھی اس سے زیادہ ہولناک مستقبل دنیا کے لیے آنے والا ہے - یہہ اصرار کہ ایک دوسرے کی جان اور مال اور حقوق کو تلف کرنا ؟ اور زندگی کو مقابلہ اور جنگ و جدل اور رقابت کے اصول پر چلانا قوانین فطرت میں شامل ہے فطرت اور انسانی طبیعت دونوں کے ساتھ نا انصافی ہے - ان حیوانات میں بھی جہاں فطرت کے قوانین کی کار فرمائی بغیر کسی روک ٹوک کے جاری ہے اور تعلیم و تمدن نے طبائع پر کوئی فرق نہیں

ڈالا ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ ایک ہی نسل کے جانور ایک دوسرے کو جان سے ماریں اور کھائیں - اور ان میں جہاں ضروریات زندگی کے اُصول کے لیے باہمی کشمکش کا نقشہ نظر آتا ہے وہاں باہمی اشتراک عمل ؟ امداد اور تقسیم کار بھی موجود ہے - اگر دو گدھے ایک مکان میں نہیں سما سکتے تو ہزاروں چیونٹیاں مل جل کر امن و امان سے زندگی بسر کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی نہیں ہوتیں - لیکن انسان کو اپنے لیے شاہراہ عمل اور اصول قائم کرنے کے لیے کم تر حیوانات کی زندگی سے سبق لینے کی ضرورت نہیں - اس میں سیکھنے ؟ تسو و تما پانے ؟ زندگی کو اخلاقی اصول اور قدوز کے ماتحت منتظم کرنے کی صلاحیت و ودیعت کی گئی ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی جبلّتوں کے نیچے لے جانے والے میلانوں کو زیر کرکے بلندی کی طرف پرواز کرتا رہے - اس کے لیے باعث ننگ ہے یہہ بات کہ وہ زندگی کو محض نفسانی اغراض کے حصول کے لیے استعمال کرے اور ان کی طلب میں باہمی مروت ؟ محبت ؟ اشتراک عمل اور حیات انسانی کے احترام کو بھول جائے - مختلف اقوام کے مابین ہندستانی کلرکتر سے یہہ چیزیں کم ہوتی جا رہی ہیں اور خود ہم لوگ وہ سبق بھول گئے ہیں جو ہم نے دوسروں کو پڑھایا تھا اور عجب بات یہہ ہے کہ وہ لوگ جو اب بھی اس اصول کی لفظی اور ظاہری پیروی کرتے ہیں مثلاً مکھیوں اور مچھروں اور پھنگوں کی جان لینے سے احتراز کرتے ہیں اس کے اصل معنی اور روح کو بھلا بیٹھے ہیں - اور ذرا سے پروپگنڈے یا جذبات کی یورش سے بے قابو ہو کر اپنے ہم وطنوں سے لڑنے لگتے ہیں یہانتک کہ بعض اوقات ان مجنونانہ جنگوں میں جن کو اجتماعی خود کشی کہنا بےجا نہ ہوگا اکثر جانیں تلف ہو جاتی ہیں - ایک لحاظ سے یہہ بات حیرت انگیز نہیں بھی ہے - فطرت انسانی کا تقاضہ ہے کہ وہ اکثر روح مذہب سے غافل

ہو کر محض اس کی رسوم اور علامات یعنی اس کے جسد بے جان سے تعلق پیدا کر لیتی ہے لیکن تعلیم کا یہہ فرض ہے کہ وہ اس جسم میں دو بارہ روح پیدا کرے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ پر لائے جہاں ان کا دماغ اور ان کے جذبات اور ان کے بہترین آئیڈیل سب ہم آہنگی کے ساتھہ کام کریں - دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لیے اور موجودہ تخریبی دھنیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ قوموں میں احترام حیات کے احساس اور عقیدہ کو مستحکم کیا جائے تاکہ ہر شخص نہ صرف اپنی زندگی اور اپنے معاد کو عزیز اور قیمتی جانے بلکہ اور سب کی جانوں اور معاد کو بھی احترام اور رواداری کی نظر سے دیکھے - ہندستانیوں پر بالخصوص یہہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس اصول کو دوبارہ صحیح معنوں میں مضبوطی کے ساتھہ پکڑ لیں اور خود کو اپنی کوشش سے اور دنیا کو اپنی مثال سے ایک بہت بڑے خطرہ سے نجات دلائیں -

(۷)

اس مضمون میں ہم نے یہہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندستانیوں کی قومی سیرت کی تشکیل میں بہت سے اثرات اور تہذیبوں کا حصہ ہے ہندستانی طبیعت کا یہہ خاصّہ رہا ہے کہ وہ بیرونی اثرات کو قبول کر کے ان کو اپنا بنا لیتی ہے اور اب بھی ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ ہم اس اصول کو ہاتھہ سے نہ دیں - لیکن قبول کرنے کے یہہ معنی نہیں کہ ہم بغیر غور اور فکر کے ؟ بغیر تنقید اور تبصرہ کے ؟ بغیر انتخاب کے ان اثرات کو جذب کرلیں - ہمیں اپنی تہذیبی قدور اور اعیان کو زندہ اور اپنے فلسفہ زندگی کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ ہم کو یہہ بھی غور کرنا چاہئے کہ موجودہ زمانہ کی ؟ جس میں بہت سے لحاظ سے زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں مخصوص ضروریات

کیا ہیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے ہمیں قومی سیرت میں کن چیزوں پر خاص طور پر توجہ کرنے اور زور دینے کی ضرورت ہے - ماحول کی تبدیلی ؟ جو خود بڑی حد تک انسانی جد و جہد کا نتیجہ ہے ؟ انسانی تعلیم و تربیت میں ترمیم اور تبدیلی چاہتی ہے اور ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کو اس نئے ماحول کے لیے تیار کرنا ہے - اس تیاری میں عام سماجی اداروں اور تمدنی انتظامات کا بھی دخل ہے جو اپنے غیر محسوس اثر سے لوگوں کے مزاج اور طبیعت کو آہستہ آہستہ بدلتے اور ڈھالتے رہتے ہیں - لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارے پاس سب سے زبردست اور موثر ذریعہ تعلیم ہے جو بچپن اور بلوغ کے پُر شوق اور ولولوں اور اُمنگوں سے بھرے ہوئے زمانے میں دی جاتی ہے - قومی سیرت اور قومی زندگی کی تشکیل تو اسی طرح ہوسکتی ہے کہ ماہرین تعلیم ایک طرف بچہ کے مخصوص رجحانات اور جبلتوں کو سمجھیں اور دوسری طرف تہذیب و تمدن کے عالی شان نظام کا مطالعہ کریں اور ان میں مدرسہ کے ماحول اور مشاغل کے ذریعہ اس قسم کا نتیجہ خیز تعلق پیدا کریں کہ بچہ تعلیم کی منزل سے گذرنے کے بعد تمدنی زندگی میں مکمل طریقہ سے حصہ لے سکے - اگر زندگی کے جدید مسائل اس بات کو چاہتے ہیں کہ ہم مغرب سے سائنس کو لیں تو ہمیں اس سے باک نہیں ہونا چاہئے - اگر دنیا میں ترقی کرنے کے لیے بچوں میں جدت، اجتہاد اور عملیت پیدا کرنے کی اور قسمت پرستی اور قناعت کے اصولوں میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے تو تعلیم کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہیے - اگر دنیا کو باہمی جنگ و جدال اور رقابت کے خطرناک نتائج سے بچانے کے لیے ہمیں احترام جیات اور خدمت کے قدیم اور دائمی اصولوں کے ساتھ از سر نو رشتہ جوڑنے کی ضرورت ہے تو ہمیں ماضی کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور تعلیمی نظم و نسق کے ذریعہ

اس نصب‌العین کو عملی جامہ پہنانا چاہیے - کہیں تعلیم کا کام زمانہ کے رجحانات کو امداد دینے کا ہے اور کہیں اس کا فرض ہے کہ ان رجحانات سے دنیا کو محفوظ اور مامون کرے کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے انسان بجائے ارتقاء کی قوتوں کا تابع ہوجانے کے ان کو اپنے ارادہ اور عقل کے راستے پر چلا سکتا ہے -

موجودہ زمانہ نے انسان کے سامنے جو مسائل اور ماحول پیدا کر دیے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم کو کس قسم کی سیرت اور ذہنیت تیار کرنے کی ضرورت ہے ؟ اس سوال کا جواب ضمناً بیان بالا میں آجاتا ہے - یہاں ہم مختصر اور صاف الفاظ میں ان نتائج کو پیش کرتے ہیں جو اس بیان سے نکلتے ہیں اور جن پر ماہرین تعلیم کو دیر یا سویر غور کرنا پڑے گا اگر وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم اور حیات قومی میں کوئی ربط ہو اور اس کے معنی محض نوشت و خواند یا واقفیت حاصل کرنے تک محدود نہ سمجھے جائیں -

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سائنس نے دنیا میں نہایت زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے - اور یہ انقلاب نہ صرف مادی دنیا تک محدود ہے بلکہ ہماری علمی اور اخلاقی زندگی پر بھی اس کا بہت گہرا اثر پڑا ہے - ہمارے بہت سے پرانے قرینے اور خیالات جو کم علمی پر مبنی تھے بالکل باطل ثابت ہو چکے ہیں اور علمی تحقیق و تفتیش جو برابر جاری ہے آئے دن نئے اور بعض مرتبہ انقلابی حقائق کا انکشاف کرتی جاتی ہے جن کی طرف سے منہ موڑ لینا یا غفلت برتنا نہ صرف ذہنی جمودگسی ہے بلکہ قومی ترقی کے لیے نہایت زبردست رکاوٹ ہے - اس لیے سائنس کی ترقی میں حصہ لینا ہمارا قومی فرض ہے اور ہماری تعلیم اس کو نظر انداز نہیں کرسکتی - لیکن سائنس جو صحیح معنوں میں انکشاف حقائق کا نام ہے ایک خاص ذہنیت کی طالب ہے - تعصب؟

جمود؟ تو ہم پرستی کا اور سائنس کا ساتھ نہیں ہو سکتا - اس کے لیے ایسے دل و دماغ کی ضرورت ہے جو صداقت اور محض صداقت کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور مصلحت؟ رر پرستی؟ پرانے لیکن غلط خیالات؟ قدیم تعصبات کو صداقت کی خاطر ترک کرنے کے لیے تیار ہو - جو کسی شخص کو اس لیے قابل دار نہ سمجھے کہ وہ کہتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے حالانکہ تمام دنیا کا یہ عقیدہ ہے کہ سورج دنیا کے گرد گھومتا ہے - جو کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ نئے حقائق کا استقبال کرے اور اپنی غلطیوں کا ایمانداری سے اعتراف کرے اور ان کو اتار پھینکنے کے لیے تیار ہو خواہ وہ مصاحبت کی وجہ سے کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو گئی ہوں - یہ ذہنیت دنیا کے کسی ملک میں بھی عام نہیں - متمدن امریکہ میں انتہائی ذہنی تعصب اور سچ کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کی مثالیں حال ہی میں فاش ہو چکی ہیں ہمارے ملک میں اس قسم کی ذہنیت خاص طور پر معہود ہے - ہم اپنی معاشرتی اور علمی زندگی دونوں میں پرانے بتوں کو پوجتے ہیں عام اس سے کہ ہمیں ان سے کوئی فیض پہنچتا ہے یا نہیں - اور جب کوئی صاحب نظر شخص کے قائم شدہ رواج یا ادارہ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو تمام قومیں جو رسم و رواج کی پابندی کے ساتھ وابستہ ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہیں لہذا سائنس کی تعلیم دینے سے مقصد صرف یہی نہیں کہ لوگ طبیعیات اور کیمیا اور علم نباتات اور علم حیوانات وغیرہ پڑھ لیں بلکہ اس سے زیادہ اہم اور قومی سیرت کے لیے زیادہ فوری ضرورت یہ ہے کہ لوگوں میں یہ سائنٹفک نقطہ نظر پیدا کیا جائے - اس کوشش میں کامیابی کا اثر محض ہماری علمی زندگی تک محدود نہ ہوگا بلکہ اس کا ردّ عمل ہماری معاشرتی اور تمدنی زندگی؟ ہمارے سیاسی مسائل پر بھی نمایاں ہوگا -

ہم بیان کرچکے ہیں کہ سائنس نے انسان کے قبضہ قدرت میں بے انتہا قوت دیدی ہے جس کے جائز استعمال کے لیے بےحد ضبط نفس اور احساس ذمہ داری کی ضرورت ہے - سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان میں ابھی تک یہہ احساس پوری طرح پیدا نہیں ہوا اس وجہ سے وہ بسا اوقات قدرت کی ان مہیب قوتوں کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے جس طرح کوئی نادان بچہ کسی خطرناک ہتیار کے ساتھ جس کے خطرہ کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھتا - اس کی مادی اور اخلاقی نشو و نما میں توازن اور ہم آہنگی نہیں - اس صورت حال سے جو خوفناک نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ تمام دنیا کو معلوم ہیں اور خود مغرب کے صاحبان فکر جانتے ہیں کہ ان سے کہیں مہلک نتائج آئندہ حل کر پیدا ہوسکتے ہیں اگر سائنس کی دریافت کی ہوئی طاقتوں کو انسانی بہبود کے بجائے باہمی ہلاکت اور تخریب کے لیے استعمال کیا گیا - اس لیے تعلیم پر یہ ذمہداری عائد ہوتی ہے کہ وہ صلح پسندی اور امن جوئی کی خواہش قوموں میں پیدا کرے - ان کو مادی علمی اشتراک عمل کے فوائد اور باہمی مخالفتوں اور رقابتوں کے نتائج سے آگاہ کرے اور ان اخلاقی اور روحانی اُصولوں کی سلطنت کو مستحکم کرے جو متمدن مذاہب کی بنیاد ہیں؟ جو سائنس کی غیر محدود تخریبی قوت کو روکنے اور قابو میں لانے کا بہترین ذریعہ ہیں - یہ موقع نہیں کہ میں بتاؤں کہ اس اعلیٰ اور مشکل مقصد کے حصول میں معمولی ابتدائی ثانوی مدارس کس طرح مدد دے سکتے ہیں لیکن ماہرین نفسیات اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ جو طبیعت اور رجحانات بچپن کے زمانے میں مدرسہ اور گھر کے روز مرہ مشاغل سے پیدا ہوتے ہیں ان کا مجموعی اثر آئندہ عمر میں بہت دور تک پہنچتا ہے -

سائنس نے صنعت و حرفت اقتصادی نظام اور پیشوں اور کام کی نوعیت میں جو انقلاب پیدا کیا ہے ان کی وجہ سے بھی قومی سیرت کی تشکیل اور تعلیم کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے - مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں بہت زیادہ ؟ اور ہندستان میں مقابلۃً کم ؟ کام کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی ہے - دستکاری کے بجائے مشین کے کارخانے ؟ چھوٹے چھوٹے دستکاروں کی برادری کے بجائے بڑے پیمانے پر خرید فروخت ؟ اشیا کی بازاری اور بیدارار ؟ شہروں میں مزدوروں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کا اجتماع ؟ تعلیمی کام کے بجائے محض مشین کے پرزوں کی طرح گھنٹوں ایک مقررہ حرکت کا انجام دینا ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہاتھ سے کام کرنے والوں کے لئے اپنے کام میں کوئی دلچسپی یا تعلیمی مواقع یا جذب کے اظہار کا امکان نہیں رہا اور ان کی حیثیت مکمل انسانوں کے بجائے محض مشین کے پرزوں کی سی ہوگئی - اب تعلیم پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کمی کی تلافی کرے اور ان میں زندگی سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرے - ان کو ان کے کام کی وسیع پر معاشرتی اور قومی اہمیت سے واقف کرنا ؟ محنت کی عظمت اور اثرات سمجھنا ؟ اقتصادی نظام میں ان کی حیثیت سے ان کو آگاہ کرنا تعلیم کا کام ہے - اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس طرح تربیت کرنی چاہیے کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں تہذیبی مشاغل اور دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ہو سکیں - ان کی زندگی کولہو کے بیل جیسی نہ ہو جس کو نہ کچھ دکھائی دیتا ہے ؟ نہ سمجھ میں آتا ہے ؟ جو ہر وقت ایک چکّر میں گھومتا رہتا ہے اور فرصت کے وقت کو محض گھاس اور چارہ کھانے میں گذارتا ہے - تہذیب جدید کا ایک نہایت نقصان اور مضر اثر یہ ہوا ہے کہ اس نے لوگوں کے کام کو اس قدر روح فرسا حد تک "میکنیکی"

بنا دیا ہے کہ آٹھ یا دس گھنٹے تک اس میں مصروف رہنے کے بعد ان میں اعلیٰ قسم کی انسانی دلچسپیوں، آرٹ، فطرت، تہذیب، معاشرت کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ وہ اپنی فرصت کے وقت نہایت ادنیٰ درجے کی دلچسپیوں میں گذارتے ہیں جو کسی طرح سیرت اور مذاق کو بہتر نہیں بنا سکتیں۔ معاشرت اور صنعت و حرفت کے مفکرین کا یہ فرض ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو کام کی نوعیت میں تبدیلی کریں یا کہ اس میں کام کرنے والوں کو اپنی شخصیت اور اپنی ذہنی اور جذباتی دلچسپیوں کی تربیت کا موقع ملے۔ اور تعلیم کی یہہ ذمہ داری ہے کہ وہ طلبا کو ایسے شوقوں اور مشاغل سے روشناس کرے جو آئندہ زندگی میں ان کی فرصت کے رفیق اور اظہار خودی کا ذریعہ ثابت ہوں۔ لیکن یہہ ظاہر ہے کہ دنیا کے کام کا ایک کافی حصہ ایسا غیر دلچسپ اور "مکانیکی" ضرور رہےگا اس میں معلم یا مصوّر یا کسی چابک‌دست کاریگر کے کام کی طرح اظہار خودی اور شخصیت کی تربیت ممکن نہ ہوگی اس لیے انسانی روح کی عظمت اور احترام کا تقاضہ ہے کہ مدرسے ہر فرد میں تخیل کی نشوونما کریں اور تخلیق کے جذبہ کو فروغ دیں اور فرصت کے مشاغل کے ذریعہ جہاں تک ممکن ہو، شخصیت اور سیرت کی تشکیل کریں۔ "ہم اُس دن کا خواب دیکھتے ہیں جب ہم ان کے جسم اور دماغ اور روح کی اس طرح تربیت کریں گے کہ ہم اُن کو اطمینان خاطر اور بے خوفی کے ساتھہ دنیا کی کشمکش میں حصہ لینے کے لیے جاتا دیکھیں‌گے اور ہر نو عمر کام کرنے والے میں انفرادی قوت کا ایک ایسا نوشیدہ چشمہ ہوگا جس کو نہ صنعت و حرفت کا مشینی نظام خشک کر سکے گا نہ زندگی کی ناانصافیاں حراب کر سکیں‌گی۔ خواہ اس کا کام محض یہہ ہو کہ وہ زمین میں ہل

چلائے لیکن اس کا دماغ دنیا کے دور دراز حدود تک پہنچے گا - خواہ مادر گیتی کو کھودے اور اُس کا سینہ چیرے میں اپنی عمر صرف کرے لیکن اس کے تحصیل کی رسائی ستاروں تک ہوگی - مسلموں کا شور اور تجارت کی منڈیوں کی چیخ پکار اس کے کانوں کو موسیقی کی شیریں اور خوبصورت الفاظ کے ترنم کی طرف سے بہرا نہ کر سکےگی اگر ہم ان چیزوں کو اس کی زندگی کا بابا بابا بنادیں" - یہہ اندرونی قوت جو انسان کو بجائے خود ایک عالم خیال بنادیتی ہے اور اس کو ایک حد تک شخصیت کو مغلوب کرنے والے اثرات سے محفوظ اور سوسائٹی کے علمے سے بے نیاز کردیتی ہے - تہذیب نفس اور تربیت کامل کے لیے لازم ہے اور اس دور میں جب کہ چار طرف مسلموں، بڑے پیمانے پر کاروبار ، ادنیٰ اور سستی قسم کے اسباب تفریح اور جمہوریت کے ہموار کرنے والے اثرات کا زور ہے اس قوت کی خاص طور پر ضرورت ہے - قومی فلسفہ تعلیم جو قومی سدرت کی تسکیل کو ضروری سمجھتا ہے اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا -

موجودہ دور کا تیسرا رجحان جو ہندستان میں بہت واضح طور سے ظاہر ہو رہا ہے جمہوریت ہے - یہاں موقع نہیں کہ میں اس کے ارتقاء یا اس کے فوائد اور کمزوریوں سے بحث کروں - ہمارے لیے اس وقت صرف یہہ غور کرنا کافی ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں یہہ فلسفہ سیاست اپنا سکہ جما چکا ہے اور اگرچہ آج کل بعض ملکوں مثلاً اٹلی اور روس میں مختلف وجہ سے اس کی مخصوص شکل مسترد کر دی گئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس خیال اور طریقہ نظم کا نشو و نما جاری ہے اور مغرب کے اکثر ملکوں مثلاً چین ، ترکی ، ہندستان وغیرہ میں یا تو جمہوریت قائم ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے - بہر حال خواہ دوسرے ملکوں کی سیاسی تاریخ کوئی صورت اختیار

کرے اس امر سے کسي شخص کو انکار نہ ہوگا کہ ہندستان کا سیاسي مستقبل جمہوري نظام حکومت کے ساتھہ وابستہ ہے - ممکن ہے کہ بعض صاحبان فکر اپنے نقطہ نظر سے اس نظام حکومت کو ملک کے لیے بہترین نظام تصور نہ کریں لیکن عملی سیاست دانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اور کوئی طریقہ نہ قابل عمل معلوم ہوتا ہے نہ لائق ترجیح - اس لیے موجودہ زمانہ میں جو تعلیم رائج کی جائے اس کے لیے ضروري ہے کہ وہ نئي نسل کو ان فرائض اور ذمہ داریوں کے لیے تیار کرے جو نتیجتہً جمہوری سہریوں کے اس پر عائد ہونے والي ہیں - اس لحاظ سے تعلیم کا سیاسي نظام سے بہت گہرا تعلق ہے - جو خوبیاں اور قومی سیرت کے خصائص ایک مطلق العنان بادشاہ کی حکومت میں مفید ہوں گے وہ ایک خود مختار جمہوری حکومت میں مفید نہیں ہو سکتے - وہاں سب سے بڑي خوبی یہہ سمجھی جائے گی کہ ہر باشندہ حکام بالا کے سامنے ہر معاملہ میں سر تسلیم خم کر دے ؟ سیاسي اور ملکي معاملات میں اپني شخصیت کو بالکل حکومت کے ماتحت بنا دے اور مشین کے پرزے کی طرح دوسرے پرزوں کے ساتھہ مل کر کام کرے تاکہ مشین چلانے والوں کے جو مقاصد ہوں وہ کامیابی کے ساتھہ پورے ہو جائیں - بر خلاف اس کے ایک آزاد جمہوري سہري میں دوسری قسم کی صفات درکار ہوں گي - اس میں غور و فکر کي صلاحیت ہوني چاہیے ؟ ملکی معاملات کو سمجھہ کر ان پر رایے دینے اور اس رائے کی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے آمادگی ہوني چاہیے - جذب اور اجتہاد عمل اور اُپج ہوني چاہیے تا کہ وہ خود سوچ کر ایسی تدابیر نکالے اور دوسروں کے سامنے پیش کرے جو اجتماعی ترقی میں معین ہوں - مختصر یہہ کہ جمہوریت کے لیے فعالیت کی ضرورت ہے ؟ مجہولیت کي نہیں - ہندستانی سرت میں ان خصائص کا پیدا

کرنا لازمی ہے - اس میں غلط قسم کی قناعت ؟ غلط قسم کی تدبیر پرستی ؟ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی عادت ؟ حوصلہ اور ہمت کی کمی جو پیدا ہو گئی ہے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے - جمہوری ذمہ داری کا احساس ایک طرف تو دھنی بیداری چاہتا ہے اور دوسری طرف عملی قوت کا طالب ہے اور تیسری طرف جذبات کی ایسی تربیت کہ ہر شخص اپنے مفاد کو عام ملکی مفاد کا جز و سمجھے ؟ ان کا رقیب نہ خیال کرے - اور ہر تدبیر اور کام کے متعلق یہہ سوچے کہ علاوہ میری ذات کے ؟ دوسرے لوگوں کی زندگی اور حقوق پر اس سے کیا اثر پڑے گا - ہندستانی سیرت ان تینوں پہلوؤں سے توجہ کے قابل ہے- تعلیم کی کمی کی وجہ سے لوگوں میں عام طور پر اتنی ذہنی بیداری نہیں ہے کہ وہ ان مسائل کو سمجھ سکیں جو ملک کو در پیش ہیں گذشتہ دس سال میں سیاسی تحریکوں نے بڑی حد تک عوام‌الناس کو بیدار کیا ہے لیکن ابھی وہ منزل مقصود بہت دور ہے جب ہر بالغ آدمی معاملات کے عام پہلوؤں کو سمجھ کر ان کے متعلق رائے دے سکےگا - جذباتی رخ اس سے بھی زیادہ توجہ کا محتاج ہے - وہ انسانیت "جو تیدن از تپ ہمسائگاں" کے ہم معنی ہے ہم میں سے تحسینیت قوم کے بہت کم ہو گئی ہے - اور ہم اکثر تحائے قومی مفاد کے اپنے ذاتی یا جماعتی مفاد کو مشعل ہدایت بنا لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندستانیوں میں باہمی اختلافات چھوٹی باتوں میں پیدا ہو جاتے ہیں اور قوم کی قوتیں اکثر بڑے بڑے تعمیری کاموں میں صرف ہونے کے بجائے ان اختلافات کی نذر ہو جاتی ہیں - لیکن شاید سب سے زیادہ کمی ہمارے قومی سیرت میں قوت عمل کی ہے - ہم نے یہہ بھلا دیا ہے کہ انسانی کوشش اور محنت کس قدر زبردست جبر ہے اور وہ اس دنیائے آب و گل میں کیسے عظیم‌الشان انقلاب

پیدا کر دیتی ہے - ہم میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تقدیر
کو غلط معنی پہنا کر اپنی سستی اور غفلت کو ایک گمراہ کن فلسفہ
کی آڑ میں چھپاتے ہیں - قوم میں حوصلہ ، ہمت ، اپج ، بڑے بڑے
کاموں کو کرنے کا جوش اور ولولہ پیدا کرنا چاہیے تا کہ ہمارے اوپر
مداً بدنامی کا یہہ تیکہ نہ رہے کہ کوہ ہمالیہ پر چڑھنے کے لیے بھی
غیر ملکی پہاڑوں کی ضرورت پڑی - خود ہمارے سیّاحوں میں اتنا
حوصلہ نہ ہوا کہ اپنے ملک میں پوری طرح سیّاحت کرتے اور جان
جوکھوں میں ڈال کر علم کی خدمت کرتے - ہمارے ہاں علمی قابلیت
یا تکلیفیں سہنے کی قوت کی کمی نہیں - صرف حوصلے اور ہمتیں
افسردہ اور پست ہیں - اور جب تک ان میں زندگی اور حرارت پیدا
نہیں ہوگی جمہوری حکومت پوری کامیابی کے ساتھہ نہیں مل سکتی
ہندستانیوں کو ایک ایسی قوم کی ضرورت ہے جس میں ہر شخص
کی انفرادیت کی پوری طرح نشو و نما کی گئی ہو اور وہ جنڈہ پیسائی
اور بے خوفی کے ساتھہ ان تمام ذمہ داریوں کا بوجھہ اپنے شانوں پر
اٹھانے کے لیے تیار ہو جو اس کے حصہ میں آئیں - جو اپنے
خیالات کو خلوص اور قوت کے ساتھہ دوسروں کے سامنے پیش کر دے
اور اپنے عقائد اور اصولوں کے لیے قربانی کرنے کو تیار ہو - جس میں اپنی
روح اور اپنی شخصیت کی عظمت کا احترام ہو لیکن اس کے ساتھہ
ساتھہ دوسروں کی روح اور شخصیت کا احترام بھی ہو اور اس بنیاد
پر وہ ان کے ساتھہ مل جل کر کام کرنے یا ان کے دکھہ درد اور خوشیوں
کو بٹانے کے لیے تیار ہو - یہہ نصب‌العین الفاظ میں نہایت مشکل
اور شاید نا ممکن‌الحصول معلوم ہوتا ہے لیکن نصب‌العین کو ہمیشہ اتنا
بلند ہونا چاہیے کہ اس کی طرف اٹھنا ممکن ہو اس تک پہنچ
جانا ممکن نہ ہو - اور تعلیم اگر قوم کے ہر فرد میں یہہ صفات پیدا

نہیں کر سکتي تو اتنا ضرور کر سکتي ہے کہ بحیثیت مجموعي یہہ رجحانات قوم میں پیدا ہو جائیں اور اس کي سیرت میں نسبتاً معاملات پر جرأت اور ایمانداري کے ساتھہ غور اور اظہار خیال کرنے کی، دانی اغراض کو بلند تر قومی اغراض میں جذب کرنے کي، اور ہمت اور دلیري کے ساتھہ اپنے پُر خلوص عقائد پر عمل کرنے کی زیادہ صلاحیت نمایاں ہو جاوے - ایسي سیرت کا خوبی اور وضاحت کے ساتھہ نقشہ کھینچنے کے لیے میں ڈاکٹر جیمز وارڈ کي چند سطریں نقل کرتا ہوں جنھوں نے تھوڑے سے الفاظ میں آزاد جمہوریت کے ایک مکمل شہری کی صفات بیان کر دی ہیں —

"کوئي مرد یا عورت جس کا دماغ تعصبات سے پاک ہو، جس کا فیصلہ آزادانہ ہو، جس میں اخلاقي جرأت ہو، جس کو دلائل کے ذریعہ قائل کرنے کی ضرورت ہو لیکن خوشامد اس پر کوئی اثر نہ کر سکے، جو عقل کے سامنے سر تسلیم خم کرے، دنیوي وجاہت کے سامنے نہ جھکے، جس کو محض یہہ کاوش ہے کہ وہ سچائي اور حق پر رہے اور یہہ فکر نہ ہو کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے، جو خود اپني ذات سے سچا اور پُر خلوص ہو اور اِس لیے کسي کے ساتھہ بھي دھوکہ یا جھوٹ کا برتاؤ نہ کرے، ایسے ایک مرد یا عورت کي قدر کا اندازہ لگانا ناممکن ہے - اگر ایسے افراد کي کوئي قوم ہو تو وہ تمام دنیا کو نئی زندگی بخش سکتي ہے" -

ایک مکمل تعلیم یافتہ انسان کی اگر ہم تعریف کرنا چاہیں تو مندرجۂ بالا عبارت تقریباً اِس مقصد کو پورا کرتی ہے - اور ہمیں جس آئیل کو سامنے رکھہ کر ہندستان کي قومي سیرت کی تشکیل کرني چاہیے اس کو تقریباً واضح کر دیتي ہے - تقریباً، لیکن پوري طرح نہیں ! اِس لیے کہ اس تعریف میں انسان کے انفرادي پہلو پر زور دیا گیا ہے اور بحیثیت ایک

آزاد اور بے بہار روح رکھنے والے کے اِس میں جو صفات ہونی چاہئیں اُن کو پیش کیا گیا ہے - لیکن اِس کے معسرنی تعلقات اور فرائض کی پوری اہمیت کو بیان نہیں کیا گیا اِس میں شک نہیں کہ ہندستان جیسے ملک میں؟ جہاں صدیوں کی رسوم اور قدیم اداروں کی جکڑبند نے شخصیت کو مقید کر رکھا ہے اور لوگ ایک دوسرے کی نقل بن کر رہ گئے ہیں؟ انسانی سیرت کے اس رخ کو نمایاں کرنے کی کافی ضرورت ہے - لیکن ہم یہہ نہیں چاہتے کہ گزشتہ صدی کی تاریخ یورپ کا اعادہ کریں اور انفرادیت کے رجحان پر کسی قسم کی روک ٹوک نہ کریں یہاں تک کہ وہ نفسی نفسی کی کیفیت قوم پر طاری کردے اور لوگوں کو اپنے سیلاب میں بہا کر لیجائے - ہماری قومی سیرت میں اِس وقت خاص طور پر دوش بدوش کام کرنے کی اتفاق کی قوت سے مشکلات کو زیر کرنے کی؟ اتحاد عمل اور یک جہتی کی کمی ہے اور اِس عنصر کو اہمیت دینے کے لیے ہمیں خدمت اور احترام حیات کے قدیم اصولوں کو دوبارہ مضبوطی کے ساتھہ پکڑنا چاہیے تاکہ ایک طرف تو ہم میں امن پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جو صرف دوسری قوموں سے جنگ نہ کرنے ہی کا نام نہیں (کیوں کہ وہ تو محض ایک منفی عمل ہے) بلکہ اِس سے یہ مراد ہے کہ ہم اپنی تمام قوتوں کو اسی جوش اور تنظیم کے ساتھہ امن کی فتوحات حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں جس طرح اِن کو جنگ کے مہلک اور تباہ کُن مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں - دوسرے ہم یہ محسوس کریں کہ کوئی زندگی اپنے پورے کمال اور جود یابی کو نہیں پہونچ سکتی جب تک اِس کا مقصد محض اپنی ذات تک محدود ہو اور وہ خودی کے محدود تصور سے گزر کر دوسروں کو بھی اِس میں شامل نہ کرے - گزشتہ سو سال میں جو تعلیم یافتہ طبقہ ہندستان میں پیدا ہوا ہے اس کے متعلق یہ شکایت ہے اور بجا شکایت ہے کہ اس نے خدمت کے نصب العین کی صحیح اہمیت کو نہیں سمجھا

اور اپنے ملک کے کم نصیب لوگوں تک اِس روشنی کو پہونچانے کی کوشش نہیں کی جو تعلیم کے ذریعہ اِن کو حاصل ہوئی تھی نہ وہ اُن کے دکھہ درد ؟ اُن کے روز مرہ کے مسائل اور مشکلات ہی میں شریک ہوئے نہ انہوں نے اُن کی اقتصادی اور معاشرتی حالت کو درست کرنے کی کوشش کی لوگوں نے فرداً فرداً کہیں کہیں اِس قسم کی کوشش ضرور کی اور گزشتہ بیس سال میں تعلیم یافتہ طبقہ نے مقابلتاً ملک کی عام حالت کی طرف زیادہ توجہ بھی کی - لیکن انفرادی کوشش اِس امر کا بدل نہیں ہو سکتی کہ تعلیم نے اِس اعلیٰ نصب‌العین کو قومی سیرت کا جزو نہیں بنایا - موجودہ تہذیب کو خواہ وہ ہندستان کی ہو یا انگلستان کی ؟ چین کی یا امریکہ کی ؟ زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں پر ایمان نہیں رہا - اِس لئے اِس کے پاس ایسے محرکات موجود نہیں جو جذبات کو اُبھاریں اور قوت عمل کو جوش میں لائیں - جو انسانی زندگی کی غیر محدود اہمیت اور قیمت اور انسانی روح کے بہترین امکانات کا احساس ہر فرد میں پیدا کر سکیں - اِس زمانہ کا سب سے بڑا مطالبہ یہی ہے کہ لوگوں کی سیرت اِس طرح تشکیل کی جائے کہ اُن کا ایمان تازہ ہو اور وہ سمجھیں کہ اُن کے ہر کام اور ہر خیال کی ایک غیر فانی زندگی ہے جس کا اثر اُن کے بعد قائم رہےگا ؟ کہ اِنسان کی زندگی نہ ایک سراب ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی ؟ نہ ایک قول بیاناتی ہے جو اندھیرے میں چمکتا ہے اور چمک کر غائب ہو جاتا ہے نہیں اِنسان دنیا میں خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے تا کہ وہ خود کو اخلاق الٰہی کے ساتھہ متصف کرے اور اپنے تمام امکانات کو نشو و نما دے کر اُن کو آزادی کے ساتھہ مشیت الٰہی یعنی تکمیل اعلیٰ ترین روحانی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرے - اور یہہ یاد رکھے کہ اگر نیک نیتی کے ساتھہ اور اصول معاشرت اور اصول اخلاق کو مد نظر

رکھہ کر وہ سائنس کی ترقی ؛ فطرت کی تسخیر ؛ اور حصول ذرائع کے لیے کوشش کرےگا تو یہہ تمام "دنیوی" جد و جہد بھی انہیں "روحانی" مقاصد کے حصول میں مدد دےگی - اور اگر وہ زندگی اور مذہب کا باہمی رشتہ منقطع کر کے ؛ دنیا کی جد و جہد اور معاملات سے منہہ موڑ کر ؛ محض تارک‌الدنیا اور راہب بن جاءے گا اور عبادات میں اپنی زندگی بسر کرےگا تو اُس کو نہ صرف دنیا ہی حاصل نہ ہوگی بلکہ وہ اپنے پیش نظر مقصد میں بھی کامیاب نہ ہوگا - زندگی ؛ اپنی گونا گوں مشکلات اور امکانات ؛ کامیابیوں اور ناکامیوں ؛ بلندیوں اور پستیوں ؛ روحانیت اور حیوانیت کو اپنی گود میں لیے ہوءے ہم میں سے ہر ایک سے سوال کرتی ہے : کیا تم مجھے لینے کے لیے ؛ مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہو ؟ جو لوگ اِس چیلنج سے خوف زدہ ہوکر اپنا منہہ پھیر لیتے ہیں وہ شکست خوردہ ہیں اور مستقبل کی تشکیل میں حصہ نہیں لے سکتے - جو لوگ اِس چیلنج کو مردانہ وار قبول کرتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ اپنی تہذیب و تمدن ؛ اپنے اخلاق و مذہب کے بہترین اصولوں کی روشنی میں اِس زندگی کو بہتر اور خوب تر بنائیں تا کہ وہ امکانات جو اِس میں پوشیدہ ہیں روز بروز ظاہر ہوتے چلے جائیں اور مشیت الٰہی پوری ہو -

مشو نومید زیں مشت غباری ترسان جلوۂ تا تابیداری
چو فطرت می تراشد پیکرے را تماشا می کند در روزگارے!

اداریہ

اکیڈیمی

پانچویں صدی قبل مسیح ؟ یونان کی تاریخ میں اِنتہائی اقتدار اور عظمت کا زمانہ ہے - جب کہ شہر ایتھنز کی ریاست جمہور کے ہاتھوں میں ہے ؟ ہر شہری بلا لحاظ دولت و پیشہ ؟ حکومت کے اداروں کا ذمہ دار رکن بننے کی حیثیت رکھتا ہے - ایک روز اگر وہ رسّا بنانے میں مشغول ہے ؟ تو دوسرے روز فوج کا اعلیٰ کمانڈر منتخب ہو سکتا ہے ؟ آج مشعلچی ہے ؟ تو کل کسی جہازی بیڑے کا امیرالبحر - ہر شہری کو اپنے شہر کی عزت اور حرمت کا احساس اور ہر مرد اور عورت کا دل اس کی خدمت کے ولولے سے سرشار ہے - ایتھنز کی حکومت ایک بڑی سلطنت میں پھیلی ہوئی ہے ؟ ایشیائے کوچک اور بحر اسود کے سواحل پر ؟ بحیرۂ روم میں پھیلے ہوئے جزیروں اور بندرگاہوں میں ایتھنز کے عمّال اِنتظام حکومت کر رہے ہیں اور ماتحت ریاستوں سے خراج وصول کرتے ہیں -

ایتھنز دولت ؟ علم و ادب اور فنون کا مرکز بنا ہوا ہے ؟ شہر عالیشان عمارتوں اور خوبصورت بتوں سے سجا ہوا ہے اور مصوّروں ؟ مورخوں ؟ شاعروں اور ڈراماتویسوں کے کارناموں کے باعث دنیا سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے - عین اِسی زمانۂ عروج میں اپنے رقیب سپارٹا سے اس کی لڑائی چھڑ جاتی ہے - اور جنگ میں اپنے سرداروں کی بےعنوانیوں اور دشمنوں کی کمزوری کے باعث ایسا بسا ہوتا ہے کہ اس کی وسیع سلطنت چشم زدن میں سپارٹا کے قبضے میں چلی جاتی ہے ؟ زوال اس قدر تیزی کے ساتھ آتا ہے کہ طاقت اور حکومت تھوڑے ہی دنوں میں افسانہ

ہو جاتی ہے اور سپارٹا سے شکست کھانے کے نصف ہی صدی کے اندر ایتھنز آزادی تک سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ۔

ایتھنز کی تاریخ میں اس زوال کی ابتدا سے ایک دوسرا مگر پہلے سے بھی زیادہ شاندار دور شروع ہوتا ہے ۔ اب تک ایتھنز کا اِنسانوں کے جسموں پر تسلّط تھا؟ اب اُن کی دھنیتوں پر اس کی حکومت و فرمانروائی ہے ۔ پہلی حکومت عارضی اور چند روزہ تھی دوسری دائمی اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہوتی ہے ۔

ایتھنز سے چار میل کے فاصلے پر قیفیسوس ندی بہتی ہے اُس کے کنارے اکادیموس کا باغ تھا ۔ ایتھنز کے انحطاط کے زمانہ میں شہر کے ہنگاموں سے بچنے کے لیے افلاطون اس باغ میں پناہ لیتا ہے ؟ اور اپنی طولانی عمر کے پچاس سال اپنے رفیقوں اور شاگردوں کے ساتھ حقیقت کی تفتیش میں گذار دیتا ہے ۔ یہیں وہ مکالمے تیار ہوتے ہیں جن میں اِنسان کی روح اور ذہن ؟ عالم کی اِبتداء و اِمکان کے متعلق دین و دنیا کے تمام مسئلوں پر ایسی سنجیدہ اور پُر مغز بحثیں ؟ ہیں کہ آج تک دنیا اُن کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے ۔ یہی وہ علمی صُحبت تھی جس کے فیض سے ارسطو کا دماغ منور ہوتا ہے اور آئندہ وہ "اُستاد زماں" کا لقب حاصل کرتا ہے یہی وہ پہلی اکیڈیمی ہے جس کا تتبع دو ہزار برس سے یورپ کا ہر ملک اور دنیا کی ہر قوم آج تک برابر کر رہی ہے افلاطون نے اُس کی بنیاد کچھ ایسے طور پر رکھی کہ نو برس تک یہہ اکیڈیمی قائم رہی اور کم سے کم سِرو کے وقت تک اس کے زاویۂ نگاہ میں اور اس کے فلسفہ کے بنیادی اصولوں میں ایک خاص شان نظر آتی رہی ۔

یونان کے شہروں پر جب روم کا قبضہ ہوا تو یونانی فیلسوف اور ادیب اٹلی پہونچے اور اہل روما ان کے شاگرد ہوئے ۔ یونانیوں نے اپنے فاتحوں کو مفتوح کیا ۔ اور یونانی تہذیب کا تسلط سلطنت روما کے وسیلہ سے مغربی

دنیا پر بحر اوقیانوس سے دجلہ و فرات تک قائم ہوگیا آخر اس سلطنت کا آفتاب بھی ڈھلا اور یورپ کی تہذیب چھٹی صدی عیسوی میں طوائف الملوکی فلاکت اور جہل کی تاریکی میں روپوش ہو گئی - ایسے زمانہ میں عرب کی زمین سے ایک سر چشمۂ حیات جاری ہوا جس نے وادیٔ سندھ سے وادیٔ الکبیر تک کے ممالک کی آبیاری کی اور علم و ادب کی بجھی ہوئی شمع کو از سر نو روشن کیا - قرطبہ ؟ اشبیلیہ ؟ طلمسان ؟ قاہرہ ؟ دمشق ؟ بغداد ؟ بصرہ وغیرہ میں علوم کے چرچے پھیلے -

ہندستان اور یونان کی علمی کتابوں کا ترجمہ ہوا قیصر جستینین کی عصبیت سے اکیڈیمی کے اراکین شہر بدر کردیے گئے اور افلاطونی اکیڈیمی تباہ و برباد ہوگئی - لیکن عربوں کی رواداری کی بدولت ان یونانی فلیسوفوں نے عربی علوم کی ترقی میں بہت حصہ لیا شاگرد بھی اُستاد سے فہم و ذکا میں کم نہ تھے - فارابی ؟ ابن سینا اور ابن رشد نے ارسطو کے گُم شدہ فلسفے کو دوبارہ زندہ کیا - ابن خلدون اور البیرونی نے فلسفۂ تاریخ اور مذہب پر حیرت انگیز مقالے لکھے -

الخوارزمی ؟ فرغانی ابن ہشام نے ریاضی پر اور ابوالفدا ؟ مسعودی ؟ ادریسی وغیرہ نے جغرافیہ پر کتابیں تصنیف کیں ؟ یورپ کی قومیں جو پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک عالم تاریکی میں حیران و سرگرداں تھیں اس زمانہ میں عربوں کے علمی اداروں سے بہرہ ور ہوتی رہیں - آخر کار جب اسلامی تہذیب زوال پذیر ہوئی تو اُنہوں نے اُس شمع علم کو جسے اپنے اُستادوں سے حاصل کیا تھا سنوارا اور فروغ دیا - اٹلی کے علم دوست ؟ عیش پسند ؟ حسن پرست ؟ اور سوچ طبیعت ناشنڈے یورپ کے اس نشاۃالثانیہ کے عَلَم بردار بنے - فلارنس کے میڈیچی خاندان کے حکمرانوں نے اکیڈیمیا فلاتونیکا (افلاطونی اکیڈیمی) کو قائم کیا - اور یہ اکیڈیمی اٹلی کی علمی تحقیق اور ادبی سرگرمی کا ماوا اور

ملحا ٹھہری - فرانس کی دیکھا دیکھی اور شہروں اور ملکوں میں بھی اکیڈمیوں کا قیام ہوا - سترھویں صدی میں فرانس نے اندرونی جھگڑوں اور مذہبی فسادوں سے فراغت حاصل کی؟ ملک میں امن و امان اور حکومت کو استحکام حاصل ہوا - تہذیب کو زمانہ کی ہوا راس آئی - ریشلو کا سا غیر معمولی صاحب مصلحت وزیر بر سر کار ہوا - اس نے فرانس کی مشہور اکیڈیمی کی بنیاد ڈالی اور سنہ ۱۶۳۵ع میں اکیڈمی فرانسیز کو زبان کی اصلاح کے لیے قائم کیا ساتھی سند میں اس کی غرض یہہ بیان کی کہ فرانسیسی زبان؟ عوام کی بولیوں؟ وکیلوں کی بیباکیوں؟ درباریوں کی بے عنوانیوں اور بازاریوں کی منہہ زوریوں سے آلودہ ہے اور اسے پاک و صاف کرنے کے لیے لغت صرف و نحو علم بیان و عروض کی کتابیں تیار کرنے کی ضرورت ہے -

سنہ ۱۷۸۹ع کے انقلاب کے بعد اکیڈیمی کی دوبارہ تنظیم ہوئی اور اب اس کی آمدنی سرکاری اور غیر سرکاری ذرایع سے اس قدر ہے کہ اس کے انعامات کی چار دانگ عالم میں دھوم ہے -

خانہ جنگیوں کے خاتمے پر جب بادشاہ فریڈرک اعظم نے اپنی فتوحات اور جمزہ دستی کے ذریعہ پروسیا کو بین الاقوامی برابری کا دعویدار ثابت کردیا تو ملکی احتشام اور سلطنت کے اقتدار کے اعلان کی غرض سے اسے باپ کی قائم کی ہوئی اکیڈیمی کو فروغ دیا - جرمنی کے پایہ تخت برلن میں اس نظام کی بنیاد پڑی جو آج تک علم و ادب کا مرکز ہے -

فرانس کی نقل انگلستان نے کی - سنہ ۱۶۶۱ع میں سیاسی اور مذہبی خانہ جنگیوں سے قوم کو فرصت ملی اور دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی تو چارلس دوم نے سائنس دانوں کی جماعت کو شاہی سند

عطا کي اور اس طريقے سے رائل سوسائٹي کي سنه ۱۶۶۲ع ميں ابتدا هوئي اور سنه ۱۹۰۲ع ميں برٹش اکيڈيمي خاص طور پر ادبيات و لسانيات کي ترقي کے ليے قائم کي گئي -

اس ڈهائي هزار برس کي تاريخ سے يهه معلوم هوتا هے که اکيڈيمي کا قيام قوموں کے نشو و نما ميں خاص اهميت رکهتا هے - هر قوم کي تاريخ ميں ايک زمانه آتا هے جب رهنمايان قوم کو يهه احساس هوتا هے که علم و ادب کي سر پرستي قومي مذاق کي حفاظت کے ليے ضروري هے جذبۂ قوميت کے مظاهره کے ليے علم و ادب ايک ذريعه هے اس ليے جذبۂ قوميت کي استواري کے ساتهه علم و ادب کي ترقي بهي وابسته هے - قوم کي شان صرف آبادي کے هجوم و دولت کي کثرت تجارت و صنعت کي گوناگوني پر منحصر نهيں هے - بلکه وه اس سے کهيں زياده علم و ادب اور فن کے ارتقا ميں نمايان هوتي هے - اُن سے قوم کي ظاهري پر و مذهبي اور اس طرح اس کے روحاني خودداري کا اظهار هوتا هے - هر قوم ايک شخصيت رکهتي هے جس ميں اس کي زندگي کا راز پنهاں هوتا هے - اس شخصيت کو متعين کرنا اور قائم رکهنا اس ليے ضروري هے که گلدستۂ اقوام کي شگفتگي اور شوکتمندي اور عالم انساني کي آراستگي کا باعث هو - علم ادب اور فن وه وسائل هيں جن کے ذريعه حسن و صداقت کے مذاقات قوم کے افراد کي ذهنيتوں کو ايک رشته ميں منسلک کرتے هيں ان مظاهروں ميں ايک گرمي هے جو اختلاف شور اور ايک نور هے جو يگانگت انگيز هے - مشهور انگريزي اديب کارلائل کا قول هے اگر مجهه کے پوچها جائے که سلطنت برطانيه ايک طرف اور شيکسپير دوسري طرف هو اور سوال هو که ان دونوں ميں سے ايک باقي رهے اور دوسرا فنا هو جائے تو ميں بلا تامل کهونگا که سلطنت کا تلف هو جانا مجهے منظور هے ليکن شيکسپير کا نهيں -

علم و ادب اور فن کی حفاظت و اشاعت؟ قوم کی ان ضرورتوں کو پورا کرتی ہے - جن پر اس کے قیام و بہبود کا انحصار ہے ہندستان کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جس جس زمانہ میں ہماری قوم کا تیر اقبال تام فلک پر درخشاں ہوتا ہے اُسی زمانے میں ہماری تہذیب کا نور دنیا کی آنکھوں کو چکاچوندھ کردیتا ہے -

موریہ خاندان کی حکومت کا زمانہ ہے تو ورشنوں کی تنظیم؟ فلسفہ میں انہماک؟ اور اجنتا؟ ایلورا؟ سانچی بھاگھہ اور بھرہُت کے شاہ کار؟ مصوّری؟ بت تراشی اور تعمیر کی ترقی کا پتہ دیتے ہیں - گپتا خاندان کا عہد زریں ہے تو کالی داس کے ناٹکوں؟ سار ناتھہ اور امراوتی کے بے نظیر ستوپاؤں میں فن کی کرشمہ ساری کا نشان ملتا ہے -

مغلیہ خاندان کی شمشیر ہیبت زا اور تدبیر جہاں بانی؟ ہند کی پراگندہ قوموں کو یکجا اور تجارت کی سرحد سے دکن کی گھاٹیوں تک ایک چھتر کے سایہ میں جمع کرنے میں کامیاب ہوتی ہے اور یہی وہ زمانہ ہے کہ بے پایاں دولت و ثروت کی کشش فرنگستان کے تاجروں کو سات سمندر عبور کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور صوبہ‌داروں کے درباروں میں تجارت کا پروانہ حاصل کرنے کے لئے عرض‌داشتیں گذارنے اور نذریں پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے - قومی زندگی کی ہما ہمی اور دلوں کے اُبھار کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ تلسی داس؟ سور داس؟ کبیر اور کیشو شاعری کے دریا بہاتے ہیں اور اپنے انمول رتنوں سے ادب کو مالا مال کرتے ہیں - اہل فن اور کلاونتوں میں تیانسین؟ بیجو اور عبدالصمد؟ کے سحر نگار قلم؟ جس کے مجسمے تیار کرتے ہیں تان سین موسیقی میں وہ دلربا راگ الاپتا ہے جو آج تک دلوں کو مست کرتے ہیں - تعمیرات میں ہندستان کا کوئی جوڑ نہیں؟ کوئی نرا سہر

نہیں جو مغلوں کے ذوق سلیم کا شاہد نہ ہو صرف ایک تاج محل اس داستان کو بقائے دوام بخشنے کے لیے کافی ہے - اس علم و ادب اور فن کا مدار ملک کے حکمرانوں اسوک، چندر گپت، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی سرپرستی اور قدر نوازی پر تھا - اور اس سرپرستی کا راز قومی ضروریات کا احساس تھا - اورنگ زیب کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھرا وہ طلسم جس پر خیالستان تہذیب کا قیام تھا ٹوٹا، دل بجھے، ہمتیں پست ہوئیں لیکن عہد رفتہ کی یاد، ان تصورات کو نسیان کی اس خاموس لحد میں سلا نہ سکی جہاں سے صدائے بازگشت بھی نہ آئے - زمانہ کی سرد مہری اور زندگی کی تلخ کامی کی تیس مغر اور غالب کو تڑپاتی ہے اِن کے دلوں سے جو آہ و فغاں نکلتی ہے اِس کی پر حُزن آواز اس وقت تک ہمارے کانوں میں گونجتی رہےگی جب تک ہندستانی زبان دنیا میں باقی ہے - اٹھارویں صدی کا آخری حصہ اور اُنیسویں صدی کے پہلے پچاس سال ہندستان کی تاریخ میں ایسے گزرے ہیں جن کے بیان میں مورخوں کے قلم خون کے آنسو بہائیں گے - لیکن "ہر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگزرد" - زمانہ بدلتا ہے - انگریزی تعلیم نئے خیالات اور نئے جذبات سکھاتی ہے قومیت کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے - ملک میں ایک نئی روح سرایت کرتی ہے - بیسویں صدی کا آغاز ہوتا ہے - قدیمی کارناموں کی یاد، جاپان کی جنگ، انگریز فتوحات، یوروپ کی جاتی جنگی، ہندستان کے نصف النہر پر امیدوں کے لامتناہی منظر کی جھلک نگاہوں کو لطف اندوز اور دلوں کو امنگوں سے سرشار کردیتی ہے قوم کی عزت و وقار اور قومی شخصیت کے تعین کے خیالات ذہنوں میں موجزن ہوتے ہیں - قدرتی طور پر لوگوں کے دل، قومی زبان اور ادب کی ترقی کی جانب مائل ہوتے ہیں اور ایسے ادارہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اِس غرض کے پورا کرنے میں مددگار اور معاون ہو -

ہندستان میں اردو اور ہندی زبانوں میں انیسویں صدی کی ابتدا سے مغربی تاثرات کے باعث زور افزوں ترقی رہی ہے - دونوں زبانوں میں ادب کا معتدبہ ذخیرہ جمع ہو چکا ہے - مصنفین کی ایک خاص جماعت اِس خدمت میں مصروف ہے کہ علم و ادب کے ہر شعبے کو تصنیفات سے پُر کردے - لیکن ابھی تک علوم کی بہت سی شاخیں ایسی ہیں جن میں کتابیں نہیں ہیں اور جو کتابیں موجود ہیں اُن کی تعداد کم ہے اُن کا معیار اتنا بلند نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے - ادب کی ضروریات سے ہندی اور اردو سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص خوب واقف ہے - زبان کے بارے میں یہہ صحیح ہے "کہ گیسوے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" اُردو اور ہندی میں ایسے ناولوں ڈراموں افسانوں کی کمی ہے جو آدبی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ہوں - تنقید و تاریخ اور سیر کی صنفیں بھی بلکل نسبتہ ہیں - نظم کی حالت یہہ ہے کہ گو غزل، مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ میں کافی اور اعلیٰ پایہ کا مواد موجود ہے - لیکن اِس کی بنا پر یہہ نہیں کہا جاسکتا کہ زمانے کے مذاق کے مطابق نظم ہماری نئی زندگی کی ترجمانی میں کامیابی حاصل کر چکی ہے -

ملک کی آبادی کا خیال کرتے ہوئے یہہ کہنا نا مناسب نہ ہوگا کہ ایک نہایت محدود دائرہ علم و ادب کی اشاعت و توسیع میں دلچسپی لیتا ہے - ہمارے کروڑوں اہل وطن علم سے بے بہرہ ہیں اور ادب کی روحانی مسرت سے بے خبر - مگر اسے بھول نہ جانا چاہیے کہ قومی زندگی کا انحصار انہیں غریب خاکسار صبر کیش انسانوں پر ہے جو اس وقت ان کے فیضان سے مستفید نہیں ہو سکتے جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب وہ اصرار کرینگے کہ انہیں علم و ادب سے لطف اندوز ہونے کا وہی فطری حق حاصل ہے جو معدودے چند انسانوں کو اس وقت ہے - اور ان کا مطالبہ انفرادی اور مجموعی مفاد کے لحاظ سے بالکل حق بجانب ہوگا -

ہندستانی اکیڈمی کے قیام کی غرض ان ضرورتوں کا پورا کرنا ہے - یعنی مختلف علوم پر کتابیں تحریر کرانا؛ ادب کی کمیوں کو پورا کرنا اور اس قسم کی تصانیف کا ملک کے سامنے پیش کرنا جو عوام کی تعلیم کا ذریعہ بن سکیں - یہاں یہہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منتظم جماعتوں کے ذریعہ سے ادب کی ترقی ہو سکتی ہے یا نہیں - بعض اصحاب کا خیال ہے کہ ادب کا تعلق روح کی آزادی سے ہے - اس کی تخلیق کسی مصنوعی ترکیب سے نہیں ہو سکتی - یہہ ممکن نہیں کہ تدریسی اسباب ذہن میں وہ کیفیت پیدا کر سکیں جس کا نتیجہ شعر و سخن کا حسن لطیف ہو - شاعر اور ادیب بنانے سے نہیں بنتے قدرت اپنے قوانین کے مطابق اُنہیں پردۂ مستور سے عالم ظہور میں لاتی ہے - یہہ ایک حد تک صحیح ہے - لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے - ادب جن احساسات اور تخیلات کا حامل ہے وہ تمام انسانوں میں کم و بیش پائے جاتے ہیں - ایسا نہ ہوتا تو ادب کی سلطنت عالمگیر نہ ہوتی - اس کی تاثیر چند انسانوں تک محدود ہوتی - ان احساسات جذبات اور تخیلات کے اظہار کی قابلیت البتہ محدود ہے -

لیکن یہہ حدود اتنے تنگ نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے - ترقیب کی کمی کی وجہ سے بہت سے انسان جن میں یہہ قابلیت موجود ہے اس کے اظہار سے معذور نہیں - اس کی مثالیں ہر زمانہ اور ہر ملک سے مل سکتی ہیں اور تفصیل کی محتاج نہیں - اردو اور ہندی کی تاریخ خود اس کی گواہ ہے - گو اردو اور ہندی میں شاعری کم از کم چار سو برس دیسٹر سے ہو رہی ہے - لیکن دونوں زبانوں میں گلکرائسٹ کے وقت سے پہلے جو ادب موجود تھی اس کی حالت ہرگز ادبی کہلانے کے مستحق نہ تھی - مگر گلکرائسٹ کی سرپرستی

میں پانچ سات برس ہی میں وہ بھی پیدا ہوئی جس پر ہمیں آج تک ناز ہے۔ اس کی کوششوں سے للو لعل؟ بیدل مصر؟ لطف علی بیگ؟ میر شیر علی افسوس؟ میر امن دہلوی؟ سید حیدر بخش حیدری وغیرہ ایسے ادیب کلکتہ میں جمع ہوئے جن کے شاہکاروں کے لئے ہندستان ہمیشہ اُن کا رہیں منت رہےگا اگر عصر موجودہ میں ایک ایسی جماعت ہو جسے علم و ادب کی ضروریوں کا پورا احساس ہو۔ جس کے ارکان کا نصب العین ایک؟ مذاق صحیح اور نظر وسیع ہو؟ جن کا دل ادبی تعصبات سے خالی اور اہل فن و ہنر کی ہمدردی سے مملو ہو؟ جو ادب کی خدمت کے لئے نیک نیتی کے ساتھ مستعد ہو؟ علم و ادب کی توسیع کے لیے کافی آمدنی کے ذرائع رکھتی ہو تو یہہ ممکن ہے کہ یہہ جماعت وہ کام کر سکے جو گلکرائسٹ نے آج سے سو برس پہلے انجام دیا تھا۔

کسی کا قول ہے کہ جماعت میں کرامت ہے۔ اکیڈیمی کو بھی جس خدمت کی توفیق ہو سکتی ہے اس حالت میں جب کہ اس میں جماعت کی خوبیاں پائی جائیں۔ یعنی یہہ کہ وہ محض چند انفرادی ہستیوں کا مجمع نہ ہو جن میں کوئی خصوصیت مشترک نہیں یا جن میں ہر شخص کا زاویہ نگاہ مختلف ہو جماعت اس وقت تک جماعت کہلانے کی مستحق ہے جب کہ اس کے افراد ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہوں ان کی دھنیں ایک آئیڈیل کے تابع کام کرتی ہوں اور ان کی مجمعہ اور لگاتار کوششوں کا مقصد ایک ہو۔ جس طرح مختلف تاروں کے چھیڑنے سے اور مختلف سُروں کے میل سے ایک سُریلا راگ نکلتا ہے اسی طرح ایک اکیڈیمی کے مختلف طبائع کے اراکین کے ملنے سے ایک لطیف دھنیت پیدا ہو سکتی ہے جن پر مذاق صحیح اور جس ادب کی بنیاد قائم ہو۔

ہندستانی اکیڈیمی کی کامیابی کا اندازہ کرنے کے لیے مقالات اور تصنیفات کی کثرت یا انعاموں اور عطیوں کی افراط صحیح معیار نہیں بلکہ یہہ دیکھنا ہوگا کہ کہاں تک اس نے اولاطون کی ابتدائی اکیڈیمی کی طرح ادبیات کے بارہ میں ایسے اصول قائم کیے جو امتداد زمانہ کے ساتھہ وسعت پذیر ہوں لیکن جن کی بنیادیں ہل نہ سکیں کہاں تک فرانسیسی اکیڈیمی کی طرح زبان کے سنوارنے اور ادب کی آرائش میں ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے ایک طرف تصنع اور تنگ نظری اور دوسری طرف بے ضابطگی و بے اصولی سے بچ کر ادب میں روح قومی کے اظہار اور تعین کی صلاحیت پیدا ہوئی اور کہاں تک اس کی کوششوں کی وجہ سے ہمارے دلوں کے سامان انبساط اور ذہن کی قوت پرواز میں اضافہ ہوا ۔

تارا چند

گورنمنٹ صوبہ و متحدہ نے ہندستانی زبان و ادب کی ترقی و حوصلہ افزائی کے لیے سنہ ۱۹۲۷ ع میں ہندستانی اکیڈیمی ؟؟ قائم کی تھی جس کو کم و بیش ۱۰ سال ہو گئے ۔ اس قلیل مدت میں کسی اکیڈیمی کا اندازہ یا جائزہ لینا قبل از وقت ہے ؟ تمدن اور علمی تحریکوں کی عمریں ؟ دو چار سال سے نہیں ؟ بلکہ قرنوں اور صدیوں سے لگائی جاتی ہیں ۔ تاہم اکیڈیمی نے اس مختصر دور میں جو عملی کارنامے پیش کیے ہیں (اور جو ایک رپورٹ کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں) اُن سے یہہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکیڈیمی کا مستقبل کیا ہو گا ؟

اکیڈیمی کا تاریخی مفہوم کیا ہے ؟ اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں و وہ کن حالات کے ماتحت ؟ عالم وجود میں آئی ہے ؟ ان اُمور کی تفصیل

ہمارے جنرل سکریٹری ڈاکٹر تارا چند صاحب ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایل نے ایک مستقل مقالے کی صورت میں بنس فرمائی ہے جس کو ناظرین انہیں صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے ۔

اب صرف رسالہ "ہندستانی" اور اس کی حیثیت و نوعیت کے بارہ میں کچھ عرض کرنا باقی ہے ۔ یہ رسالہ انڈین اکیڈمی کے شعبۂ اردو کا آرگن ہوگا یہ سال میں چار بار نکلے گا ۔ اس میں ادب و انشا ، لسانیات و تنقید ، آثار قدیمہ و تاریخ و نیز دیگر تحقیقی و عملی موضوعات پر مضامین ہونگے ۔

رہا اُردو زبان کا مسئلہ ، تو حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے اور "کثرت تعبیر" سے ترسان ، اس لئے فی الحال اس کے بارے میں کوئی صاف ، مکمل اور قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ۔

آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب دلفریب نے (جو اکیڈمی کے بھی ایک ذمہ دار ممبر ہیں) ۱۹۲۸ء کے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اُردو کے بارہ میں یہ خیالات ظاہر فرمائے ہیں —

"معمولاً جو زبان بولی جاتی ہے وہ بمقابلہ بلند ہندی کے ، بلند اُردو ہے ، اس کی وجہ تلاش کرنے کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ، عربی اور فارسی زندہ زبانیں ہیں جو عرب ، عراق عرب ، ایران اور افغانستان کے کچھ حصوں میں بولی جاتی ہیں خالص سنسکرت زبان کہیں نہیں بولی جاتی ۔ یہ صرف پنڈتوں کے حلقوں میں محدود ہے اُردو کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ وہ ہندستان کے ہمسایہ ممالک سے رشتۂ اتحاد رکھتی ہے ۔ بین الاقوامی تعلقات

اور ہمسایہ ممالک کے لوگوں کے ساتھ آزاد میل جول
بعینی ہے اِن ممالک سے لوگوں کی مسلسل آمد و رفت ؟
اُردو کی قوت میں اضافہ ؟ اور اس کی بدرنجی ترقی میں
اعانت کرے گی - ہندستان ؟ جس کا تعلق مغرب کے
ایسیائی ممالک سے بمدنی اور تجارتی دونوں حیثیتوں سے
قریب تر ہوتا جارہا ہے ؟ درآمد میں وہاں کے الفاظ
و لغت کو بھی اپنی زبان میں لاکر جذب کرے گا - اس لیے
یہہ ایک خیالی اُمید نہیں ہے کہ کچھہ زمانہ کے بعد
ہندستانی زبان ؟ عربی ؟ترکی ؟ فارسی ؟ اور دیگر زبانوں
کے الفاظ سے مالا مال ہو جائیگی - یہہ تمام فوائد ؟
جو اُردو کو حاصل ہیں اس کے اعتبار سے اردو ؟ تمام
ہندستان کی " لنگوا فرینکا " ہونے کی مدعی ہو سکتی
ہے "

پنجاب اور دکن کی اُردو میں ؟ فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت و بہتات ؟
بعید نہیں ؟ اسی قسم کے خیالات کے باعث ہو لیکن صوبۂ متحدہ کی حالت
مختلف ہے یہاں بعض لوگ اُردو میں اگر فارسی اور عربی کا عنصر غالب
دیکھنا چاہتے ہیں تو بعضوں کا یہہ بھی خیال ہے کہ اُردو کو فارسی اور
عربی سے نہیں بلکہ اُسے ملک کی ہندی بھاشا سے ہم‌آہنگ ہونا چاہیے -

ع - " ہر سو ہزار عقدۂ مشکل بیاد اند "

اصل یہہ ہے کہ ہمارے ذہن میں اُردو کے متعلق ؟ ابھی کوئی صاف
اور قطعی پروگرام نہیں ہے لیکن جس طرح مختلف ذہنوں اور دماغوں
میں کسی چیز کا خاکہ بار بار بنتا اور بگڑتا ہے جو اس بات کا ثبوت
ہوتا ہے کہ کسی پُر سکون لمحے تک ہمیں یقیناً پہونچنا ہے ٹھیک اسی
طرح اردو کے آئندہ پروگرام کے بارے میں بھی ؟ ہمیں ؟ جلد یا بدیر ؟ یہہ

طے کرنا ہوگا کہ اس کو کس راستے اور کس طریقے پر چلنا چاہیے اور اُس کی صحیح منزل کیا ہے ؟ فی الحال تو مسئلۂ زبان کے بارہ میں —

ع "اس قدر ہمت کے بانگ جرس سے می آید"

سے زیادہ نہ ہم کو معلوم ہے اور نہ شاید اس سے زیادہ معلوم کرنے درہم بیمار ہیں۔

لیکن اردو زبان کے اِس وسیع تحمل سے قطع نظر ؟ غالباً اِس سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ زبان کی جنسیت و نوعیت ؟ بہت کچھ مقامی اور اسے مخاطبین کی حیثیت و نوعیت پر موقوف ہے جس کا اندازہ اکثریت کے طبعی رجحان اور اُن کے لب و لہجہ کے اختلاف سے بخوبی ہو سکتا ہے اسی کے ساتھ ؟ ہر لکھنے والے کی بھی آرزو ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ اِس کے گرد و پیش ؟ انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد ؟ اُس کے خیالات سے مستفید ہو سکے —

اِس لحاظ سے ہمارے صوبے کے اہل قلم ؟ زبان کی سنجیدگی و سنگینگی کو نقصان پہونچائے بغیر ؟ اگر کسی قدر صفائی و سادگی کو گوارا کر لیں تو کیا جو افادہ اِس سے متصور ہے وہ اِس خفیف سے ادبی جرم کی تلافی نہ کر سکے گا ؟

کسی بلند نظر ادیب کے لیے زبان کی بلندی و پستی ؟ لفظوں کی سنجیدگی و آسانی کوئی معنی نہیں رکھتی جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے ادیب کا اصل راز یہ بتایا ہے —

"اصل میں یہ چیز زبان نہیں ہے جو صحیح ؟ وزدار ؟ پاکیزہ اور نفیس ہوتی ہے — بلکہ یہ ذہن ہے جو اِس میں متشکل ہوتا ہے —"

پھر صورت ممالک متحدہ میں مفاہمے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی بیچ بیچ کا راستہ اختیار کیا جائے جنانچہ اکیڈمی اور اُس کے کارکنوں کے نقطۂ نظر اور فرائض کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے ؟

سر ولیم میورس نے اُس تقریر کو بیس نظر رکھنا چاہیے جو موصوف نے اکیڈمی کے افتتاح کے وقت بمقام لکھنؤ ارشاد فرمائی تھی - اُس کا خاص اقتباس یہہ ہے :—

"ہر ہندی لکھنے والے کے پیش نظر یہہ مقصد ہونا چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے پڑھنے کے لیے کتاب لکھہ رہا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کو خیال رکھنا چاہیے کہ اُن کی لکھی ہوئی کتاب کو ہندو پڑھیں گے - ممکن ہے یہہ امید پوری نہو لیکن میں یہہ امید کرتا ہوں کہ اکیڈمی کے اراکین اس پر بالکل تیار ہونگے کہ وہ کسی زبان میں فرقہ وارانہ بیان پیدا نہ ہونے دیں گے اور زبانوں کو مخصوص جماعت کی زبان نہ ہونے دیں گے - مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر اردو لکھنے والے عربی جملے استعمال کریں جیسا کہ بعض پولیس کے دور نامچے لکھنے والے کچھہ دن پہلے کیا کرتے تھے یا ہندو مصنفین سنسکرت کے الفاظ خواہ مخواہ اپنی عبارت میں بھریں تو یہہ لوگ دوہری مصیبت لا رہے ہیں پہلا جرم یہہ ہے کہ وہ خود بھی دوسرے فریق سے دور ہوتے جاتے ہیں اور اپنے مخاطبوں کو بھی اُن سے دور کرتے ہیں اِس طرح یہہ اپنی جرم سے زیادہ معسریتی جرم ہے - اِس کے علاوہ اِس طریقے سے وہ اپنی کتابوں کو ناقابل فہم بناتے ہیں جن کو عام آدمی نہیں سمجھتے اور یہہ ایک ایسا گناہ ہے جو وہ اکیڈمی کے مقاصد کے خلاف کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اکیڈمی کے اراکین اس کا خیال رکھیں گے - "

لیکن حقیقت یہہ ہے کہ ہندی اور اردو میں شاید اتنا اختلاف نہیں ہے جتنا ہندی اور اردو کے پرستاروں میں ہے اس لیے اس مسئلے کا حل؟ اردو اور ہندی کی کمر ٹوٹنے سے اتنا ممکن نہیں ہے جتنا اردو اور ہندی کے علم برداروں کی ذہنیت کی اصلاح سے - یہہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہندستان کی تمام قومیں تو ہندستان کی ترقی میں متعدد قالب اور ایک جان ہو کر رہ سکتی ہیں لیکن ہندستان کی مختلف زبانیں اپنے اپنے مخصوص امتیازات کو قائم رکھہ کر ترقی نہیں کر سکتیں! حالانکہ اردو اور ہندی؟ اپنی اصل کے اعتبار سے باہم اُتنی مختلف بھی نہیں جتنی خود یہہ قومیں!

یہہ جو کچھہ عرض کیا گیا ممکن ہے اردو اور ہندی کے کلّی مسئلے کا اس سے حل نہ ہو سکتا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقامی حیثیت سے عملاً اس کا حل اسی طرح اسیر اور آبرے کو برابر کرنے سے ممکن ہے - اس بنا پر بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے رسالے کی پالیسی اور اس کا پروگرام انہیں لائنس پر ہو -

دوسرے سعیہ ہائے علمی کے مانند؟ ملکی لٹریچر کی نجات بھی ملک کی متحدہ ذہنیت کی تشکیل پر موقوف ہے - یہہ مبارک کام ہندستانی اکیڈمی کے مابحت (جس میں ہمارے صوبے کے بہترین دل و دماغ شریک ہیں) اگر انجام نہ پا سکا تو اس سے زیادہ ملک کی شامت اور بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے؟

رسالے میں جہاں ہر قسم کے علمی؟ ادبی؟ تنقیدی اور لسانیاتی مضامین کے نکالنے کا ارادہ کیا گیا ہے وہیں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ساتھہ کے ساتھہ تخلیقی لٹریچر کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی رہے -

س دیل میں چونکہ افسانے اور نظمیں بھی آتی ھیں اس لیے اس کے بارہ میں بھی کچھہ عرض کر دینا غالباً بیجا نہ ھو —

یہہ امر بے حد مسرت انگیز ھے کہ عام طور پر اردو میں ایسے لکھنے والوں کی کافی تعداد موجود ھے جو بدیع و جمیل ایسا ؟ اور خوبصورت طرز نگارش پر قدرت رکھتے ھیں لیکن اسی کے ساتھہ ؟ علمی و ادبی چیز کے نام سے ایک ایسے "سراب" و "فریب" کی بھی روز بروز افزائی ھوتی جا رھی ھے جس سے بچنا اور بچانا ؟ ھر بھی خواہ اردو کا اولین فرض ھونا چاھیے - یہہ وہ "پریشان خیالی" و "پولیدہ بیانی" ھے جسے عام طور پر آرٹ سے متّہم کیا جاتا ھے - اصل یہہ ھے کہ فکر و مطالعے کی زحمتوں سے بچ کر ؟ اگر آسانی سے تحریروں کو بلند و وقیع کر کے دکھانا مقصود ھو تو عموماً اسی قسم کی ھوائی چیزیں تیار ھوتی ھیں - اسی لیے ادب کے ساتھہ ساتھہ ھمارے نوجوان طبقے کی زندگی بھی سر تا سر سطحی اور مصنوعی ھوتی جارھی ھے حالانکہ ایک برقی یافتہ زبان کی حقیقی عظمت ؟ سنجیدہ غور و مطالعہ اور پُر فکر سائستہ خیالی پر منحصر ھے بغیر اِس کے نہ صحیح ادبی ماحول تیار ھو سکتا ھے اور نہ اعلیٰ قسم کا شاعر و ادیب - یہہ صحیح ھے کہ اصلی شاعر و ادیب بنایا نہیں جاتا بلکہ وہ ھوتا ھے لیکن اِس باب میں ھم قطرت کی اِتنی اعانت ضرور کر سکتے ھیں کہ اِس کے لیے ایک اچھی زمین تیار کر دیں جس کے لیے سخت سے سخت احتساب اور بس لازمی و ضروری ھے (چنانچہ اسی مصلحت سے اکیڈیمی نے اپنے یہاں ریویو کا خاص اھتمام کیا ھے) اسی طرح شعر و نظم کے بارے میں بھی ھمارا آئیڈیل یہہ ھے کہ نہ وہ کھٹوپی کی طرح بے کیف و بے روح ھو اور نہ پھر اِس درجہ پُر الم و رقیق کہ قدم قدم پر حرکت قلب بند ھونے کا احتمال ھونے لگے افلاطون نے اپنے آئیڈیل ریپبلک میں شاید اسی قسم کے شاعر و شعر کی گنجائش نہیں پائی تھی -

بہر صورت ہم احتیاطاً لیکن خلوص کے ساتھ یہہ آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ نظموں اور افسانوں میں جب تک حقیقی تخلیقی شان نہو اُس وقت تک رسالے کو اِن چیزوں سے مامون و مصئون رکھنے کی ہماری انتہائی کوشش ہوگی -

---

عام علمی و ادبی مضامین کے زبان و بیان اور اُن کے طرز انشا کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر کیا ہوگا ؟ عرض ہے کہ اِس میں ہر ایسا مضمون درج کیا جائے گا جو معقول ہو؟ مفید ہو اور دلچسپ ہو - ہمارے نزدیک ہر اچھا مضمون معقول بھی ہو سکتا ہے اور مفید و دلچسپ بھی - مختلف طبائع مختلف قسم کی چیزیں پسند کرتی ہیں لیکن یہاں مختلف طبائع کے معنی؟ ادبی اور بد مذاق طبائع کے نہیں ہیں -

ہمارا یہہ معیار بظاہر بہت مختصر اور بیس با افتادہ معلوم ہوگا لیکن اِس سے غالباً کسی کو انکار نہ ہو کہ اِس کا نباہنا کافی مشکل اور دشوار ہے -

ایڈیٹر

تبصرے

عرب و ہند کے تعلقات

مصنفہ جناب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی - تقطیع ۲۰×۳۶
صفحات ۳۰۹ - ٹائپ کی طباعت - کاغذ دبیز - شائع کردہ
ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد سنہ ۱۹۳۰ع - مجلد قیمت چار روپیہ -

(از ڈاکٹر رفیع احمد بی - ایچ - ڈی - الہ آباد یونیورسٹی)

یو - پی کی ہندستانی اکیڈیمی محتاج تعارف نہیں - اس نے اپنے چند سالہ زمانہ حیات میں اردو اور ہندی کی جو خدمت کی ہے وہ اس کے کارکنوں کے لیے باعث فخر اور اردو ہندی کے خیرخواہوں کے لیے موجب مسرت ہے - ایک طرف ملک کے قابل قدر اہل قلم کو صلائے عام ہے کہ کسی مفید مبحث پر سلیس و سہل زبان میں تصنیف و تالیف کرکے اردو ہندی کے سرمایہ میں قیمتی اضافہ کریں چنانچہ اکیڈیمی کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دوسری طرف ملک کے مایۂ ناز اصحاب علم و فضل کو دعوت دی جاتی ہے کہ ہندستانی اکیڈیمی کے سامنے اردو یا ہندی میں کسی اہم موضوع پر تقریر کرکے اپنے علمی تحقیقات کے نتائج سے قوم کو بہرہ‌مند کریں - چنانچہ اب تک اس قسم کی کئی ایک تقریریں ہو چکی ہیں اور ان کو اکیڈیمی نے آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے - منجملہ ان شائع شدہ تقریروں کے - کتاب زیر تبصرہ بھی ہے - جو مولانا سید محمد سلیمان ندوی کی پانچ تقریروں کا مجموعہ ہے - علامہ موصوف کی محققانہ و عالمانہ شخصیت اور موضوع کی تاریخی و افادی اہمیت اور پھر ہندستانی اکیڈیمی کی سرپرستی کتاب میں ان سب باتوں سے حائز طور پر بھی یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ

کتاب فی الواقع ایسی ہی بے نظیر ہوگی - اور ہم خوش ہیں کہ یہہ کتاب موقع سے بھی کچھہ زیادہ کامیاب بلکہ لاجواب مصنف ہے اور خلوص دل سے فاضل مصنف ؟ ہندستانی اکنڈمی اور دنیائے اردو کو اس علمی کارنامہ پر مبارکباد دیتے ہیں -

کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے - پہلے حصہ میں آثار تعلقات اور ہندستان کے عرب سیاحوں کا ذکر ہے اس میں ابتداءً بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی روایات میں عرب و ہند کا تعلق ہبوط آدم سے قائم ہے - اگرچہ یہہ روایتیں فن حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ ہیں - مگر مسلمانوں کی اس ذہنیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ ہندستان کو اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں ؟؟ پھر عرب و ہند کے ابتدائی تجارتی تعلقات؟ لفظ ہند کی تحقیق؟ اور ہندستان پر عربوں کے حملہ کا ذکر ہے آخر میں - عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا ابن خرداذبہ المتوفی ۲۵۰ھ سے لیکر ابن بطوطہ سنہ ۷۷۹ تک مختصراً ذکر کیا گیا ہے - اور دوران ذکر میں بہت سی مفید اطلاعات درج ہیں -

دوسرے حصہ کا موضوع تجارتی تعلقات ہے اس میں خلیج فارس کے اور ہندستان کے مغربی بندرگاہوں - دریائی تجارتی راستوں اور ہندستان کی پیداوار اور پیوند کا ذکر ہے اسی سلسلہ میں یہہ بتایا گیا ہے کہ زبان عربی بلکہ قرآن پاک میں کون کون سے ہندی الفاظ داخل ہیں - مثلاً عربی میں مسالوں اور اکثر جڑیوں اور کئی دواؤں کے نام - مانند فلفل - صندل - مسک - اطریفل ہندی الاصل ہیں - قرآن شریف میں بھی ہندی لفظ زنجبیل مسک اور کافور آئے ہیں - پھر ہندستان کی تجارتی در آمد کا ذکر ہے اسی موقع پر اس سوال پر بحث کی ہے کہ آیا اہل ہند بتی پرست تھے - بعض انگریز مورخوں کا خیال ہے

کہ کُل ہندو نو نہیں - لیکن کم از کم سندھ اور گجرات کے لوگ ضرور
جہاردانی کرتے تھے -

تیسرے حصہ کا مبحث عرب و ہند کے علمی تعلقات ہے - ابتداءً
مصنف نے اپنے مآخذ کا ذکر کیا ہے پھر علمی تحقیقات کا آغاز برآمکہ
سے کرتے ہیں - اسی ذیل میں برآمکہ کی اصلیت کی تحقیق کی ہے
عام طور پر برآمکہ مجوسی الاصل سمجھے جاتے ہیں بلخ میں نو بہار
نام آتش کدہ تھا - جس کے یہہ لوگ بڑے مغاں تھے - مولوی عبدالرزاق
صاحب نے تاریخ البرامکہ میں برمک کی اصل برمغ بتائی ہے مگر
مولانا ندوی کی تحقیق ہے کہ نہ یہہ لوگ مجوسی الاصل تھے اور نہ نو
بہار آتش کدہ تھا - بلکہ وہ بودھوں کا مندر تھا - بودھوں کے معبد کو وہار
کہتے ہیں - اسی وہار کی جرائی بہار ہے - اس میں کچھہ شک
نہیں یہہ خیال سب سے پہلے مولانا نے نہیں بیان کیا - کیوں کہ
جیسا کہ خود موصوف نے لکھا ہے - رجاو نے کتاب الہند کے انگریزی
ترجمہ کے مقدمہ میں نوبہار کی اصل نو وہار قرار دی ہے - اور
اسی طرح انسائکلوپیڈیا آف اِسلام کے مضمون برآمکہ میں اس کی طرف
اِشارہ کیا گیا ہے - مگر اسی کے ساتھہ اس میں بھی کچھہ شک نہیں
کہ مولانا ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس خیال کو نہایت خوبی کے
ساتھہ بادۂ ثبوت کو پہونچایا ہے - اس کے بعد مولانا نے برآمکہ کی قدر
دانی و علم پروری کی بدولت سنسکرت سے عربی میں جو ترجمے ہوئے
ان کا مفصل ذکر کیا ہے - اسی ذیل میں یہہ بھی بتایا ہے کہ بدن چار
سنسکرتی اصطلاحیں عربی میں جوں کی توں مستعمل ہیں - رقوم
ہندسہ کی بابت لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے لیں - اس موقع
پر لفظ ہندسہ کی تحقیق کی ہے عام طور پر اس کا تعلق لفظ ہندسے
بتایا جاتا ہے مگر درحقیقت یہہ فارسی لفظ اندازہ کا معرّب ہے - آخر

میں البیرونی کے علمی کارناموں کا اور پھر برد و شطرنج کا ذکر ہے جو ہندستان سے عرب پہونچے -

چوتھے حصہ کا عنوان عرب و ہند کے مذہبی تعلقات ہے - مآخذ کا ذکر کر کے ایک نہایت دلچسپ اور نیتنس افرور تحقیق کی ہے - وہ یہہ کہ مسلمان عرب فاتحین ترک و افغان و مغل فاتحین ہند میں بڑا فرق تھا - آخرالذکر قوموں کو جونکہ مسلمان ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا - بلکہ غیر مسلم کی ایک کافی تعداد اُن میں موجود تھی - اس لیے وہ ضرور اِسلامی روح سے محروم تھیں جس کا یہہ لازمی نتیجہ تھا کہ یہہ لوگ اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھہ وہ اِسلامی سلوک نہیں کرسکے جو عربوں نے اپنی مفتوح قوموں کے ساتھہ کیا - عربوں نے جن قوموں کے ساتھہ معاہدہ کیا انکی مذہبی آزادی برقرار رکھی اور ان کے مذہبی عبادتگاہوں کو تہس نہس نہیں کیا - ترک و افغان فاتحین نے ہندوؤں سے جزیہ تو لیا مگر اس کے عوض میں وہ حقوق نہیں دیے جو عرب مسلمان جزیہ لینے پر مفتوحین کو دیتے تھے - محمد بن قاسم نے سندھہ فتح کیا تو اس نے سندھہ کے غیر مسلم لوگوں کو وہی حقوق دیے جو عربوں نے عراق و شام کے یہودیوں عیسائیوں اور پارسیوں کو دیے تھے اس نکتہ کو نہیں نظر نہ رکھنے کا یہہ نتیجہ ہے کہ ان نو مسلم ترکوں - افغانوں اور مغلوں کے طریقہ ملک گیری و حکمرانی پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ اِسلام کے سر تھوپے جاتے ہیں حالانکہ ان کو اِسلام سے کچھہ تعلق نہیں -

اس تحقیق کے بعد فاضل مصنف نے مسلمانوں کی تحقیقات - ہندو مذہب کی تاریخ بیان کی ہے اور نہایت مفید دلچسپ معلومات پیش کیے ہیں - اسی ضمن میں لفظ سمنہ کی تحقیق کی ہے اور بتلایا ہے کہ اس سے بودہ مت کے لوگ مراد ہیں - اور لفظ بت کی اصل بدھہ ہے - پھر یہہ

بتلایا ہے کہ مختلف تجارتی - معاشرتی و سیاسی تعلقات کی وجہ سے سندھ، گجرات، کارومنڈل و جزائر، بحر ہند میں اسلام آہستہ آہستہ کیونکر پھیلتا چلا گیا - اسی ذیل میں یہہ ایک جغرافیائی معلومات بیان کی ہے کہ آج سے ایک ہزار برس پہلے کسی ہندو راجہ کے حکم سے ہندی یا زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا گیا تھا - جنم پر مسئلہ وحدۃالوجود کے بارے لکھا ہے کہ ایسی کوئی بیّن دلیل موجود نہیں جس سے یہہ ثابت ہو سکے کہ یہہ تخیّل مسلمانوں میں ویدانت سے آیا - ممکن ہے کہ یہہ افلاطونی فلسفہ کا اثر ہو - البتہ منصور جس وحدۃالوجود کا قائل تھا وہ محتاط صوفیوں کا وحدۃالوجود نہیں وہ حلول کا قائل تھا - ممکن ہے وہ یہہ عقیدہ ہندستان سے لے گیا ہو - مولانا کا یہہ خیال صحیح ہے کہ ہندوؤں میں وحدت تنزیہی کا جو تخیل پیدا ہوا وہ اسلام کے اثر سے ہے -

پانچویں حصہ کا موضوع سراسر تاریخی ہے - اس کا عنوان، ہندستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے، ہے اور یہہ سب سے بڑا حصہ یعنی نصف کتاب سے کچھہ ہی کم ہے - شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی جو آبادیاں قائم ہوئیں - اس علاقہ میں یہ صرف یہہ ہوا کہ باہر سے مسلمان آکر آباد ہوئے بلکہ خود ملک کے باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا - یہہ اثر دو طرفہ کوششوں کا نتیجہ تھا ایک تو عرب تاجروں کی تجارت کا اور دوسرے سرائیدیب کے پیش قدم کی بیاوت کے لیے آنے والے صوفیوں اور درویشوں کی تبلیغ کا - پھر اسلام کے چھہ مرکز سر بفلک، مالدیب، ملیبار، کارومنڈل، گجرات اور سندھہ کی اشاعت اسلام کا مفصل بیان ہے - گجرات کے ذیل میں ابن بطوطہ کے سفر نامہ سے تمام ساحلی مقامات کا حال لکھا ہے - اور سندھہ کے ذیل میں وہاں کی مسلمان حکومتوں کے مختصر حالات لکھے ہیں اور عربی کتب تاریخ و جغرافیہ کے مفید

و دلچسپ افسانوں کا ترجمہ دیا ہے - منصورہ کا مفصل تذکرہ ہے - عربی خلیفوں کی حکومتوں کے بعد سومری اور سمہ بادشاہوں کا حال ہے - اور پھر یہاں کے مشہور شہروں کا ذکر کیا ہے - اس کتاب کی زبان نہایت شگفتہ - دلکش اور اکیڈیمی کے نصب العین کے مطابق ہے یعنی مثلاً عربی الفاظ اور بعض فارسی تراکیب سے خالی ہے - یہ بالکل خشک ہی ہے نہ سوچ و رنگیں - جہاں موقع آجاتا ہے تو مولانا نہایت بے تکلفی سے ایسے جوہر قلم دکھا جاتے ہیں کہ بار بار اُن سے لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے ذرا اس تمثیل کی لطافت کو ملاحظہ کیجئے —

"مگر فتوحات کا یہ سلسلہ اس جہاز کی طرح تھا جو ایک زور میں سمندر کے سینہ کو چاک کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے - لیکن جیسے ہی وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے پیچھے پانی سمٹ کر ایسا ہو جاتا ہے کہ پانی کی سطح میں اس غیر معمولی شگاف کا نشان بھی نہیں ملتا" ایک جگہ اور لکھتے ہیں "ایک پل سمندر کا ایک ہاتھ اگر عربوں کے ارض حرم کا دامن تھامتا ہے تو اس کا دوسرا ہاتھ ہندوؤں کے آریہ ورت کے قدم چھوتا ہے -"

مولانا نے لفظ "بندرگاہ" کو مونث استعمال کیا ہے - لفظ "بندر" تو مبتدأ مذکر ہے مگر "بندرگاہ" کے بارے تامل ہے - میں نے اپنے چند احباب و رفقائے کار سے دریافت کیا تو انھوں نے مذکر بتایا - فرہنگ آصفیہ میں اسے مونث لکھا ہے مگر نوراللغات میں مذکر ہونا درج ہے اور غالباً یہی صحیح معلوم ہوتا ہے - امید ہے کوئی اور صاحب اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر مزید روشنی ڈالیں گے -

طباعت اس کتاب کی نائب کے حروف میں ہے اور کشادہ کشادہ - مگر افسوس ہے کہ طباعت کی بے شمار غلطیاں رہ گئیں - اگرچہ آخر میں

جهه صفحوں کا صحیح نامه لگا هوا هے باهم اور بهت سی غلطیاں هیں
لیکن سنه عموماً "سندهه" جهپا هے - ابن خرداذبه هر جگه ابن حرداربه
(ر کے ساتهه) هے اول تو دال هي سے هونا چاهیے تها ورنه زیاده سے زیاده
ذال سے - فهرست مضامین کو نهایت مفید طریقه سے مرتب کیا گیا هے
البته اپني صاحب ضرور هے که متن کتاب میں حصوں کے علاوه - جو عنوانات
قائم کیے گئے هیں اُن کو فهرست میں جلي طور پر نهیں دکهلایا گیا - اس لیے
اهم اور دیلي مسائل میں کچهه فرق سرسری نظر میں معلوم نهیں هوتا -
اب میں چند نایں مشوره عرض کرتا هوں -

شروع میں ابن حوقل کا بنایا هوا نقشه اور سنده کا حو نقشه دیا
گیا هے - وه غلط حدود اربعه قائم هونے کي وجه سے کسي قدر مضحکه خیز
هوگیا هے اگر مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کو باهم بدل دیا جائے تو
یهه زیاده غلط نهیں رهتا "بحر هند" هندستان کے شمال مغرب میں هے
نه که جنوب مشرق میں مولانا نے صفحه ۳۷ اور ۳۹۷ پر اودهي فتوح کے علاوه
ایک اور فتوح کا سندهه کے قریب هونا بتلایا هے ترما نه قیام لندن مجهے بهي
یهه خیال هوا تها که شاید فتوح درهیں لیکن جب میں نے کچهه جستجو
کی تو یهه خیال غلط نکلا کیننگهم وغیره کے قدیم جغرافیوں میں صرف ایک
هي فتوح کا ذکر هے - هندستان واپس آنے کے بعد معلوم هوا که جناب
مولوي سید مقبول احمد صاحب فتوح کی تاریخ لکهه رهے هیں - ان
کی "حیات خلیل" کے بعد ان کي تحقیق و کاوش کا کون قائل نه هوگا -
اُن کے نزدیک بهی فتوح ایک هی هے - مولانا سید سلیمان ندوی نے
دو حوالے دیے هیں - ایک مسعودی کا اور دوسرا تساري کا - آخرالذکر
کي احسن التقاسیم یهاں الهآباد میں نه مل سکی - مروج الذهب مطبوعه
پیرس کو پهر دیکها - مولانا نے صفحه ۳۷۲ کا حوالہ دیا هے - اس پر یهه
عبارت هے —

"ملک الہند البلہری - ملک قنوج من ملوک السند بورہ ہذا اسم کل ملک یلی القنوج وھذا مدینۃ یقال لہا بورہ باسم ملوکھم و قد صارت الیوم فی حیز الاسلام وھی من اعمال الملتان ....و بورہ ھذالذي ھو ملک القنوج ھو صند البلہري ملک الہند - "

ترجمہ — ہندستان کا بادشاہ بلہری ہے اور بادشاہان سندہ میں سے قنوج کا بادشاہ بودرہ ہے - قنوج کے ہر بادشاہ کو بودرہ کہتے ہیں - اور یہاں ایک شہر ہے- جسے شاہان قنوج کے نام پر بورہ کہتے ہیں اور یہہ شہر آج کل مسلمانوں کے قبضہ میں ہے اور ملتان کے متعلق ہے - بورہ بادشاہ قنوج - ہندستان کے بادشاہ بلہری کا مخالف ہے اس بیان سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ مسعودی قنوج نام شہر کو نہیں ؟ بلکہ بورہ نام شہر کو مسلمانوں کے قبضہ میں بتلاتا ہے - مولانا نے اس سے غلط نتیجہ نکالا کہ قنوج دو ہے - مسعودي ہندستان کے دو حصے کرتا ہے ؟ ایک شمالي - جسے وہ سندھہ کہتا ہے - اور قنوج کے بادشاہ کو ؟ شاہان سندھہ سے قرار دیتا ہے - دوسرا جنوبی - جسے وہ ہند کہتا ہے اور یہاں کے بادشاہ کو بلہری بتاتا ہے - اور یہہ کہتا ہے کہ ان دونوں بادشاہوں میں باہم سخت مخالفت و دشمني ہے چنانچہ آگے چل کر بادشاہ قنوج کا ذکر کرتا ہے کہ اس کے ہر چار سمتوں میں لڑنے کے لئے چار لشکر ہیں - شمالي لشکر - والیء ملتان سے لڑنے کے لیے ہے اور جنوبي بلہري کي سر کوبي کے لئے - اب رہا یہہ کہ بلہري اور بورہ در اصل کیا لفظ ہیں - اس کي بابت البیرونی نے صفحہ ۲۲ پر مفصل بحث کی ہے -

صفحہ ۵۹ پر حاشیہ کے بعد برکت میں عراق درج ہے - حاشیہ ؟ عراق میں نہیں شام میں ہے - (معجم البلدان یاقوت) -

صفحہ ۱۵۷ پر شاباق کی بابت مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ خاص رہروں کے بیان میں اس کي اور کوئی کتاب بھي نہیں - جو سابوس

صدی ھجری تک عربی میں موجود تھی - اس کتاب کا نام کتاب السموم ھے اور یہ اب تک موجود ھے - مجھے اس کے قلمی دو نسخوں کا پتہ معلوم ھے - ایک نسخہ برلن کے کتب خانہ میں ھے (دیکھو فہرست مخطوطات عربیہ برلن ۱۱۶۴ ع) اور دوسرا قاھرہ کے خدیویہ کتب خانہ میں (دیکھو فہرست جلد سسم مخطوطات المکتبۃ الخدیویہ) برلن والا نسخہ میں نے برلن میں دیکھا تھا - یہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے ۸۴ صفحات پر شامل ھے -

دیباچہ میں ھے کہ ابتداء ابو حاتم تلمیذ نے خالد برمکی کے لیے ۲۰۰ ھ میں یونانی فارسی ترجمہ کیا اور پھر عباس بن سعید جوھر نے ۲۱۰ ھ میں اس کا عربی میں ترجمہ کیا - یہ رسالہ چار مقالات میں منقسم ھے - پہلا مقالہ بطور مقدمہ ھے - اس میں لکھا ھے کہ حکیموں نے مختلف قسم کے قاتل زھر بادشاھوں کی زندگی بچانے کے لیے بنائے ھیں - اُن کا اِستعمال سوائے بادشاہ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں - دوسرا مقالہ مختلف قسم کے زھروں کے علامات کی بابت ھے - تیسرے مقالہ میں مختلف قسم کے زھر بنانے کے نسخے ھیں -

صفحہ ۲۵۶ پر صفاریہ حکومت کو سامانیہ حکومت کے بعد ھونا لکھا ھے - یہ صحیح نہیں ھے صفاریہ خاندان پہلے ھوا ھے -

المختصر یہ کتاب مستطاب ادبیات اردو میں ایک نفیس اضافہ ھے فاضل مصنف نے جس علمی تفحص و تعمقی تجسس سے یہ کتاب تصنیف فرمائی ھے حقیقت تو یہ ھے کہ دنیائے اردو میں صرف انہیں کا حصہ ھے - مولانا کی اسی قبیل کی ایک اور تصنیف ھے - جو فی الواقع اس کتاب کی طرح بے نظیر ھے - جس طرح وہ کتاب سر زمین قرآن پاک کی جغرافی و تاریخی معلومات کا بہترین ذخیرہ ھے اسی طرح یہ تصنیف تعلقات عرب و ھند پر جامع ترین کتاب ھے -

---

* جاسوسہ دیلی - ارض القرآن -

روزنامچہ مقدس

مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھ - ۱۵ حر - قیمت ایک روپیہ ۸ آنہ -

حاجی انس - ابن علی صاحب ایڈیٹر و پروپرائٹر اخبار نیّر اعظم مرادآباد نے سنہ ۲۰ ع میں فریضۂ حج و زیارت مقامات مقدسہ کے سلسلے میں سفر کیا تھا "روزنامچہ مقدس" انہیں سفر کے حالات پر مشتمل ہے -

سفر نامہ کی حیثیت تمام تر سیاح کے نقطۂ نظر پر موقوف ہے - حاجی اِنس - اِبن علی صاحب کا سفر چونکہ زیادہ تر مذہبی اخلاص و عقیدت سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس سفر نامے کے اکثر حصے دینی جذبات سے لبریز ہیں -

طرز نگارش قدیم ، مگر صاف ، سادہ اور دلچسپ ہے- کتاب میں ایک فہرست مضامین کی بھی ضرورت تھی ، تاہم اصل کتاب میں جلی سرخیوں سے اس ضرورت کو خفیف طرز پر پورا کر دیا گیا ہے - لکھائی چھپائی معمولی مگر سرورق رنگین و دیدۂ زیب ہے -

---

لغات سعیدی

مرتبۂ مولوی عبدالعزیز صاحب - مطبوعہ مطبع مجیدی ، کانپور -

حجم ۶۲۷ صفحات - قیمت درج نہیں -

ملنے کا پتہ — مطبع مجیدی ، کانپور -

یہہ ضخیم لغت عربی ، فارسی ، ترکی اور عبرانی زبانوں کے الفاظ کا مجموعہ ہے ان الفاظ کی تشریح سلیس اُردو زبان میں کی گئی ہے -

ترتیب میں ایک حد تک خوبی ملحوظ رکھی گئی ہے -
الفاظ پر اعراب لگا کر صحت تلفظ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے -
وہ الفاظ جو عام طور پر لکھنے پڑھنے میں رائج ہیں اس میں اکثر
موجود ہیں - اس لیے یہہ کتاب طلباء کے لیے مفید ہو سکتی ہے -
البتہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے اس کو کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے -
کاغذ اچھا ؛ لکھاء ی چھپاء ی ؛ دیدہ زیب اور ٹائیٹل رنگین ہے -

رسید کتب :

مخزن نجات - جہل حدیث کا ترجمہ مطبع معارف ؛
اعظم گڈھہ — قیمت ۳ آنہ -

منتخبات ہندی کلام - مرتبۂ ڈاکٹر جعفر حسین ؛
بی - ایچ ڈی - حیدرآباد بک ڈپو - چادر گھاٹ ؛ حیدرآباد
دکن — قیمت دو روپیہ آٹھہ آنہ -

اعلان

ہندستانی اکیڈیمی نے خاص خاص ماہرین فن کے ذریعہ کتابوں پر
ریویو کرانے کا اہتمام کیا ہے ؛ جن کتابوں پر ریویو کرانا مقصود ہو ان کی
دو جلدیں اکیڈیمی میں روانہ کرنی چاہئیں - تا کہ ایک جلد اکیڈیمی
میں رہے ؛ اور دوسری تبصرہ نگار کے پاس بھیجی جاءے -

هندستاني

هندستاني اکیڈیمي کا تماهي رساله

جلد ۱ | اپریل سنه ۱۹۳۱ع | حصه ۲

* رسم و رواج کا اثر زبان پر

(از مولوی نورالحسن نیّر ' بي - اے صاحب نوراللغات)

کسي نے خوب کہا هے کہ ملک کي انشا پرداری اپنے ملک کي تاریخ اشاروں سے بناتي هے بول چال سے محاورے اور مثل سے ؟ لفظوں کا طریق استعمال ؟ اُسی طرح مقولے اور نصیحت سے فُصحا کا طرز گفتگو اور ان کے مذاق کا حال معلوم هوتا هے - بول چال محاورے مثل اور مقولے میں فرق هے اور وہ کسي قدر وضاحت چاهتا هے -

بول چال - کہتے هیں ایک خاص قسم کی ترتیب الفاظ کو ؟ جو اهل زبان کي زبان پر هو اور جس کے خلاف بولنا ٹکسال باهر هو -

(الف) اس میں الفاظ اپنے حقیقي معنی دیتے هیں مثلاً مجھے پانچ چھ مرتبہ تمھارے یہاں جانے کا اتفاق هوا - اگر اس پر قیاس کر کے تین یا چ کہیں تو غلط هوگا - کیونکہ فُصحا اس معني میں "تین چار" "پانچ چھ" اور "دس بیس" بولتے هیں -

(ب) جو جملے کي ترتیب؟ یا الفاظ کا طریقۂ استعمال اردو زبان میں مقرر هے؟ روز مرہ میں اس کي مطابقت لازم هے مثلاً "کیا کہیے سال بھر میں ایکبار بھی لکھنؤ جانے کا موقع نہیں ملا" - اگر اس جگہ "موقع نہ ملا" کہیں تو غلط هوگا -

---

* یہ مضمون اکیڈیمي کے گذشتہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا -

(ج) جس طرح خاص خاص موقعے اور محل پر اہل زبان بیساختہ الفاظ یا فقرے کہہ جاتے ہیں ان کو اسی طرح استعمال کرنا ضروری ہے :—

آتش—کیوں محنت بڑھائی بھی تم سے
ہم گنہ گار بے گناہ ہو تم

اس صورت میں فعل کا حذف کرنا اور مکرر نہ لانا فصاحت کی جان ہے -

محاورہ - جب ایک یا کئی لفظ مصدر سے مل کر اور حقیقی معنی سے متجاوز ہوکر کچھ اور معنی دینے لگتے ہیں تو اُس کو محاورہ کہتے ہیں - مثلاً آگ پانی میں لگانا - مزاج کو بھڑکا دینا ؟ جہاں لڑائی نہ ہوتی ہو وہاں لڑائی کرادینا - شرارت کرنا ؟ فتنہ اُٹھانا ؟ کے معانی میں مستعمل ہے - محاورے میں مصدر کے جملہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اصل محاورے میں کسی قسم کے تصرّف کرنے کا اختیار نہیں مثلاً "سر سہرا رہنا" کی جگہ "سر پر سہرا رہنا" تکسال باہر ہے -

مثل - ایک یا چند جملے جو عرصۂ دراز سے کسی خاص موقعے پر بطور مثال بولے جاتے اور اپنی حقیقی معنی سے متجاوز ہوکر کچھ اور معنی دیتے ہیں - مثلاً کوئی شخص ایسی سے پر بار یا فخر کرے جو اس کے ہاتھ آنا دشوار بھی تو اس کی نسبت بولتے ہیں انوکھے گاؤں میں اونٹ آیا لوگوں نے جانا پرمیسر آیا - مثل میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر جائز ہے - لیکن مصدر کے تمام مشتقات کے ساتھ استعمال جائز نہیں - مثلاً ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا کی جگہ ناچ نہ آنا آنگن ٹیڑھا بتانے لگے تو تصرّف بیجا ہوگا -

مقولہ - وہ فقرہ یا جملہ جو توجہ عام کلیہ یا عمدہ نصیحت ہونے کے عام پسند ہو گیا ہو - اس میں الفاظ اپنے حقیقی معانی سے

متجاوز نہیں ہوتے اور نہ اس میں قدامت کی شرط ہے مثلاً
"بزرگی بعقل است نہ بسال" "با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب"

رسم و رواج - دو لفظوں سے مرکب ہے اور یہ دونوں لفظ بظاہر ہم معنی ہیں لیکن اِن میں فرق امتیازی ہے؛ ہر رسم کو رواج کہہ سکتے ہیں لیکن ہر رواج کو رسم نہیں کہہ سکتے -

رسم - خاص کر اُن افعال کے واسطے مستعمل ہے جس کو لوگ شادی غمی کے موقعوں پر دوسروں کی تقلید میں کرتے آتے ہیں - اور رواج صرف دستور اور چلن کے معنی میں مستعمل ہے - رسموں کی زندگی بے شبہہ خاص خاص زمانے تک رہتی ہے پھر اُن میں کمی بیشی ہوتی ہے - رسمیں امیر اور دولتمند عورتوں کا دل بہلاوا ہیں اور ضروری بھی نہیں ہوتی ہیں - متوسط درجے کے غریب لوگ اُن میں ترمیمیں کرتے رہتے ہیں میری نظر اُن رسموں کی طرف گئی جن سے محاورات بنے ہیں - اس میں شبہہ نہیں کہ بہت سی رسمیں ترک ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں - لیکن جو محاورات اُن سے بنے ہیں وہ ہمارے اُردو لٹریچر کا ایک ضروری جزو ہوگئے ہیں متقدمین کے کلام نثر و نظم میں اُن کی تلمیحیں موجود ہیں لہذا اِس مختصر مضمون میں اُن رسموں کو لکھتا ہوں جن کے جاننے سے اصل محاورے کی حقیقت اور معانی واضح ہو جاتے ہیں - ہر رسم کو مختصراً بیان کر کے وہ محاورات لکھدیئے ہیں جو اُن سے بنے ہیں -

(واضح ہو کہ اس مضمون میں مسلمانوں کی رسموں کا ذکر ہے) -

حمل کے آثار میں امور ذیل ہیں :—

۱ - ہاتھ پاؤں ٹوٹنا - سستی اور کاہلی ہونا - سونے اور پڑے رہنے کو جی چاہنا -

محاورات ذیل حاملہ ہونے کے معانی میں مستعمل ہیں :—

پاؤں بھاری ہونا ۔ دو جیا ہونا ۔ پیٹ رہ جانا* ۔ امید سے ہونا ۔

۲ ۔ حاملہ عورت کو گوشت سے بعرب ہو جاتی ہے اور کھٹّی میٹھی اور چٹپٹی چیز کو جی چاہتا ہے اِس لیے کہتے ہیں کہ جی چاہنا محاورہ ہوگیا۔

۳ ۔ حمل کا ساتواں مہینہ جب ہوتا ہے میکے کی طرف سے سَدَھوڑا آتا ہے (سدھوڑا ہندی میں ساب چیزوں کو کہتے ہیں) جس میں ساب طرح کی ترکاریاں میوے اور پکوان ہوتے ہیں ۔ سہ پہر کے وقت حاملہ کی گود بھری جاتی ہے یعنی اُس کو دلہن کی طرح آراستہ کر کے بندنس اُس کی گود میں کھانے کے پھل، میوے، ناریل وغیرہ ڈال دیتی ہیں گویا شگون ہے کہ ہمیشہ گود ہری بھری رہے اِس رسم کا نام گود بھرنا ہے ۔ لکھنؤ میں بیگمات کی زبانوں پر سدھوڑا دہلی میں سَدَھوڑ سَدَھوڑا ہے قصبات میں اِس جگہ سدھوڑی معانی ذیل میں مستعمل ہے :-

۱ ۔ وہ ساب طرح کا پکوان جو سنوانسے میں دلہن کے میکے سے میوے اور چند قسم کی ترکاریوں کے ساتھ آتا ہے ۔

۲ ۔ حمل کے ساتویں مہینے حاملہ کا میکے سے سسرال آنا ۔ سنوانسا ۔ اِسی گود بھرنے کی رسم کا نام ہے اور اُس بچے کو بھی کہتے ہیں جو ساتویں مہینے پیدا ہو ۔ بعض خاندانوں میں نویں مہینہ گود بھرنے کی رسم ادا کیجاتی ہے اور اُس کو نوماسا کہتے ہیں ۔ اور بعض خاندانوں میں گود بھرنے کی رسم ساتویں اور نویں مہینہ یعنی دو بار کیجاتی ہے ۔

۴ ۔ نوماسے کے بعد حاملہ اپنے گھر یعنی میکے جاتی ہے اور اِسکو پاؤں پھیرنے جانا کہتے ہیں ۔

نوٹ—پیٹ رہ جانا مترادف الفاظ میں ہے ۔ لیکن اس میں تحقیر کا پہلو ہوتا ہے ۔ حمل عربی میں بالفتح ہے ۔ ۔ ۔ را نے بفتح اول و دوم کہا ہے اور زبانوں پر بھی اِسی طرح ہے ۔ جانصاحب—دائی یقین دل کو ہے گر جائیگا حمل ۔ ننھا سا لڑکا جواب میں کل پیٹ مل گیا

۵ - اکثر بچے سر کے بھل پیدا ہوتے ہیں اور بعض پاؤں کے بھل، جو پاؤں کے بھل پیدا ہوتے ہیں اُن کو پایل کہتے ہیں - عورتوں کا عقیدہ ہے کہ ایسے شخص کے لات مارنے سے کمر کی چک دفع ہو جاتی ہے :—

حاتم صاحب—پایل ہے دو گاما ذرا ٹھوکر تو لگا جا

چک آئی ہے اُٹھا نہیں جاتا ہے کمر سے

۶ - بچے کے پیدا ہوتے ہی اُس کی نال کلاوے سے باندھکر چاقو سے کاٹ دیتے ہیں کلاوہ بچے کے گلے میں لٹکا دیتے ہیں - اور کٹے ہوئے نال کو پیشتر رچہ خانے ہی میں اور کبھی کبھی گھر کے کسی اور حصے میں دفن کردیتے ہیں عموماً یہ خیال ہے کہ مولود کو اُس جگہ یا مکان سے خاص تعلق اور اُنس ہوتا ہے جس میں اُس کا نال گڑا ہوتا ہے - چنانچہ نال گڑنا خاص تعلق ہونا، خصوصیت ہونا، کے معنی میں مستعمل ہے :-

منیر—اُسی ویرانے میں پھر پھر کے رہا کرتا ہے

دل میں کیا نال گڑا ہے بت ہرجائی کا

امیر—نکلتے ہی نہیں مسجد سے واعظ

خدا کے گھر میں نال اُن کی گڑی ہے

نال - وہ لانبی سی آنت جو پیدا ہوتے وقت بچے کے ناف سے لٹکی ہوئی ہوتی ہے -

۷ - لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں دستور ہے کہ جس ٹھیکری میں اُسے نہلاتے ہیں اُس کی رضامندی سے اُسی میں لڑکے کی ماں ایک روپیہ ڈال دیتی ہے جس کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ یہ لڑکی ہمارے لڑکے کی منگیتر ہوگئی-

۸ - جب سے بچہ ہوتا ہے رچہ کے سرہانے لوہے کی چیزیں جس میں

نوٹ—نال کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے - دہلی میں مؤنث اور لکھنؤ میں مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے - بیگمات لکھنؤ کی زبانوں پر تانیث ہی کے ساتھ ہے -

کجلوٹی بھی ہوتی ہے ضرور رکھتے ہیں اور عورتوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے بچہ بہوت بریت اور آسیب کے خلل سے محفوظ رہتا ہے -

۹ - بانگ دینا - جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے کان میں آہستہ آہستہ کلمات اذاں کہتے ہیں اس فعل کا نام بانگ دینا ہے بانگ دینے والے کو قند دیتے ہیں -

۱۰ - بچہ جس روز پیدا ہوتا ہے اُس روز سے چھہ روز تک رچہ کو سونے نہیں دیتے اور اس غرض سے رچہ کے پلنگ کو اکیلا نہیں چھوڑتے؟ انگیٹھی پر انگیٹھی روشن رہتی ہے - چھہ روز تک باری باری سے متعدد عورتیں جاگتی اور رچہ گیریاں گاتی ہیں -

رچہ خانہ - وہ مقام جہاں بچہ پیدا ہوتا ہے -

ناسخ—بال گرتا ہے کبھی اور لاش گرتی ہے کبھی
جو رچہ خانہ ہے وہ اک روز ماتم خانہ ہے

رچہ - (فارسی میں بغیر تشدید حرف دوم ہے اردو میں فصحا بھی اسی طرح بولتے ہیں عوام بتشدید بولتے ہیں) وہ عورت جس نے بچہ جنا ہو - ایسی عورت کو چالیس روز تک رچہ کہتے ہیں - اور سات دن تک آلی رچہ

جانصاحب—رچہ کی جان کا رہنا ہے ذرا اے جان جنتے میں
خدا ہی کام ہے رنڈی کے آنا ایسی مشکل میں

رچہ گیریاں - وہ گیت جو رچہ خانے میں گائے جاتے ہیں -

۱۱ - جس روز سے بچہ پیدا ہوتا ہے نکتی یعنی نلی کو رچہ خانے میں نہیں آنے دیتے غالباً اِس خیال سے کہ وہ دون کیے ہوئے بال کو نہ کھا جائے - یا اِس خیال سے کہ بلّی کی بھیس میں جن اور آسیب نہ ہوں -

۱۲ - بچے کو اول دن شہد - دوسرے دن گھٹی - تیسرے روز دودھ پلاتے ہیں بیشتر چھٹی تک پھوپھی سے دودھ پلاتے ہیں -

گھٹّی میں پڑنا - کسی چیز کے استعمال کا بچپن سے عادی ہوجانا - سرشت میں داخل ہو جانا کی جگہ مستعمل ہے -

شاد—چھناؤں واعظو کیا مے پڑی ہے میری گھٹّی میں
وہ میخوار ازل ہوں دخت رز کا جس نے سر ڈھانکا

ناسخ—طفلی ہی سے ہے شوق شراب آب کے مانند
گھٹّی میری بیری میں بھی زنہار نہ چھوٹی

۱۳ - چھٹّی - ولادت کے چھہ روز کے بعد چھٹّی نہلاتے ہیں - رچہ نہا دھوکر سنہری پٹّی سر سے باندھہ اور اعلیٰ درجے کی پوساک پہن کر بچے کے سر کو قصابے سے باندھکر دلہن سی بنی ہوئی پلنگ پر بیٹھتی ہے - اور مبارک باد کے گیت گائے جاتے ہیں - اُس روز برادری کی تمام عورتیں جمع ہوتی ہیں تیسرے پہر کو میکے سے چھٹّی جسے چھوچھک بھی کہتے ہیں آتی ہے - چھٹّی میں سونے خواہ چاندی کے کڑے - بچے کے گھونگھرو - چاندی کے چٹّے بٹّے جُسنبان - کُھنکُھنے ؟ ؟رتا ؟ توتی وغیرہ ہوتا ہے - بچے کے ماموں کی طرف سے ہنسلی ؟ کڑے؟ خالہ کی طرف سے کرتے ٹوپی کا رواج ہے - چھٹّی کے روز ماں یا دایہ کا دودھہ بغیر بھوبھی کے دیا جاتا ہے جس کے اِس طرح پینے میں بچے کو دقّت ہوتی ہے - اس واسطے چھٹّی کا دودھہ یاد آنا کمال دقت اور پریشانی میں گھر جانے کے معنی میں مستعمل ہے -

رشک—فکر بندش میں چھٹّی کا دودھہ یاد آیا کیا
غوطے کھائے سیکڑوں مضمون ہوئے شیر میں

چھٹّی کا کھایا یاد نکلنا - گذشتہ آرام و راحت کی کسر نکلنا -

چھٹّی کے پوتڑے اب تک نہیں سوکھے - ہنوز نا تجربہ کار ہے ؟ کی جگہ -

چھٹّی نہانا - بچہ ہونے کے چھہ روز بعد کا غسل کرنا -

۱۴ - عقیقہ یا موندن - عربی میں وہ بال جو بچے کے سر پر پیٹ میں پیدا ہو جاتے ہیں - وہ قربانی جو بچّے کی پیدایش کے پہلے ہفتے

میں کي جاتي ھے - پیدایش سے ساتویں دن بچے کے بال منڈوائے جاتے ھیں اور اُن بالوں کے برابر چاندي خیرات کی جاتي ھے - اِسي تاریخ کو بچّے کا نام بھي رکھا جاتا ھے - بیٹے کے واسطے دو بکرے اور بیٹي کے واسطے ایک بکرا بطور صدقہ ذبح کرتے ھیں -

۱۵ - رچہ کا تارے دیکھنا - چھٹي کي رات کو زچہ‌خانے کے پاس چوکي بچھاتے اور اُس چوکي پر رچہ بچہ دونوں کو لاتے ھیں زچہ ؟ بچّے کو گود میں لے کر رچہ خانے سے باھر آتی ھے دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لیے ساتھہ ھوتی ھیں - دائي آتے کي چومک لیے آگے آگے چلتی‌ھے- رچہ بچے کو گود میں لے کر اور قرآن شریف سر پر رکھکر آسمان کي طرف دیکھتي اور چوکي پر کھڑي ھو کر سات ستارے گنتي ھے اُس وقت دونوں تلواروں کي نوک سے نوک ملا کر رچہ کے سر پر فوس بناتي ھیں تا کہ اُوپر سے جن اور پري کا گزر نہ ھو -

امیر—واہ کیا شکلیں ھیں قابل ھیں یہ تصویروں کے
دیکھو نکلي ھے رچّہ سایہ میں شمشیروں کے

جس وقت رچہ تارے دیکھتي ھے اُس وقت بچے کا باپ تیر کمان لے کر رچہ کے پلنگ پر کھڑا ھو جاتا ھے اور پڑي بسم اللہ کہکر چھت پر تیر لگا کر گویا فرضي مرگ مارتا ھے اِسي رسم کا نام مرگ مارنا پڑ گیا ھے-

اب یہ دونوں رسمیں صرف شہزادوں میں باقي ھیں -

شاہ نصیر نے جب بہادر شاہ کے یہاں شہزادہ پیدا ھوا اِس رسم کا ذکر کیا ھے- وھیں پھر شاہ نے یہ رسم کي واں - چھپرکھٹ پر قدم رکھہ ھو کے ساداں ادا کر حرف بسم اللہ سارا - کمان و تیر لے کر مرگ مارا نمودار اس طرح تھا سقف میں تیر - فلک پر کہکشاں کی جیسے تحریر

اب صرف تارے دکھانے کي رسم باقي ھے - اور مرگ مارنے اور زچہ کي تلواروں کے ساتھہ سایہ میں لے کر چلنے کي رسمیں متروک ھیں -

۱۶ - رتجگہ - جسے لکھنؤ میں خدائی رات کہتے ہیں ، چھٹی، دودھ چھٹائی، سالگرہ ، بسم اللہ ، اور بیمار کے موقعوں پر ہوتا ہے - رات بھر گلگلے دئے جاتے ہیں اور اللہ میاں کا رحم بنایا جاتا ہے اور مسجدوں کے طاق بھرے جاتے ہیں -

رحم - ایک قسم کا حلوں کا کچا حلوا ہوتا ہے - جس کو لڈو کی شکل کا بھی بنا لیتے ہیں گلگلوں اور رحم پر بیمار دلوائی جاتی ہے -

۱۷ - چھٹی یا چھلا - بچہ کا چالیسویں دن کا نہان جس کو بڑا چلہ بھی کہتے ہیں عموماً اِس تقریب میں چھٹی سے زیادہ دھوم دھام ہوتی ہے -

۱۸ - عورتیں بچے کے بہلانے کے لئے چاند کو چندا ماموں کہتی ہیں -

۱۹ - عورتیں اکثر رات کو بچوں کے بہلانے اور کھلانے کو اپنا ہاتھ چراغ کی لو کی طرف لے جاتی اور اُدھر سے ہلتا کر رہی ہاتھ بچوں کے منہ پر پھیرتی ہیں اور یہ الفاظ بطور دعا زبان سے کہتی جاتی ہیں ، اُکھو مکھو میاں کو اُلہہ رکھو ؟

سوں—دیکھ منہہ بک ہتیلی آتی ہے
اکھو مکھو تمہیں کو بھائی ہے

۲۰ - بھائی - بچہ اگر سوتے میں ہنستا ہے تو کہتی ہیں کہ بھائی ہنساتی ہے -

بھائی - سنسکرت میں وہ روح جو خوشی اور غم کی باتیں کہہ کے دودھ پیتے بچوں کو سوتے جاگتے ہنساتی رولاتی ہے - اُردو میں وہ خواب جس کو دیکھ کر بچے سوتے میں ہنسنے لگتے ہیں —

بحر—افسوس بھائی نے بھی مجھکو
طفلی میں یہ عشق کی خبر کی
طرفہ عمگین ہوں کہ روتی گئی وہ آہ سحور
آئی طفلی میں بھائی جو ہنسائے مجھکو

قلق نے سہواً نہائي کي جگہ بے حیائي کہا ہے -

روتے روتے جو نیند آتي تھي

بے حیائي اُسے ہنساتي تھي

۲۱—دانتوں کے نکلنے کي رسم - جب بچے کا پہلا دانت نکلتا ہے خسخاس کي میٹھي گھنگھنیاں تقسیم کرتے ہیں اور اُسکو دانت گھنگھني کہتے ہیں -

جب دودھ پیتے بچے کے دانت نکلنے کے قریب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بچہ دانتوں پر ہے - دودھ کے دانت توتتے ہیں - تو اُن کو جوہے کے تل میں ڈالتے ہیں تاکہ بچے کے دانت بھي چھوٹے چھوٹے جوھیا کي دانتوں کي طرح خوشنما نکلیں -

دودہ کے دانت - وہ ملائم دانت جو شیرخوارگي کے زمانے میں نکلتے ہیں -

دودہ کے دانت نہیں توتے ہیں - نادان اور ناتجربہکار ہونے کا کنایہ ہے -

شوں قدوائي—بچپنا ہے میرے اُسکوں سے جو رح چھوٹے ہیں

دودہ کے دانت ابھي سنتم کے نہیں توتے ہیں

۲۲—سالگرہ - جس روز بچہ سال بھر کا ہوتا ہے تو ایک کشتي میں شیرینی اور کلاوہ کسي بڑے بوڑھے کے آگے رکھتے ہیں وہ تیار دیکر اور بسم‌اللہ کہہ کے کلاوے میں ایک گرہ لگا دیتا ہے -

سلاطین و اُمرا عمر طبعي کے ہر نئے سال شروع ہونے کي تاریخ جشن کرتے ہیں - ہندستان میں بھي سالگرہ کے دن ہر سال ایک کلاوے میں گرہ لگا دیتے ہیں اور نذر و تیار اور فاتحہ کے بعد شیرینی تقسیم کرتے ہیں -

۲۳—دودہ بڑھانا - کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ تین سال کے بعد دودہ چھڑاتے ہیں اور اس رسم کو دودہ بڑھائي اور فعل کو دودہ بڑھانا کہتے ہیں -

مہر جس—وہ گل جب کہ جوبھے برس میں لگا
بڑھایا گیا دودہ اُس ماہ کا

اوج—آب بہکاں سے ہوئی دودہ بڑھائی جس کی
خیمہ سے بدت کے سرماں نکل آئی جس کی

اِس تقریب میں ننھیال اور ددھیال کے اعزّا جمع ہوتے اور کھچوڑی ملتے اور بچّے کو دیتے ہیں - دائی کھلائی کو انعام و اکرام اور جوڑے باگے دئے جاتے ہیں -

۲۴—ختنہ - (عربی میں ختن بالفتح ختنہ کرنا) یہ رسم شرعی ہندستان کے مسلمانوں میں بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتی ہے یہ رسم سہ پہر کو ہوتی ہے - اکثر ختنہ کرنا نائی کا کام ہے لیکن اب تو ڈاکٹروں سے ختنہ کرایا جاتا ہے جس میں اکثر خطا ہوتی ہے - جب بچہ کا زخم اچھا ہو جاتا ہے اُس کو دولہا بناتے اور گھوڑے پر چڑھا کر باجا بجاتے کسی بزرگ کی درگاہ میں لیجاتے ہیں - ختنہ کو سنت اور مسلمانی بھی کہتے ہیں -

۲۵ - ناک کان چھیدوانے کی رسم - بیسیر تابع چھہ سال کی عمر میں لڑکیوں کے ناک کان چھیدے جاتے ہیں - ناک چھیدنے کے لیے نائن جاتی کا ننھا کیل یا نتھہ پہننے کے واسطے چھیدا جاتا ہے - اور ہر ایک کان میں نیچے کیطرف تین تین سوراخ اور اوپر کی جانب چار چار بالے بالیاں نتّے پہننے کے لیے کیے جاتے ہیں -

۲۶ - بسم اللہ کی شادی - بچہ جب ساڑھے چار برس کا ہوتا ہے اسی تقریب سے مکتب نشینی کی ابتدا ہوتی ہے -

بچے کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھہ سورۂ علق کی آیتیں پڑھاتے ہیں بعدہ "مبارک سلامت" کی دھوم ہوتی ہے - اس تقریب میں

حیثیت کے موافق دھوم دھام کرتے ہیں اس کو مکتب بھی کہتے ہیں -

آمین - ہدیہ - بچہ قرآن شریف ختم کرتا ہے تو بڑی خوشی کرتے ہیں استاد کو انعام و اکرام و خلعت اور احباب اور اعزا کو شیرینی تقسیم کرتے ہیں - اُس کو دہلی میں ہدیہ اور لکھنؤ میں آمین اور آمین کی شادی کہتے ہیں -

۲۷ - روزہ - جب بچہ سات یا نو یا گیارہ سال کا ہو جاتا ہے تو اُسے روزہ رکھواتے ہیں اور وہ بھی ایک چھوٹی سی تقریب ہوتی ہے -

روزہ کشائی - دہلی میں یہ معنی افطاری ہے —

داغ—قسمت ہی میں زاہد کے ہیں دن رات کے فاقے
کیا پیر مغاں روزہ کشائی نہیں دیتا

لکھنؤ میں روزہ کھلوانے کی تقریب کا نام ہے .—

نحر—زاہدو دعوتِ رنداں ہے سراب اور کباب
کبھی میخانے میں بھی روزہ کشائی ہو جائے

۲۸ - موچھوں کا کوڈا - بچے کا سن جب ۱۷ - ۱۸ سال کا ہو جاتا ہے اور اُس کی مسیں بھیگنے لگتی ہیں تو موچھوں کا کوڈا کیا جاتا ہے - لڑکے کی موچھوں پر گھسا ہوا صندل انگلی سے نہیں بلکہ روئیے سے لگاتے ہیں - یہ تیار سوئیوں پر ہوتی ہے - اِس رسم میں بھی فردی رسمہ دار جمع کیے جاتے ہیں - مسیں بھیگنا — سبزہ آغاز ہونا — وہ سبزی نمایاں ہونا جو ڈاڑھی موچھوں کے نئے بالوں کے نکلنے سے ظاہر ہوتی ہے -

جانصاحب—اُنھی کو دل ہے جوانی کی بنا ہے استوار
ہوتے نکلے ہیں مسیں بھیگتی سبزہ آغاز

۲۹ - بات - منگنی - نسبت -

ہندستان میں لڑکے والے کی طرف سے نسبت کا پیغام جاتا ہے -

جس جگہ پیغام دینا ہوتا ہے وہاں کے افسر خاندان کے پاس نسبت کے رقعہ سے پہلے ایک سرخ کاغذ پر خاندانی حالات لکھ کر مسّاطہ کے ذریعے سے بھیجتے ہیں - اِس کاغذ میں خاندانی حالات ، حال حلیہ ، آمدنی وغیرہ اور لڑکے کی علمی قابلیت درج ہوتی ہے - اِس کاغذ کو اِسم نویسی کہتے ہیں - اِسم نویسی کے جواب میں اگر رضامندی کا اشارہ معلوم ہوا تو رقعہ بھیجتے ہیں -

بات آنا - نسبت کا پیام آنا :—

طلسم الفت—دھوم مستوں نے یہ مچائی ہے
دختر زر کی بات آئی ہے

بات ٹھہرانا—نسبت ٹھیرانا - بات ٹھہرنا - منگنی قرار پانا :—

طلسم الفت—بات بھی ٹھہری ہے کہیں اُن کی
آپ کو فکر کچھ نہیں اُن کی

بات جانا—منگنی کا تمام جانا -

شعور—فرحت عید کو نسبت نہ رہی شادی سے
جس کے گھر رقعہ گیا اور وہی بات گئی

۳۰ - فریقین کا اِطمینان ہو جاتا ہے تو منہہ میٹھا کرنے کا دن مقرر کر کے دولہا کی طرف سے چند عورتیں دلہن کے گھر مٹھائی کے خوان اور جڑھاوا لے کر جاتی ہیں - مٹھائی کی مقدار حسب حیثیت کے مطابق ہوتی ہے اِسی رسم کو منہہ میٹھا کرنا کہتے ہیں -

جڑھاوا - اُس زیور کو کہتے ہیں جو منگنی یا براٹ کے روز دلہن کو دولہا والوں کی طرف سے دیا جاتا ہے اُس میں نیستر سونے کی انگوٹھی یا چاندی کا چھلّا ہوتا ہے -

نیستر چڑھانا - منگنی کے روز انگوٹھی ، چھلا وغیرہ منسوبہ کو پہنانا -

خان صاحب—انگوٹھی ایسی بنائے نہیں دمامیہ کی
چڑھانا تم نے ہے سمدھن بہت نشان خراب

۳۱ ۔ بیاہ مانگنا ۔ جب نکاح کرنے کا زمانہ آجاتا ہے تو دولہا کی طرف کی عورتیں امدروں میں باجے گاجے کے ساتھ مٹھائی کے خوان ساتھ لیکر اور عزتوں میں چپ چپاتے منسوبہ کے گھر جاتی اور تاریخ ٹھیرا کر واپس آتی ہیں اس کو بیاہ مانگنا کہتے ہیں ۔

۳۲ ۔ مائیوں بٹھانا ۔ جب بیاہ کے سات یا گیارہ روز رہ جاتے ہیں ؟ قریبی رشتہ دار عورتوں کو جمع کر کے دلہن کا کرتا ۔ پیجامہ ۔ دوپٹا زرد رنگتے ہیں بینڈیاں بناتے ہیں اور اس روز منسوبہ کو زرد کپڑے پہناتے ہیں اور مکان کے کسی کوٹھے در بٹھاتے ہیں ۔ اب اُس کی صحبت میں بس ساتھی ہمعمر لڑکیاں رہتی ہیں ۔

بلائی ۔ (قصاب میں) برات سے دو روز پیشتر عروس کے بیل لگایا جاتا ہے ۔ اس رسم کو بلائی کہتے ہیں (فقرہ) آج بلائی کل سہاگ برسوں برات ہے ۔

۳۳—شادی سے دو تین روز پہلے دولہا بھی علیحدہ مکان میں بٹھایا ہے اُس کو مانجے بیٹھنا کہتے ہیں دولہا دلہن کی گھر والیاں سہاگ گاتی ہیں ۔

سہاگ ۔ (ھ ۔ سو ۔ اچھا ۔ بھاگ ۔ وسیب سنسکرت میں بمعنی خوش ؟ خوش قسمتی ہے) ۔

یہ لفظ معانی ذیل میں مستعمل ہے ۔—

۱ ۔ خاوند کی حیات کا زمانہ ۔

۲ ۔ ایک قسم کے خاص گیت جو شادی بیاہ میں گائے جاتے ہیں دہلی میں ان گیتوں کو سہاگ گھوڑیاں کہتے ہیں :—

میر حسن—اِدھر کا تو یہ رنگ تھا اور یہ راگ

محل میں اُدھر گھوڑیاں اور سہاگ

۳ - وہ تمام زیور اور جوڑے جو سہاگن ہونے کی حالت میں عورتیں پہنتی اور اِستعمال کرتی ہیں جیسے بیٹھ - مہندی - مسّی وغیرہ -

سہاگ رات—سب رفقا اِس کو بیحد کی رات بھی کہتے ہیں —

جان صاحب—آئی جب کلموہی وہ بیحد کی رات

باجی ہمسایہ نے سکھائی یہ بات

۳۴ - اُبٹن - ایک خوشبودار مسالا ہے جس کے اِستعمال سے رنگ نکھرتا اور بدن میں خوشبو دیر تک رہتی ہے یہ ہلدی اور جو کے ٹھنے ہوئے آٹے؟ کھلی؟ جھنڈ جھنیلے؟ ناگر موتھا؟ بیج؟ بالچھڑ اور بیر بات سے مرکب ہوتا ہے اور تیل ڈال کر بانی میں گھولا جاتا ہے - لکھنؤ میں اُبٹن دھلی میں بٹنا اور اُبٹنا ہے —

تسلیم لکھنوی—کیوں نہ عیش سے مرا دل اے وفا دشمن ملے

روز تو بکھرے بہائے روز عید اُبٹن ملے

داغ دھلوی—دامن سے رشک گل کی اُڑی داغ میں جو خاک

بٹنا وہ بن گئی ہے عروس بہار

مائیوں بیٹھنے کے بعد دولہا دلہن کے اُبٹن روز ملا جاتا ہے - اُبٹن کھیلنا - عموماً دولہا دولہن کے مانجھے بیٹھنے کے بعد اور خصوصاً ساچق کے روز اُبٹن بڑی بڑی لگنوں میں گھولتے اور دونوں گھروں میں عورتیں عورتوں کے اور مرد مردوں کے اُبٹن لگا کر بڑی گپ بناتے ہیں - اُبٹن کھیلنے کا رواج بیشتر اُن لوگوں میں ہے جن میں آپس میں مذاق ہوتا ہو جیسے سالے بہنوئی - نند - بھاوجیں -

۳۵ - بڑی - ساچق - (بڑی بر بمعنی شوہر) ساچق ترکی میں بکسر حرف ا سوم اُردو میں بفتح سوم ہوگیا ہے - بعض شہروں میں برات

سے ایک دن پہلے اور قصبات میں برات کے روز دولہا کی طرف سے دولہن کے یہاں کپڑے ، زیور ، میوہ ، مٹھائی ، مانوس زنانہ ، رنگین سر بند تھیلیاں ، سہاگ پڑا ، پھلل ، پان اور کھلیں جاتی ہیں - تھالیوں میں سفید شکر چھوارے بادل - کشمش - بادام - مہندی کورہ بناب ہوئے ہیں - جوڑوں زیور اور میوے کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے - اپنے اپنے مقدور در ہے جوڑے مع زیور واپس آتے ہیں باقی سب چیزیں عروس کے یہاں رہتی ہیں ایک جوڑا جو سب میں بہتر ہوتا ہے اور پاپوش عروس کو پہنا کر رخصت کرتے ہیں —

حاشیہ—جوڑا بڑی میں آتا بڑی دھوم دھام کا

سہاگ پڑا - کاغذ کا خوشنما پڑا جس میں خوشبو کی چیزیں رکھ کر ساچق میں دولہن کو بھیجتے ہیں -

ساچق چڑھنا - جب بڑی دھوم دھام سے باجے گاجے کے ساتھ جاتی ہے اُس کو ساچق چڑھنا کہتے ہیں -

شربت پلائی ۱ - وہ نقد رقم جو برات یا ساچق کے روز دولہا اور دولہا کے رشتے دار شربت بانٹنے پر شربت کی پیالی میں ڈالتے ہیں -

۲ - وہ نیگ جو دولہا یا دلہن کی طرف سے نائی کو دیا جائے -

شربت پلانا ۱ - حجام کا نکاح سے پیشتر سب براتیوں کو شربت پلانا -

۲ - رسم کرنا - شربت کے پیالے پر نکاح کر دینا -

عربیوں کی طرح صرف شربت پلا کر نکاح کر دینا -

۳۶ - (برات بر وزن نجات - بر - شوہر - رات آتا ہے) عوام کی زبانوں پر باراتی ہے - یہ لفظ معانی دیل میں مستعمل ہے - (۱) شادی

کا دن (۲) شادي کا جلوس - دولها کي سواري کا جلوس آرايش کے ساتھہ -

برات اُترنا - براتيوں کا ٹھہرنا کسي مقام پر —

محسن—خوشی میں بھرے مومن و مومنات

احاطے میں رضواں کے اُتری برات

برات جانا - شادی کے جلوس کا جانا - مجمع کا روانہ ہونا :—

داغ—ساتھہ حوروں کے ہے شہید ترا - کیا عدم کو برات جاتي ہے

برات چڑھنا - برات کے جلوس کا عروس کے گھر کو دھوم دھام سے روانہ ہونا -

برات کرنا - شادي کے جلوس میں شریک کرنا -

برات لیجانا - براتیوں کو دولھن کے گھر لے جانا -

براتی - وہ جو دولها کي طرف سے برات کے جلوس میں شریک ہو -

جانصاحب—کیسے ہوئے ہیں جمع براتي برات میں

ذوق—پہونچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو

انجم سے لاکھہ جمع کرے لشکر آسماں

دلھن - (ھ - بر وزن ختن) عروس —

جلال—کیا شرمگیں نگاہ سے کہتا ہے دل نہ پوچھہ

یار و بیار یار یہ دولها دلھن کے ہیں

اس‌کي جمع دلہنیں ہے -

انیس—گردان کے پھر آنکھوں سے سہرے کو لگاؤ

دو چاند سی گھر میں دلہنیں بیاہ کے لاؤ

بعض شعرا نے دولھن بھي کہا ہے —

نواب مرزا شوق—عطر دولھن کا نہ اِس طرح ملے رہتے تھے

بند محرم کے نہ اِس طرح کسے رہتے تھے

دولھن کا عطر - عطر عروس - عوام عطر دولھن کہتے ہیں -

۳۷ ـ صحنک ـ (ف ـ صحن - بڑا تھال ـ صحنک اُس کی تصغیر ہے) یہ لفظ دو معنی میں مستعمل ہے ـ

۱ ـ حضرت فاطمہ کی تیمار ـ

۲ ـ فاطمہ کا طباق یا کونڈا ـ

یہ تیمار جسکے یا زردے پر دلائی جاتی ہے ـ

صحنک کی ایجاد جودھا بائی نے کی ـ نور جہاں جس کا نکاح شیر افگن کے بعد جہانگیر سے ہوا تھا جودھا بائی کو نظر حقارت سے دیکھتی تھی ـ جودھا بائی نے اُس کے ذلیل کرنے کو ایک روز تمام بیگمات کی دعوت کی حضرت فاطمہ کی تیمار دلوائی تیمار کے لیے جسکہ تکوایا کورے کورے کونڈوں میں رکھا ساتھ ترکاریاں رکھیں اور جب سب بیگمات جمع ہوگئیں تو آواز بلند کہا "اِس صحنک کو رہی نبوی کھا سکتی ہے جس نے دوسرا خاوند نہ کیا ہو" ـ یہ سن کر نور جہاں شرمندہ ہوئی ـ اب یہ تیمار ہر ایک تقریب اور شادی کے موقع پر ہوتی ہے ـ اِس کے کھانے کے واسطے پاکدامن اور پارسا عورتیں نامزد کی جاتی ہیں دوھاجو اِس کو نہیں چھو سکتی ہے ـ

۳۸ ـ نراب ـ

حجام نوشہ کو پہلا دُھلا کر بدن کا جوڑا لپٹتا ہے اُس کے بعد شاہانہ جوڑا پہناتا جاتا ہے ـ نیچے کرتا ـ کرتے کے اوپر انگرکھا یا اچکن یا شیروانی ـ سر پر دستار ـ دستار پر گوشوارہ ـ شہزادوں میں موتیوں کا طرہ اور سہرا ـ متوسط درجے کے لوگوں میں پھولوں کا سہرا پھولوں کا طرّہ ـ پھولوں کی کَلغی ـ

نوشاہ آراستہ ہو گیا تو زیور سے آراستہ گھوڑا لایا گیا ـ دولھا سوار ہوا اُس کے پیچھے شہبالا (دولھا کا چھوٹا بھائی یا کسی اور قریبی رشتہ دار کا لڑکا جس کی عمر کم ہو) ـ

دولھا کے ایک ہاتھ میں لگام دوسرے میں رومال منہ سے ڈھکا ہوا ـ

دولہا آگے بڑھا تمام براتی پیچھے پیچھے سب سے آگے باجا اور سب سے پیچھے رتھی سواریوں کے محافے اِس شان سے براتِ چڑھی -

راستے میں آتشبازی - چوٹیاں - پیسے لٹائے جاتے اور آتشبازی چھوٹتی ہے جس وقت یہ جلوس دلہن کے دروازے پہونچتا ہے لوگ پیسوائی کو آتے ہیں دولہا اور سب براتی مردانے میں اور رتھی سواریاں زنانخانے میں اُترتی ہیں -

دولہا مسند پر زرد پر صدر میں بٹھایا جاتا ہے رومال اُس کے منہہ پر رہتا ہے اُس کے ہمعمر پہلو میں بیٹھتے ہیں - دلہن کے طرف سے کنیزیں میں دولہا کا جوڑا آتا ہے جس کو پہنا کر نکاح ہوتا ہے - بدن کا جوڑا نائی کا حق ہے - دلہن والے قاضی صاحب کو بلاتے ہیں - قاضی صاحب کے آنے کے بعد دلہن والوں کی طرف سے ایک وکیل اور دو گواہ آتے ہیں - قاضی صاحب پہلے دولہا کے پاس بیٹھ کر خطبہ پڑھتے ہیں جس میں حمد و نعت ؟ توحید و رسالت کی شہادت ہوتی ہے - اور خدا سے ڈرنے اور اُس کے احکام پر عمل کرنے اور عہد و قرار پر قائم رہنے کی ترغیب ہوتی ہے - عروس کا ولی جلسۂ نکاح میں نہیں آتا اپنی طرف سے وکیل کردیتا ہے - اور اس وکالت کے دو گواہ بھی مقرر کردیتا ہے -

شرعاً بالغہ عورت کے لیے ضرورت ہے کہ بلا واسطہ اختیار وکالت کی دے - چنانچہ اب بھی قصبات میں پہلے وکیل اور گواہ عروس کے پردے کے باہر جا کر بآواز بلند اختیار حاصل کرتے ہیں ؟ عروس ہاں ہوں نہیں کرتی بلکہ رو دیتی ہے اور اِس سے اختیار مراد لی جاتی ہے - قاضی وکیل سے عروس کا نام؟ ولدیت وغیرہ دس مہر کی تعداد آہستہ آہستہ دریافت کرتا ہے - اور پھر دولہا سے کہتا ہے کہ مسماۃ فلاں بنت فلاں کو بعوض اتنے دیں مہر کے تمہاری زوجیت میں دیا تم نے قبول کیا - اُس کے جواب میں دولہا بعد تھوڑے وقفے کے کہتا ہے "قبول کیا میں نے" -

قاضي صاحب یہ مضمون تین مرتبہ آہستہ آہستہ دولہا سے کہتے ہیں اور اُس سے "قبول کیا میں نے" ہر بار کہلاتے ہیں - یہ مضمون اس قدر دھیمی آواز سے کہا جاتا ہے کہ وکیل اور گواہ سن لیتے ہیں- بقیہ اہل مجلس مشکل سے سن پاتے ہیں - اسي سوال و جواب کا نام ایجاب و قبول ہے -

ایجاب وقبول کے بعد قاضي اور تمام اہل مجلس دعا کے واسطے ہاتھہ اُٹھاتے ہیں - اور حاضرین مبارک باد دینا شروع کرتے ہیں - نکاح کے ختم ہوتے ہی دولہا کے سر پر چھوارے لٹائے جاتے ہیں اور قاضي صاحب کو حسب حیثیت دولہا کا باب نذر دیتا ہے - بعد نکاح کے عروس کا جوڑا دولہا کے طرف سے جاتا ہے -

نوشاہ - نوشہ -

سہرا - (ھ - سر - موتد) وہ پھولوں کي لڑیاں جو دولہا اور دلہن کے سر پر سے منھہ پر لٹکائي جاتی ہیں - سہرادوں اور والیان ملک کے یہاں سونے اور موتیوں کا سہرا عروس کے باندھا جاتا ہے -

۲ - وہ نظم جو شعرا سہرا باندھنے کے تقریب میں کہتے ہیں :—

ریاض—دھوم مچ جائے ترم نوشہ میں - سور اُٹھے جوت ہی کہا سہرا

سہرا باندھنا - سہرا سر پر رکھنا دولہا بنانے کے لیے -

بحر—رات گذري ہمیں دولہا کی طرح فرقت میں

صبح کو آنسوؤں کے ہار نے سہرا باندھا

سہرا بنانا - موتیوں یا پھولوں کي مسلسل لڑیاں بنانا کہ سہرے کی صورت ہوجائے —

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بناکر لایا

واسطے تیرے ترا دوں تناگر سہرا

سہرا بندھائی - سہرا باندھنے کا نیگ جو بہنوئي کو ملتا ہے -

سہرا دکھانا - شادي دیکھنے کا موقع نصیب کرنا -

سہرا دیکھنا ۔ بیاہ دیکھنا ۔ بیاہ رچانا ۔

سہرا گوندھنا ۔ موتیوں یا پھولوں کو بڑو کر سہرے کی شکل بنانا ۔

جلوہ ۔ عربی میں بالفتح دکھانا ؟ بالکسر اپنے آپ کو خاص انداز سے دکھانا ۔ عوام کی زبانوں پر بالضم ہے ۔

سہرے جلوے کی ۔ (جلوہ اردو میں آرسی مصحف کی جگہ مستعمل ہے ۔ پہلی رخصتی کو دولہا دلہن کو آمنے سامنے بٹھا کر آرسی مصحف دکھاتے ہیں ۔ بیاہنا بیوی :—

جانصاحب—کیوں سَوت کی میں آگ میں جل جل کے مروں گی
ہوں سہرے نہ جلوے کی جو بھرنا میں بھروں گی

سہرے کے پھول کھلنا ۔ (کنایہ) بیاہ کا وقت آنا ۔ بیاہ ہونا

منیر—دونوں دولہا دلہن خوشی سے ملیں
کہیں سہرے کے پھول جلد کھلیں

سہرے کی لڑی ٹوٹنا ۔ عورتیں اس کو منحوس سمجھتی ہیں :—

جانصاحب—ہو خیر دلہن دولہا کی مانھا مرا ٹھنکا
اچھا نہیں یہ ٹوٹنا سہرے کے لڑی کا

ٹوشاہ ٹوشہ (ف ۔ ٹو ۔ ٹیا ۔ شاہ ۔ داماد)

دولہا ۔ جورو بھی تک یہ خطاب دولہا کا رہتا ہے ۔

بیاہ (سنسکرت میں وواہ ۔ ٹواہ) اُردو نظم میں بر وزن راہ فصیح اور بر وزن سیاہ غیر فصیح ہے :—

داغ—کرے اللہ عمر و دولت و اقبال دور افزوں
خدا وہ دن دکھائے لوگ دیکھیں بیاہ کی شادی

۴۱—ریت رسم ۔ بعد نکاح کے دولہا عروس کے مکان میں بلایا جاتا ہے دولہا سہرا لٹکائے گردن جھکائے منہ پر رومال رکھے شرمیلی چال سے

آهسته آهسته قدم اُٹھاتے ہوئے ڈیوڑھی پر آتا ہے یہاں سے دولہا کی بہنیں دولہا کے سر پر آنچل ڈال کر اندر لیجاتی ہیں -

۱ — اُس وقت دلہن والیاں دلہن کے پاس بیٹھا کر کالے بل اور سکر دلہن کے ہاتھ پر رکھ کر دولہا کے منہ سے چٹواتی ہیں - دولہا کو بغیر ہاتھ لگائے زبان سے چاٹنا پڑتا ہے - یہ ایک قسم کا ٹوٹکا ہے - اور منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مطیع اور تابعدار رہے - چنانچہ اسی ٹوٹکے سے کالے بل چاٹنا محاورہ ہو گیا ہے - اور یوں اِستعمال میں ہے "کیا ہم نے ایسے ہی تمہارے کالے بل چاٹے ہیں جو تم سے آنکھ نیچی کریں" -

۲ — دلہن کی چوٹی پر کاجل تار کے دولہا کے آنکھوں میں لگاتی ہیں تا کہ ہمیشہ بیوی کے چوٹی تلے رہے -

۳ — دلہن کے پاؤں کے نیچے کا پان دولہا کو کھلاتے ہیں -

۴ — دولہا کے ایک ہاتھ سے مروحہ پسوایا جاتا ہے - مروح ؟ تالجھڑ چھیل چھبیلے ؟ کپور ؟ کچری ؟ صندل ؟ مشک دانہ وغیرہ خوشبودار چیزوں کا نام ہے - ایک ہاتھ سے اِن چیزوں کا پیسنا کارے دارد ؟ دولہا پسینے پسینے ہو جاتا ہے اُس وقت ساب سُہاگنیں اُس کی کُمک کو آتی ہیں - اور مل کر پسوا دیتی ہیں جب یہ پس جاتا ہے تو دولہا اور سہاگنیں دلہن کی مانگ میں بھر دیتی ہیں - بعض جگہ مانگ سیندور سے بھری جاتی ہے - اور دولہا کا باپ اُسرفی سے مانگ بھرتا ہے -

۴ — تو باتیں چٹواتا - تو باپ ؟ دیاب سے نگڑا ہوا ہے - تو باتیں تومنی چٹواتی ہے - پہلے دلہن کے سر پر مصری کی ڈلی رکھتی ہے اور دولہا سے کہتی ہے اِس کو منہ سے اُٹھا کر کھا جاؤ - جب دولہا سر کے پاس آتا منہ لے جاتا ہے وہاں سے ہٹا کر

دوسری جگہ رکھہ دیتی ہے - جب سر کی ڈلی بمشکل دولہا کھا لیتا ہے تو دو ڈلیاں مونڈھوں پر اور پھر ٹُتّھے گُھٹنیوں اور گھٹنوں پر رکھہ کر اسی طرح ڈھکاتی ہے -

۴۱ — آرسی مصحف - دولہا دلہن کو آمنے سامنے سر سے سر ملا کر بٹھاتے اور سرخ دوسالہ یا دوپٹا دولہن کے سر پر ڈال دیتے ہیں آئینہ اور قرآن شریف سورۂ اخلاص کے مقام پر کھول کر بیچ میں رکھہ دیتے ہیں عورتیں دولہا سے اصرار کرتی ہیں کہ دیکھو اور کہو بی بی میں تمہارا غلام ؟ آنکھیں کھولو - دولہا کہنے میں اغماض کرتا ہے آخر اُس سے دھینگا دھینگی کہوا ہی لیتی ہیں - دلہن جب اس پر بھی شرم سے آنکھیں نہیں کھولتی ہے تو منت سماجت کر کے سمجھاتے ہیں کہ آنکھیں کھول کر بی بی آئینہ دیکھہ لو - جب دلہن ذرا ذرا آنکھیں کھول دیتی ہے دولہا کہہ اُٹھتا ہے کہ آنکھیں کھولدیں اور اپنے ہاتھہ کی انگوٹھی دلہن کے ہاتھہ میں پہنا دیتا ہے :—

ولق—سورہ عورتوں کا چار طرف

جلد دکھلاؤ آرسی مصحف

۴۲ - جہیز (عربی میں بکسر اول و دوم جہاز کا اِمالہ ہے) عوام دھیر اور دان دھیر کہتے ہیں - وہ اسباب جو لڑکی کو شادی کے وقت میکے سے ملتا ہے - بیشتر گھر بار کی ضروری چیزیں اور گھر داری کے سامان سے مراد ہوتی ہے جو ہر شخص اپنی حیثیت کے موافق بیٹی کو رخصت کے وقت دیتا ہے - اس میں سات سے لے کر اکیس تک بھاری بھاری جوڑے دُھرے بھرے گہنے ہوتے ہیں - علاوہ ضرورت کے بال بچہ ہونے کا سامان ؟ یعنی طشت ؟ چوکی ؟ رخت خانے میں باندھنے کا سرخ پردہ بھی ہوتا ہے -

۴۳ ـ بابل ـ جسے دھلی میں منڈھا کہتے ھیں ـ گھر کے چھوٹنے کا ایک درد انگیز گیت جو عروس کے میکے سے پہلی رخصتي کے وقت گایا جاتا ھے ـ

۴۴ ـ جب دلھن کی سواري دولھا کے گھر پہونچتي ھے تو دولھا کي بہنیں دروازے رباے مکان کے بند کرلیتي ھیں اور اُس کا نیگ لیتي ھیں دلھن گود میں اُتاري جاتي ھے اور اُس وقت منھہ دکھائي دي جاتي ھے اور کھیر چٹائي جاتي ھے ـ

روٹھائي ـ وہ بھدی جو جاوند کے رسمے دار دلھن کا منہ دیکھہ کر دیتے ھیں ـ

کھیر چٹانا ـ یہ رسم اس طرح ادا کي جاتي ھے کہ عروس کي ھتیلي پر کھیر پھیکي رکھہ کر اس میں اندار سے شکر ملاے ھیں بعض مقامات پر دستور ھے کہ دولھا اپے ھاتھہ سے چکھہ لیتا ھے اور بعضوں میں صرف اپنا ھاتھہ وھاں تک لے جاتا ھے اور چکھتا نہیں پھر میراثن وہ کھیر اک پیالے میں رکھہ لیتي ھے اور اسي طرح سات مرتبہ کھیر عروس کے ھاتھہ پر رکھي جاتي ھے ـ اور ھر بار اس کو میراثن اپے پیالے میں رکھہ لیتی ھے ـ اس وقت میراثنیں گیت گاتي ھیں ـ

۴۵ ـ پاؤں دھونا ـ اس وقت لوٹا اور طشت جو جہیز میں عروس کو ملتا ھے سامنے لایا جاتا ھے اور بوشہ عروس کے پاؤں طشت میں اُسی لوٹے سے دھوتا ھے اور یہ دھوون گھر کے چاروں کونوں پر ڈال دیا جاتا ھے اُس کو پاؤں دھلانا ـ پاؤں دھونا کہتے ھیں ـ

پاؤں دھودھوکے پینا ـ پاؤں دھو کے پینا ـ کمال مطیع ھونا ـ فرمانبردار ھونا ؛ کمال محبت اور اطاعت ظاھر کرنے کے لیے مستعمل ھے :—

غالب—غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہو ـ
پیتا ھوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

بحر—پلا دے اپنے ہاتھوں ایک دن اپنا اُلش مجھکو
پیوں دھو دھو کے تیرے پاؤں اے پیر مغاں برسوں

۴۶ - چوتھی - دوسرے دن دلھن کے بھائی جو عمر میں اُس سے چھوٹے ہوتے ہیں چوتھی لیکر آتے ہیں - چوتھی میں مٹھائی اور کھاجوں کے مٹکے ہوتے ہیں - تیسرے پہر کو دولھا اور دلھن کے مکان پر جاتے ہیں - دولھا کی سالیاں بوشہ کی جوتی چھپا دیتی ہیں - اور جب تک اس کا نیگ نہیں لے لیتیں اُس کی جوتی نہیں دیتیں - اُس وقت چوتھی کھیلنے کی رسم ادا کی جاتی ہے - سالیاں دولھا کو پھولوں کی چھڑیاں مارتی ہیں اور وہ بھی پھولوں کی چھڑی ؟ سبز ترکاری سے مارتا ہے -

۴۷ - چالے - چوتھی کے بعد چار چالے ہوتے ہیں -

پہلا چالا ماں - دوسرا خالہ یا پھوپھی ؟ تیسرا نانی ؟ چوتھا دادی کی طرف سے اگر اِن رشتہ داروں نے نہ کیا تو باپ کو یہ چاروں چالے کرنا پڑتے ہیں - چالے اکثر جمعہ یا دوشنبہ کو ہوتے ہیں جس کی طرف سے چالے ہوتے ہیں اس کے یہاں دلھن اور دولھا کے کل عزیز رشتہ دار عورتیں مہمان ہوتی ہیں - اب یہ چالے بیشتر بوشہ کے باپ کی طرف سے ہوتے ہیں -

۴۸ - سفر - اگر دولھا کو سفر کرنا پڑے تو اس کو لازم ہے کہ سسرالی رشتہ داروں کے واسطے نسائی لائے؟ نسائی میں مختلف قسم کی چیزیں کم قیمت ہوتی ہیں -

نوشاہ کی سفر سے واپسی پر تیل دماس سسرال سے آتا ہے - وہ اُرد کے چار دانے تیل میں ڈال دیتا ہے اور وہ تیل ماش حلال خورے کو دے دیا جاتا ہے ؟ اس کے بعد دیدار پیر کا کونڈا ہوتا ہے -

پیر دیدار - عورتوں نے ایک فرضی ولی قرار دے رکھا ہے عورتیں جب کسی کے آنے کی آرزو ہوتی ہے تو کونڈا مانتی ہیں -

لذت عشق - کوئي بولي آئے مرا منہ لعا
تو کونڈا کروں پیر دیدار کا

۴۹ - میت کی رسمیں -

برع کا وقت آتا ھے تو نبلیاں بلے اوپر ھو جاتی ھیں سانس بے قاعدہ چلنے لگتي ھے - نبض کي رفتار بھي بے قاعدہ ھو جاتی ھے - اس کو محاوراب ذیل سے ظاھر کرتے ھیں —

پُتلیاں بدل جانا -
نُبلیاں اُلٹ جانا -
پُتلیاں پھر جانا -

یعنی برع کے وقت نُبلیوں کا بلے اوپر ھو جانا .—

حلال—جلوہ نقاب اُلٹ کے جو تم نے دکھا دیا
عش آگیا اُلٹ گئیں دو چار پُتلیاں

امیر—پُتلیاں بھي بدل گئیں دم برع - وقت پر کوئي آسنا نہ ھوا -

حلال—اب تو خدا کے واسطے منہ پھیر کر نہ بیٹھہ
آنکھوں میں دم ھے پھر گئیں اے یار پُتلیاں

آنکھوں میں جان اٹکنا - آنکھوں میں جان اڑ جانا - آنکھوں میں جان ھونا - آنکھوں میں دم آنا - آنکھوں میں دم اٹکنا - تمام جسم سے دم نکل کے جستجو دیدار سے آنکھوں میں رک رھنے کی جگہ —

بحر—اب تو آنکھوں میں جان اٹکی ھے
دیکھہ جا آ کے ایک نظر مجھکو

شرف—اے یار کسي طرح یہ رخصت نہیں ھوتی
آنکھوں میں تیرے دیکھنے کو جان اڑی ھے

آتش—اک رشک مسیحا کے تصور میں ھے یہ حال
آنکھوں میں ھے جان اور فنا دم نہیں ھوتا

داغ—دم میری آنکھوں میں اٹکا ہے کہ دیکھوں تو سہی —
کیا مسیحا سے مرے درد کا درماں ہوگا

آنکھوں میں جی کھنچ آنا - آنکھوں میں جی آنا - روح کا بدن سے نکل کر آنکھوں تک آجانا - مرنے کے قریب ہونا —

مدر—مرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ کہنے
کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا

اب یہ دونوں محاورے قلیل الاستعمال ہیں -

دم اُکھڑنا - سانس، اُکھڑنا - سانس کا بے قاعدہ چلنا -

داغ—دیکھ لینے کو ترے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمار غم ہجر میں کیا رکھا ہے

دم اُلٹ جانا - نزع کی حالت ہونا -

حرأت—نہ جانا یہ کہ جانے سے کہیں کیوں کر جیئے گا وہ
کہ جس کا دم اُلٹ جانا تھا میرے روٹھ جانے سے

دم درود نہیں - ذرا طاقت نہیں - قریب مرگ ہے -

سرور—اب عیادت کو آئے سود نہیں
دمِ آخر ہے دم درود نہیں

دم دُگدُگی میں ہونا - (دُگدُگی - حلقوم سینہ اور گلے کے بیچ کا گڑھا) نزع کا عالم ہونا —

انیس—جھیدیں وہیں گلا یہ لعینوں کے جی میں تھا
یاں کنٹھ بیٹھ جانے سے دم دُگدُگی میں تھا

دم لب یا لبوں پر آجانا - جاں بلب ہونا :—

راسخ—شکوہ کرتا ہے زبانِ حال سے بیداد کا
کھنچ کے لب پر آگیا دم خنجر جلاد کا

---

* سانس لکھنؤ میں بالاتفاق مؤنث ہے - دہلی والے مذکر بھی بولتے ہیں -

دم نکلنا - جان نکلنا -

دمِ واپسیں - آخری سانس جو مرتے وقت نکلتی ہے -

دم دیکھنا - سانس دیکھنا - بیمار کی حالت ردی ہوتی ہے تو اُس کی سانس دیکھتے ہیں کہ مسلسل جاری ہے یا اُکھڑگئی یا نہیں آتی :-

شرف—منہ ڈھانکنا تھا کوئی دیکھتا تھا سانس
شب بھر یہ حال سن کے مری داستاں رہا

سانس گننا - سانس کا شمار ہونا - نزع کا وقت ہونا - جب سانسیں گنی جاتی ہیں -

اوج—ہو سانس کا شمار بس اب وقت ہے اخیر
گر شدت عطش سے ہوا جاں بحق صغیر

نبض اُبھرنا - نبض ڈوب کر پھر چلتی ہوئی معلوم ہونا -

نبض ڈوبنا - نبض کی رفتار کا جاتا رہنا —

رضا—نبضِ مریض ڈوب کے اُبھری نہ شام غم
امید دل نے زور لگایا تو کیا ہوا

نبض نہ ملنا - نبضیں نہ ملنا - نبض کی حرکت محسوس نہ ہونا -

نبضیں چھوٹنا - نبضوں میں حرکت نہ رہنا .—

محسن رح—طبیب آئیں نالیں پہ تو دم گھٹتیں
مری نبض دیکھیں تو نبضیں چھٹتیں

جان بحق ہونا - مرجانا -

۵۰ - جب دم نکل جاتا ہے اور سکتے کا شبہہ ہوتا ہے تو آئینہ منہ کے سامنے رکھہ کر دیکھتے ہیں اگر آئینہ پر سانس کا اثر معلوم ہوتا ہے تو سکتہ ہی سمجھتے ہیں —

شعور—کہیں سکتا نہ عاشق کو ہوا ہو - اُسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا

۵۱ - مرد کے جنازے پر سفید چادر ڈالتے ہیں عورت کے جنازے پر گہوارہ باندھ کر چادر ڈالتے ہیں - بیوہ ہو تو سفید اور سہاگن ہو تو رنگین -

گہوارہ - چارپائی کے دونوں پٹیوں میں کھپچّیاں باندھ کر محراب سی بنادیتے ہیں اور اُس کو گہوارہ کہتے ہیں -

۵۲ - قبر پر مردے کے سرہانے اُس کا شجرہ اور جواب نامہ رکھتے ہیں -

جواب نامہ - سفید کپڑے پر پنڈول مٹّی سے حکم لکھتے اور اُس کو جواب نامہ کہتے ہیں -

قبریں دو قسم کی ہوتی ہیں :—

(۱) بغلی* - ایک لانبا گڑھا کھود کر اُس کے پہلو میں جانب قبلہ اندر ہی اندر قبر بناتے ہیں -

(۲) صندوقی - میت کے قد کے برابر لانبی اور قد آدم گہری ہوتی ہے -

لحد - جس بغلی گڑھے میں مُردے کو رکھتے ہیں اُس کو لحد کہتے ہیں -

۵۳ - مُردے کو قبر میں رکھنے کے بعد تختے سے بند کر کے مٹّی دیتے ہیں -

مٹّی† دینا - میت کو قبر میں اُتارنے کے بعد حاضرین کا تھوڑی تھوڑی مٹّی لے کر قبر میں ڈالنا :—

ناسخ—کل نہ دے گا کوئی مٹّی بھی اُنہیں - آج رو رو کہ دیا کرتے تھے

مٹّی ٹھکانے لگانا - مُردے کی تجہیز و تکفین کو حسب قاعدہ سر انجام دینا :—

ریاض—لگا دیتا کوئی مٹّی ٹھکانے - ریاض اِک آرزو مُردہ پڑی ہے

مٹّی عزیز کرنا—کنایہ ہے کسی مردے کے دفن میں شریک ہونے اور اپنے ہاتھ سے دفن کرنے سے :—

---

* بغلی بسکون دوم و بفتح دوم دونوں طرح صحیح ہے -

بحر—وہ رنج پائے کہ مر مر کے زندگانی کی - بغل میں دل بغلی گور کا عذاب رہا -

† یہ لفظ بالکسر اور بالفتح دونوں طرح مستعمل ہے لیکن بالکسر فصیح ہے -

آتش—قبول خاطرِ مردم ہو ہوتیا کیطرح
عبر تیری کریں سبح و برہمن متّی -

۵۴ - قُل کے ڈھیلے - دفن کرنے کے بعد ڈھیلوں پر قل ہو اللہ پڑھ کر پھونکتے اور اُن ڈھیلوں سے قبر باٹتے ہیں -

شعور—گنج زر جس نے لٹایا نام روشن ہوگیا
قبر میں ہر قل کا ڈھیلا سانپ کا من ہو گیا

۵۵ - ماتمدار عورتیں - جب کوئی پرسا دیتا ہے تو میت کے صفات بیان کر کے روتی ہیں اُس کو بیان کرنا اور بین کرنا کہتے ہیں -

بلّا لینا - (عو) منہ ڈھانک کر میت پر رونا - ماتم کرنا -

پُرسا دینا - ماتم پرسی کرنا -

داغ—دلِ غمگیں کا اس بیکسی میں
دیا پُرسا کراماً کاتبیں نے

پُرسا لینا - میت کے وارثوں کا صبر اور دلاسے کی باتیں لوگوں سے سننا -

منہہ ڈھانکنا - منہ ڈھانپنا - منہ پر کپڑا ڈال کر رونا - بین کرنا :—

شاد—منہ بھی ڈھانپا میت عاشق نہ جو
دیکھ کر آنکھیں کُھلیں شرما گیا

دہلی میں منہ ڈھانکنا اور لکھنؤ میں دونوں محاورے مستعمل ہیں :—

شاد—نہ نکلا جب کوئی گریاں مَرے پر مجھ پُر ارماں کا
ہزاروں آرزوؤں نے مری میت نہ منہ ڈھانکا

۵۶ - میت کے گھر والے تین روز تک چولھا گرم نہیں کرتے - اُن کے واسطے رشتہ داروں کے یہاں سے کھانا آتا ہے -

حاضری - (۱) وہ کھانا جو مردے کے وارثوں کو بعد دفن میت بھیجتے ہیں :-

بھجواؤ گھر میں سحر کے اے جان حاضری
بھوکا تمھارے دید کا کچھ کھا کے مر گیا

اس کو کڑوی کھچڑی اور کڑوی روٹی بھی کہتے ہیں -

(۲) - وہ نقد رقم جو قریبی رشتہ دار میت کے وارثوں کو دیتے ہیں -

۵۷ - سوم - پھول - بیجا - دفن کے تیسرے روز رسم فاتحہ ادا ہوتی ہے اعزا اور احباب جمع ہو کر قرآن شریف پڑھتے اور چنوں پر کلمہ پڑھتے ہیں چنے دس بارہ سیر ہوتے ہیں - جب چنے اور قرآن شریف ختم ہو جاتا ہے تو چنے ایک چادر میں اکٹھا کر کے اُس میں الائچی دانے ملا دیتے ہیں ؟ جب فاتحہ شروع ہوتا ہے ؟ ارگجا چنوں کے پاس رکھدیتے اور لوبان یا اگر کی بتی جلادیتے ہیں -

ارگجا—(ہ - بمعنی خوشبو ہے) اردو میں ایک مرکب خوشبو کا نام ہے - برادۂ صندل - کافور کو عرق گلاب میں ملا کر ایک پیالے میں رکھتے ہیں اور اس پیالے کو پھولوں کی بھری ہوئی رکابی میں رکھ کر ہر فاتحہ خوان کے سامنے لے جاتے ہیں - وہ ایک پھول پر سورۂ اخلاص یعنی قل ہواللہ پڑھکر اُس پیالے میں ڈال دیتا ہے - یہ پیالہ مردے کی قبر پر پھینک دیا جاتا ہے -

پھول - ہندوؤں میں مردوں کی ہڈیاں جل جانے کے بعد چن کر گنگا جی میں بہانے کے واسطے بھیجتے ہیں - مسلمانوں میں سوم ؟ بیجا کے معنی میں مستعمل ہے - اور اس کا فعل جمع میں آتا ہے —

میر—جب سے عاشق کے ہوئے پھول پہننا کیسا

کپڑے وسواس سے پھولوں میں بساتے بھی نہیں

سوم - (ف - بکسر اول و ضم ہمزہ بسکل واو - مرکب ہے سہ - م سے یہ مبہم الفاظ عدد میں بسبت کے واسطے آتا ہے) - بیجا —

امیر—عاشق کا سوگ چاہیے رنگت نہ کیجیے

جہلم تو کیا سوم بھی ابھی تو ہوا نہیں

اردو میں زبانوں پر سُیم ہے —

منیر—بلبلوں کا سُیم نہیں اے گل

کیوں ترے منہہ سے پھول جھڑتے ہیں

۵۸ - سوگ - یہ لفظ فارسي اور ہندي میں مشترک ہے رشتہ دار عورتیں ماتم میں چالیس روز تک پان کھانا ؟ مسي ملنا ؟ مہندي لگانا - رنگین لباس اور چوڑیاں پہننا ترک کردیتي ہیں - بیوہ عمر بھر کے لیے سب زینت کي چیزیں ترک کر دیتي ہے اس کو سوگ کرنا - سوگ منانا - سوگ رکھنا - سوگ میں بیٹھنا کہتے ہیں - سوگ اُتارنا - سوگ بڑھانا - ماتم کرنا - موقوف کرنا

شرف—شہیدِ یار کا اپنے وہ شاید سوگ اُتاریںگے

طلب ہے آئینہ سرمہ بھي رکھا ہے حنا بھي ہے

سوگن—عمردہ عورت جو کسي کا سوگ کرتی ہے -

رنڈاپا—وہ زمانہ جو عورت پر بیوہ ہونے کے بعد گزرے -

رنڈ سالہ—وہ لباس جو عورت کو بیوہ ہونے پر شوہر کے ماتم میں پہناتے ہیں جب کوئي عورت بیوہ ہوجاتي ہے تمام کنبے کي عورتیں جمع ہو کر سفید جوڑا پہناتي اور چوڑیاں وغیرہ جو سہاگ کي چیزیں ہیں توڑ ڈالتي ہیں -

۵۹ - سوم کے بعد دسویں روز فاتحہ ہوتا ہے اس کو دسویں کا فاتحہ اور جو بیسویں روز ہوتا ہے اس کو بیسواں اور جو چالیسویں روز ہوتا ہے اُس کو چالیسواں کہتے ہیں -

۶۰ - چہلم—عوام کي زبانوں پر چِہلُم ہے - صحیح چِہلُم ہے -

ذوق—عبث جاں منتظر ہوتوں پہ ہے وہ شوخ کب آنا

اگر چہلم کو بھي آیا تو ہم سمجھینگے اب آنا

۶۱ - سہ ماہي - چھہ ماہي - برسي - اُن فاتحوں کو کہتے ہیں جو تیسرے مہینے - چوتھے مہینے - چھٹے مہینے اور سال بھر بعد ہوں -

۹۲ ـ تبارک—جب کہ مہینے میں جمعہ یا جمعرات کو مُردے کی تجہیز کے واسطے چالیس مرتبہ سورۂ تبارک‌الذي (اُنتیسویں پارے کي سورۃ کا نام) پڑھي جاتی ہے اور میدے کي میٹھي تنوري روٹیاں جن پر سونف کلونجي جمي ہوتي ہے بطور خیرات تقسیم کرتے ہیں اُن کو تبارک کي روٹیاں اور تبارک کہتے ہیں -

۹۳ ـ دپسا—مرنے کے دو برس بعد خاص وفات کي تاریخ یہ فاتحہ ہوتا ہے -

گارساں دتاسی

(از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی)

گارساں دتاسی اُردو ادب کا ایک قابل وقعت محسن ہے ۔ اُس کے احسان نہ صرف اس لیے یاد رہیں گے کہ اس نے ہندستان سے دور ایک غیر ملک میں بیٹھ کر ہماری زبان اور ادب کی عمر بھر خدمت کی بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے زمانے میں خود ہمارے ادیب اپنے علمی اور ادبی خزانوں کی صحیح قدر و قیمت سے ناواقف تھے ۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اُردو ادب پر تحقیقات شروع کی ۔ اس کے مصنفوں اور تصنیفوں پر نا قدرانہ نظر ڈالی اور فرانسیسی زبان میں ہندستانی ادب کی ایک مبسوط تاریخ لکھ کر تین جلدوں میں شائع کی ۔

یہ گارساں دتاسی ہی تھا جو اُردو کے مایۂ ناز قدیم شاعر ولی کے کمال سے سب سے پہلے واقف ہوا اور اس کے کلام کے متعدد نسخوں کے مقابلے کے بعد ایک قابل یادگار دیوان شایع کرایا ۔ نہ صرف یہی بلکہ بہت کم اُردو داں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس فرانسیسی محقق نے ہماری زبان اور ادب کے متعلق (۳۰) سے زیادہ کتابیں اور رسالے لکھے اور شایع کیے ۔ اُردو ادبیات کی تمام تاریخ چھان ڈالیے بہت کم ادیب آپ کو ایسے ملینگے جنھوں نے اپنی زبان اور ادب میں اس قدر کام کیا ہو ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک اُردو کے بعض رسالوں میں اس فرانسیسی محقق کی ایک دو کتابوں کا کچھ سرسری ذکر کیا گیا ہے ۔ حیدرآباد دکن کے ایک رسالہ "تحفہ" میں چند سال قبل دتاسی کی معلومات کی بعض غلطیوں پر روشنی ڈالی گئی بھی اور انجمن ترقی اُردو کے رسالے میں اُس کے چند خطبوں کے اُردو ترجمے بھی

شایع ہوئے ہیں لیکن اس کی زندگی اور اُردو سے متعلقہ کارناموں کی نسبت اب تک کسی قسم کی معلومات اُردو تو اُردو کسی اور زبان میں بھی نہیں شایع ہوئی -

اُردو کی لسّانی ساخت پر عملی تحقیقات کرنے کے سلسلے میں ۱۹۲۹ع میں جب میں نے دوبارہ یورپ کا سفر کیا تو فرانس میں ایک سال سے زیادہ قیام کرنے کا موقع ملا - وہاں کے متعدد کتب خانوں کے اُردو مخطوطوں کا میں اپنے پہلے ہی سفر میں مطالعہ کرچکا تھا اور اسی ضمن میں گارساں دتاسی کی ہندستانی زبان کے متعلق اس قدر فرانسیسی کتابیں نظر سے گزری تھیں کہ ان پر کچھ لکھنے کو بے اختیار جی چاہتا تھا - چنانچہ اس دوسرے سفر میں چھٹّیوں وغیرہ میں جس قدر موقع مل سکا فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی اور آخر کار اس قابل عظمت محقق کی نسبت جو کچھ معلومات حاصل ہو سکیں ان کا ایک مختصر سا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :—

علمی نشو و نما

دتاسی فرانس کا مشہور بندرگاہ مارسیل میں سنہ ۱۷۹۴ع میں پیدا ہوا - علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد جب مشرقی زبانوں کا شوق اُبھرا تو بیئس سال کی عمر میں وہ سنہ ۱۸۱۷ع میں پیرس پہونچا جہاں موسیو سلوستر دی ساسی (M. Silvestre de Sacy) السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا - دساسی نے اس نوجوان کا پدرانہ شفقت کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اس قدر خلوص اور توجہ کے ساتھ تعلیم دی کہ گارساں دتاسی نے بہت جلد عربی اور ترکی زبانوں پر دسترس حاصل کرلی - ان زبانوں سے اس نے فرانسیسی میں جو اعلیٰ درجے کے ترجمے کیے ہیں وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ دساسی اپنے شاگرد

کو کامیاب بنانے میں کس خلوص کے ساتھ مصروف تھا - اور یہی وجہ تھی کہ گارساں دتاسی کے دل میں اپنے اُستاد کی شفقت اور خلوص کی یاد آخر عمر تک تازہ رہی -

عربی اور ترکی زبانوں کی تحصیل ہی کے دوران میں دتاسی کو فارسی کا شوق پیدا ہو گیا - اور فارسی ادب نے اس کو اِس قدر لُبھایا کہ اس زمانے میں اس نے دو تین فارسی کارناموں کا بھی فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا - ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر "منطق الطیر" کا ترجمہ ہے - اس ترجمے کے ساتھ دتاسی نے اس کتاب پر ایک مقدمہ بھی شایع کیا جس میں اس نے "ایرانیوں کی فلسفیانہ اور مذہبی شاعری" پر بحث کی ہے -

غالباً فارسی کتابوں ہی کے مطالعہ سے دتاسی کو تصوف کا شوق پیدا ہوا اور یہ وہ شوق ہے جو ایک دفعہ پیدا ہوجانے کے بعد بہت کم دور ہوتا ہے - چنانچہ دتاسی بھی اس میں اس قدر محو ہوگیا کہ تمام عمر صوفیاء کے عقائد اور انہی سے متعلقہ مسائل کا مطالعہ کرتا رہا - اور شاید اس کا یہی شوق تصوّف تھا جس نے اس کو ہندستانی مصنفین کی طرف متوجہ کیا اور جس کی وجہ سے اس نے نہ صرف ہندستانی سیکھ لی بلکہ اس پر قابل وقعت کام کیے -

اُردوے شغف اور دیوان ولی

راقم نے دتاسی اور اس کے کارناموں کی نسبت جو معلومات بہم پہونچائی ہیں ان کے مطابق میر تقی میر کی مثنوی اژدر نامہ ان چند اردو کتابوں میں سے ہے جو ابتدا میں دتاسی کو پسند آئیں - اور جن کا فرانسیسی زبان میں اس نے ترجمہ کیا - میر کی اس مثنوی کا فرانسیسی

ترجمہ ۱۸۲۹ع میں "Conciles aux mauvaise poets" Paris (Doudey-Dupre) کے نام سے شایع ہوا ۔

جب دتاسی کے استاد سلوستر دساسي نے دیکھا کہ اسکا قابل فخر شاگرد ہندستاني ادبیات کا ماہر ہو کر اس میں اس قدر دلچسپی لے رہا ہے تو اس نے حکومت سے درخواست کی کہ مدرسۂ السنۂ مشرقیہ میں ہندستانی زبان و ادب کے لیے بھي ایک پروفیسري کي جگہ قایم کی جاوے چنانچہ موسیو دمارنگ ناک (M de Maitignac) کے محتصر سے عہد وزارت میں مشہور مستشرق کي یہ سفارش منظور کرلی گئي اور دتاسي سنہ ۱۸۳۸ع میں ہندستاني کا پروفیسر ہو گیا ۔

اس خدمت کو حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے دتاسي نے اپنے شاگردوں کی شہرت کے لیے ہندستاني زبان کا ایک قاعدہ مرتب کیا جو سنہ ۱۸۲۹ع میں Rudiment de la langue Hindoustanie کے نام سے شایع ہوا - تین چار سال بعد دتاسي نے اس قاعدے کا ایک ضمیمہ لکھنے کي ضرورت محسوس کی چنانچہ یہ ضمیمہ بھي ۱۸۳۴ع میں شایع ہوگیا ۔

طالبعلموں کي ضرورتوں کو پورا کرتے رہنے کے ساتھہ ساتھہ دتاسي اپنے ذوق کے مطابق اُردو شعرا کے مطالعہ میں بھي مصروف تھا ۔ چنانچہ اِنھیں دو تین برسوں میں وہ کلیات ولی پر کام کرتا رہا ۔ اس شاعر کا نام اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے ہندستان سے اس کے متعدد قلمی نسخے منگائے ۔ اُن کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا اور عرصۂ دراز کي محنت کے بعد ایک قابل قدر دیوان مرتب کیا جو سنہ ۱۸۳۴ع میں پیرس کے شاہی کتب خانے سے شایع ہوا ۔

اس کام میں دتاسي نے جس توجہ اور دلچسپی کو ملحوظ رکھا اس کا اندازہ دیوان ولي کے ان مخطوطوں کي طویل فہرست کے مطالعے سے

ہو سکتا ہے جو دتاسی نے جگہ جگہ سے منگا کر جمع کیے تھے اور جن کا تذکرہ آیندہ صفحات میں دکّنی مخطوطوں کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے -

دتاسی کا کلیات ولی کئی حیثیتوں سے قابل قدر ہے اس کے ذریعہ سے دتاسی نے نہ صرف ایک حقیقی شاعر کو صحیح عظمت اور مقبولیت سے روشناس کیا بلکہ اُردو دنیا کے لیے قدیم شاعروں کے کلام کو سلیقہ سے مرتب دینے کا ایک لایق تقلید نمونہ بھی پیش کیا لیکن اس نمونے کے باوجود بھی اُردو کے بہت کم شاعروں کے کلام اس اِحتیاط اور توجہ کے ساتھ شایع کیے گئے ہیں -

جہاں دتاسی ولی جیسے عظیم‌الشان شاعر کے کلام میں محو تھا ایک اور اُردو کتاب بھی اس کے زیر مطالعہ تھی - یہ تحسین‌الدین کی مثنوی "کامروپ" ہے - اس کتاب کی طرف دتاسی کی توجہ غالباً اسی سے مُنعطف ہوئی کہ وہ ایک طویل مسلسل نظم تھی اور یہ وہ چیز ہے جس کی ولی کے یہاں کمی تھی - چنانچہ دتاسی نے کامروپ کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ بھی سنہ ۱۸۳۴ع میں شایع ہوا -

اس کام کی خوبی اور مقبولیت کا اس واقع سے اندازہ ہوگا کہ اس ترجمے کی اشاعت کے بعد ایک سال کے اندر دتاسی اصل اُردو کامروپ کو شایع کرنے پر مجبور ہوگیا - اس کے بھی اس فرانسیسی محقق نے کئی قلمی نسخے جمع کئے تھے - یہ کتاب پیرس کے شاہی کتب خانے سے سنہ ۱۸۳۵ع میں چھپ کر نکلی - اس سال دتاسی نے اُردو کی ایک اور مسلسل کتاب گُل بکاؤلی کا فرانسیسی زبان میں خلاصہ شایع کیا -

تاریخ ادبیات هندوي و هندستانی

ان ابتدائي کاموں کے بعد دتاسي کو اُردو ادب کا خاصا دوں پیدا ہوگیا تھا۔ اس اثنا میں اس نے هندستاني مصنفین کي بہت سی کتابیں اور تقریباً جملہ تذکرے اپنے کتب خانے میں جمع کر لیے تھے ۔ جو انگریز یا فرانسیسي هندستان آتے تھے دتاسي ان سے مراسلت کر کے اُردو مخطوطے اور مصنفین کے حالات طلب کیا کرتا چنانچہ اس مضمون کے آخري حصے کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اس سلسلے میں اس زمانے کے تمام مستشرقین سے اس کي شناسائي ہوگئی تھي ۔ نیز هندستانی ادبیات کي ضمن میں تیس چالیس یورپین افراد سے اس کو تعلق رہا ہے ۔

خوش قسمتی سے دتاسي کي کاوشیں اکثر دفعہ کارگر ہوئیں ۔ اس کا گھر هندستان کے شاهي اور دوسرے عالیشان کتب خانوں کے بعض اچھے اچھے مخطوطوں یا ان کي نقلوں سے مالا مال ہوگیا ۔ مطبوعہ کتابیں اس کے هاں بطور تحفہ آنے لگیں اور بعض دفعہ اس کے لیے اس کے دوستوں نے خود مصنفین سے ان کے حالات دریافت کرکے روانہ کیے ۔

ان تمام سہولتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دتاسي چار پانچ سال کي محنت کے بعد هندستانی ادب کی ایک تاریخ مرتب کرنے میں کامیاب ہوگیا جو سنہ ۱۸۳۹ع میں "تاریخ ادبیات هندوي و هندستاني" کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں پیرس کے شاهی کتب خانے سے شایع ہوئی ۔ یہ تاریخ نہ صرف یورپی زبانوں میں اِس موضوع پر اپنی قسم کي پہلي چیز تھی بلکہ خود اُردو میں بھي اس طرح کا کوئی کام اس وقت تک نہیں کیا گیا تھا ۔ یہ واقعی ایک حیرت کي بات ہے کہ ایک غیر شخص ہماري زبان و ادب کي تاریخ لکھ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔

دتاسي کا یہ کارنامہ دیوان ولي کي اشاعت سے بھي زیادہ اہم ہے ۔

گو اس میں بعض جگہ غلطیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن اس زمانے کی معلومات کے لحاظ سے ان غلطیوں کا پایا جانا ایک فطری بات تھی - جس قدر مواد اُردو تذکروں ، مخطوطوں کی اندرونی شہادتوں اور ادیب مستشرقین کے بیانات سے حاصل ہو سکا اس کو دتاسی نے خاص سلیقے اور خوبی سے ایک کارآمد کتاب کی شکل میں پیش کردیا ہے - ہمارے تذکرہ نویسوں کے مبالغہ آمیز بیانات اور مُبہم اسالیب بیان اکثر دفعہ خود ہماری زبان کے اہل تحقیق ہی کو پریشان کردیتے ہیں گارساں دتاسی تو ایک بالکل غیر ملک اور غیر طرز تمدن کا پروردہ تھا - اس کو ان کتابوں سے اصل مطلب اور کام کی باتیں حاصل کرنے میں جو دقت حاصل ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہم اُردو داں بہت کم کر سکتے ہیں -

دتاسی کی کتاب کی سب سے زیادہ مفید خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک سائنٹیفک تاریخ ادبیات اُردو ہے - ہمارے تذکرہ نویس ، شاعروں کے اصل حالات زندگی اور خصوصاً ان کی تاریخ پیدایش و وفات یا کتابوں کے سنینی تصنیف کے اظہار میں ہمیشہ غافل رہے ہیں - دتاسی کو بھی اس کی بڑی سخت شکایت ہے - اس نے ضروری حالات اور معتبر تواریخ معلوم کرنے کی حتی‌الامکان کوشش کی ہے اور ان تاریخوں وغیرہ کے لحاظ سے تو دتاسی کا یہ کام بے حد قابل قدر ہے -

یہ کارنامہ ابھی اختتام تک نہیں پہنچا تھا کہ اِسکی اہمیت کا دتاسی کے ہم وطن ہم عصروں نے اندازہ لگا لیا - فرانسیسی علما اس کی مسکلات اور کام کی خوبی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی" کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی یعنی سنہ ۱۸۳۸ع میں گارساں دتاسی کو فرنچ اکیڈیمی کا رکن بنا لیا - یہ وہ عزت ہے جو فرانس میں بہت کم ادیبوں اور محققوں کو اس عمر میں حاصل ہوئی ہے -

دتاسی کی تاریخ ادب صرف فرانس ہی میں نہیں بلکہ انگریز مستشرقین

میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی چنانچہ اس کی اشاعت کے بعد ہی اُنھوں نے ہندستانیوں میں اس کے ترجمے کا خیال پیدا کیا اور آخر دہلی کالج کے پروفسر مولوی کریم‌الدین نے اپنی کتاب طبقات الشعراء اسی فرانسیسی تاریخ کے ایک آزاد ترجمے کے طور پر شایع کی -

اس سلسلے میں مولوی کریم‌الدین اور دتاسی کے درمیان مراسلت بھی جاری ہو گئی چنانچہ دتاسی کے مخطوطوں میں سے ایک دو ایسے بھی ہمارے نظر سے گزرتے ہیں جن کو مولوی کریم‌الدین نے اس محقق کے یہاں بطور تحفہ روانہ کیا تھا -

ہندی کا شوق اور افتتاحیہ خطبے

تاریخ کی اشاعت کے بعد دتاسی کچھ عرصہ تک درس و تدریس ہی میں مشغول رہا اور اس بات کی کوشش کی کہ ہندستانی کی دوسری شاخ ہندی پر اور زیادہ مہارت حاصل کرلے - اس نے اپنی تاریخ میں ہندی مصنفین کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ اس طرف اور بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے -

ساتھ ہی گارساں دتاسی نے اردو کام کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا چنانچہ سنہ ۱۸۴۵ع میں میاں مسکین کے ایک مرثیے کا فرانسیسی ترجمہ شایع کیا اور اسی زمانہ میں گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کے اس فرمان کا بھی ترجمہ چھپوایا جو مندر سومنات کے دروازوں سے متعلق شایع کیا گیا تھا -

پیرس کے مدرسۂ السنۂ مشرقیہ میں ہندستانی کے ساتھ ساتھ دتاسی ہندی بھی پڑھایا کرتا تھا لیکن فرانسیسی زبان میں اس کا کوئی قاعدہ نہیں تھا - چنانچہ یہ کام بھی دتاسی ہی کو کرنا پڑا - اور ہندستانی قواعد کی اشاعت کے اٹھارہ سال بعد سنہ ۱۸۴۷ع میں اس

نے "قاعدۂ زبان ہندوی" کے نام سے ایک کتاب شایع کی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل نئی اور کار آمد چیز تھی -

ان تمام کاموں کے بعد دتاسی کی شہرت ہندستان میں پھیل چکی تھی اور نہ صرف انگریز بلکہ ہندو اور مسلمان ادیب بھی اس کے یہاں اپنے کام تنقید و تبصرہ کے لیے روانہ کرنے لگے - اس طرح دتاسی کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہوگئی - اور بغیر زیادہ کد و کاوش کے اس کے گھر ہندستانی ادبیات کا ذخیرہ جمع ہونے لگا -

جب دتاسی نے دیکھا کہ ہندستان سے مستقل طور پر معلومات حاصل کرنے کے ذریعے پیدا ہوگئے ہیں - تو اس نے ہر تعلیمی سال کے آغاز پر اپنے معمولی درسوں سے پہلے ایک خطبۂ افتتاحیہ پڑھنا شروع کیا اس خطبے میں وہ سال گذشتہ کی جملہ ہندستانی ادبی اور علمی تحریکوں پر نظر ثانی گست ڈالتا تھا - اس قسم کا پہلا خطبہ غالباً سنہ ۱۸۵۰ع میں شایع ہوا -

دتاسی کے یہ خطبے تاریخی حیثیت سے بے حد قیمتی ہیں - ان سے ہندستانی زبان و ادب کی سالانہ ترقی سن وار محفوظ ہوگئی ہے اور محققین کے لئے ایک نہایت مفید مواد حاصل ہوگیا ہے - خوش قسمتی سے ان میں سے بعض مطبوعہ خطبوں کے اردو ترجمے انجمن ترقی اردو کے رسالے میں شایع ہوچکے ہیں - جن کے مطالعہ سے وہ لوگ جو فرانسیسی نہیں جانتے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں -

ان خطبوں نے دتاسی کے زمانے میں ہندستانی ادبیات کی حمایت و اشاعت کا بھی بہت کچھ کام کیا ہے - چنانچہ دتاسی کی وفات کے بعد فرانسیسی اکیڈیمی کے صدر نے مجلس میں سرکاری طور پر جب اس کے اوصاف بیان کیے تو دوران تقریر میں ان خطبوں

کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اس کے الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے :—

"مدرسۂ السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے دتاسی ہر سال اپنے لکچروں کو ایک خطبے سے شروع کرتے تھے جس میں وہ گذشتہ سال کی ادبی تحریکات ہند پر نظر ثانی کرتے ۔ یہ تبصرہ اس قدر صحیح اور ثقہ ہوتا تھا کہ اس کو نہ صرف اہل فرانس ہی پڑھتے بلکہ انگلستان، روس اور ہر اس جگہ کے لوگ جہاں مشرق سے دلچسپی لی جاتی ، اس تبصرہ کا غور و خوض سے مطالعہ کرتے تھے خود ہندستان میں ہمارے رفیق کار کی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا" ۔

اِس اثناء میں دتاسی کی نظر سے ایک اردو ڈرامہ گذرا ، اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ اردو ادب میں اس صنف کی قابل افسوس کمی ہے اس لئے اس ڈرامے کو اس نے غور سے پڑھا ، اور نہ صرف یہی بلکہ ، اس کا فرانسیسی میں ترجمہ بھی کیا جو سنہ ۱۸۵۰ع میں شایع ہوا ۔

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ اس زمانے میں دتاسی ہندی کی طرف بھی متوجہ تھا ۔ اس سلسلے میں یہاں یہ امر قابل اظہار ہے کہ سنہ ۱۸۵۲ع میں اس نے "شکنتلا ناٹک" کا ایک فرانسیسی ترجمہ شایع کیا ۔

دوسال بعد سنہ ۱۸۵۴ع میں دتاسی نے ایک اور دلچسپ کام ختم کیا یعنی "ہندستان کی عورت شعرا" پر اس نے ایک کتاب شایع کی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے واقعی نئی چیز تھی ۔

دوسرے ہی سال یعنے سنہ ۱۸۵۵ع میں دتاسی کی ایک اور قابل قدر کتاب شایع ہوئی ۔ جس کا نام "ہندستانی مصنفین اور ان کے کار نامے" ہے ۔ یہ کتاب گو صحیح نہیں ۔ لیکن تاریخ ادبیات اُردو لکھنے والے کے لیے نہایت

معید ہے - اور حوالہ جات کی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے -

اس کے بعد کے دو برسوں میں اگرچہ اس فرانسیسی محقق کی کوئی خاص کتاب شایع نہیں ہوئی لیکن یہ ملحوظ رہے کہ وہ ہرسال جو خطبۂ افتتاحیہ پڑھا کرتا تھا وہ ساتھہ ہی ایک رسالہ کی شکل میں شایع ہو جاتا تھا - اس موقعے پر اس امر کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ غدر سنہ ۱۸۵۷ع کے بعد اس نے جو خطبہ لکھا وہ اس زمانے کے قیامت خیز واقعات کا ایک ہم عصر ناظرہ ہونے کی وجہ سے نہایت قیمتی ہے -

اس عرصے میں دتاسی نہال چند لاہوری کی کتاب "تاج الملوک و بکاؤلی" پر بھی کام کرتا رہا تھا چنانچہ اس کا ترجمہ سنہ ۱۸۵۸ع میں شایع ہوا -

سنہ ۱۸۶۰ع سے سنہ ۱۸۷۵ع تک

اب دتاسی بہت بوڑھا ہو چلا تھا مگر اس کی علمی دلچسپیاں اور کام کاج برابر جاری تھے - اس کی عمر پینسٹھہ سے زیادہ تھی جب اس نے سر سید احمد خاں کی مشہور کتاب "آثارالصنادید" کا فرانسیسی ترجمہ کرنا شروع کیا - اس کتاب کی موجودہ ادبی اور تاریخی اہمیت سے اہل نظر نا واقف نہیں ہیں - لیکن ستّر برس پہلے ایک اجنبی پروفیسر کا اپنے بڑھاپے میں اس کے ترجمے کا ارادہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اس کتاب نے اس کو کس قدر متاثر کیا تھا اور یہ بھی کہ دتاسی کا ذوق علم کس قدر اعلیٰ تھا کہ اس کتاب کو ترجمے کے لیے فوراً انتخاب کرلیا - یہ ترجمہ سنہ ۱۸۶۱ع میں پیرس کے شہنشاہی مطبع سے چھپ کر نکلا -

دوسال بعد سنہ ۱۸۶۳ع میں دتاسی نے اپنے قدیم "قاعدہ زبان ہندستانی" پر نظر ثانی کر کے اس کی دوسری طبع شایع کی - یہ کتاب پہلی دفعہ سنہ ۱۸۳۳ع میں شایع ہوئی تھی - اور تیس سال کا درمیانی عرصہ درس و تدریس کے عملی تجربوں کے لحاظ سے کافی سبق آموز تھا ؛ بعد کے چند مہینے اُردو "اخوان الصفا" کے اقتباسات کے ترجمے میں گزرے - اور یہ ترجمہ سنہ ۱۸۶۴ع میں شایع ہوا -

اس کے بعد پانچ چھ برس تک دتاسی نے کوئی نیا کام نہیں کیا البتہ سالانہ افتتاحیہ خطبے تیار کرتا رہا جو ہر سال وسعت معلومات اور بحتگی نقطۂ نظر کی وجہ سے زیادہ پُر لطف اور مفید ہوتے جاتے تھے -

اس عرصے میں "تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی" کو چھپے ہوئے تیس سال سے زیادہ گذر چکے تھے - اور درمیانی زمانے میں گارسان دتاسی کی معلومات طوفانی رفتار کے ساتھ ترقی کرچکی تھیں اس لحاظ سے ضروری تھا کہ وہ اس پر نظر ثانی کرتا - چنانچہ جس قسمتی سے پچھتّر برس کی عمر میں وہ یہ کام بھی کرسکا - اور اس کی تاریخ کی دوسری طبع ؛ اس دفعہ تین جلدوں میں ؛ سنہ ۱۸۷۰ع میں شایع ہوئی -

اس طبع کے وقت وہ پروفیسر اور محقق کی حیثیت سے بے حد مشہور ہوچکا تھا - دنیا کے ہر مہذب ملک میں اس کے قدردان پیدا ہو گئے تھے - بادشاہوں کے درباروں سے اس کو بڑے بڑے خطابات عطا کئے گئے تھے - اس کی جماعتوں میں طالب علموں کی کثرت تھی اور اکثر نوجوان مستشرق اس کے اسّی سال کے تجربوں اور معلومات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اس کی اس مقبولیت کا اندازہ اس مضمون کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے جو فرانس کے ایک مشہور رسالہ "صحیفۂ علماء" (Journal des Savants) کے مئی سنہ ۱۸۷۵ع

کے نمبر میں شایع ہوا تھا ۔ اس مضمون نگار کا نام ' بار تھیلمی سان ہلیر ' ۔ (B. Saint-Hilaire) تھا وہ اپنے مضمون کو جن الفاظ میں ختم کرتا ہے ان کا اُردو ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے تا کہ دتاسی کی نسبت اس کے ایک ہم عصر کی رائے معلوم ہو سکے :—

" آج پچاس برس کا عرصہ گذر گیا کہ دتاسی اس کام (یعنے پروفیسری) کو نہایت خوبی اور کمال سے انجام دے رہے ہیں اور اُن کے شاگردوں کی تعداد حاصی ہوگئی ہے " ۔

آخری زمانہ

دتاسی کی زندگی کے آخری سال کچھ کم مشغولیت میں نہیں گذرے ۔ وفات سے ایک دو سال پہلے یعنے سنہ ۱۸۷۶ع میں اس نے ایک اور اہم کام ختم کیا ۔ اس کی عمر بیاسی سال کی تھی جب اس کا یہ کارنامہ شایع ہوا ۔ یہ کتاب ہندستانی ' عربی ' فارسی ' اور ترکی مقبول عام نظموں ' مقولوں ' اور تلمیحوں کے فرانسیسی ترجموں کا مجموعہ تھی ۔ اس کی خوبی اور اہمیت کا اندازہ اس امر کے اظہار سے ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ایسے مستشرق کی مسلسل محنت اور حصول معلومات کا نتیجہ ہے جس نے اپنی زندگی کا کل تہتر (۷۳) یعنے ساتھ ستّر سال اسلامی زبانوں ' تہذیب اور ادبیات کے مطالعے اور درس و تدریس میں گذار دیا ۔

اس دلچسپ کتاب کی ترتیب کے ساتھ ساتھ دتاسی ایک اور اہم علمی خدمت میں مشغول تھا ۔ چونکہ وہ خود بوڑھا ہو گیا تھا ۔ اس لیے اپنے شاگرد رشید ڈیلا نکل (F. Delancle) سے اس نے ایک " ہندستانی فرانسیسی اور فرانسیسی ہندستانی لغت " تیار کرنے کی فرمایش کی ۔ اور خود اس کام کی شروع سے آخر تک نگرانی کرتا رہا ۔ یہ اعلیٰ درجے کا کارنامہ بھی سنہ ۱۸۷۶ع میں شایع ہوا ۔

ان دو اهم کتابوں کي اشاعت کے کچھہ عرصہ بعد هي دتاسي نے میرامن کی "باغ و بہار" کا فرانسیسی ترجمہ شروع کیا جو سنہ ۱۸۷۸ع میں اُس کی وفات سے چند مہینے پہلے چھپ کر نکلا - لیکن یہ کتاب دتاسي کا آخری کار نامہ نہیں تھی - اس کی آخری کوشش "مسلمانوں کے نام اور خطاب" کے نام سے سایع هوئي اس کتاب کا موضوع بھی ظاهر کرتا هے کہ یہ فرانسیسي محقق اپني آخري عمر میں اسلام اور مسلمان پر کام کرنے میں مشغول تھا - اور اسلامی تصوف کا وہ ذوق جس نے پچیس تیس برس کی عمر میں اس کو اسلامي زبانوں کی تحصیل کی طرف متوجہ کیا تھا ؟ چوراسي برس کی عمر میں یعنے سنہ ۱۸۷۸ع تک اس سے کام کراتا رہا -

دتاسي ایک آن تھک محنت کرنے والا انسان تھا - اس کي ساري عمر پُر خلوص علمي خدمت میں گذري - فرانسیسي زبان میں هندستانی کے متعلق اس نے جو معلومات منتقل کي هیں اپني معلومات هماري زبان کي نسبت خود انگریزی میں بھي اب تک موجود نہیں - حالانکہ اس وقت تک کئی انگریز علماء اس موضوع پر کام کرتے رہے هیں اور انھیں دتاسي کے مقابلے میں هر طرح کی سہولتیں بھي حاصل رهیں -

دتاسی نے ایک کامیاب زندگي بسر کي - خوش قسمتي سے اس کے زمانہ نے بھي اس کی وسعت معلومات اور غیر معمولی لیاقت سے فائدہ اُٹھانے کي کوشش کی - اور اس کي محنتوں کے بار آور هونے کے لئے هر طرح امداد پہونچائي -

فرانس میں اس کی کماحقہ ؟ عزت افزائی هوئي - نہ صرف انسٹیٹیوٹ دي فرانس جیسی رفیع‌الشان مجلس کا وہ رکن بنایا گیا بلکہ "شیوالیر دلا لیژون دانر" (Chevalıar de la Legıon'

(d'honneur. حیسا اعلیٰ رتبہ بھی اس کو حاصل ہوا ۔ دوسرے ملکوں سے اس کو جو خطابات عطا ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے :—

۱ ۔ پرتگال ۔

"Commandeur del' ordra de saint jaques du Portugal"

۲ ۔ سویڈن ۔

"Chevalier de' l' E toile Polaire de Suede"

۳ ۔ ہندستان ۔

Knight of the Imperial order of the star of India"

ان درباری اور سیاسی ہمت افزائیوں کے علاوہ دتاسی کی حقیقی علمی قدر و منزلت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ وہ پیرس کی مشہور ایشیاٹک سوسائٹی کا نہ صرف بانی تھا بلکہ آخر میں اس کا صدر بھی منتخب ہوا تھا ۔ سینٹ پیٹرس برگ ، برلن ، ویّنا ، فلارنس ، اسپال وغیرہ جیسے اہم مقامات اور دارالحکومتوں کی مشہور علمی اکیڈیمیوں اور مجالس اعلیٰ کا مصروف رکن ہونے کے علاوہ دتاسی 'لندن ، کلکتہ اور بمبئی کی ایسیاٹک سوسائیٹیوں کا بھی اعزازی رکن تھا ۔

لیکن ان تمام اعزازات اور رتبوں کے باوجود گارسان دتاسی ایک منکسر مزاج اور سادہ طبیعت آدمی تھا ۔ اس کی وفات کے بعد اکیڈیمی کے صدر نے اس کے اوصاف میں جو تقریر کی اور جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ۔ اس کے چند اقتباسات کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔ جس سے دتاسی کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے ۔

" گذشتہ چہار شنبہ کو موسیو گارسان دتاسی کا جنازہ اُٹھایا گیا ان کی خواہش کے مطابق جس کو انہوں نے با ضابطہ ظاہر کیا تھا ، اکیڈیمی سرکاری طور پر ان کے جنازہ کے ہمراہی کے لیے شریک نہیں ہوئی یہ تجہیز دوستوں کے تھا جو ہم نے ان کے جنازہ کے ہمراہی کی

لاش مارسیلز کو روانہ کی گئی اور کوئی تقریر نہیں کی گئی ۔ اس لیے اب اجازت دیجیے کہ اپنے کھوئے ہوے دوست کو الوداع کہوں ۔

ان کی شہرت ہندستان میں فرانس سے زیادہ تھی ۔ ہندستانی صحیفوں میں ان کی تصویریں چھپیں اور نثر و نظم میں اس مغربی تنقید نگار کی مدح میں گیت گائے گئے

گارساں دتاسی کا نام ایک آن تھک کام کرنے والے ، ایک سچے مستشرق کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ لیکن جس چیز کی ہم (جو انہیں جانتے تھے) تعریف کرنے پر مجبور ہیں وہ ان کے اخلاق ، نرم دلی اور نا قابل قبول انکسار ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو چھوٹا سمجھنے کے لیے ہمیشہ تیار تھے ۔ وہ علم سے سوائے اس کی خدمت کے اور کسی بات کے طلبگار نہ تھے ۔

اپنے آبا و اجداد کے مذہب عیسائیت کے وہ پورے معتقد تھے اور صبر و رضا کے ساتھ انتقال کیا ۔ "

گارساں دتاسی کے کتب خانے کے قلمی نسخوں کی فہرست

دکنی مخطوطے

۱ ۔ قصص الانبیا ــــ محمد بن حسن الدینوری الحنفی کی فارسی کتاب "قصص الانبیا" کا دکّنی ترجمہ از عبدالصمد عبدالوہاب خان ابن نصرت خان اصل فارسی کتاب سلمی کی عربی قصص الانبیا کا ترجمہ تھی ۔

خوبصورت مخطوطہ ۔ نظام آباد یا ارکاٹ (تحصیل محمد نور)

میں سنہ ۱۲۳۳ھ (م ۱۸۱۷ع - ۱۸۱۸ع) نقل کیا گیا - ۲۱۱ ورق - کتلاگ نمبر ۲۷۸۵ -

۲ - خزانۂ عبادت—طویل مثنوی مصنفہ شاہ محمد قادری سنہ تصنیف ۱۱۹۹ھ (م ۱۷۸۴ع) دکنی مسلمان اس کتاب کی بہت عزت کرتے ہیں -

مخطوطہ خوبصورت نستعلیق میں ، شہر مدراس میں سنہ ۱۸۴۸ع میں نقل کیا گیا - کاتب غلام قادر - گارساں دتاسی کو یہ نسخہ پانڈیچری کے موسیو اے سکے (M. E. Sice) نے دیا تھا - ۲۸۷ ورق کتلاگ نمبر ۲۷۸۶ -

۳ - قصہ فیروز شاہ—مصنفہ محمد عاجز دکنی مصنف لعل و گوہر - یہ مخطوطہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی ملکیت رہ چکا تھا - کتلاگ نمبر ۲۸۰۴ -

۴ - قصہ پیغمبران—مُلا محمد باقر مجلسی کی فارسی کتاب "حیات القلوب" کا اردو ترجمہ - از ولی محمد بن حافظ میران - مخطوطہ پانڈیچری میں نقل کیا گیا - خط خوبصورت ، کتلاگ نمبر ۲۷۸۴ -

۵ - دیوان ولی—شاہ محمد ولی اللہ - جہاں جہاں سمجھ میں نہیں آیا - یا جہاں الفاظ متروک نظر آئے کاتب نے وہاں اپنے زمانے کے الفاظ داخل کردیے ہیں - اس کے علاوہ اکثر دفعہ اُس نے غالباً اپنے اشعار داخل کرکے اس میں ولی سے منسوب کردیا ہے - ۱۸۲ صفحات - (اس مخطوطہ کا نام دتاسی نے دیوان ولی مخطوطہ ای (M. E) رکھا تھا - کتلاگ نمبر ۲۸۲۱ -

۶ - دیوان ولی - یہ مخطوطہ گارساں دتاسی کے مخطوطات دیوان ولی میں سب سے زیادہ مکمل ، صحیح ، قدیم ، اور قابل وثوق ہے -

اسي کے مطابق دتاسي نے اپنا دیوان ولي مرتب کیا تھا - اس کا نام مخطوطہ نمبر ۱ (M. A) تھا - اس کا کاتب غالباً سمجھدار اور محتاط آدمي ہوگا - ۱۲۵ ورق - کتلاگ نمبر ۲۸۲۲ -

۷ - دیوان ولي - مخطوطہ د (M. D.) قدیم ، نہایت صحیح - لیکن کاتب نے وہ اشعار چھوڑ دیے جن کو وہ سمجھ نہ سکا - یہ مخطوطہ متوفی ڈبلیو برائس کي ملکیت تھا - اور اسي سے اس مشترق نے اپني " ہندستاني گرامر " میں تین غزلیں منتخب کرکے شائع کي ہیں - ۲۷۰ ورق - کتلاگ نمبر ۲۸۲۳ -

۸ - دیوان ولي - مخطوطہ سي (M C) مورخہ ۲۶ صفرسنہ ۲۲ھ جلوس محمد شاہ - لکھا نہیں کہ کس شہر میں ، لیکن ظاہر کرتي ہے کہ شمالي ہند میں نقل کیا گیا - ۲۰۲ ورق - کتلاگ نمبر ۲۸۲۴ -

۹ - دیوان ولي - مخطوطہ ایف (M. F.) نہایت اچھا نسخہ - خوبصورت تحریر لیکن نا مکمل - صرف ردیف (و) تک کي غزلیں شامل ہیں - یہ مخطوطہ جے - ڈبلیو رسل (J. W. Russel) کی ملکیت رہ چکا تھا - اور دتاسی کومسہور مشترق شکسپیر نے دیا تھا - ۱۲۶ صفحات - کتلاگ نمبر ۲۸۲۵ -

۱۰ - دیوان ولي - مغل شاہنشاہ محمد شاہ کے کتب خانے کي ملکیت - نفیس تحریر ، صحیح اور بغیر تغیّر و تبدّل کے - ۲۳۲ صفحات - کتلاگ نمبر ۲۸۲۶ -

۱۱ - دیوان ولی - مخطوطہ جی (M. G.) مکمل اور بہت اچھي حالت میں - بغیر تاریخ کتلاگ نمبر ۲۸۲۷ -

۱۲ - دیوان ولي - مخطوطہ آئی (M. I) ایس لی پریسان (S Lee Paraissan) کي ملکیت مورخہ سنہ ۱۸۰۱ع مکمل - لیکن بعض جگہ غلط ، کتلاگ نمبر ۲۸۲۸ -

۱۳ - دیوان ولي - مورخہ سنہ ۱۷۸۰ع - کپتان فولیس (Faules) کي فرمائش پر نقل کیا گیا تھا - نہایت صاف لکھا ہوا اور مکمل - ۲۵۷ صفحات ، کتلاگ ۲۸۸۹ -

۱۴ - دیوان ولي - خود گارساں دتاسي کے ہاتھہ کا لکھا ہوا نسخہ اس سے کلیات ولي سنہ ۱۸۳۴ع میں شایع کیا گیا - کتلاگ نمبر ۲۸۳۰ -

۱۵ - رسالۂ توحید یا کتاب التصوف - صوفیانہ موضوع پر دکنی زبان کي ایک مشہور نظم ، ۲۰۹ اوراق ، کتلاگ نمبر ۲۸۴۵ -

۱۶ - نوسي نامہ - نعشي کي کتاب کا دکني نظم میں ترجمہ از مولانا عواصي - نسخہ نہایت قدیم اور خوبصورت خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے - حمد و نعت کے بعد ایک فصل چار صفحے کي سلطان عبداللہ قطب شاہ کي مدح میں لکھي گئي ہے - ۲۰۰ صفحات کتلاگ نمبر ۲۸۴۹ -

۱۷ - لعل و گوہر از محمد عاجز دکني - ایک خوبصورت مجموعے میں شامل ہے - آخر میں سحرالبیان بھي نقل کي گئي ہے - کتلاگ نمبر ۲۸۶۲ -

۱۸ - قصہ لعل و گوہر - از محمد عاجز دکني - ایک مجموعہ میں شامل ہے - جس میں مفرح القلوب ترجمہ ہتوپدیش بھي منقول ہے - کتلاگ نمبر ۲۸۶۳ -

۱۹ - پنچھي ناچھا - منطق الطیر فریدالدین عطار کا دکني ترجمہ از وحیدالدین - مصنفہ سنہ ۱۱۲۴ (۱۷۱۲ - ۱۷۱۳ع) یہ مخطوطہ انڈیچری کے موسیو سکے کي ملکیت رہ چکا تھا - اور نظام حیدر آباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا تھا - ۱۷۶ اوراق کتلاگ نمبر ۲۸۶۷ -

۲۰ - معراج نامہ - از سید بلاقی دکنی - مکتوبہ سنہ ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ - ۱۸۰۵ع) کاتب شیخ احمد نے نظم کے آخر میں اپنی پسند کے اور شعر اضافہ کیے ہیں - یہ کتاب ایک مجموعہ میں شامل ہے - جس میں ۱۳ متفرق مثنویاں اور غزلیں ہیں - کٹلاگ نمبر ۲۸۶۹ -

۲۱ - تروینج بی‌بی فاطمہ - از بلاقی یا نظام‌الدین یہ کتاب بھی متذکرہ بالا مجموعہ میں شامل ہے -

۲۲ - کھویری نامہ از نظام‌الدین دکنی - یسوع مسیح کا ایک قصہ - یہ بھی متذکرہ مجموعہ میں شامل ہے - ہیر بلوٹ (D, Herbelot) نے ایک کتاب قصۃالحمجمہ کا ذکر کیا ہے - جس میں یہی قصہ بیان کیا گیا ہے -

۲۳ - قصہ دحیا کبلی - ایک صحابی کا قصہ - تہیت دکنی زبان میں از عبیدی یا عابدی آخر میں دو قصیدے بھی ہیں - مکتوبہ سنہ ۱۲۲۱ھ ۱۳ صفحات ، یہ بھی متذکرہ مجموعہ میں شامل ہے -

۲۴ - مروی کے احوال ، یا مروی احوال سے ۱۸ صفحات کی مثنوی جس کو دناسی نے وحید دکنی کے نام سے منسوب کیا ہے - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۵ - قصہ حضرت علی سیل - وحیدی دکنی مطبعہ ۱۲۱۸ھ اس کا اصل نام غالباً وہی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتب خانے کے نسخے پر لکھا ہے - یعنی قصہ در احوال خان محمد حنیف مکتوبہ ۱۲۱۸ھ ۳۷ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۲۶ - مجلس طفلی - یہ غالباً مرثیہ ہے ۲۳ صفحات - غم نامی شاعر سے منسوب ہے - جس کے متعلق کوئی معلومات نہیں - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۷ - قصہ چندر بدن و ماہیار - از میر حیدر شاہ دکنی ۳۱ صفحات - اِس کا ایک نسخہ چندری لال حیدرآباد کے کتب خانے میں تھا - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۸ - بولد نامہ خاتون جنت - مثنوی ۵۱ صفحات - نام مصنف نا معلوم متذکرہ مجموعہ میں -

۲۹ - وفات نامہ خاتون جنت - نظم ؟ ۱۵ صفحات ؟ نام مصنف نا معلوم متذکرہ مجموعہ میں -

۳۰ - قصہ ملکہ بادشاہ - نظم از محمد پیر دکنی - مصنف کہتا ہے کہ یہ کتاب فارسی کا ترجمہ ہے - در اصل اس یونانی ملکہ کا قصہ فارسی میں بھی موجود ہے جس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں محفوظ ہے - ۳۴ صفحات ؟ متذکرہ مجموعہ میں -

۳۱ - قصہ ذولی نامہ - مثنوی از شاہ محمد زماں یار دکنی ۱۹ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۳۲ - قصہ ابوالفیض نوری - نظم نہایت دلچسپ قصہ ہے - از خانی دکنی - ۳۰ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۳۳ - قصہ ماہ منور سوداگر بچہ وشمشاد بانو دختر فرنگی - از دیدار دکنی نامکمل نسخہ ۲۲ صفحات ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں قصہ رضوان شاہ فایز بھی داخل ہے کتلاگ نمبر ۲۸۷۰ -

۳۴ - قصہ رضوان شاہ از فایز دکنی سنہ ۱۶۸۳ع اشک نے اسی مضمون پر ایک قصہ نثر میں لکھا ہے - ۲۰۲ صفحات متذکرہ مجموعہ -

۳۵ - قصہ شیخ را (ضیا؟) دکنی میں ایک چھوٹی سی صوفیانہ مثنوی - بحر رمل میں لکھی گئی ہے نسخہ نہایت بے احتیاطی سے نقل کیا گیا ہے - اور مارسل کے کتب خانے کی ملکیت ہے جو قومی کتب خانے کا ناظم تھا - کتلاگ نمبر ۲۸۷۴ -

۳۶ - گلشن عشق - از نصرتي دکني (۱۹۵۸) یه نسخه لیڈن کي ملکیت رہ چکا تھا - مورخه سنه ۱۷۵۸ ع - از خط رمز علي چشتي ۳۶۸ صفحات کتلاگ نمبر ۲۸۷۶ -

۳۷ - کریما - پند نامه سعدی ؟ فارسي ؟ معه ترجمه بربان دکني اردو ۳۳ صفحات - کتلاگ نمبر ۲۸۸۸ -

۳۸ - جنگ نامه سہراب و رستم - شاہ نامه کے ایک حصه کا ترجمه از منشي کاظم‌الدین دکني - سر ریوس شمني ہوتن کي ملکیت ۴۵۰ ورق - کتلاگ نمبر ۲۸۹۱ -

۳۹ - ترجمه انوار سہیلی - بربان دکني - نام مصنف نامعلوم - خوبصورت مخطوطه مورخه سنه ۱۱۷۹ ھ (۱۷۰۵ع) آدم کلارک کي ملکیت کتلاگ نمبر ۲۸۹۲ -

۴۰ - ترجمه انوار سہیلي - نہایت خوشخط نسخه - ہنری چنڈلر (Henry Chandler) کی ملکیت حاشیه پر انگریزی میں نوٹ ہیں - ۱۸۰ اوراق کتلاگ نمبر ۲۸۹۳ -

۴۱ - دکني عرلین - چھوٹا خوبصورت مخطوطه - دیاسي کو موسیو اس سکے (M E. Sice) نے دیا تھا - کتلاگ نمبر ۲۹۱۳ -

۴۲ - ایک دکني قصه - دیاسي کے ہاتھه کا نقل کیا ہوا - ۵۱ صفحات کتلاگ نمبر ۲۹۱۵ -

۴۳ - ایک دکني قصه - دیاسي کے ہاتھه کا نقل کیا ہوا - نام مصنف نا معلوم کتلاگ نمبر ۲۹۱۷ -

۴۴ - ایک دکني قصه دیاسي کے ہاتھه کا نقل کیا ہوا - متذکره بالا قصه کے ساتھه شامل ہے -

قلمی اُردو تذکرے

۱ - تذکرہ فتح علی حسینی گردیزی - ۱۱۵۳ھ (م ۱۷۴۰ - ۱۷۴۱ع)
شمال اور دکن کے سو شاعروں کے حالات - کپتان ترویر (Troyer) نے
ٹیپو سلطان کے ایک مخطوطہ سے نقل کیا - خوشخط - ۱۷۰ صفحات -
اس کی اور نقلیں ایسٹ انڈیا ہاؤس - اوسلے (Ousley) کلکشن اور
کتب خانہ وزیر نظام میں موجود ہیں کتلاگ نمبر ۲۹۴۱ -

۲ - تذکرہ شعرائے ہندی از علم ہمدانی مصحفی (۱۷۶۰ - ۱۸۱۵ع)
محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۰ع) سے سنہ ۱۷۸۳ع تک کے شاعروں کے حالات ،
فورٹ ولیم کے کتب خانے سے یہ نسخہ سنہ ۱۸۳۲ع میں نقل کیا گیا -
۱۵۴ صفحات کتلاگ نمبر ۲۹۳۸ -

۳ - گلزار ابراہیم - تین سو ہندستانی شاعروں کا تذکرہ ، مصنفہ
علی ابراہیم امین الدولہ ناصر جنگ یہ کام سنہ ۱۷۷۲ع میں شروع کیا
گیا اور ۱۷۸۳ع میں ختم ہوا - خط نسخ میں نہایت اختصار کے ساتھ
موسیو ترویر نے گارساں دتاسی کے لیے نقل کیا - کتلاگ نمبر ۲۸۱۰ -

۴ - گلزار ابراہیم - از علی ابراہیم - خوبصورت نستعلیق میں یہ
نسخہ ترنر ماکن (Turner Macan) ایڈیٹر "شاہ نامہ" کی ملکیت
رہ چکا تھا - ۲۵۱ اوراق کتلاگ نمبر ۲۸۱۱ -

۵ - گلشن ہند - از مرزا علی لطف ورثہ کاظم بیگ خاں
مورخہ ۱۲۱۵ھ (م ۱۸۰۰ - ۱۸۰۱ع) لطف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اُس نے
اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے - صرف پہلا حصہ جو ساتھ بڑے
شاعروں پر مشتمل ہے مکمل ہے - دوسرا ختم نہیں ہوا -

سید ذوالفقار علی تجلی نے بتاریخ ۱۲۲۳ھ (م ۱۸۳۷ - ۱۸۳۸ع)
وزیر نظام حیدرآباد کے نسخے سے نقل کیا - دتاسی کو کرنل سیٹووارڈ

(Steward) نے تحفہ دیا تھا - ۴۰۰ صفحات ، کتلاگ نمبر ۲۸۰۷ -

۶ — مجموعہ نغز - از ابوالقاسم دھلوی (۱۸۰۶ - ۱۸۰۷) تقریباً آٹھ سو شاعروں کے حالات لکھے ھیں ، نہایت خوشخط مخطوطہ - ۹۱۸ اوراق ، کتلاگ نمبر ۲۹۳۷ -

۷ — عمدہ منتخبہ - از میر محمد خاں اعظم الدولہ سرور ابن نواب ابوالقاسم مظفر خاں بہادر بارہ سو شاعروں کے حالات - ۱۲۲۱ ھ (م ۱۸۰۶ - ۲۸۰۷ ع) نواب حسین علی خاں بہادر نے ۱۸۴۹ ع میں نقل کیا - ۷۴۲ صفحات ، کتلاگ نمبر ۲۹۳۹ -

۸ — دیوان جہان - انتخاب کلام شعرائے ھند ، از بینی نراین لاھوری ۱۸۱۴ ع - ٹی روبک (T. Robak) کے مشورے پر یہ کام کیا گیا مکتوبہ ۱۸۳۲ ع کتلاگ نمبر ۲۸۰۸ -

۹ — گلشن بے خار ، از محمد مصطفی شیفتہ مصنفہ ۱۲۴۸ - ۱۲۵۰ ھ (م ۱۸۳۲ - ۱۸۳۴) چھ سو شاعروں کے حالات - یہ کتاب دھلی میں ۱۷۴۵ ع میں شائع ھوئی - یہ مخطوطہ ۱۸۳۵ ع میں نہایت احتیاط کے ساتھ لکھا گیا ، داسی کومتوفی نوبدوس دھلوی (نے دیا تھا - کتلاگ نمبر ۲۹۴۰ —

۱۰ — نسخہ دلکشا - یہ کتاب بابو راجندر لال متھرا کے تذکرہ شعراء کا دوسرا حصہ ھے پہلا حصہ کلکتہ میں ۱۸۷۰ ع میں شائع ھوا - ۱۱۰ صفحات جس میں ھندستانی مصنفین پر ۵۸۷ مضامین ھیں ، یہ دوسرا حصہ ان شعرا سے متعلق ھے جن کے نام حرف ک سے شروع ھوتے ھیں - بہت ھی خوبصورت مخطوطہ - کتلاگ نمبر ۲۸۰۹ -

۱۱ — گلدستۂ حیدری ، مصنفہ حیدر بخش حیدری مصنف توتا کہانی - یہ کتاب حیدری کی حسب ذیل تین کتابوں کا مجموعہ

ھے :— ۱ - مجموعہ تواریخ و سوانح ، (۲) - دیوان - (۳) - شعراے ھندستانی کا تذکرہ -

یہ تیسری کتاب اگر چہ ترتیب کے لحاظ سے اچھی ھے ، لیکن مصنف نے اسے تکمیل کو نہیں پہنچایا مخطوطہ نہایت اچھی حالت میں ھے ، اور خوشخط نستعلیق میں لکھا گیا ھے - ۴۶۳ ورق کتلاگ ۲۸۱۲ -

اہم ھندستانی کتب خانوں کے مخطوطے

اس ضمیمے میں دتاسی کے اُن اردو مخطوطوں کی فہرست درج ھے - جو ھندستان کے قابل ذکر کتب خانوں یا اشخاص کی ملکیت تھی اور جو یا تو نحسنہ دتاسی کے یہاں پہنچ گئیں یا جن کی نقلیں نہایت اھتمام کے ساتھہ تیار کی گئی تھیں -

۱—محمد شاہ کا شہنشاھی کتب خانہ دھلی :—

،، دیوان ولی اورنگ آبادی ' اعلیٰ درجہ کا خط - صحیح ؟ اور بغیر تغیر و تبدل کے ؟ ۲۳۲ صفحات (۲۸۲۶) یہ شاھی کتب خانے کا اصلی نسخہ ھے -

۲—حضور نظام حیدرآباد کا کتب خانہ —

،، پنچھی باچھا ،، منطق الطیر کا دکنی ترجمہ از وجیہ الدین مصنفہ ۱۱۲۴ھ - ۱۷۶ اوراق نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے غالباً موسیو سکے نے نقل کرایا (۲۸۶۷) -

۳—حضور نظام کے ریر کا کتب خانہ :—

الف— ،، دیوان افسوس ،، میر شیر علی افسوس کا اردو دیوان شروع میں ایک فارسی مقدمہ ھے جس میں مصنف کی سوانح عمری لکھی ھے - خوبصورت مخطوطہ - ۴۴۲

صفحات فی صفحہ ۱۵ سطر؛ یہ وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے کا اصلی نسخہ ہے - (۸۱۶) -

ب—"گلشن ہند" از مرزا لطف مورخۂ ۱۲۱۵ھ کاتب سید ذوالفقار علی تخلص بتاریخ ۱۲۲۳ھ - غالباً کرنل اسٹیوارٹ نے وزیر نظام کے نسخے سے نقل کرایا - اور دتاسی کو بطور تحفہ پیش کیا ؛ ۴۰۰ صفحات (۲۸۰۷)

۴—ٹیپو سلطان بادشاہ میسور کا کتب خانہ .—

"تذکرہ گرویزی" از فتح علی حسینی ۱۱۵۳ھ - کپتان ترویر نے ٹیپو سلطان کے ایک نسخے سے نقل کرایا ' خوشخط ' ۱۷۰ صفحات ' اس کتاب کا ایک ایک نسخہ وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے اور اُس کے کلکشن میں بھی موجود ہے (۲۹۴۱) -

۵—مہا راجہ کالی کرشنا بہادر کے مخطوطے —

الف "قصہ کا مروپ" از تحسین الدین ' کاتب لکھتا ہے کہ وہ اس کو ۲۷ اگھن (نومبر - دسمبر) کو ختم کرتا ہے ' مگر سنہ نہیں لکھا ہے - یہ نسخہ خود مہاراجہ نے دتاسی کو تحفہ دیا تھا -

ب— "مصدر فیوض" اسی نام سے کتاب کا سنہ تصنیف بھی نکلتا ہے ' از نذرالدین حسن شیخ قریشی ۱۸۱۵ع - مصنف لکھتا ہے کہ یہ کتاب بریلی کے فارسی سیکھنے والوں کے لئے نواب احمد یار خاں ابن محمد ذوالفقار کی فرمائش پر لکھی گئی ' مہا راجہ کالی کرشنا کے لیے سید محمد علی صاحب نے ۱۸۲۹ع میں نقل کیا - ۲۲۴ صفحات ' یہ مہا راجہ کا اصل مخطوطہ ہے (۲۹۰۳) -

۶—کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال —

"ترجمۂ تاریخ آسام" ترجمہ میر بہادر علی حسینی (۱۸۰۵ع)

ایشاٹک سوسائٹی بنگال کے مخطوطہ سے پرنسپ نے نقل کرایا اور دتاسی کو تحفہ دیا (۲۸۰۵) -

۷— فورٹ ولیم کالج کا کتب خانہ —

الف — "قصہ فیروز شاہ عاجز دکنی" (دیکھو دکنی مخطوطے) یہ اصل مخطوطہ فورٹ ولیم کے کتب خانہ میں تھا - نہ معلوم دتاسی کے یہاں کسی طرح پہنچ گیا (۲۸۰۴) -

ب — "قصہ کامروپ" از تحسین الدین ' موسیو ترویر سکریٹری ہندو کالج کلکتہ نے نہایت اہتمام کے ساتھ کتب خانے فورٹ ولیم کے ایک نایاب نسخے سے نقل کرایا (۲۸۵۴) -

ج — "قصہ یوسف زلیخا" از محمد امین دکنی (دیکھو دکنی مخطوطے) یہ مخطوطہ بھی ترویر کی فرمایش پر فورٹ ولیم کے اصل مخطوطے سے نہایت خوشخط نقل کیا گیا - ۲۹۹ صفحات (۲۸۸۱) -

د — "تذکرہ ہندی" از شیخ غلام ہمدانی مصحفی (دیکھو دتاسی کے اردو تذکرے) یہ نسخہ فورٹ ولیم کے کتب خانے کے مخطوطے سے ۱۸۳۲ع میں نقل کیا گیا - ۱۵۴ صفحات (۲۹۳۸) -

یورپین مستشرقین اور دیگر اشخاص

اس ضمیمے میں اُن یورپی افراد کی مفصلی فہرست پیش کی گئی ہے جنھوں نے اپنے اردو مخطوطے گارساں دتاسی کو بطور تحفہ نذر کئے یا جن کے کتب خانوں کے مخطوطے دتاسی نے خریدے تھے -

ہر شخص کے نام کے آگے اس کے مخطوطوں کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ آیندہ اس ضمن میں تحقیقات کرنے والوں کو مدد مل سکے -

اشخاص کے نام انگریزی حروف تہجی کے مطابق سلسلہ وار لکھے گئے ہیں اور قوسین میں اُن اردو مخطوطوں کے کتلاگ نمبر دے گئے ہیں جن کے ذکر کے سلسلے میں فہرست کتب خانہ دتاسی میں اُن کا نام آیا ہے -

۱ — آرنٹ (Sanford Arnot) اسکاٹ لینڈ کا مستشرق "ترجمہ گنج خوبی" از میر امن ۱۹۰۲ ع (۲۸۳۴)

۲ — بلنڈ (N. Bland) "کلیات سودا" مورخہ ۱۷۹۰ ع (۲۸۱۷) -

۳ — چینڈلر (Henry Chandler) "ترجمہ انوار سہیلی دکنی" (۲۸۹۳) -

۴ — کلارک (Adarn Clarke) "ترجمہ انوار سہیلی دکنی" مورخہ ۱۱۷۹ ھ (۲۸۹۲) -

۵ — فلکونر (M. Falconer)

(۱) - "دیوان شاہ رکن الدین عشق دہلوی (۲۸۱۵)

(۲) - "قصہ مہر و ماہ" از منشی غلام اکی (Aki) (۲۸۷۵) -

۶ - فارپس (D. Forbes) -

(۱) - "حیدر نامہ" مورخہ ۱۲۲۰ھ (۲۷۹۹) -

(۲) - "نولد نامہ" مثنوی شیخ غلام محی الدین رشت منگل پوری مورخہ ۱۲۱۹ھ مکتوبہ مصنف (۲۸۳۳) -

(۳) - "خیابان ریحان" از ریحان الدین بنگال (۱۸۹۷-۱۸۹۸ع) (۲۸۷۹) -

(۴) - "منتخبات اردو" از میر افضل علی سنہ ۱۸۴۰ع (۲۹۰۰) -

(۵) - "مخزن الامثال" از محمد علی سنہاپی (۲۸۹۹) -

۷ - فریزر (M. Fraser) مشہور سیاح ایران کے بھائی -

"مجمع داستان" از حکیم حکومت رائے سنہ ۱۲۴۳ع مکتوبہ مصنف (۲۸۴۴) -

۸ - گلکرائسٹ (Dr. Gilchrist) "قصہ کامروپ" از گُلدن لال لاہوری - مکتوبہ مصنف (۲۸۵۱) -

۹ - ہوٹن (Sir Chamnez Haughton) "دیوان ولی" از مرزا لطف علی دہلوی (۲۸۲۰) -

(۲) - "جنگ نامہ سہراب و رستم" از منشی کاظم‌الدین دکنی (۲۸۹۱) -

۱۰ - لیس (Nessan Lees) (۱) - "مرثیہ اول درمہ" از سید آغاحسن موسوی امانت دہلوی (۲۸۳۱) -

(۲) - "چار مراثی" از مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی (۲۸۳۲) -

۱۱ - ماکن (Turner Macan) ایڈیٹر شاہ نامہ -

(۱) - "گلزار ابراہیم" از علی ابراہیم خاں (۲۸۱۱) -

(۲) - "کلیات جرأت" از قلندر بخش (۲۸۱۴) -

۱۲ - مارسل (Mercel) نیلیو نک نیشونل کا ڈائرکٹر - "قصہ شیخ ضیاء" دکنی منظوم (۲۸۷۴) -

۱۳ - پریسان (S. Lee Paraisant) - "دیوان ولی" مورخہ سنہ ۱۱۸۰ع (۲۸۲۸) -

۱۴ - پرائس (W. Price) - مصنف ہندستانی گرامر "دیوان ولی" مخطوطہ "د" (۲۸۲۳) -

۱۵ - پرنسپ - (Prinsip) - "تاریخ شعر شاہ" مترجمۂ مطہر علی خاں ولا ، سنہ ۱۸۰۵ع - (۲۸۰۲) -

۱۶ - رویک (T. Roebuck) اسی مستشرق کے مشورے پر بینی نارائن لاہوری نے اپنے انتخاب دیوان جہان کا کام تکمیل کو پہونچایا - "کلیات قلندر بخش جرأت" مورخہ سنہ ۱۸۰۸ع (۲۸۱۴) -

۱۷ - رومر - (Romer) - "قصہ مادھو نل" از مرزا لطف علی ولا سنہ ۱۲۱۵ (۲۸۷۱) -

۱۸ - رسل - (J. W. Russel) - "دیوان ولی" مخطوطہ ف - (۲۸۲۵) -

۱۹ - شکسپیر - (G. Shakespeare) - "نو طرز مرصع چہار درویش" از میر محمد عطاحسین تحسین مورخہ سنہ ۱۷۸۸ع (۲۸۹۰) -

(۲) - "دیوان ولی" مخطوطہ ف (۲۸۲۵) -

۲۰ - سکے - (M E Sice) مقیم پانڈیچری -

(۱) - "خزانۂ عبادت" از شاہ محمد قادری ۱۱۹۹ھ (۲۷۸۹) -

(۲) - "خلاصہ تاریخ نادر شاہ" حیدری کے ترجمہ سے اس کو کوئی تعلق نہیں (۲۷۹۹) -

(۳) - "بنجھی نا چھا" از وحیہ الدین ۱۱۲۴ھ نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا - (۲۸۹۷) -

(۴) - "دکنی غزلیں" (۲۹۱۳) -

۲۱ - یسٹیوارڈ - (Col Steward) - "گلشن ہند" از مرزا علی لطف وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا (۲۸۰۷) -

۲۲ - ٹرویر (Cap. Troyer) سکریٹری کلکتہ ہندو کالج -

۱ - گلزار ابراہیم - از علی ابراہیم خاں خلیل - خود ٹرویر کا مکتوبہ (۲۸۱۰) -

(۲) - "قصہ کامروپ" از تحسین الدین - فورٹ ولیم کے کتب خانے سے ٹرویر نے نہایت اہتمام سے نقل کرایا (۲۸۵۴) -

(۳) - "قصہ یوسف زلیخا" از امین دکنی سنہ ۱۶۰۰ع - فورٹ ولیم کے کتب خانے سے ٹرویر نے نہایت اہتمام سے نقل کرایا (۲۸۸۱) -

(۴) - "تذکرہ گرویزی" از علی حسین گرویزی سنہ ۱۱۵۳ع - خود ٹرویر نے ٹیپو سلطان کے ایک مخطوطے سے نقل کیا (۲۹۴۱) -

۲۳ - وائٹ (Col. Wight) - "مجموعہ کلام ہندستانی و فارسی"
از صدرالدین محمد فیض ابن زبردست خان (۲۸۷۸) -

ان مستشرقین کے علاوہ دس اور یورپی افراد کے نام گارسان دتاسی کے اردو مخطوطوں کے سلسلے میں ہماری نظر سے گذرے ہیں - گو ان کا حسب ذیل تذکرہ بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر ممکن ہے کہ کسی وقت تحقیق و تفتیش میں اس سے مدد ملے - فوسٹن میں دتاسی کے ان مخطوطوں کا فہرست نمبر درج ہے جن کے سلسلے میں ان اشخاص کا ذکر آیا ہے -

۱—انڈرسن (James Anderson) اور گلاڈون نے ملفوظات جہانگیری کے انتخابات کئے تھے (۲۷۹۷) -

۲—بوتروس (F. Boutrous) پرنسپل دہلی کالج - اس شخص کی زیر نگرانی مولوی امام بخش صہبائی نے "حدائق البلاغت" کا اردو ترجمہ کیا (۲۹۰۱) بوتروس ہی نے دتاسی کے لیے نہایت احتیاط سے اس ترجمہ کا ایک نسخہ لکھوایا -

اسی بوتروس نے دتاسی کو مصطفیٰ خان شیفتہ کا "تذکرۂ گلشن بے خار" بھی نقل کرا کر تحفہ دیا تھا (۲۹۴۰) -

۳—فولس (Captain Foules) - اس شخص کی فرمایش پر کلیات ولی سنہ ۱۷۸۰ع میں نقل کیا گیا تھا (۲۸۲۹) -

۴—فرانسس - (M. Robert Fransis) اس شخص کو تحفہ دینے کے لیے شاہ حسین خان حقیقت دہلوی نے اپنے قصے "جذب عشق" کو ۱۲۱۲ھ (م ۱۷۹۷ - ۱۷۹۸) میں نقل کیا - یہ نسخہ اصل کام کی تیسری نقل ہے - نقل کرتے وقت مصنف فتح گڈھ کیمپ میں تھا - اس کتاب میں ایک صحیح واقعہ بیان کیا گیا ہے جو بمقام سمارو

۱۲۰۴ھ (م - ۱۷۸۹ - ۱۷۹۰) گذرا - اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۱ھ ہے (۲۸۸۳) -

۵—گلادون - (Gladuin) نے "ملفوظات جہانگیری" کے انتخابات پیش کئے تھے (۲۷۹۷) -

۶—ہیربلو - (D' Herlbelot) نے ایک کتاب "قصہ الحمجہ" کا ذکر کیا ہے جس میں وہی قصہ بیان کیا گیا ہے جو نظام الدین دکنی کی کتاب "کھوپری نامہ" میں یسوع مسیح کی نسبت لکھا گیا ہے (۲۸۶۹ - ۳) -

۷—جونس - (sir William Jones) نے "تاریخ نادری حیدری" کا انگریزی میں ترجمہ شایع کیا - (۲۸۰۱) -

۸—لیڈن - (Leydan) - "گلشن عشق" نصرتی دکنی (۱۶۵۸) مورخہ سنہ ۱۷۵۸ اسی شخص کی ملک تھی جو داسی نے حاصل کی - (۲۸۷۶) -

۹—لٹل (Captain Thomas Little.) یہ شخص ٹیپو سلطان کی مخالف انگریز فوج میں سردار تھا - اور اسی کی فرمایش پر حیدر نامہ فارسی کا اردو میں ترجمہ کیا گیا - اس کتاب میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سوانح و حالات درج ہیں - مورخہ ۱۲۲۰ھ (۲۷۹۹) -

۱۰—مونات (James Monot) فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں یہ شخص ہندستانی پروفیسر تھا اور اس نے "بیتال پچیسی" مترجمہ سری للو لال کنی گجراتی اور مظہر علی خان ولا در نظر ثانی کرنے کے لیے تیرینی چرن متر سے فرمایش کی - (۲۸۶۸) -

"مثنوي حُزن اختر"

اور

خصوصیات مصنف

(از مولانا احسن مارهروي پروفیسر اُردو اِنٹرمیڈیٹ کالج علی‌گڑھ)

تاریخي اندراجات سے الگ هو کر دیکھا جائے تو هندستان کے سلاطین و والیان ملک میں چند هستیاں هي ایسی نظر آئیں گي؟ جن کو شهرت عام نے بقائے دوام کی شاہ راہ سے گزرنے کا موقع دیا هے - انهیں چند نفوس میں لکھنؤ کے آخري تاجدار جان عالم واجد علي شاہ اختر کو بھي شمار کرنا چاهیے؟ خاص و عام میں اُنکي شهرتیں جن واقعات و حالات سے وابستہ هیں وہ تین عنوانوں میں محدود هیں .—

(۱) کمال شاعري -
(۲) انهماک نشاط -
(۳) زوال سلطنت -

ان تینوں حالتوں کے وقوع میں کسي شبہے کي گنجائش نہیں؟ البتہ اُن کے بیان و اظہار میں زیبائش داستان کی سي رنگ آمیزیاں دھوکے میں ڈال سکتي هیں - ایسي باتوں کي تصدیق و تکذیب کے لئے دوسرے وقائع نویسوں کي تحریروں کے مقابل میں خود صاحب واقعہ کے بیانات کا مطالعہ زیادہ قابل اعتبار اطلاعیں بہم پہونچا سکتا هے -

حُسن اتفاق سے واجد علي شاہ مرحوم کا بیشتر سرمایہ تصنیف و تالیف طبع هو چکا هے اگر اُس کو معیار نفسیات پر فطري اصول کے ساتھ پرکھا جائے تو مصنف کے اکثر صحیح واقعات اور وقوعي حالات معلوم هو سکتے هیں - في‌الحال اُن کي ایک تصنیف (مثنوي حزن

اختر) سے خصوصیات مذکور پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی -

اس مثنوی میں بادشاہ موصوف نے انتزاع سلطنت کے بعد اپنے لکھنؤ سے جانے، کلکتے میں رہنے اور قید ہونے کے سوانح اس شرح و بسط سے قلم بند کیے ہیں کہ ان کو پڑھکر واقعات کی تصدیق کرنے کے لیے، اُن کے بیان کا انداز صداقت، دوسری تحریروں کے تائیدی ثبوت سے مستغنی کر دیتا ہے -

جان عالم کی مشہور خصوصیتوں میں اُن کی شاعری کا نمبر تیسرا ہے - اور اُن کی شہرت سخن، صرف طبقۂ شعرا اور وہ بھی مخصوص حلقے تک محدود ہے -

مثنوی حزن اختر کو پڑھ کر جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اُنہیں خصوصی شہرتوں کے ماتحت ہیں جن کا بیان اوپر ہو چکا ہے، یعنی —

۱ - کمال شاعری اور اُس کے اسالیب بیان کی تنقید -

۲ - انہماک نساط اور اُس کے متعلقات -

۳ - زوال سلطنت اور اُس کے اسباب -

لیکن قبل اس کے کہ ان خصوصیات پر تبصرہ و نظر کا سلسلہ شروع کیا جائے بعض اہل قلم کی ایسی تحریریں نقل کی جاتی ہیں جن سے موجودہ طرز تنقید کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے —

رسالۂ مخزن لاہور نمبر (۱) جلد (۱۶) اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع میں "جان عالم کی شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، اُس کے صفحہ (۴۸) سطر (۵) میں یہہ الفاظ درج ہیں —

"یہہ ہندستان کے پہلے بادشاہ ہیں جنھوں نے شاعری میں کسی کی شاگردی قبول کرنا ننگ ٤ سمجھا" -

اس انکشاف کے بعد خود جان عالم اختر کا اعتراف بھی سننے کے قابل ہے :—

زن و مرد سے کم ہوئے سات لوگ
مجھے فتح دولہ کا اب بھی ہے سوگ

خدا بخشے اُس کو عجب مرد تھا
فنِ شاعری میں تو وہ فرد تھا

یہہ بندہ ہے شاگرد اُس ماہ کا
بندھا ہے دھواں دل میں اک آہ کا

(مثنوی جان اختر مطبوعہ سلطان المطابع صفحہ (۵۳)-

اسی طرح ایک مضمون نگار کا بیان اخبار ذوالقرنین بدایوں میں دیکھا گیا؛ نمبر (۳۵) جلد (۲۸) ۳۱ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں بعنوان "اودھ کی تاریخ کا ایک ورق یعنی آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی زندگی کا مختصر خاکہ" - بیان کیا گیا ہے کہ —

حرام مطلق نہیں کرتے تھے؛ غیر متبوعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے؛ (۳۶۰) بیگمات تھیں اور اُن میں کوئی ایسی نہ تھی جس کے ساتھ از روئے شرع شریف متعہ نہ ہو گیا ہو؛ کبھی کسی عورت کے ساتھ جبراً متعہ نہیں کیا؛ بے شک متبوعات کی کثرت تھی اور بادشاہ پر جو فرد جرم لگائی گئی ہے اُس میں سب سے زیادہ سنگین یہی جرم تصور کیا جاتا ہے؛ اس پر کوئی شرعی الزام تو آ ہی نہیں سکتا اس لیے کہ بادشاہ مذہب اثنا عشریہ کے پیرو تھے لہذا اُن کے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز تھا؛ اب رہا یہہ کہ اخلاقی اور تمدّنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں سے متعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اس

کی حالت یہہ ہے کہ بادشاہ نہایت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے؟ اور اُنھیں ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہ تھا کہ کسی نا محرم عورت پر اُن کی نظر پڑے مگر شاہی محل تھا جس میں بیس خدمتوں محلداروں؟ مغلانیوں؟ مکان‌دارنیوں؟ یہاں تک کہ بھشتنوں اور خاکروبنوں کے ایک گروہ کثیر کے رہنے کی ضرورت بھی - ممتوعات میں چند ہی تھیں جن کے ساتھہ خلوت‌گاہ میں داخل کرنے کی غرض سے متعہ کیا گیا ہو؟ ورنہ سب کی سب خدمتگارنیاں تھیں؟ لیکن جونکہ متعہ ہو جانا لہذا جائز تھا کہ اُن میں سے کوئی پسند آئے تو خلوت میں بلا لی جائے - معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کی حالت پر غور نہیں کیا اس لیے کہ ممتوعات کی کثرت تو اُن کے اتقا اور بلندیِ شرع کی دلیل تھی اور اتقا بھی ایسا؟ جیسا معمولی مسلمانوں میں بھی کم دیکھا گیا ہے؟ بہت سے اگلے بادشاہوں کی نسبت آپ سنتے ہیں کہ اُن کے محل میں چند بیوی کے ساتھہ ہزاروں کنیزیں بھری ہوئی تھیں اور اب بھی اگرچہ پردہ فروشی مشرع اور جائز کنیزوں کی فراہمی کا سلسلہ مسدود ہو گیا ہے؟ مگر ہندستان کے مسلمان والیان ملک کے محل اور زنان‌خانے اُسی طرح بے حد عورتوں سے بھرے ہوئے ہیں جن کے جائز و ناجائز ہونے کا کبھی اُنھیں خیال بھی نہیں آتا - لہذا واحد علی شاہ نے شرعی پہلو کی نگہداشت کے ساتھہ اپنا شوق پورا کیا تو کون اعتراض کرسکتا ہے؟ لوگ خواہ مخواہ کو بدنام کرتے ہیں کہ بھشتنیں اور مہترانیاں واحد علی کی بیوی تھیں مگر جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ سخت مغالطے

میں پڑے ہوئے ہیں اصل واقعہ یہہ تھا کہ بادشاہ اپنے ہاتھہ سے آبدست نہیں لیتے تھے لہذا کئی گز چھالتین یا نین سُکھہ کی لُنگی سے آبدست کرایا جاتا تھا ؟ جس کو دو عورتیں اِدھر اُدھر کھینچتیں ؟ اس خدمت پر ایک بھشتن اور بھنگن مقرر تھی - اور چوں کہ اُن پر سطر طاہر کرنا پڑتا تھا لہذا بادشاہ نے ان دونوں کو ممنوعات میں داخل کرکے پہلی کو آب رساں بیگم ؟ اور دوسری کو مُصفّی بیگم کا خطاب دے دیا تھا ؟ بادشاہ نے کبھی حرام نہیں کیا اور نہ کسی نا محرم عورت کو اپنے سامنے آنے دیا - چنانچہ خدمت میں جتنی عورتیں رہتی تھیں وہ قبلہ و کعبہ کے سامنے آتیں اور قبلہ و کعبہ تحقیق و تنقیح کے بعد اُن کے ساتھہ متعہ کا صیغہ پڑھہ دیتے ؟؟ - لیکن خود بادشاہ سلامت یہہ ارشاد فرماتے ہیں -

چہارم ہے قیصر بھی بیگم کے ساتھہ
لکھا نام میں نے بہت غم کے ساتھہ
نہ منکوحہ تھی اور نہ ممنوعہ تھی
فقط دوستی سے یہاں وہ رہی
اُسے بعد چندے جو آیا خیال
گئی لکھنؤ ہم کو دے کر ملال
وہیں راد وہ ساردہ بھیلیاں
عدد میں تھے گیارہ ہزار اے جواں
وہ دس اس لئے نا رہے میرے پاس
نہ ٹھہری ہوئی اس طرح کی اُداس
ہمیں چھوڑ زنداں میں ؟ راہی ہوئی
گئی وہ گئی وہ گئی وہ بری

(حزن اختر صفحہ (۶۵ و ۶۶)-

کسي مشہور و معروف ہستي کے اوصاف بیان کرنے میں ایسي بالاخوانیاں جن سے اس کي وقعت اور کم ہو جائے ہجو ملیح کی مترادف ہیں ؛ خصوصاً اس حالت میں کہ موصوف خود اس کا مدعي نہ ہو - اپني انفرادي رائے پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کے متعلق اب تک جن دو ایک اہل قلم نے آزادانہ یا روادارانہ تبصرہ کیا ہے اُس کا خلاصہ درج کردیا جائے تا کہ عام رایوں کو سن کر ؛ ناظرین ہر اتفاقي اور اختلافی رائے سے بآساني نتیجہ نکال سکیں ؛ نیز دونوں قسم کي روایتوں کا امتزاج ؛ درایت کے تجزیئے سے دودھ کا دودھ اور پاني کا پاني ہو سکے -

(۱) (اقتباس خم خانۂ جاوید مولفہ پنڈت سري رام جلد اول صفحہ ۲۰۹ و ۲۱۰) -

"ہم اُن کي نفس شاعري کے متعلق اپني رائے ظاہر کرتے ہیں ؛ اُن کے متعدد دیوان ؛ مثنویاں ؛ ضخیم مرثیے ؛ سلام اور مختلف و بے شمار نظمیں دیکھہ کر ہر شخص یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ سلطان عالم ہر وقت اور ہر لحظہ اسي فکر میں رہتے ہوں گے - ہر رنگ اور ہر طرز میں لکھا ہے ؛ مگر اساتذۂ لکھنؤ کي خشک کلامي کے زبردست اثر پر حاوی نہ ہوسکے ؛ چنانچہ کلام میں سوز و گداز کم ہے اور زیادہ تر رعایت لفظي ہي کی تکرار ہے - غزل ؛ قصیدہ ؛ مثنوي ؛ سلام ؛ قطعہ ؛ الغرض کوئي صنف شاعري اُن کي فکر رسا سے نہیں چھوٹي بلکہ اپني حیرت انگیز پُر گوئي کي بدولت جو کچھہ لکھا جي بھر کر لکھا مگر افسوس ہے کہ جملہ تصانیف میں سے صرف ٹُھمریوں نے قبولیت کا درجہ حاصل کیا ؛ جملہ تصانیف کي تعداد (۴۰) جلدوں سے کم نہیں اُن کے زمانے میں کیا بلکہ اُن سے پہلے ہي لکھنؤ کے شعرا رعایت لفظي اور استعارہ بندی کا ایسا رواج دے

گئے تھے کہ وہاں والے اب تک اس طرز پر مانے ہوئے ہیں غزلوں میں حضرت اختر کی روش بھی وہی ہے ؟ بس ہم نہایت آزادی سے اس رعایت لفظی کی پابندیوں کو مد نظر رکھکر اُن کی غزلوں پر رائے دیتے ہیں کہ اُن کے کلام میں اکثر جگہ مرزوبی طبع اور فراہمی الفاظ کے سوا کوئی خاص زبان یا بیان کا لطف نہیں پایا جاتا ؟ مثنویوں میں البتہ اکثر جگہ روزمرہ اور بیان کی صفائی کا خیال رکھا ہے - دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ اُن کے مکتوبات وغیرہ دیکھہ کر ایک عجیب اور قابل قدر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ اختر ہی ایک ایسے بے دھوک اور سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنے تمام خفیہ رازوں ؟ دلی بھیدوں اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپنی خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ اُن خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے بھی پیش کیا ؟ ان کی یہ اخلاقی جرءت واقعی اس خاص روش میں تمام شعرائے ماضی و حال سے بڑھہ گئی ہے - "

(۲) (اقتباس مضمون "جان عالم کی شاعری" از رسالۂ مخزن لاہور ؟ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع بوسنہ خواجہ عشرت لکھنوی) -

" حضرت قدر قدرت ابوالمنصور سکندر جاہ ناصرالدین فیصر زماں سلطان عالم ؟ علاوہ اور تمام علوم و فنون کے گلشن شاعری کی بھی گلگشت کیا کرتے تھے اور اس باغ میں بہت کچھہ گلکاری بھی کی ہے ؟ نظم کے ہر صیغے میں داد سخن دی ہے . وہ زمانہ اُردو شاعری کے شباب کا تھا ؟ زبان کے قواعد ؟ محاورات کی پابندی ؟ متروکات کا لحاظ ثقیل اور غلط الفاظ کی تذئیں سے پرہیز کا دور دورا تھا . . دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان مستند اور مقبول عام تھی اور دہلی کا ٹوٹتا ہوا مجمع بھی اسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا

تھا ۔ پھر شاہ اختر کا شاعری میں معجز نمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا۔ بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لیے ہوئے تھا ۔ بادشاہ اگرچہ کسی سے تلمذ نہ رکھتے تھے لیکن طور کلام زیادہ تر میر و مرزا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا تھا ۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر دنگ اُٹھتے تھے۔ خداوند! یہ شاعری نہیں سحر ہے۔ اعجاز ہے ۔ فارسی ترکیبوں کے حملے ایک جدید شان سے جھلکتے تھے ۔ بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں کہ اُن کی شاعری تعریف کی نوچھار سے کمال کی حد تک نہیں پہنچتی یا اور مصاحبین کی بے جا خوشامد سے بندہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی۔ مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے اُن کو یہ شک ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے اور چوں کہ خود سخن فہم تھے اس سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل اُن کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی ۔ جان عالم نے تو باوجود مشاغل اور سلطنت کے جو کچھ فرمایا آویزۂ گوش خلائق ہوا۔ ہر غزل مقبول خاص و عام تھی۔ مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمین آپ کے دریائے فکر کے آگے پانی تھی۔ ہر پہلو پر خوبیاں بلاغت کا خیال رہتا تھا پھر تشبیہات و استعارات کی ملمع کاری نور علی نور ۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام در اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیوں اور عمدہ تخئیل کے سمندر موج زن نظر آئیں گے۔" ۔

غالباً دو اقتباسات شاہ موصوف کی حقیقت شاعری اور متذکرہ اہل الرائے کی ذہنیت کے معلوم کرنے میں کافی مدد دیں گے۔ اُردو شعرا کے اکثر تذکرے واجد علی شاہ کے وجود سے پہلے لکھے گئے۔ اور جو تذکرے

اُن کے عہد میں تصنیف و تالیف ہوئے اُن میں "سخن شعرا" (مولفہ نساخ) کے سوا کسی میں اُن کا نام تک نہیں دیکھا گیا - نساخ نے بھی صرف دو سطری حال لکھ کر دو ایک سحر درج کردیے ہیں ؟ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سلسلۂ شاعری قابل تذکرہ نہ تھے ؟ دو ایک تذکرے چودہسویں صدی عیسوی میں اساعت پذیر ہوئے اُنھیں میں کم و بیش اُن کے حالات ملتے ہیں ؟ یا بعض رسائل و صحائف میں اُن کی شاعری وغیرہ کے متعلق مضامین پڑھنے میں آتے ہیں ؟ جن دو تحریروں کا انتخاب یہاں درج کیا گیا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی دو چار تحریریں اور مل جائیں مگر وہ بھی بیشتر انہیں سے ماخوذ ؟ اور اس لئے اسی انداز کی حامل ہوں گی ؟ لہذا انہیں اصل ماخذوں کو ملحوظ رکھ کر اس باب میں کچھ عرض کیا جاتا ہے -

جب سے دور جدید کی شاعری نے اہل ذوق میں تعارف حاصل کیا ہے اُس وقت سے بخصوصیت "اُردو شاعری کے دو مختلف اسکول" کا عنوان لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ؟ اس اصطلاحی روز مرہ و عنوان کو پیش نظر رکھکر دیکھا جاتا ہے تو اہل دہلی اور اُن کے ساتھ دوسرے دلدادۂ سلاست زبان ؟ مؤلف خمخانۂ جاوید کے ہمنوا پائے جاتے ہیں ؟ یعنی اہل لکھنؤ خشک کلامی ؟ رعایت لفظی کی تکرار ؟ استعارہ بندی ؟ کنگھی چوٹی کے سوا اور کوئی سرمایۂ شاعری نہیں رکھتے - ان خیالات کی تائید میں اقتباس خمخانۂ جاوید کے علاوہ شعرالہند جلد اول کی عبارت پڑھنی چاہیے —

"لکھنؤ کی شاعری کا خاکا اگرچہ مصحفی اور انشا ہی کے زمانے میں قائم ہوچکا تھا - تاہم اب تک شاعری کے مختلف اسکول قائم نہیں ہوئے تھے ؟ لیکن ناسخ اور آتش نے اس رنگ کو زیادہ نمایاں کیا ؟ اُن کے زمانے سے لکھنؤ اور دلی کے دو مختلف اسکول قائم ہو گئے جن کی

خصوصیات باہم مختلف قرار پائیں :—

(۱) لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں عام طور پر جو زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا اُس کا اثر وہاں کی شاعری میں نمایاں ہوا ہے ۔

(۲) شعرائے دہلی کے کلام میں فارسی زبان کی دلاویز ترکیبیں نہایت کثرت سے پائی جاتی ہیں لیکن شعرائے لکھنؤ کا کلام اُن ترکیبوں سے بالکل خالی ہے ۔

(۳) شعرائے دہلی قدما کی طرز پر اکثر مختصر غزلیں کہتے تھے اس لیے اُن کے یہاں مبتذل، سخیف اور بھرتی کے اشعار بہت کم ہوتے تھے ؛ لیکن شعرائے لکھنؤ اکثر نہایت سیر حاصل غزلیں لکھتے ہیں جن کی انتہا بسا اوقات دو غزلہ سہ غزلہ اور چہ غزلہ پر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام قافیوں کو خواہ مخواہ باندھنا پڑتا ہے اور اس طرح بہت سے مبتذل مضامین پیدا ہو جاتے ہیں ۔

(۴) شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام میں معنوی طور پر جو خبرمابہ‌الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ کے کلام میں روحانی جذبات بہت کم پائے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ محسوس کے خارجی اوصاف و لوازم وغیرہ کا ذکر اس کثرت سے آجاتا ہے کہ اُن کے کلام کو پڑھ کر تغزل کا لطف بہت کم حاصل ہوتا ہے ۔

(۵) رعایت لفظی کی طرف شعرائے لکھنؤ کا عام میلان پایا جاتا ہے اور اس صنعت کو وہ نہایت ابتذال کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ۔

(۶) اعتدال بھی شعرائے لکھنؤ کی ایک عام خصوصیت ہے -

(۷) شعرائے لکھنؤ کا عام رنگ معاملہ بندی ہے جس نے حد اعتدال سے بڑھ کر بازاری روش اختیار کر لی ہے - اس لیے اُن کے کلام میں متانت و ثقاہت نہیں پائی جاتی -

(۸) تشبیہات و استعارات میں نزاکت و لطافت نہیں -

(از صفحہ ۲۰۷ تا ۲۱۴ شعرالہند جلد اول) -

ان خیالات سے اگرچہ اہل لکھنؤ اور اُن کے مداحین کم و بیش اختلاف رکھتے ہیں مگر اتنا اعتراف اکثر سنجیدہ صاحبان ذوق کی تحریروں میں ضرور پایا جاتا ہے --

۱ - "وہ خیالات سنجیدہ (ناسخ) کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل ہو گئے جو در حقیقت احاطۂ غزل سرائی سے باہر ہیں ؟ اس دور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وارداتِ و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے سنجیدہ کی غزلیں معرّا ہو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب خوب ہو کر ایک ایسے قدیم کی شاعری ایجاد ہو گئی جس در یہ قصیدہ گوئی اور یہ غزل سرائی دو میں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی ہے - ناسخ کی مشنویں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی ہیں اس پر بھی کبھی کبھی پھبتی کا اثر پیدا کر لیتی ہیں -

(کاشف الحقائق مولفہ شمس العلما مولوی سید امداد امام اثر صفحات ۱۳۹ - ۱۴۴) -

۲ - بادشاہ (واجد علی شاہ) کی طبیعت تصنع کو زیادہ پسند کرتی تھی ؟ تعلی ترق و تکبر و خواجہ وتر جس رنگ میں ڈوبے

ہوئے تھے وہی رنگ بادشاہ کو پسند تھا مگر یہ رنگ غیر
طبعی ہونے کے سبب سے کبھی عام پسند نہیں ہوا -
(مضمون رسالہ ادیب الہ آباد بابت مارچ سنہ ۱۹۱۲ع
نوشتہ مولوی حیدرعلی طبا طبائی) -

متذکرۂ بالا تمام اقتباسوں میں صرف خواجہ عزیز لکھنوی کی رائے ایسی ہے جس کا نقطہ نقطہ شاہ اکبر کی شاعری کے اُن اوصاف سے دست و بغل ہے جن میں ذرا سی گنجائش بھی اُس دوسرے پہلو کے نظر نہیں آتی جو بڑے بڑے شاعر میں بحیثیت انسان ہونا چاہیے - اُن کا بانگ بلند یہ لکھنا کہ --

۱ - "وہ زمانہ اُردو شاعری کے شباب کا تھا، زبان کے قواعد، محاورات کی پابندی، معروکات کا لحاظ، مقبول اور غلط الفاظ کی تفتیش سے دہلی کا دور دورہ تھا -

۲ - بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لیے ہوئے تھا -

۳ - طرز کلام زیادہ تر میر و مرزا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا تھا -

۴ - مضامین کی بےجا خوشامد سے دھنہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی - مگر شاہ اکبر کا کلام اس عیب سے بری تھا -"

میرے نزدیک حقیقت سے دور ہے -

اہل وقوف کے نزدیک شاہ اکبر کی شاعری کے لیے یہہ کہنا کہ "اُن کا رنگ میر و مرزا سے ملتا جلتا ہے" مطبوعات شاعری میں یقیناً نا قابل قبول ہے اب رہا یہہ امر کہ وہ محاورات کے ایسے پابند تھے کہ کبھی غلطی نہیں کرتے تھے، اس لحاظ سے مان لیا جائے کہ وہ بادشاہ تھے، اور بمصداق، ہر عیب کہ سلطان بکند ہنر است - خاموشی اختیار کر لی جائے تو دوسری بات ہے، ورنہ اُن کا کلام پڑھ کر صاف معلوم

ہوتا ہے کہ وہ نہ تمام محاورات پر پوری طرح حاوی تھے نہ اُن کا کلام متروکات سے بے نیا ہے نہ اُن کی شاعری میں وہ پُختگی و سنجیدگی پائی جاتی ہے جو کسی مشاق اور محتاط سخن گو کے کلام میں ہونی چاہیے؟ اور نہ اُن کے اسالیب بیان سے بحیثیت مجموعی کوئی روحانی انبساط حاصل ہوتا ہے - بلکہ صرف اس بنا پر کہ اُنھوں نے مثنویوں میں اکثر آپ بیتی بیان کی ہے؟ پڑھنے والے اور سننے والے میں اُسانی ہمدردی کا قطری جذبہ ضرور بیدار ہو جاتا ہے - غرض کہ اُن کی شاعری میں وہی ایک بات مایۃ الامتیاز ہے جس کو مؤلف جم خانۂ جاوید نے ظاہر کر دیا ہے کہ "اُن کے مکتوبات وغیرہ کو دیکھ کر ایک عجیب اور قابل قدر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ اخگر ہی ایک ایسے بے دھڑک اور سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنے تمام جذبات اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپنی خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ اُن خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے پیش کیا؟ اُن کی یہ اخلاقی جرأت واقعی اس خاص روش میں تمام شعرائے ماضی و حال سے بڑھ گئی ہے" - فی الحقیقت یہی وہ خصوصیت ہے جس نے شاہ اخگر کو شعرا کی صف میں شامل ہونے کا موقع دیا ورنہ اُنھوں نے جس قسم کی سخن سرائی اور قافیہ پیمائی کی ہے اُس کا اندازہ سطور آیندہ سے واضح ہوگا -

اس سے میرا یہ منشا نہیں ہے کہ شاہ موصوف کے کلام میں کوئی شعر یا کوئی حصہ؟ صحت لفظی؟ نہ حسنگی محاورات؟ پختگی تقدس؟ اور سلامت بیان سے خالی ہے؟ اس بحث کی مزید توضیح سے پہلے لکھنؤ کے عام مذاق شاعری کی بابت جو خاص بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے - لیکن یہ خیالات زیادہ تر بیسویں صدی عیسوی سے پہلے کی شاعری کے آئینہ دار ہوں گے -

عالباً تاریخی حیثیت سے حسب بیان مؤلف شعرالہند کوئی سخن فہم اس کا مخالف نہ ہوا کہ لکھنؤ کی شاعری کا جداگانہ وجود شیخ ناسخ کی بدولت قائم ہوا ؟ اور اُنھوں نے اسی ادعا پر اپنا تخلص ناسخ رکھا ۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ سے پہلے عام شعرا کے کلام میں جو رطب و یابس بھرا ہوا تھا اُن سب کو اُنھوں نے صاف کر کے ایک منجھی ہوئی زبان کا رواج دیا ۔ اس دعوی کی تائید و تردید کے لیے دو تنقیحیں قائم کی جاتی ہیں ۔

(الف) آیا ناسخ سے پہلے کسی شاعر نے وہ الفاظ اور وہ ترکیبیں استعمال نہیں کیں جو اُن کے قلم سے نتیں پذیر ہوئیں ۔

(ب) آیا ناسخ کے زمانے میں وہ الفاظ مستعمل ہوتے تھے جن کو اُنھوں نے متروک کیا ۔ تنقیح اول کی تائید میں صاحب کشف الحقائق جلد دوم صفحہ (۱۳۸) میں لکھتے ہیں ؟ کہ :—

"شیخ امام بخش ناسخ زبان اُردو کے مصلح گزرے ہیں ؟ اس اعتبار سے اُن کا یہ تخلص نہایت حسب حال ہے ؟ شیخ نے اُردو کو خراش تراش کر ایسا درست کردیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ۔ ذوق نے صرف مضمون آوری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور اصلاح زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے ۔ مومن کو بھی اس جانب کچھ میلان نہ ہوا ؟ اور غالب نے تو فارسی کی اس قدر آمیزش کردی کہ اُردو پر زبان فارسی کا شبہہ ہونے لگا ؟ حضرت (غالب) نے فارسی الفاظ یا فارسی جملوں کو اس طرح باندھا کہ اُردو فارسی نما ہو گئی ۔ اس کے برخلاف شیخ نے گو الفاظ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اُردو اُردو رہ گئی ؟ بلکہ

اگر فارسی جملے کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی کو اُردو کر کے دکھا دیا؟ مثلاً شیخ فرماتے ہیں ؟؟ :—

"سوالِ وصل پر ہلنا پری رو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے براب عاشقاں پر شاخ آہو کا"

اس شعر میں سوالِ وصل ، پری رو ، ابرو ، اشارہ ، اور براب عاشقاں پر شاخ آہو - الفاظ فارسی اور جملہ و ترکیب کی تعریف میں آسکتے ہیں؟ کیا ناظرین میں کوئی ایسا ذوق نا آشنا ہوگا جس نے یہ الفاظ شیخ ناسخ کے سوا کسی دہلوی شاعری کے کلام میں نہ دیکھے ہوں مثلاً -

سوال بوسہ کو ٹالا جواب چیں ابرو سے
براب عاشقاں پر شاخ آہو اس کو کہتے ہیں

مؤلف کاشف الحقائق نے طویل تمہید کے بعد صرف ایک شعر مثال میں لکھا ہے ؟ اس لیے جواب میں بھی ایک ہی شعر کافی سمجھا گیا ورنہ ایسے الفاظ اور جملے متقدمین ناسخ و ذوق کے کلام میں بھی بکثرت پائے جاتے ہیں - لہٰذا بوادید حالات اس اختیار خصوصی کو قدر مشترک پا کر نتیجہ اول کا فیصلہ شیخ صاحب کے خلاف کیا جا سکتا ہے -

دوسری تنقیح اصل تنقیح ہے اور اسی پر اختلاف و اتفاق کا دارومدار ہے - جہاں تک راقم کی معلومات ہے محاورات و الفاظ کے ترک و اختیار کی دو ہی صورتیں دیکھی جاتی ہیں؟ اول یہ کہ جب کسی قدیم لفظ یا محاورے کا استعمال کم یا زیادہ ہونے لگتا ہے تو فصحائے مستند و معتبر اُن لفظوں کو اپنے روزمرہ سے خارج کرنے لگتے ہیں یا داخل کرلیتے ہیں مثلاً آوے ؟ جاوے ؟ ہووے ؟ کیا رے ؟ لیویں ؟ دیویں وغیرہم کو سو سوا سو برس عام و خاص سب بے تکلف بولتے تھے ؟ بعد کے آنے والوں نے ابتداء کبھی بھی الفاظ استعمال کیے اور کبھی ان کی جگہ آئے ؟ جائے ؟ ہوئے ؟

کھائے؟ لے یا لیں - دے یا دیں بولنے شروع کیے - رفتہ رفتہ مُصلحین و محققین نے پہلے لفظوں کو بول چال میں کم دیکھ کر اور ان قائم مقاموں میں کسی حرف کو مخل فصاحت نہ سمجھ کر بولنا اور لکھنا شروع کردیا ؟ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبان ترک و اختیار کے عہد آخر میں قدیم الفاظ معدوم ہو گئے اور اُن کے بعد جو نسل پیدا ہوئی اُس نے اُن لفظوں کو ہمیشہ کے لیے مفقود سمجھ کر یک قلم متروک کردیا - دیکھیے فارسی ترکیب کے ساتھ نون کا اعلان فارسی قواعد کے خلاف تھا مگر متقدّمین اور متوسطین شعرائے اُردو نے تکثرت دین - و ایمان - زمین و آسمان ؟ فخر ہندستان وغیرہ کو باعلان نون لکھا ہے - چنانچہ ذوق و مومن اور غالب کے زمانے تک اس قسم کا استعمال رہا مگر متقدمین سے کم ؟ اُن کے بعد جو زمانہ آیا اُس میں اہل سخن نے متفق‌علیہ اس کو متروک سمجھ لیا - اس خصوص میں اُن حضرات کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے جنھوں نے تبحرل شاعری کی تائید و ترویج کے بعد متروک تراکیب و الفاظ کا استعمال جائز سمجھ لیا ہے -

دوسری صورت یہ ہے کہ آنے والی نسل نے وہ قدیم الفاظ سنے ہی نہیں یا اُس کے صوتہ و سہرمیں ادبی حیثیت سے وہ الفاظ داخل زور مرہ نہیں ایسی حالت میں وہ شاعر اپنی سخن آفرینی میں اُن الفاظ سے کیا سروکار رکھ سکتا ہے جن کا وجود اُس کے موجود ہونے سے پہلے معدوم ہو چکا ہو - معمولی تفحّص سے معلوم ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ کے آثار شاعری میں ایسے بہت سے الفاظ جن کو متروکات ناسخ کہا جاتا ہے اُن سے پہلے ترک ہونے شروع ہوگئے تھے ؟ مگر چوں کہ شعرائے عصر نے اپنے ابتدائی کلام سے اُن الفاظ کو خارج نہیں کیا تھا ؟ اس لیے جا بجا اُن کے دیوانوں میں آتے ہے ؟ کھٹکتے ہے ؟ وغیرہ الفاظ قائم رہ گئے ؟ اگر ان الفاظ کے ساتھ وہ مترادف اور اختیار کردہ الفاظ اُن معاصرین کے کلام میں

کہیں موجود نہ ہوں تو بے شک یہ خیال صحیح تھا کہ ان کے سوا دوسرے مجتہدان فن نے ان لفظوں کو ترک کیا ہے مگر جب کہ یکدم یہ دیکھا جاتا ہے کہ متروک الفاظ فی صدی تاسع اور اختیار کردہ فی صدی تجاسع مستعمل ہو رہے ہیں تو اس کا کامل یقین ہوجاتا ہے کہ شیخ ناسخ کے لکھے ہوئے الفاظ دوسرے معاصرین بلکہ متقدمین کے کلام میں بھی موزوں ہوتے رہتے تھے -

شیخ ناسخ لاہوری نسبت کے لحاظ سے شمالی ہند میں ایک تو وارد کی حیثیت رکھتے ہیں یہ مسلّم ہے کہ وہ ساری عمر اسی صوبے میں رہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ خلاق مطلق نے اُنھیں جوہر قابل بننے کی صلاحیت عطا کی تھی اور اسی طرح تمام وہ خوبیاں جو ایک مستند فاضل کو حاصل ہوسکتی ہیں بوجہ کمال اُن میں موجود تھیں - تاہم ہمہ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اتاً عن جد دوسرے شعرائے شمالی ہند کی طرح اُردو کو اپنی مادری زبان کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں - جن الفاظ کو آج غلط فہمی سے محض اُن کی متروکات میں شامل سمجھا جارہا ہے وہ یقیناً اُن سے پہلے متروک ہونے شروع ہو گئے تھے؟ اول تو اُنھوں نے وہ الفاظ جس کو شاہ حاتم کے زمانے سے اُردو داں بول رہے تھے سنے ہی نہ ہوں گے اور جب سنے ہی نہیں تو ترک و اختیار کا احساس کیا ہوتا اور بفرض سنے بھی تو ایسے وقت میں سنے جب کہ عموماً دوسرے شعرائے مصلحین یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب ان محاورات و الفاظ کی ترویج موزوں و مناسب نہیں - اس بنا پر تنقیح دوم کا یہ فیصلہ قرین انصاف ہے کہ بنیا شیخ صاحب ہی محاورات متقدمین کے ناسخ نہیں ہیں بلکہ -

اُنھیں آشفتہ مزاجوں میں جواں مرد بھی تھا

شیخ ناسخ کے کلام میں بھی بعض الفاظ اور اسالیب بیان ایسے ملتے ہیں

جن کو فی زمانہا کوئی اُردو داں استعمال نہیں کرتا اور اُن کے زمانے میں بلکہ اُن سے پہلے بھی موجودہ عہد کے الفاظ مستعمل ہونے لگے ہے - مثلاً ؟ ولے (مگر) تلے (نیچے) ہووے (ہو) بن (بغیر) مثلاً حسب ذیل اشعار :-

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آئی سب وقت میں تو احساں ہوتا

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
تھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

دار کا چاہیے عاشق کو جھکانا ایسا
دل میں ہو ذکر صنم ہاتھ میں قرآں ہووے

غیر گوہر کسی دریا کا میں شناج نہیں
تشنۂ سیر جدا ں کہیں شناج نہیں

لیکن اگر اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو کہ ناسخ سے پہلے مگر ؟ تلے ؟ ہووے اور بن کے سوا دوسرے مترادفات کا استعمال ہی نہ تھا ؟ تو اس کا جواب بھی حسب ذیل اشعار سے ملے گا - ان مثالوں میں ولے اور بن کی مثالیں مخصوص نہیں لکھی ہیں کیوں کہ ایک مشکک یکساں وزن عروضی ہونے کی وجہ سے بے کمی جگہ بن اور ولے کے بجائے مگر پڑھ سکتا ہے ؟ تاہم مگر کی مثال ایک فائدے سے لکھی جائے گی -

سید - اثر کے قوافی کے ساتھ میر کا شعر ہے —

روؤں تو آتشِ دل شمع سمط بجھتی نہیں ؟
مجھکو لے جا کے ڈبو دیویں مگر پانی میں

ہووے کي جگہ ہو ملاحظہ ہو :—

میر

قطرہ قطرہ اسکناري تا کجا بیس سحاب
ایک دن تو ٹوٹ تر اے دیدۂ تر ہو سو ہو

میرحسن

وہي ہو شہر اور وہ باغ و گلزار
وہي صحبت ہو اور وہ یار کے یار

میر عباس علی عرفاں دہلوي

یہ حال نہیں ابروے خمدار کے نیچے
رنگي کو قضا لائي ہے تلوار کے نیچے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیح ناسخ اور اُن کے تلامذہ و متبعین تندس الفاظ ؟ استعمال تراکیب اور اسالیب بیان میں کوئي ایسا خاص فرق نہیں دکھا سکے جس کی شان کم و بیش اُن کے متقدمین و معاصرین کے کلام میں دستیاب نہ ہو سکے ؟ البتہ خارجي اور سطحی مضامین حسن و عشق کو رعایت لفظي اور دیگر صنائع و بدائع کے لزوم مالا یلزم سے ضرور اپنالیا* ہے اور یہی اُن کا امتیازی اور خصوصي رنگ مانا جا سکتا ہے ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ چوں کہ اُن کے مستعملہ تلازمات صنایع بدایع زیادہ تر فارسي کي تقلید میں شروع ہوئے تھے اس لیے اُن کے زمانے میں تصداق "کل جدید لذیذ" ہیں ایسي گل‌کاریاں جنستان دہلي میں بھي پائي جاتي ہیں ؟ لیکن اُن کی مقدار اُسي قدر ہے جس

---

*یہ لفظ دانستہ لکھا گیا ہے ۔

قدر کہ ناسخ ، وزیر ، رشک ، برق ، بحر وغیرہم کے مجموعہ کلام سے صاف سنجیدہ ، اور با اثر اشعار کے انتخاب کی مقدار -

چوں کہ یہ مضمون صرف واجد علی شاہ کے متعلق لکھا گیا ہے اور موجودہ بحث شاعری لکھنؤ کے خصوصی رنگ کی وجہ سے چھڑ گئی تھی اس لیے حضرت ناسخ وغیرہ کا تذکرہ اتنی وضاحت سے کیا گیا ، اب اصل مدعا کی طرف متوجہ ہونا چاہیے -

واجد علی شاہ اگرچہ شیخ ناسخ کے انتقال سے ۸ - ۹ برس بعد تخت نشین ہوئے لیکن اُن کی پیدائش شیخ صاحب کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی جبکہ اُن کی طرز و روش کا اثر عام طور پر صوبۂ اودھ میں پھیلا ہوا تھا ان کے نامور تلامذہ اور جملہ مقلدین عموماً اُسی رنگ کو پسند کرتے تھے ، ایسی حالت میں شاہ اختر جان عالم ، (جن کے میلان طبع کی تصدیق اُن کے مصاحب مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی بھی فرماتے ہیں) کس طرح اس چھائے ہوئے رنگ سے بچ جاتے ، چنان چہ وہ بھی زیادہ تر اُسی لفظی تکرار ، عامیانہ جذبات ، عریاں مضامین ، کے سبق دھراتے رہے - اب چند اشعار شاہ اختر کے درج کیے جاتے ہیں اس دعویٰ کو مد نظر رکھ کر پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ مذکورات اور پختگی تقدس اور استعمال محاورات پر کس قدر حاوی و عامل تھے ، یہ مضمون مثنوی حزن اختر کی تنقید کے سلسلے میں شروع کیا گیا ہے اس لیے نمونۂ اشعار بھی اُسی مثنوی سے منتخب کیے گئے ہیں .—

(۱) وزیرِ نبی سوہرِ فاطمہ
حسین و حسن کا پدر مہ لقا

وہ تھی لکھنؤ میں مع والدہ
سناء اب گئی سوے ملکِ بقا

تب دل کی سوزے کی مانند ہے
گرفتار رنداں ترا رند ہے

(۲) جو کچھہ حد امکان میں آئے گا
بحکم گورنر وہ مل جائے گا
جہاں میں رہوں گا تنا خواں ہوں
مگر قید غم میں پریشان ہوں
الہی ملیں مجھسے میرے حبیب
جو ہوں دور وہ جلد ہوویں قریب
کیے نذر قیصر بھی گیارہ ہزار
کہ لیوے یہ رنج اُس کے دل میں قرار
ہے چھبیسویں آج دیعقد کی
لکھہ اخبار کچھہ قید کے بعد کی

(۳) گلِ تازہ بچھسے ہے یا آب و تاب
حسن بھی ہرا ہے ؟ درختوں میں آب
ادب کر ادب کر خموش اخترا
کہاں تو کہاں یہ سخن مرحبا
بس اختر کر اب ترک طرزِ بیاں
ہوئی ختم یہ مثنوی گل ستاں

مندرجۂ بالا اشعار میں صرف خط کشیدہ الفاظ توجّہ طلب ہیں ۔ اگرچہ آج کل کا ادبی مذاق اور ذوق سلیم ان اشاروں کے بعد کسی تفصیل و صراحت کا محتاج نہیں ؟ لیکن اس خیال سے کہ شاید مضمون نگار اچھی طرح اُن شعروں کے محاسن کو نہ پہچان سکا ہو ؟ تھوڑی سی وضاحت کی جائے گی ۔ ان ابیات میں دو بین

قسم کے شبہات ہیں ؟ اول یہ کہ اُس زمانے کے مسلمہ قواعد و اصول کے خلاف قافیے لکھے گئے ہیں - دوم یہ کہ بعض الفاظ کی موزونیت اُردو شاعری کے شباب کے زمانے میں ایک پابند متروکات کے لیے قابل نظر ہے - سوم یہ کہ ایک پختہ کلام اور کہنہ مشق جس کو نکتہ چینیوں کا لحاظ بھی رہتا ہو ایسے الفاظ استعمال کرے جن سے باقی جملے بہ صرف بے ربط ہو جائیں بلکہ اُن سے مضحکہ خیز مہملیت ظاہر ہوتی ہو -

(۱) موجودہ زمانے کی بے راہ روی اور آزادی سے قطع نظر کر کے نصف صدی پہلے کے اساتذۂ لکھنؤ بالعموم اس کے پابند نظر آتے ہیں کہ ؟ ہائے مظہرہ یا عربی کی تائے مدوّرہ کو الف سے ہم قافیہ نہیں کرتے - فاطمہ ؟ والدہ ؟ لقا اور بقا اگرچہ اُردو تلفظ میں ہم آواز ہیں لیکن شیخ ناسخ اور اُن کے تلامذہ اور دیگر اساتذہ نے اپنے زمانے میں اس کو جائز نہیں رکھا ؟ - اور بفرض کسی نے کہا تو غلط مانا گیا - اسی طرح مانند بمعنی نون اول صحیح لفظ ہے اور بند بقیداً بکسر رائے مہملہ ہے - یہ اختلاف توجیہ غیر مسلم ہے - عوام کالانعام (جُہلا) البتہ مانند کو بکسر نون بولتے ہیں جن کی پابندی اخص الخواص (اور پھر بادشاہ) کے لیے کیسی ؟ -

(۲) امکان ؟ آسمان ؟ وغیرہ جیسے الفاظ کا نون بہ ترکیب اضافی اعلان نون کے سابقہ مدت سے واضحان فن نے متروک کردیا ہے - ؟

جہاں میں رہوں گا نغاخوان ہوں - اس مصرع میں اظہار نون ثغا خوان کے علاوہ ؟ ہوں رو مرہ کی پابندی سے آزاد ہے - صیغۂ استقبال کے سابقہ حال (ہوں) کا جوز اس وقت موزوں ہوسکتا ہے جب کہ وہ مضارع کا صیغہ ہو؟ اگر یہاں حال و استقبال کا اتصال

غلط نہ مانا جائے تو بھی فقرہ ناقص اور غلط ہو جاتا ہے اس کی صحیح بحر نہ ہو گی "میں جہاں رہوں گا تناخواں رہوں گا یا ہوں گا" ۔ اس مد میں ہوں اور لیوے وہ الفاظ ہیں جن کو اُسی عہد کے متروکات میں شامل ہونا چاہیے ۔ اسی سلسلے میں "لکھہ اخبار کچھہ قید کے بعد کی" والا مصرع کسی ناول کو دھن نشیں ہوے نہیں دیتا ۔ کیوں کہ پہلے مصرع میں چھٹسویں کے لیے یقیناً کی (یاے معروف) چاہیے مگر اخبار میں جس کو متفق علیہ ابتدا سے اب تک اہل لکھنؤ کے لیے بقاعدۂ جمع عربی مذکر ہونا چاہیے) فعل تانیث قابل غور ہے ۔

(۳) الفاظ کا توازن ؟ اسالیب کا تناسب ؟ فصاحت و سلاست کی روح ہے ؟ مگر اس شعر میں

گُلِ تازہ تجھسے ہے یا آب و تاب

چمن بھی ہرا ہے ؟ درختوں میں آب

ذوق سلیم کو "چمن بھی ہرا ہے" کے بعد "درختوں میں آب" کا جملہ جس قدر نا مربوط معلوم ہو سکتا ہے اُس کی لذت اہل مذاق ہی سے پوچھی جائے ۔ مزید تصدیق کے لیے پورے شعر کو ایک ساتھہ پڑھہ کر دیکھنا چاہیے کہ اس سلاست میں کیسی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے ؟ جس سے شاعر کا انتہائی عجز ثابت ہوتا ہے ۔

اکثر مثنویوں میں قافیہ پیمائی کے لیے برائے بیت الفاظ لائے جاتے ہیں ؟ یہ عمل بھی اگرچہ شاعر کی کم مشقی اور عجز طبع کا نمایندہ ہے ۔ لیکن معنوی حیثیت سے اُن بھرتی کے لفظوں میں شعر کی ترکیب کے ساتھہ کچھہ نہ کچھہ مناسبت ہوتی ہے ۔ ذیل کے اشعار اس خصوصیت سے معرا ہیں ۔

ادب کر ادب کر خموش اختراؔ

کہاں تو کہاں یہ سخن مرحبا

اس سعر میں علاوہ اختراؔ کی رکاکت کے ؟ مرحبا کا کوئی محل نظر نہیں آتا - مرحبا تحسین و تعریف کے موقعے پر مستعمل ہے جس کا ترجمۂ اُردو واہ وا ہے - اور یہاں تحسین کی جگہ تادیب کا موقع ہے ؟ اسی طرح مصنف کا پہلا سعر —

وزیرِ نبی شوہرِ فاطمہ

حسین و حسن کا پدر مہ لقا

یہاں پہلا سہ تو یہ ہے کہ باضافت توصیفی پدر مہ لقا ہونا چاہیے ؟ اور اگر اُردو کی عام بول چال یا مجبوری نظم کی خاطر فکِ اضافت جائز بھی ہو تو حضرت مولیٰ علی کو مہ لقا کہنا کم از کم اس موقع پر تو کوئی مناسبت نہیں رکھتا - تیسرا شعر

بس اختر کر اب ترک طرزِ بیاں

ہوئی ختم یہ مثنوی ؟ گُلستاں

یہاں بھی حذفِ اضافت کے علاوہ ایسی مثنوی کو گلستاں بنانا جس میں اول سے آخر تک حزن و ملال کی داستان لکھی گئی ہو کس قدر مُضحک ہے -

رسالۂ محزن سنہ ۱۹۰۸ع کے مضمون میں جس بلند آہنگی سے شاہ موصوف کو نابند مشروکات اور تحفۂ کلام وغیرہ بنایا گیا ہے اُس کا اندازہ مندرجۂ بالا انتخاب اشعار سے ہو گیا ہوگا جو بہت سرسری طریقے سے نقل کر لیے گئے ہیں ، اگر بالاستیعاب ساری مثنوی کے اشعار لکھے جائیں تو عالباً مثنوی کا نصف حصہ ایسا منتخب کیا جا سکتا ہے جن میں شاعرانہ خوبیوں کا کوئی لطیف اور دلچسپ پہلو بحر موزونیت کے نظر نہ آئے گا -

اس دعوے کا تصفیہ کہ د ساہ اختر کا رنگ میر و مرزا سے ملتا جلتا ہے اس سے بہتر نہیں ہوسکتا کہ مضمون نگار متدرن کے منتخب کردہ اور چیدہ اشعار لکھہ کر میر و مرزا کے بھی بعض اُسی قسم کے اشعار درج کئے جائیں اور آخری فیصلہ خود ناظرین پر چھوڑ دیا جائے -

شاہ اختر

بندے کو اُس کے عشق ہے داب و صواب کا
مبدع حقیقۃ ہے وہ کل کائنات کا
پایا نہ کوئی چاہ دفن دیدۂ ترسا
چشموں سے بہت کھینچتے ہیں اسکوں کا چرسا
ناقوس برہمن سے صدائے اذاں سنی
مسجد سے میں نے قصد کیا سومنات کا

فقط دل سے ہیں اعضائے رئیسہ
کرے سلطاں نہ آزادی کی خواہش

کچھہ نہیں اختر مجھے عشق مجازی سے حصول
اب تو معشوقِ حقیقی سے ہے اپنا اختلاط
پر پتنگوں کے جلا کر صبحدم گُل کر دیا
بزم عالم میں یہی کیا شمع کا محصول تھا

بدن صاف نہ رنگینی دکھاؤ صاحب
پول ہارے ہو تو گُل چھلوں کے کھاؤ صاحب
کہیں تار نظر بند نہ تراکب نہ ترے
بال کی اوٹ میں جائے ہو تو جاؤ صاحب

کیا یہی وہ اشعار ہو سکتے ہیں جو میر و مرزا کے مذاق سے ملے جلے کہے جائیں بہر حال ان کے مقابل میں ہم طرح اور ہم قافیہ کیسے ؟ ہم مضمون اشعار بھی پوری طرح نہیں مل سکتے ۔ لیکن باوجود اس کے میر و مرزا آفتاب و ماہتاب کی طرح آسمان شاعری پر چمک رہے ہیں ۔ یہاں اُن کے چند معمولی شعر جو کسی حد تک ہم قافیہ و ہم مضمون ہیں لکھے جاتے ہیں —

میر

ہر ذی حباب کا ہے سبب جو حیات کا
نکلے ہے جی ہی اُس کے لیے کائنات کا
اشعار ہوویں خامہ و آبِ سیہ بحار
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اُس کی صفات کا
اُس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب زمین
شمع حرم ہو یا کہ دِیا سومنات کا
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھ ہو، پر اعتبار بھی ہو کائنات کا

کچھ بھی معاش ہے یہ کی اُس نے اُک جسک
جب مُدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا

کیا کہیے کیا رکھے ہیں ہم بھی بار خواہش
اِک جان و صد تمنا اِک دل ہزار خواہش

سب سے آنکھ بند رکھتے ہیں، جو ہیں احتیاط
ہوتے ہیں یہ لوگ، بھی کتنے دانشمند، احتیاط

پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے
دیکھا تم کو بھی واہ وا صاحب

دل کا اُلجھنا اپنا ایسا نہیں کہ سلجھے
ہیں دام زلف میں ہم اُس کے اسیر صاحب

کس گنہ کا ہے بس ار مرگ نہ عذرِ جانسوز
پاؤں پر شمع کے پائے ہیں پرِ پروانہ

سودا

خال کا دانہ ملے ہے خرمن گوہر کے برج
حُسن گندم‌گوں کے مزرع کا یہ کچھ محصول ہے

مرے سجود کی دیر و حرم سے گزری قدر
رکھوں ہوں دعویٰ ترے در نہ جبہ سائی کا

دھن غنچے کا جب دیکھوں ہوں گوش گل نہ گلشن میں
تو اپنا درد دل کہنا کسی سے یاد آتا ہے

شاہ اختر کے زیادہ اشعار کا انتخاب تحصیل حاصل سمجھا گیا ؟ کیونکہ جن جذبات و خیالات کی روشنی ان شعروں میں نظر آ رہی ہے اُسی کا پرتو اوروں میں بھی ہوتا - سخن فہم ناظرین کے لیے اس روش کے اپنے ہی اشعار صحیح رائے قائم کرنے کے لیے کافی ہوں گے - ایسے شعروں کے انتخاب سے یہ غرض و غایت نہیں کہ سلطان عالم اختر رمزہٗ شعرا میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے تھے ، بلکہ مدعائے اصلی یہ ہے کہ جس جامعیت و مشابہت کے ساتھ ممدوح کو پیش کیا جاتا ہے وہ صورت اساتذہ کے ہم پہلو بنانے کے لیے کافی نہیں -

مثنوی حُزن اختر کو پڑھکر اُس کے حُسن و قُبح پر راقم سطور نے جو رائے قایم کی ہے اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱—ساری اختر کی گوئی بغیر کسی تصنع و تاویل کے مُسلم ہے -

۲—جہاں تک شعر میں وزن عروضی کا تعلق ہے اُن کی بندشیں صاف اور چست ہوتی ہیں عام شعرا کی طرح معمولی حروف کو بھی حتی‌الوسع ساقط‌الوزن ہونے نہیں دیتے -

۳—پورے کلام کو پڑھکر بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ فن شعر سے کافی آگاہی رکھتے ہیں اور جس شعبے میں قلم اُٹھاتے ہیں اُس کی اکثر اصطلاحیں اور خصوصیات نمایاں کرتے جاتے ہیں -

۴—اپنے جانگی اور ترائیویت حالات ' جن کو عموماً شعرا پوشیدہ رکھتے ہیں ' پوری جرأت اور کافی وضاحت کے ساتھ بے تکلف سینے سے سفینے میں منتقل کر دیتے ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جس میں کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی اُن کا حریف نہیں -

۵—مضامین کے اعتبار سے اُن کے کلام میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی وہی فرسودگی جس کے تذکرے صفحات ما سبق میں جا بجا ہو چکے ہیں یکسرت موجود ہے جس کو پڑھکر پڑھنے والے پر ایسا اثر نہیں ہوتا جیسا کہ قدرہ آب نیسی کو سن کر ہونا چاہیے -

۶—رعایت لفظی اور استعارات و تشبیہات کی بلائیں اُن کے کلام پر اُسی طرح مُسلط ہیں جس طرح اُن کے معاصرین ؟ وزیر ؟ رشک ؟ برق اور امانت وغیرہ کے مجموعۂ سخن کو مغلوب کیے ہوئے ہیں -

مثنوی حزن اختر ۷۴ عنوانوں پر منقسم ہے ممکن ہے کہ یہ تعداد سنہ ۷۴ھ کی مناسبت سے مقرر کی گئی ہو - ان عنوانوں میں تین عنوان بخصوصیت شاعرانہ تلازمات اور تشبیہ و استعارات کے مرکز ہیں -

اول صفحہ (۱۰۱) پر "ساقی نامہ و حال نیوفائی مطلوب السلطان نواب حسنہ صاحب کربلائی۔"

دوم صفحہ (۱۱۳) پر "ساقی نامہ در انتظام جواہر گفتار در نیوفائی چند صاحبان محل در فید"۔

سوم صفحہ (۱۳۳) پر "گفتار در صرف زر جود بہ رندان و ساقی نامہ بالترام سالح۔"

یہ تینوں مضامین علی الترتیب صفحہ (۱۰۱) سے شروع ہو کر صفحہ (۱۴۵) پر ختم ہوئے ہیں۔ پہلے عنوان میں گانے بجانے اور تمام راگ راگنیوں اور آلات سرود کا مذکور ہے، مثلاً —

صدا دے مغنی کو اے عشگسار
کہاں ہے ترا لائے اس جا ستار

کدھر بین ہے اور کہاں دائرا
کہو چھیڑے قوال ڈھولک کو آ

صدا زیر و بم کی سنادے ہمیں
وہ رقاصۂ جوش دکھادے ہمیں

وہ مدھم وہ پنچم وہ دھیوت لگے
نکھاد فلک جس پہ تحسین کرے

دوسرے عنوان میں حسن اور گل و ریاحین، اور جواہرات کے نام رعایت لفظی کے ساتھ گنائے گئے ہیں مثلاً —

چہک بلبل لکھنؤ باغ میں
ہُما میں دکھا فرق اور راغ میں

کلی جب کھلے دست نفحہ کُھلے
زر و سیم میں روئے نسرین تُلے

کدھر ہے وہ نیلا جو پوشہ بنائے
گُل اسرفی ہے کہاں نذر لائے

وہ الماس معنی کو ہووے چمک
کہ روشن رہیں رات دن سب فلک
تراشوں وہ فیروزۂ رنج کو
کہ قاروں رکھے بلّے میں گنج کو

تیسرے عنوان میں ہر قسم کے اسلحہ کی تفصیل سے نرم سخن کو رزم‌گاہ بنایا گیا ہے :—

لگا میرے تیغِ مضامیں میں زنگ - ہوا تیرۂ فکر جس طرح سنگ
بنا خنجرِ دھن جس کی طرح - سپر فہم کی ہے مگس کی طرح
طبیعت کی تیغ اصفہانی جو تھی - مضامیں کی سیفِ خوانی جو تھی
وہ خاشاک کی طرح تد بر ہوئی - یہ نحرِ تقارب بھی خنجر ہوئی

ان اشعار سے اس زمانے میں جب کہ اُن اشیاء کے دیکھنے والے تو درکنار سمجھنے والے بھی نابید ہوئے جا رہے ہیں لغت نویسوں کے لیے ایک مفید ذخیرہ جمع ہو سکتا ہے -

---

مثنوی حزن اختر جو الفاظ نرس میں مولوی محبوب علی صاحب ناظم دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے چھپوائی ہے ؟ اُس میں مولانا عبدالحلیم صاحب سرور مرحوم نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے ؟ مولانا سے اس مثنوی کے نام کے متعلق تسامح ہو گیا ہے ؟ یعنی وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ مثنوی آج سے ۶۵ برس پیشتر ۱۲۶۶ ہجری میں جب کہ بادشاہ وجد و رنگ میں تھے تصنیف ہوئی اور اس کے کئی سال بعد یعنی ۱۲۷۶ ہجری میں خود ظل‌اللہ جہاں پناہ کے مطبع واقع متیا برج میں چھپ کر اہل دربار اور بازار میں تقسیم ہوئی'' - (صفحہ ۷) -

اعلاً یہ تسامح حزن اختر کے اعداد (۱۲۶۶) سے ہوا ہے - حال آں کہ اِس سنہ میں بادشاہ لکھنؤ ہی میں سریرآرائے سلطنت تھے - لکھنؤ

سے اُن کی روانگی سنہ ۱۲۷۱ ھجری میں واقع ہوئی ہے پھر کس طرح سنہ ۱۲۶۶ ھجری میں مقید زندان فرنگ ہو سکتے ہیں چناں چہ مثنوی میں روانگی کا زمانہ اس طرح ظاہر کیا ہے —

کر اب میراں جی کا مہینا رقم
کہ جس میں ہوا حکم بھا یہ عَلَم
دلا ہمت و تسلم بھی اُس ماہ کی
چھٹی سلطنت جس میں محمد شاہ کی
اکھتّر بھے سنہ بارہ سو پر زیاد
تو مبری زباں سے رکھہ اب اس کو یاد

واقعہ یہ ہے کہ حزن اختر میں بادشاہ نے ۱۲۶۶ اشعار لکھے ہیں اسی مناسبت عددی سے اس کا نام حزن اختر رکھہ دیا ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے —

رکھا حزن اختر جو شعروں کا نام - یہی نام رکھکر کیا ہے تمام

اس کے بعد ۱۲۷۴ ھجری تک وہ مقیّد رہے اور آزاد ہوکر ۱۲۷۶ ھجری میں اس مثنوی کو چھپوادیا - مزید اور مکمل تنوب ذیل کی تاریخ سے ملتا ہے —

حضرت سلطانِ عالم دیں پناہ
اخترِ اوج و کمال و برتری
حزن اختر مثنوی تصنیف کرد
واقعی جوش داد دادِ ساعتی
الغرض مطبوع شد احسن ز حکم
گفتمش تاریخ - حزنِ اختری
۱۲۷۶ ھ

اس تاریخ کے مصنف ساقی کاتب محمد عبدالرحمن صاحب احسن ہیں -

شاہ اختر کی فہرست تصانیف طویل الذیل ہے - جن کے موضوع بھی مختلف ہیں - صرف منظومات میں چھہ دیوان ' اور مثنویاں ہیں ' بھر مراثی کی تین جلدیں علیحدہ ' اور قصائد اُردو و فارسی کی متعدد جلدیں مزید بر آں - ظاہر ہے کہ ایسے سیر نویس کے کلام کا انتخاب معمولی کام نہیں -

اس وقت تک اُن کی غزلوں کے جتنے اشعار درج کیے گئے ہیں وہ خاص مذاق کی پسند کے موافق تھے - لیکن اب کچھہ ایسے اشعار بھی نقل کیے جاتے ہیں جو اپنی بعض خوبیوں کے لحاظ سے نہ صرف عام پسند کہے جا سکتے ہیں بلکہ اہل مذاق کی داد و تحسین کے جائز مستحق ہو سکتے ہیں '—

اس عشق بے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا
آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

———

بڑا ہے ناؤں میں اب سلسلہ محبت کا
بُرا ہمارا ہوا - ہو بھلا محبت کا

———

ہاتھوں سے دل نکل کر ناسوں اُچھل پڑا ہے
ڈھونڈھیں فلک نہ قدسی کچھہ کھو گیا ہے میرا

———

بہت زخم جراّح تو نے بھرے ہیں
مرے داغ کا کوئی مرہم نہ نکلا

———

جس کی جو تاب ہے تا مرگ رہی اُس کے ساتھہ
ایک پیوند بھی اس جامے میں جوڑا نہ گیا

دل تلک چھین لیا وصل میں اے خانہ خراب
چار فرقت کے سوا اب نہیں گھر میں نکا

مرہم کوئی لگائے جو دو چار داغ ہوں
اختر کا بن تو سر سے ہے پا تک جلا ہوا

وسعتِ خُلد سے بڑھکر ہے کہیں حُبِّ وطن
تنگیِ گور سے بد تر ہے فضائے غربت

ہم بھی شریک جلسۂ ابنائے دہر ہے
ٹھہرکر نہ مار فبر نہ اے خوس حرام عیس

پوچھتا ہے جو کوئی مجھکو کہ ہمراہ ہے کون
شرم سے کہتے ہیں وہ ؟ ہے یہ ہمارا عاشق

اس دوستی میں ہو گئے اے مہرباں تمام
جب تک تم آؤ آؤ ہوئے ہم یہاں تمام

دکھاتے ہیں جو یہہ صنم ؟ دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی کو ہم دیکھتے ہیں

غمزہ و عشوہ و انداز و ادا بے مارا
ناتواں ایک بت ؟ جو رنگ ہوا چار کے ہاتھہ

نکلوں کس طرح دل سے تری مژگان کے تیروں کو
مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

جان عالم اختر کے کمال شاعری کی بعض روشوں نے ایسے سخن گسترانہ میداں دکھائے کہ اُن سے دامن کشاں گزر جانا ممکن نہ ہوا اور مجبوراً — ع - رفتہ رفتہ می شود بسیار گو ' کا مصداق بننا پڑا - طوالت اگرچہ مخل فصاحت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات — ع - بنتی نہیں ہے بات مکرر کہے بغیر' اس خیال سے پھر اعادۂ سخن کیا جاتا ہے کہ شاہ جان عالم اختر اپنے واقعات و وارداتِ کی بدولت جس قدر سوز و گداز اور جذبات روحانی کے ہم پہلو رہ چکے ہیں اُن کی مطابقت میں وہ اثرات اُن کے کلام سے مترشح نہیں ہوتے ' جن کا ظاہر ہونا مقتضائے نفسیات ہے ' بر خلاف اس کے تمام مجموعۂ کلام پر تعیّش و اطمینان کا رنگ چھایا ہوا ہے - وہ واقعات بیان کرتے ہیں اور حد سے زیادہ فصاحت کو کام میں لاتے ہیں ' لیکن الفاظ میں ایسی تاثیر اور بیان میں ایسا سوز و گداز پیدا نہیں کر سکتے جس کو سن کر سننے والا بے چین ہو جائے - اس بنا پر کہنا پڑتا ہے کہ وہ صرف خارجی اور سطحی شاعری کے عَلَم بردار تھے - جذباتی اور داخلی شاعری میں شذرِ اندازہ نظر آتے ہیں -

(باقی آیندہ -)

غیبي آواز

(از حضرت خوش ملیح‌آبادي)

قسم اِس دل کي ؟ چَسکا ھے جسے گو بُت پرستي کا
مگر پہچانتا ھے جو مراح اشیائے ھستي کا

قسم اِن تیز کانوں کي ؟ کہ ھنگامِ قدح نوشي
مشیت کي زباں رکھتي ھے جن سے مجھکو سر گوشي

قسم اِس جان کي ؟ خُو ھے جسے فطرت پرستي کي
گِنا کرتي ھے راہوں کو جو ضربیں قلب ھستي کي

قسم اُس نور کي ؟ کستي جو اِن آنکھوں کي کھینا ھے
جو نقسِ پا کے اندر عرم رھرو دیکھہ لینا ھے

قسم اِس ذوق کي ؟ حاوي ھے جو آثار قدرت پر
صمیر کائنات آئینہ ھے جس کي تصیرت کر

قسم اِس حِس کي ؟ جو پہچان کر تیور ھواؤں کے
سناتي ھے خبر طوفان کي طوفان سے پہلے

قسم اِن اُنگلیوں کي دوستو ! جو دیکھہ لیتي ھیں
جتائیں چھو کے بے برسے ھوئے اصنام کي نبضیں

قسم اِس آنکھہ کي ؟ جو درس بینس مجھکو دیتي ھے
زمیں کي نہاپ میں جو بجلیوں کو دیکھہ لیتي ھے

قسم اِس فکر کي ، سوگند اِس تخیئلِ محکم کي

جو سنني هے صدائیں جنسِ مرگانِ عالم کي

قسم اِس روح کي جو عرس کو رفعت سکھاتي هے

که راتوں کو مرے کانوں میں یه آواز آتي هے

اُٹھو ؟ جاگو ؟ بڑھو ؟ مُنه هاتھ دھو ؟ آنکھوں کو مل ڈالو

خبر لو ؟ انقلاب آیے کو هے هندوستاں والو !

اُٹھو ؟ وه صبح کا عُرفه کُھلا ، زنجیر سب ٹوٹي

وه دیکھو پَو پھٹي ؟ مُنھچے کھِلے ؟ پھلي کرن پھوٹي !!

تبصرے

اُردو کے لغات

(از پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم - اے)

(۱)

ہندستانی اکیڈمی نے اپنی چند سالہ زندگی میں اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے اپنی ضرورت و بقا کا ثبوت پہونچا دیا ہے؟ - اس کا تماہی رسالہ ہندستانی اس سلسلے کی ایک بین و نا قابل تردید دلیل ہے؟ امید کہ یہ رسالہ نہ صرف اُردو ادب و تاریخ کے لیے مفید ثابت ہوگا بلکہ متحدہ ہندستان کی مشترکہ زبان کے مسئلہ کے حل کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر رہے گا -

رسالے کے پہلے نمبر میں چند مضامین ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کو افادی نظر سے پڑھا جائے؟ آج میں ان میں سے صرف ایک مضمون کے متعلق جو اردو لغت کے متعلق ہے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں -

یہ مضمون لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد اردو جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی کا ہے؟ - مسعود حسن صاحب کو ادبیات اردو سے جو خاص شغف ہے اس کا ثبوت ان کی شایع کردہ کتابوں اور رسالہ ادب کے صفحات سے ملتا ہے اُن کا اردو کا کتب خانہ بھی جیسا کہ مجھے خود اُن کی زبانی معلوم ہوا تھا اچھا خاصہ ہے؟ اور اس مرتبہ انہوں نے اُس میں سے اردو کے متعلق لغات کا حال لکھا ہے؟ اگرچہ مضمون نا مکمل ہے؟ لیکن چونکہ وہ تاریخ و سنہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے ؟ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تیرھویں صدی کے ربع اول تک کی تصانیف پر مشتمل ہے؟ اس لیے ایک طالب علم اُس کو اُس زمانہ تک کی لغاتی تصانیف کے لئے ایک مکمل فہرست سمجھ سکتا ہے اور اسی

لیے میں اس میں اُن کتابوں کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جن کا اس میں ذکر نہیں ہے -

پروفیسر صاحب موصوف کی اس رائے سے مجھے کامل اتفاق ہے کہ اگر ایک ایک صاحب علم ایک ایک شعبے کو لے لے تو بہت جلد اردو تصانیف کی ایک مکمل فہرست مرتب ہو سکتی ہے ؟ اُنھوں نے یہ تحریک ہی نہیں کی ہے بلکہ اس مضمون کو لکھ کر اس طرف عملی قدم بھی بڑھایا ہے ؟ امید کہ دوسرے مستند بزرگ اس طرف توجہ کرینگے -

(۲)

خالق باری کے متعلق اس وقت تک جتنے مضامین شائع ہو چکے ہیں ؟ ان میں سب سے بہتر و مدلل مضمون جناب پروفیسر محمود شیرانی کا تھا جو پہلے رسالہ اردو میں شائع ہوا اور اس کے بعد اُن کی مشہور تصنیف "پنجاب میں اردو" کا جزو بن گیا ؟ - پروفیسر مسعود حسن صاحب نے خالق باری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شیرانی کے شکوک کی طرف بالکل توجہ نہیں کی ہے اور جب تک ان شکوک کو رفع نہ کیا جائے یہہ کتاب یقینی طور سے خسرو دہلوی کی نہیں کہی جا سکتی؟ مجھے امید ہے کہ ہمارے لائق ادیب بہت جلد اس طرف توجہ کرینگے -

اسی سلسلے میں دونوں فاضل استادوں نے عبدالواسع ہانسوی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے؟ پروفیسر شیرانی اس کو نصاب سہ زبان کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور پروفیسر مسعود حسن نے اُسے غرائب اللغات کے نام سے یاد کیا ہے - پروفیسر مسعود حسن کو اگرچہ یہ کتاب نہیں ملی ہے ؟ لیکن چونکہ ایسے لغات کا پتہ چل گیا ہے؟ جن میں اس کا ذکر ہے ؟ اس لیے میرا خیال ہے کہ ان کا بتایا ہوا نام صحیح ہے -

لیکن میرے لیے ایک دوسری مشکل بھی آن پڑی ہے؛ وہ یہ ہے کہ میرے پاس ایک کتاب کا قلمی نسخہ ہے؛ جو خالق باری کے طرز پر لکھی گئی ہے؛ اور اُن کی ترتیب عموماً یہ ہے کہ پہلے وہ عربی؛ پھر فارسی اور آخر میں ہندی یا اردو لفظ آتا ہے؛ اور پروفیسر شیرانی نے خالق باری اور رسالہ سہ زبان کے الفاظ کا مقابلہ کرنے میں جو الفاظ دیے ہیں؛ اُن کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عبدالواسع ہانسوی کی تصنیف نصاب سہ زبان ہے؛ مثلاً نصاب سہ زبان نے اعضائے انسانی کے یہ ہندی نام دیے ہیں —

پیشانی—ماتھا؛	آنکھہ—لہوچن
دیدہ—نتری؛	کان—سرون
گال—کپول؛ پہلو پسلی	وغیرہ وغیرہ

اب میرے نُسخے میں بھی یہی الفاظ ہیں —

۱—جبہ؛ پیشانی؛ ماتھا کہے

۲—عین؛ چشم؛ لہو چن چان

۳—قرہ؛ مردمک؛ پتری چان

۴—اذن؛ گوش سرون؛ پہچان

۵—خد رخسار کپول چوکھے

۶—جنب؛ پہلو؛ پسلی مان

میں نے طوالت کے خوف سے صرف ضروری مصرعہ ہی نقل کر دیا ہے؛ اس کے علاوہ پروفیسر سیرانی کا بیان ہے کہ —

"تناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کر دیا ہے؛ مثلاً لغات اعضائے انسانی؛ اجناس غلہ؛ میوجات؛ ترکاریہا و گلہا؛ ادویات وغیرہ وغیرہ؛ خاتمہ میں مصادر مشہورہ و غیر مشہورہ دے دیے ہیں۔"

میرا نسخہ بھی بالکل اسی طرح مرتب کیا گیا ہے ؟ اور اس کے آخر میں بھی مصادر ہیں ؟ اس لیے میرا پہلا خیال یہ ہوا کہ یہ وہی کتاب ہے ، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے کتاب کے اوپر ، سر ورق پر ؟ اور آخر میں اس کتاب کو مصادراللطائف کے نام سے موسوم پایا ؟ - میں نے سمجھا کہ ممکن ہے کہ اس کا نام غلط لکھہ گیا ہو ؟ لیکن خاتمے کی عبارت نے جو کاتب کے قلم سے ہے ؟ مجھے اور زیادہ مشتبہ بنا دیا ؟ - کہ اس میں اس کتاب کی تصنیف کا سہرا کسی دوسرے ہی "فاضل اجل" کے سر بندھا ہوا ہے ؟ وہ عبارت یہ ہے —

"تمام شد نسخہ مصادراللطائف عرف خان پہچان تصنیف مُلّا پیر محمد صمدانی قدس‌اللہ سرہ ، راقم‌الحروف احقرالعباد محمد عبدالغنی عفی عنہ قوم انصاری معروف بہ لقب لاہوری ؟ ساکن سہسوان قاضی محلہ متصلہ محلات لاہوری محلہ ؟ جہت خواندن برخوردار طالب علم مطہر علی نوشتہ شد"

ان حالات میں ان دو صورتوں کے سوا کسی تیسری کی گنجائش نہیں ، یا تو یہ کوئی دوسری کتاب ہے یا پھر کاتب نے کتاب و مصنف دونوں کے نام غلط لکھہ دیے ؟ - بہر حال اس خیال سے کہ ناظرین ہندستانی میں سے کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈال سکیں اس کے متعلق کچھہ مزید معلومات بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں -

اس کتاب میں ۳۰۹ شعر ہیں ، ان میں سے ۲۴۵ اشعار اسمائے ذات و صفات کے متعلق ہیں اور ۶۴ اشعار میں مصادر ہیں - پہلے حصے کا پہلا شعر یہ ہے —

صمد پاک برتن جان نبی تعمیر نسیتہ نکھان

چونکہ ہر مصرعے میں تین الفاظ کا التزام رکھا گیا ہے اس لیے مصادر میں بھی یہ کیا گیا ہے کہ پہلے مصرعہ میں تین مصدر دیے ہیں اور دوسرے میں علی الترتیب اُن کے معنی ؛ مثلاً

کردن ، گفتن شنیدن ، جان

کرنا ، کہنا ، سننا ، مان

اسی سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ہے کہ پروفیسر شیرانی صاحب عبدالواسع کو عہد اورنگ زیب کا مصنف بتاتے ہیں ؛ پروفیسر مسعود حسن صاحب کوئی تاریخ نہیں دیتے البتہ یہ بتانے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ وہ عجائب اللغات کی تصنیف کے وقت زندہ تھے ؟ - ان کے متعلق ایک مفصل مقالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی روداد سنہ ۱۸۸۷ع صفحہ ۱۲۱ میں شایع ہوا تھا ؛ لیکن افسوس کہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں - *

(۳)

ایک دوسری کتاب اللہ خدائی کا پروفیسر صاحب نے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ نام مصنف نے خود رکھا ہے ، اور کریما و مامعیما اور خالق باری کی طرح اس کے ابتدائی یہ الفاظ نہیں ہیں - میرے پاس اس قسم کی ایک کتاب کا دریدہ ورق ہے ، جس کی ابتداء بالکل اسی طرح ہوتی ہے ؛ اور کیا عجب ہے کہ خالق باری کی طرح اس کا نام بھی اللہ خدائی ہو ، - اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں —

اللہ خدا کردار - الخالق آفریننده سرجنہار

الرسول پیغمبر بسیتہ - الاصحاب یاران مسیتہ

الدنیا گیتی سنسار - الاحمق نادان گوار

الجنت بہشت سرگ - السقر دوزخ نرک

* میرا خیال ہے کہ اپنے پہلے شعر کی وجہ سے یہ کتاب صمد باری یا صمد نامہ کے نام سے مشہور ہو گئی ہے -

الیوم روز دیس - الشعر موی کیس

اللیل شب رات - القول گفتار بات

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس میں بھی عربی ' فارسی ' اور اُردو کی ترتیب باقی رکھی گئی ہے -

لیکن ان سب سے اہم چیز جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک اور ہی لغت ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی دریافت کی عزت مجھے ہی ملی ہے ' اس وقت تک ہم کو جتنے لغت ملے ہیں ' وہ سب کے سب ہندی سے متعلق تھے پھر بعض مناسب الفاظ کی حیثیت سے مرتب تھے جیسے صنعت باری وغیرہ اور بعض صرف قافیہ کی رعایت سے لیکن جو لغت میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ عربی فارسی اور ہندی کا نہیں بلکہ عربی فارسی اور گجراتی کا ہے ' دوسرے اس کی ترتیب صراح وغیرہ کے طریقے پر آخری حرف کے اعتبار سے کی گئی ہے ' یعنی پہلے اُن الفاظ کو لکھا گیا ہے جو الف پر ختم ہوتے ہیں ' پھر ب ' پھر پ علی ہذا القیاس ' لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو بات ہے ' وہ یہ کہ ترتیب میں عربی و فارسی کے الفاظ کو اصل لغت نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ گجراتی الفاظ کو ' ان سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ہر لفظ کی تشریح سے حاشیہ بھرا ہوا ہے اور یہ حاشیہ تمام تر عربی میں ہے -

---

اردو کی پیدائش کے متعلق جو اسباب بیان کیے جاتے ہیں اُن کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو گجرات ہی کا صوبہ ہندستان کا وہ صوبہ ہے ' جو سیاسی ' مذہبی ' اور تجارتی حیثیت سے مرکزیت رکھتا تھا ' اس لیے میرا خیال ہے کہ اردو کی اولین بنیاد اسی صوبے میں ڈالی گئی - اور اس کے ثبوت میں میرے پاس بہت کچھ دلیلیں

موجود ھیں، جن کو کسي وقت مفصل طور سے پیش کروں گا ۔ میرا خیال ھے کہ، مرثیہ مثنوي اور مذھبي شاعري میں گجرات کا ذخیرہ بہت زیادہ ھے اور ھندستاني اکیڈیمی کا فرض ھے کہ وہ اس کی حفاظت و اشاعت کا سامان کرے ۔

موجودہ نسخہ ۱۱۵۱ ع کا لکھا ھوا ھے، بدقسمتي سے نہ کتاب ھي کا نام معلوم ھو سکا اور نہ مصنف کا ۔ کاتب نے خاتمہ پر یہ عبارت لکھي ھے :—

"تم الکتاب بعون اللہ الکریم، علی ید الفقیر سیخ عطاء اللہ بن سیخ میران في رابع عشر من الجمادي الثاني سنہ ۱۱۵۱ احدي و خمسون ومایۃ بعد الالف من الہجرۃ النبویہ صلی اللہ تعالی علیہ و صحبہ اجمعین" ۔

اسکے بعد فارسی کے چھہ شعر ھیں، جو بظاھر کاتب کي طرف منسوب کیے جاسکتے ھیں ۔ لیکن آخری شعر میں جو دعوی کیا گیا ھے وہ اس خیال کو مشتبہ بنادیتا ھے، شک کي دوسری وجہ یہ بھي ھے کہ جو اشعار یہاں پر لکھے ھیں، وہ کاتب خاتمہ کتاب پر نہیں لکھتے، اُن کے چند مقرر شعر ھیں جو ھر قلمی نسخوں کے مطالعہ کرنے والے کو بہت جلد یاد ھو جاتے ھیں، اشعار یہ ھیں :—

ختم مي گردد کتاب اے دوستاں
بے نظائر در فصول داستاں (دلستان)

گر خطائے رفتہ است اندر کلام
ھست امیدم ز اخلاقِ کرام

کز سخنشا یند از روي کرم
نگرند اندر خطائے بیش و کم

التماسِ دیگر است باصد رجا
از همه یاران با صدق و صفا
چون رسند ایں جا مرا یاد آورند
فاتحه خوانند و آنگه بگذرند
انچه آمد در ضمیرم اے کبار
وا نمودم حبهٔ از صد هزار

یہ کتاب ۷۱ اوراق پرمستمل ہے - ہر صفحہ پر نو مصرعے ہیں لیکن بہت سے مصرعے حاشیہ پر بھی ملتے ہیں ، اس کے تمام اشعار کی موجودہ مقدار تقریباً ۷۰۰ ہوتی ہے - ہر لفظ کے متعلق عربی میں حاشیے پر تشریح کی گئی ہے - شارح نے بعض جگہ اپنا نام ابراہیم دیا ہے - چند جگہوں پر حاشیہ فارسی میں بھی ہے -

اس لغت کو ہندی یا اردو نہ کہنے کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ دئے گئے ہیں وہ تقریباً ۹۰ فی صدی وہ الفاظ ہیں جو صاف گجراتی میں بولے جاتے ہیں - دوسرے شارح نے بعض جگہ خود تشریح کردی ہے کہ ہندی میں اس کا دوسرا نام ہے ، یہاں پر ہم کو یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اردو کا قدیم تر نام گجری ، گوجری یا بولی گجراتی بھی ہے ، اور اس لغت میں جو الفاظ ہیں وہ اسی گجری زبان کے ہیں اس لیے فی صدی بقیہ الفاظ یہاں کے ہندوؤں کی گجراتی میں نہیں ملتے اور اسے وہ مسلمانوں کے اثر کا نتیجہ بتاتے ہیں -

اس کتاب کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے —

باب الالف

الالله پرستیده پوجیا
المعلوم دانستهٔ بوجھیا
المحمد ستوده بکھانیا
المعروف شناخته پچھانیا

اور خاتمه ان الفاظ پر هے :—

العطارد اشاد گاندھي
الهدوة باد گرد آندھي*
الرمکة مادیان گھوڑي
الرداء چادر پچھوڑي

یه کتاب میرے ایک دوست مسٹر عبداللہ عریضي بي-اے کے کتب خانے میں هے جب میں نے اس صوبے کي ورناکولر سوسائٹي کے صدر دیوان بہادر دھرو صاحب کو یه کتاب دکھائي تو وہ بہت خوش هوئے انکي تحریک پر میں اسے اڈت کر رها هوں اور گجراتي ورناکولر سوسائٹي اس کو شایع کریگي -

اس قسم کے دوسرے رسالوں پر اگر کبھي موقع ملا تو عرض کروں گا -

(۵)

تحفةالهند کے متعلق مجھے صرف اتنا عرض کرنا هے که آج سے برسوں پہلے علامه شبلي رح نے بھي اس کا ایک نسخه دریافت کیا تھا

---

* کاش اگر مرحوم زندہ هوتے تو دیکھتے که لوگوں نے اُن سے سیکڑوں برس پہلے هي سے گاندھي و آندھي کا قافیه باندھه رکھا هے -

اور اس پر الندوہ میں مضمون بھی لکھا تھا پروفیسر صاحب نے جس لغت کا ذکر کیا ھے - وہ یقینی اسی کا جزو ھے -

(۶)

یوروپین مصنفین کے متعلق اُنھوں نے لکھا ھے کہ اُن کا ماخذ مولانا عبدالحق صاحب کا فاضلانا مضمون ھے ؟ - اس سلسلے میں ؟ میں اُن کی توجہ سر جارج گریرسن کی شائع کردہ "ھندستان کی لسانی پیمایش جلد ۹ حصہ اول (Linguistic Survey of India) کی طرف مبذول کرانا چاھتا ھوں جہاں اُنھوں نے نہایت محنت سے اُن تمام کتابوں کو جمع کر دیا ھے جو اھل یورپ اور دوسرے لوگوں نے اس سلسلے میں لکھی ھیں ؟ اس طویل فہرست میں اُن کو بہت سے نام ملجائیں گے -

اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ھے کہ جب جہانگیر نے انگریزوں کو تجارت کی اجازت دیدی اور اُنھوں نے سنہ ۱۶۱۱ع میں سورت میں اپنا کار و بار شروع کیا تو مقامی زبان کو سیکھنے کے لیے سنہ ۱۶۳۰ع میں اُنھوں نے ایک لغت مرتب کیا جس کا حال گریرسن نے ان الفاظ میں بیان کیا ھے —

"Mr. Quaritch, in his Oriental Catalogue published in 1887, mentions a Ms Dictionary then in his possession (No. 34,724 in the Catalogue) which he doubtfully dates as "Surat about 1030"

This is a Dictionary of Persian Hindustani, English and Portuguese, and he describes it as a great curiosity as being the first work of its kind It was probably compiled for the use of the English Factory at Surat. The Persian is given in Native and in Roman letters, the Hindustani in Gujrati and Roman letters. It is a small folio manuscript on Oriental tinted paper"

اس کے علاوہ اٹھارویں صدی کے بعض طبی لغات یا بحری لغات جو انگریزی ، لاطینی ہندی (ہندستانی) اور عربی الفاظ پر مشتمل ہیں کتب خانہ الاصلاح دیسنہ (ضلع پٹنہ) میں موجود ہیں ، اگر میرا وہاں جانا ہوا تو انشاءاللہ اُن کے متعلق مفصل طور سے کچھ عرض کر سکوں گا -

مجھے امید کامل ہے کہ پروفیسر موصوف ان معروضات پر غور فرمائیں گے ممکن ہے کہ اردو زبان کے مختلف لغتوں کا جو گلدستہ وہ تیار کر رہے ہیں ، اُس کی تعمیر و تکمیل میں یہ چند ٹکھڑیاں بھی کام آجائیں -

---

اردو لٹریچر کی تاریخ

(مصنفہ مسٹر رام بابو سکسینا)

از مرزا احسان احمد، بی - اے ، ایل ایل ، بی (علیگ)

اس میں شبہہ نہیں ، کہ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھہ کر ایک قابل قدر علمی خدمت انجام دی ، لیکن چونکہ وہ نفس اول تھا ، اس لئے اس میں اکثر خامیاں رہ گئیں ، یعنی اُردو شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی ؟ کیا کیا ادوار قائم ہوئے ؟ مُلکی اور قومی حالات نے اس پر کیا کیا اثر ڈالے ؟ خود اس نے ملک اور قوم کو کس حد تک متاثر کیا ؟ اس کے ارتقاے تدریجی کے کیا کیا دور ہے ؟ اور ہر دور کی خصوصیات کیا تھیں ؟ اس نے کیا کیا قالب بدلے ؟ کیا کیا صورتیں اختیار کیں ؟ اِن سوالات کا جواب آب حیات سے بمشکل مل سکتا ہے ، حالانکہ یہی چیزیں اُردو لٹریچر کی تاریخ کا اصلی سرمایہ ہیں ، محض شعرا کے لطائف و طرائف سے ایک نکتہ شناس نگاہ کو تسلی نہیں ہو سکتی -

آب حیات کے بعد بھی جو اکثر تذکرے عالم وجود میں آئے ، افسوس ہے ، کہ ان میں بھی یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے ، یعنی تحقیق و تنقید سے بہت کم کام لیا گیا ہے ، جس کے بغیر کوئی تذکرہ تاریخی حیثیت سے قابل قدر نہیں ہو سکتا ، شعرالعجم کی امتیازی خصوصیت یہی ہے ، کہ بجاے لطائف و طرائف کے اس میں خصوصیات شاعری اور ان تمام اسباب و علل پر جن سے شاعری متاثر ہوتی ہے ، زیادہ بحث کی گئی ہے ، چنانچہ اس کو پڑھنے کے بعد فارسی شاعری کے ارتقاے تدریجی کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے ،

اس بنا پر ایک ایسے تذکرے کی سخت ضرورت تھی جس میں اُردو لٹریچر کے عہد بہ عہد ترقی کا ہر ممتاز پہلو نمایاں کیا جائے ؟ اور شعرا کی خصوصیات کلام پر تنقیدی نظر ڈالی جائے ہم کو نہایت مسرت ہے ؟ کہ ہمارے فاضل دوست مسٹر رام بابو سکسینہ نے اس گرانقدر تصنیف میں اس کمی کی ایک بڑی حد تک تلافی کردی ہے -

یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس کے دو حصے ہیں ؟ جو ۱۹ ابواب پر مشتمل ہیں ؟ پہلے چودہ ابواب میں شاعری کے مختلف مدارج ترقی پر تحقیقی حیثیت سے نظر ڈالی گئی ہے ؟ اور نہایت مرتب طریقے پر عہد بہ عہد کی خصوصیات اور انقلاب و تغیّر کا تذکرہ کیا گیا ہے ؟ اس کے بعد تین ابواب میں اُردو نثر کی ابتدائی حالت اور اس کی عہد بہ عہد ترقیوں کا ایک مسلسل اور مربوط بیان ہے ؟ اٹھارویں باب میں اُردو ڈراما کی مختصر تاریخ ہے ؟ اور آخری باب میں اُردو لٹریچر کی ترقی اور کارناموں پر ایک عام تبصرہ کیا گیا ہے ؟ غرض پوری کتاب پڑھنے کے بعد اس امر کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے ؟ کہ اُردو کی ابتدا کیونکر اور کب ہوئی ؟ اس نے کس ماحول میں پرورش پائی ؟ شاعری کے کیا کیا رنگ قائم ہوئے ؟ ہر دور کی خصوصیات کیا کیا تھیں ؟ نثر کی ابتدائی حالت کیا تھی ؟ اس کے کیا کیا ادوار بدلے ؟ علمی حیثیت سے زبان میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں ؟ غرض مسٹر رام بابو کے؟ اس آئینہ تاریخ میں اُردو لٹریچر کے جمال ارتقا کے وہ مختلف جلوے نظر آسکتے ہیں ؟ جن سے اور تذکرے خالی ہیں -

تصنیف زیر تنقید کی ایک بڑی خوبی تسلسل بیان؟ اور ترتیب خیال ہے ؟ جس کی وجہ سے اردو لٹریچر کے سلسلۂ تاریخی کی تمام کڑیاں سامنے آجاتی ہیں؟ اور پڑھنے والے کو جس ترتیب کے

ساتھ جس قسم کی معلومات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟ اسی ترتیب کے ساتھ اسی محل اور موقعے پر اسکو ملتی جاتی ہیں؟ اس خصوصیت کا صحیح طور پر اندازہ کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے؟ کہ جس طرح لائق مصنف نے مختلف ابواب کی تقسیم کی ہے؟ اس کو مختصر الفاظ میں ظاہر کردیا جائے۔

سب سے پہلے زبان کی تاریخ ابتدا پر بحث کی گئی ہے، یعنی اس کا اصلی منبع وجود کیا ہے؟ فارسی اور دیگر مغربی زبان نے اس پر کیا کیا اثر ڈالے؟ مولوی محمد حسین آزاد کے نزدیک اُردو کا ماخذ برج بھاسا ہے، لیکن فاضل مصنف نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے، اور یہ دکھلایا ہے، کہ اُردو کا گہوارۂ وجود در اصل وہ خاص دیسی زبان ہے، جو عام طور پر دلی اور میرٹھ کے اکناف و جوانب میں رائج تھی، برج بھاسا متھرا اور اُس کے قُرب و جوار میں مستعمل تھی؟ علاوہ فارسی کے انگریزی اور پرتگالی زبانوں نے اردو کو ایک بڑی حد تک متاثر کیا، سنہ ۱۵۴۰ ع میں پرتگالیوں نے ہندستان کے خاص خاص بندرگاہوں پر مستقل حیثیت سے قبضہ کرلیا تھا، اور مشرق کے ممتاز تجار میں ان کا شمار ہوتا تھا، ملک کے اندر ان کی مختلف آبادیاں قائم تھیں، حکومت، تبلیغ مذہب اور تجارت کے تعلق سے ان کو عوام سے اختلاط اور راہ و رسم پیدا کرنے کا موقعہ ملا، سب سے پہلے پرتگالیوں نے ہندستان میں مغربی چیزوں کو رو شناس کرایا، اس طور پر اردو لغت میں خفیف رد و بدل کے ساتھ بہت سے جدید الفاظ کا ذخیرہ جمع ہوگیا، مثلاً آلپین (Alpin) الماری (Almara) بوتل (Bottle) ارغنون (Organ)، کارتوس (Cartridge) صابون (Soap) کوچ (Sofa) تولیا (Towel) گارد (Guard)، بالتی (Bucket) کمرہ (Room) وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد فاضل مصنف نے اُردو لٹریچر پر ایک عام تبصرہ کیا ہے، جس سے مختلف مدارج ترقی کا ایک اجمالی خاکہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، جس کی تفصیل ابواب ما بعد میں کی گئی ہے، اُردو شاعری کی عام خصوصیات پر بحث کرنے کے بعد اس کو مختلف دوروں میں تقسیم کیا ہے، اور ہر دور کی خصوصیات پر محققانہ نظر ڈالی ہے، دکن کے ابتدائی دور شاعری کے تذکرے کے بعد دلی کے دور شاعری کو لیا ہے، اور اس کو تاریخی اصول پر مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے، جو حسب ذیل ہے :—

پہلا دور — آرزو اور حاتم -

دوسرا دور — میر اور سودا -

تیسرا دور — مصحفی اور انشا -

چونکہ اس دور کے بعد شاعری کا مرکز لکھنؤ کی طرف منتقل ہو گیا، اس لیے اس کے بعد تاریخی حیثیت سے لکھنؤ کے دور شاعری کا تذکرہ ضروری تھا، جس کو فاضل مصنف نے حسب ذیل تقسیم کیا ہے:—

ناسخ اور انیس کا دور، واجد علی شاہ کا دور -

چونکہ مرثیہ گوئی کو لکھنؤ کی سر زمین سے خاص تعلق رہا ہے، اس لئے اسی سلسلہ میں فاضل مصنف نے ایک مستقل باب میں مرثیہ اور مشاہیر مرثیہ گویوں مثلاً انیس، دبیر وغیرہ پر تبصرہ کیا ہے -

نظیر اکبرآبادی اور نصیر دہلوی کو چونکہ کسی خاص اسکول سے تعلق نہ تھا، اس لیے ان کی خصوصیات شاعری اور حالات کا تذکرہ ایک علیحدہ باب میں کیا گیا ہے -

اس کے بعد دلی کے خزاں رسیدہ چمنستان شاعری میں دوبارہ بہار آگئی، اور کچھ ایسے ارباب کمال پیدا ہو گئے جن کی سحر طرازیاں

اُردو ادب کے لئے سرمایۂ ناز ہیں، اس لئے اس کو دلی کی شاعری کا چوتھا دور قائم کر کے لایق مصنف نے ممتاز ترین شعرا، مثلاً غالب، ذوق وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

آخری دور کا تعلق رامپور اور حیدرآباد سے ہے، یہ زمانہ امیر اور داغ کی زمزمہ سنجیوں کا ہے، جن کی خاموشی کے بعد اردو شاعری میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوتا ہے، جس کے علمبردار آزاد اور حالی ہیں، جن کی شاعرانہ جدت طراریوں کو لایق مصنف نے ایک علیحدہ باب میں دکھلایا ہے۔

اس کے بعد اُردو نثر کا حصہ شروع ہوتا ہے، جس کی تاریخ اربعا کے فاضل مصنف نے تین دور قائم کئے ہیں۔ پہلا ابتدائی دور جس کا خاص تعلق کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ہے، یعنی جب انگریزوں کا تسلط ہندستان میں قائم ہوا اور ان کو اغراض حکومت کے لئے دیسی زبان کی تعلیم و اشاعت کے طرف خاص توجہ کرنی پڑی، دوسرا دور غالب اور سر سید احمد خاں کا ہے، جب کہ اردو زبان نے ایک خاص علمی اور ادبی حیثیت اختیار کی، اور تیسرا دور سرشار اور سرور کا ہے، جب کہ اُردو ناول اور افسانہ نگاری کو ترقی ہوئی۔

اس کے بعد لایق مصنف نے ایک مستقل باب میں اُردو ڈراما کی مختصر تاریخ لکھی ہے، اور آخری باب میں اُردو لٹریچر کی عام ترقی کا تذکرہ کیا ہے، جو در اصل ابواب ما سبق کا خلاصہ ہے۔

اس تفصیل سے آپ آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں، کہ لائق مصنف نے اپنے موضوع بحث کے مختلف پہلوؤں کو کس حسن ترتیب کے ساتھ تعین کیا ہے، نہ صرف ترتیب و تقسیم کی

خوبی کا نتیجہ ہے، کہ آخر تک پڑھنے والے کی توجہ ہٹنے نہیں پاتی، اور نہ اس کے دماغ میں کوئی انتشار پیدا ہونے پاتا ہے۔

علاوہ حسن ترتیب کے اس تصنیف کی دوسری نمایاں خصوصیت تحقیق و تنقید ہے، جو در اصل اس قسم کے تاریخی تذکروں کی جان ہے، لائق مصنف نے صرف شعرا کے عام ادبی حالات اور واقعات زندگی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی خصوصیات کلام پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ فاضل مصنف صرف افسانہ نگار نہیں ہے، بلکہ تنقیدی نظر بھی رکھتا ہے، ممکن ہے کہ فاضل مصنف کی تمام رایوں سے کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ فاضل مصنف نے اس نازک فرض کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے، اور جس نکتہ سنجی کے ساتھ اردو شاعری کے محاسن و معائب پر تنقید کی ہے، وہ موجودہ نرم ادب کی خاص توجہ کی مستحق ہے۔

لائق مصنف کے نزدیک فارسی کی کورانہ تقلید نے اردو شاعری میں متعدد معائب پیدا کردیے، قدیم شعرا کے لیے نہ تا ممکن تھا۔ کہ وہ فارسی زبان کو بالکل نظر انداز کر دیتے، لیکن انھوں نے جوش تقلید میں اس حد تک غلو سے کام لیا کہ ہندستان کو بالکل بھول گئے، اور اپنی خاص انفرادی حیثیت قائم نہ رکھ سکے، چنانچہ ہر ہر قدم پر فارسی شاعری کے دست نگر بن گئے، بہار کا منظر کھینچتا ہے، تو وہی ایران کے گل و بلبل، شمشاد و قمری، نرگس و سوسن، سنبل و ریحان کا خواب دیکھتے ہیں، لیکن چمن زار ہند میں اُن کو کوئی رنگینی نظر نہیں آتی، عشق و محبت کی نرم آرائی مقصود ہے، تو صرف لیلیٰ و مجنوں،

فرہاد و سیرس ؟ کے پُر گداز واقعات ان کے حُسن خیال کی ارایس کا سرمایہ ہیں ؟ ہندستان کے جانباز محبت کا نام تک نہیں آتا ؟ شجاعت اور بہادری کی مثالیں نہیں کرتی ہیں ؟ تو نہ رستم ؟ افراسیاب اور اسفند یار کے اے ملک کے بہادروں کی مطلق خبر نہیں ؟ تماشی اور صنعت گری کا نمونہ دکھاتا ہے ؟ تو صرف مانی اور بہزاد کی مصوری ان کی تمام تشبیہات کا ماخذ ہے ؟ عالم آب کا سماں کھینچتا ہے ؟ تو صرف جنگوں اور سنگوں کی موجیں اُن کی جسم تخیل کے سامنے رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ؟ لیکن گنگا اور جمنا کی روانی ان کی تخیّلات میں کوئی تموّج پیدا نہیں کر سکتی ؟ بلند پروازی کے جوش میں ان کو صرف کوہ لوند کی چوٹیاں نظر آتی ہیں ؟ لیکن ان کی فکر ہمالہ کی فلک بوس چوٹیوں سے کبھی بھولکر بھی نہیں ٹکراتی ؟ ہندستان کے بادشاہوں کو عدل و انصاف میں نوشیرواں سے ؟ سخاوت میں حاتم سے ؟ ترک و احتشام میں قیصر و سکندر سے تشبیہ دیجاتی ہے ؟ غرض اردو کی قدیم شاعری کا جو کچھ سرمایۂ خیال ہے ؟ وہ صرف فارسی شاعری کی صدائے بار گشت ہے ؟ اس غلامانہ تقلید نے اردو شاعری سے واقعیت کے عنصر کو بالکل فنا کر دیا ؟ اور طبیعتیں صرف فرضی اور خیالی نفس آرائیوں کی خوگر ہو گئیں ۔

ان حالات نے اردو شاعری کو جادۂ اصلیت سے بالکل منحرف کر دیا ؟ شعریت کی روح فنا ہو گئی ؟ ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین کے اعادۂ پیہم نے دل و دماغ کو جذب ؟ تنوع ؟ اور لطافت سے خالی کر دیا ؟ صنائع و بدائع ؟ دور از کار تشبیہات و استعارات ؟ مبالغہ آفرینی ؟ قافیہ بندی وغیرہ یہی جدید شاعری کا معیار کمال سمجھی جانے لگیں ؟ دائرہ خیال صرف چند مخصوص مضامین تک محدود

ہو کر رہ گیا؟ اندازِ بیان میں کوئی ندرت یا جدت باقی نہ رہی صرف ایک ہی موضوع تھا؟ جس پر مختلف طریقوں سے طبع آزمائیاں کی جاتی تھیں؟ ایک ہی جادہ تھا؟ جس کو حقیقت پرمیم و تغیّر کے ساتھ پیس کیا جاتا تھا؟ ایک ہی شاہراہ تھی؟ ایک ہی منزل تھی؟ ایک ہی قسم کے مسافر تھے؟ ایک ہی طرح کی رفتار تھی؟ حالانکہ تخیّلات کی وسیع اور گوناگوں شاہراہیں چاروں طرف کُھلی ہوئی تھیں؟ پورا صحیفۂ کائنات معہ اپنی تمام لا زوال رنگینیوں کے سامنے تھا؟ لیکن ایک دماغ جو مدت سے مصنوعی جذبات کے ادا کرنے کا عادی ہوچکا تھا؛ اس پر جمالِ حقیقت کی شعاعیں کیونکر پرتو افگن ہو سکتی تھیں؟ عرضِ فارسی کی تقلید کی بندشوں نے اردو شاعری کو کچھ اس طرح جکڑ دیا؟ کہ اس کو اپنے فطری نشو و نما کے لیے مطلق موقعہ نہ مل سکا؟ اور وہ تمام معائب جو اس قسم کی غلامانہ تقلید کے ضروری نتائج ہیں؟ اس میں پیدا ہوگئے؟ یعنی تصنع و تکلف، تنگ خیالی؟ ابتذال؟ پستی؟ لطف اور بلند جذبات کا فقدان؟ حقائق سے گریز؟ منافقانہ ذہنیت؟ لفظ پرستی؟ سطحیت وغیرہ جن کی وجہ سے اردو شاعری محض ایک بے حس اور بے جان مشین بن کر رہ گئی؟ جس کی حرکت صرف چند پامال مقررہ قواعد کے پل پر قائم تھی۔

یہ خیالات در اصل فاضل مصنف کے ہیں؟ جن کو میں نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے؟ مجھکو ان معائب کے وجود سے انکار نہیں؟ تقلید اور کورانہ تقلید فی نفسہ ایک مبتذل حرکت ہے؟ اس لیے اس کے آداب و نتائج کا مبتذل ہونا ضروری ہے؟ لیکن ہمارے فاضل دوست کی یہ رائے صحیح نہیں؛ کہ قدیم شعرا نے "فارسی کی نامانوس اور شاندار ترکیبوں کے سامنے پھانسا کی

سیرینی اور براکت کو نظر انداز کر دیا ؟؟ ممکن ہے ؟ کہ فارسی شاعری میں اس قدر بلند ، اور سریعانہ جذبات نہ ہوں ؟ جتنا کہ عرب کی شاعری میں پائے جاتے ہوں ؟ یا اس میں عاشقانہ احساس کی اس قدر شدت اور گرمی نہ ہو ؟ جتنی کہ ہندی میں محسوس ہوتی ہو ؟ لیکن انصاف یہ ہے کہ جہاں تک زبان کی شیرینی ، اور براکت کا تعلق ہے ؟ دنیا کی کوئی زبان مشکل سے فارسی کا مقابلہ کرسکتی ہے ؟ اردو شاعری میں جو کچھ شیرینی لطافت اور رنگینی ہے ؟ وہ صرف دو فارسیت کا درتو فیض ہے ؟ البتہ غالب کی سی بعض طویل اور نامانوس ترکیبوں کے استعمال سے ضرور احتراز کرنا چاہئے مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اگر آیا کی جگہ پر آمد کر دیا جائے تو پورا شعر فارسی بن جاتا ہے ؟ مثلاً دور حاضر کے ایک مشہور بزرگ فن کا شعر ہے ؟

گویا شب فراق میں سر سے تا قدم
آئینۂ تحمل ایذائے درد تھا

اگر لائق مصنف کا منشاء اسی قسم کی نا ہموار اور نا موزوں ترکیبوں سے ہے ؟ تو بے شبہہ مجھ کو ان کی رائے سے اختلاف ہے ؟ اردو زبان کو عربی اور فارسی کے معلق اور دقیق الفاظ و تراکیب سے جہاں تک ممکن ہو پاک کرنا ہمارے شعرا کا فرض اولین ہونا چاہئے ؟ لیکن فارسیت کو قطعاً خارج کر دینا در اصل اردو شاعری کی رنگینی لطافت ؟ اور شیرینی کو عارف کرنا ہے -

جو لوگ فارسیت کا ذوق صحیح رکھتے ہیں ؟ ان کے کلام سے اس امر کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے ؟ کہ فارسی کی لطیف اور نازک ترکیبیں شعر میں کیا حُسن اور جوبی پیدا کر دیتی ہیں ؟ بعض اوقات ایک مختصر سی نازک ترکیب پورے شعر میں جان ڈالدیتی ہے ؟ مثلاً

لُٹا دے دولتِ کونین اور میرے لیے

بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے ؟

اور کیجیے صرف ایک تبسم عاجز نواز کی پُر لطف ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو کس قدر پُر کیف اور دلکش بنا دیا ہے !

چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں —

اس جوئبار حسن سے سیراب ہے فضا ؟

روکو نہ اپنی نرگس مستانہ وار کو ؟

کرم کچھ آج ہے ساقی کا وہ طرب انگیز ؟

کہ جرعہ جرعہ ہے موج نرنمِ سحری ؟

ہم اس سے بے خبر نہیں ؟ کہ سادگی ؟ زبان کی ایک بڑی خوبی ہے ؟ لیکن ہم اُس کے قائل نہیں ؟ کہ جو الفاظ اور عام محاورے روزانہ گفتگو میں بولے جائیں ؟ وہی شعر میں بھی استعمال کیے جائیں ؟ شاعر عام سطح سے ایک بلند تر ہستی ہے ؟ اُس کے تخیلات غیر معمولی ہوتے ہیں ؟ وہ جسک فلسفیانہ تقریر نہیں کرتا ؟ اس کا مطمع نظر قلب انسانی کے لطیف احساسات کو مشتعل کرنا ہے جس کے لیے ضروری ہے ؟ کہ پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا جائے جو عام روش سے کسی قدر الگ ہو ؟ جس میں کوئی خاص طرفگی ہو ؟ کوئی خاص ندرت اور جدت ہو ؟ ورنہ وہ شاعر کہلائے جانے کا

مستحق نہیں ہو سکتا ؟ اس بنا پر اردو شاعری کے طرز ادا کی جدت اور لطافت کو اگر قائم رکھنا مقصود ہے ؟ تو فارسی کی لطیف ترکیبوں سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی جا سکتی لایق مصنف کے اس خیال سے بھی مجھکو اتفاق نہیں ہے ؟ کہ "قافیہ اور ردیف کی پابندیوں نے اردو شاعری کو مسخ بنا دیا اور اُس کے دائرہ خیال کو محدود کر دیا" ۔

یہ نظریہ مغربی تعلیم کا نتیجۂ اثر ہے ؟ مجھکو اس سے انکار نہیں ؟ کہ محض قافیہ کی رعایت سے شعر کہنا در اصل ذوق شاعری کو پست اور مبتذل کرتا ہے ؟ لکھنؤ کے قدیم شعرا کے دواوین اُٹھا کر دیکھیے تو ایک ہی قافیہ اور ردیف پر تیس تیس چار چار غزلیں تک ملیں گی ؟ لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں مل سکتا ؟ جس میں کوئی لطیف خیال یا کیفیت ادا کی گئی ہو ؟ اور آج بھی مشاعروں میں یہی تعریفیں کی جاتی ہیں ؟ کہ "کیا انوکھی ردیف ہے" ! کیا نوٹنا ہوا قافیہ ہے" ! اس طرح کی قافیہ پیمائی ہمارے نزدیک شعریت کے نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں ؟ اور نہ ہم فن عروض کی غیر ضروری اور مہمل بندشوں ؟ مثلاً ایطائے جلی اور ایطائے خفی وغیرہ میں پھنس کر خیالات کی فطری رو میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ؟ لیکن ہمارے لائق دوست کو غالباً اس سے انکار نہ ہوگا کہ موسیقی اور ترنم شاعری کا ایک ضروری عنصر بلکہ جزولاینفک ہے ؟ روح کو نغمے سے جو خاص تعلق اور مناسبت ہے ؟ وہ محتاج بیان نہیں ؟ چونکہ شاعر کا اصل مقصد روح انسانی کو مشتعل اور متاثر کرنا ہے ؟ اس لیے اس کے موزوں فقروں میں موسیقی کا ہونا ضروری ہے ؟ موسیقی صرف ایک ذوقی چیز ہے ؟ جو چند اجزا کی باہم ترکیب سے پیدا ہوتی ہے ؟ الفاظ منتخبہ ہوں ؟ ان کی نشست و ترکیب

صحیح اور موقعے کے مطابق ہو ؟ جس قسم کا خیال ہو ، اسی کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب کیا جائے ؟ ترکیبیں جو استعمال کی جائیں ان کے باہم دروبست میں چستی اور شگفتگی ہو ؟ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ قافیہ ایک بڑی حد تک نظم اور موسیقیت پیدا کرنے میں معین ہوتا ہے ؟ بلیانک ورس میں ممکن ہے ؟ کہ شاعر کو اپنے اظہار خیال کے لیے زیادہ آزادی محسوس ہوتی ہو ، لیکن بغیر قافیے کے شعر میں خوش نوائی اور خوش آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی ؟ جو مسلمہ طور پر شاعری کا ضروری جزو ہے ؟ یہ خیال بھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ؟ کہ قافیہ کی وجہ سے تسلسل خیال میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے ؟ ممکن ہے کہ یہ دقت زیادہ تر ان لوگوں کو محسوس ہوتی ہو ؟ جو زبان پر کامل قدرت نہ رکھتے ہوں ؟ لیکن قادرالکلام شعرا نے باوجود قافیے کی پابندی کے تسلسل خیال کے وہ نمونے پیش کیے ہیں ؟ جن کو دیکھ کر نگاہیں روشن ہو جاتی ہیں ؟ میر انیس کے مرثیے ؟ مولانا حالی کا مسدس ؟ ڈاکٹر اقبال اور علامہ شبلی کی قومی تاریخی اور سیاسی نظمیں کیا اس الزام کی تردید کے لیے کافی نہیں ہیں ؟ خود فارسی شاعری کو لیجیے جو اس نقص کی موجد ہے ؟ کیا تسلسل خیال اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے فردوسی کا شاہ نامہ دنیائے ادب کا اعلیٰ ترین شاہکار نہیں ہے ؟ کیا قافیہ اور ردیف کی پابندیوں کی وجہ سے حافظ ؟ سعدی اور امیر خسرو عشق و محبت کی لطیف کیفیتوں کی مصوری میں کامیاب نہیں رہے ہیں ؟ کیا فانی نے مناظر قدرت کی مصوری کے بہترین نمونے پیش نہیں کیے ہیں ؟ کیا عمر خیام کی رباعیات میں حیات انسانی کے نکتہ ہائے لطیف کی جھلک نظر نہیں آتی ؟ کیا اسرار و حقائق کے لحاظ سے مثنوی مولانا روم کے مقابلے میں نگزیری شاعری کوئی مثال پیش کر سکتی ہے ؟ ہمارے فاضل دوست

کے نزدیک انگریزی شاعری نے اس وقت ترقی کی ؟ جب اس نے قافیے اور ردیف کی پابندیوں کو ترک کر دیا ؟ لیکن ایران کے "ردان لم یزل" نے ان قیود کو مد نظر رکھتے ہوئے حسن تنوع ؟ حسن وسعت ؟ حسن خوبی اور لطافت کے ساتھ مختلف اصناف شاعری پر ایسے گراں اور نتائج آفرین کیے ہیں ؟ اس کی مثال دنیا کی کوئی شاعری مشکل سے پیش کر سکتی ہے -

ردیف سے گو کلام کا حُسن بڑھ جاتا ہے ؟ لیکن وہ ایک غیر ضروری قید ہے ؟ اس لیے اس کو ترک کر دینے میں شعریت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا ؟ البتہ وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر ہمارے نزدیک قافیے کا وجود ضروری معلوم ہوتا ہے ' بغیر اس کے شعر نغمۂ بے آہنگ ہے لیکن کم از کم ہم اپنی ترمیم ضرور چاہتے ہیں ' کہ قافیے کے متعلق جو بعض جزئی اور غیر ضروری قیدیں عائد کر لی گئی ہیں ' ان کو ترک کر دینا چاہیے ' قافیے کا اصل مقصد خوش نوائی اور ترنم آفرینی ہے اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے ' کہ دونوں قافیوں کے آخری حروف بھی یکساں ہوں ' مثلاً موجودہ اصول کے مطابق '' حیات کا قافیہ ' نشاط '' جائز نہیں ہو سکتا ' لیکن ہم کو اس سے اختلاف ہے ہمارے نزدیک دو ہم آواز الفاظ کا قافیہ جائز ہونا چاہیے ' کیونکہ اس حالت میں بھی ترنم قائم رہتا ہے ' اور ہم کو صرف ترنم سے تعلق ہے ' چنانچہ شعر میں حیات کا قافیہ ' نشاط یا '' تخصّص '' کا قافیہ '' تجسّس '' یا ' حسط ' کا قافیہ '' عنبر ' باندھا جائے ' تو اس میں کیا نقصان ہے ' شعر کی موسیقت اور خوش آہنگی میں کوئی فرق نہیں آتا ' اس ترمیم سے ایک طرف شعریت بھی قائم رہتی ہے اور دوسری طرف نستہ شاعر کو ذرا آزادی مل جاتی ہے بہر حال موسیقت اور

ترنم کو مد نظر رکھتے ہوئے قافیے کی بندشیں جو ضرورت سے زائد سخت ہیں ، اگر ہلکی کر دی جائیں ، تو یہ ایک قابل قدر اصلاح ہوگی -

مختلف اصناف شاعری پر لایق مصنف نے جو عام تبصرہ کیا ہے ، وہ اگرچہ مختصر ہے لیکن لایق توجہ ہے ، اُردو شاعری میں نہ تسمت اور اصناف سخن یعنی قصیدہ ، مثنوی ، قطعہ رباعی وغیرہ کے غزل کا سرمایہ بہت زیادہ ہے ، اور آج بھی اسی صنف سخن پر تکرار طبع آزمائیاں کی جاتی ہیں ، اس کے متعلق مصنف نے شکایت کی ہے کہ غزل کا میدان کس قدر محدود ہے اور اس صنف میں کس قدر تصنع اور سوقیانہ پن پیدا ہو گیا ہے - افسوس ہے کہ غزل آج بھی ان معائب سے خالی نہیں -

لایق مصنف نے غزل پر ریویو کرتے ہوئے بہت زیادہ اختصار سے کام لیا ہے ، حالانکہ اس موضوع کی اہمیت کسی قدر تفصیل کی طالب تھی ، یعنی اس کے دکھلانے کی ضرورت ہے کہ غزل کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں ؟ اس کے اصلی عناصر کیا ہیں ؟ کس قسم کے جذبات اس میں ادا ہونے چاہئیں ؟ زبان کس قسم کی ہونی چاہیے ؟ انداز بیان میں کن کن باتوں کا لحاظ ہونا چاہیے ؟ اور پھر اس معیار پر اُردو تغزل کے معائب و محاسن کا اندازہ کیا جائے اور اس سلسلے میں خاص طور پر شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی جائیں ، تا کہ لوگوں کو یہ صاف نظر آ جائے کہ ان کے سامنے جو چیز تغزّل کے نام سے پیش کی جا رہی ہے اس کو فی نفسہ تغزل سے کوئی تعلق نہیں ، بلکہ صرف الفاظ کا ایک نظر فریب طلسم ہے ، جو درد آشنا قلوب کے لیے اپنے اندر کوئی مستقل سامانِ لذت نہیں رکھتا -

غزل کا اصلی موضوع سخن عشق و محبت ہے ، اس لیے سب سے

پہلے یہ دکھانا ضروری ہے ' کہ اس عشق کی نوعیت کیا ہے ؟ اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہیں ؟

دلّی کے شاعری کی خوبی اور لطافت کی خاص وجہ یہ تھی' کہ اکثر شعرا بادۂ تصوف کے دور شناس تھے جیسا کہ لایق مصنف نے تصریح کی ہے ' اور اکثر صوفی منش شعرا کا نام لیا ہے ' مثلاً شاہ مبارک آبرو گوالیار کے مشہور صوفی شاہ محمد غوث کی سلسلۂ اولاد میں تھے شاہ حاتم ' جان جاناں مظہر ' شیخ شرف الدین ' مضمون ' میر درد ' اکابر صوفیہ میں تھے ' جن کے دور عرفان کی جھلک میر ' سودا اور اس دور کے دیگر شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے واقعہ یہ ہے کہ جوش و اثر ' اور سوز و گداز جو شاعری اور خصوصاً عشقیہ شاعری کی جان ہے ' اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا ' جب تک شاعر اس جرعۂ آتشیں کا لذت شناس نہ ہو جونکہ تصوف کا اصل مقصد روح انسانی کا تزکیہ ' اور شریفانہ اخلاق کی تربیت ہے اس لیے اس کا ایک دوسرا لازمی اثر یہ ہوتا ہے ' کہ جب تک شاعری ان ارباب نظر کے ہاتھ میں رہتی ہے ' اس کا دامن ابتذال سے پاک رہتا ہے ان کی فکر و نظر کا مقصود شاہد بازاری نہیں ' بلکہ جمال حقیقی ہوتا ہے اس لیے ان کی زبان سے وہ الفاظ اور خیالات نہیں نکلتے ' جو پاکیزگی اور متانت کے خلاف ہوں -

یہ امر خاص طور پر غور کے قابل ہے ' کہ وہی مغول جو دلی میں رہ کر احساسات کو برانگیختہ کرتا تھا ' لکھنؤ پہونچ کر آخر اس میں اس قدر ابتذال اور پستی کیوں آ گئی ؟ وہ اس قدر بد مزہ اور بے کیف کیوں ہو گیا ؟ حالانکہ علم و فضل کی کمی نہ تھی' مرہٹوں کا قحط نہ تھا فرمانروایان اودھ کی فیاضیوں کا یہ عالم تھا ' کہ شعرا دلی سے کھنچے چلے آتے تھے ساتھی دربار ارباب سخن

سے بھرا پڑا تھا، در و دیوار سے شاعری کی صدائیں آرہی تھیں، ناسخ کی علمی قابلیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن ان کی شاعری کے متعلق فاضل مصنف کی یہ رائے ہے —

"ان کی غزلیں بحر شاندار لفظی طلسم کاریوں کے صحیح اور دُر کیف جذبات و احساسات سے خالی ہیں، تصنع و تکلیف ان کی نمایاں خصوصیت ہے، ان کے اعلیٰ ترین اشعار کو بھی پڑھ کر دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، نسبیہات دورازکار اور بے کیف ہوتی ہیں عامیانہ خیالات کو پر شکوہ الفاظ میں ادا کرتے ہیں، لفظی صناعی اور ہیئت و آرائش کے سامنے جذبات کی لطافت کا بالکل لحاظ نہیں رہتا اکثر ناموزوں، ثقیل اور بھونڈے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں، جن کو غزل کی نازک برداشت نہیں کرسکتی"

امیر مینائی بھی بہت بڑے عالم تھے، لیکن ان کی شاعری میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے —

اسی طرح امیر و داغ کا موازنہ کرتے ہوئے لائق مصنف نے امیر کی شاعری کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے، اس سے مجھکو بہت کم اتفاق ہے، ہمارے نزدیک دونوں میں وہی فرق ہے، جو ایک مولوی اور شاعر میں ہوتا ہے، اس سے انکار نہیں، کہ داغ کے کلام میں بعض اوقات ابتذال کی بھی جھلک نظر آ جاتی ہے، لیکن امیر نے اس سے کہیں زیادہ مبتذل اور عامیانہ خیالات ادا کیے ہیں، اگرچہ لائق مصنف کو یہ امر تسلیم ہے، کہ دونوں میں جذب اور روحانی جوش و اثر کی کمی ہے تاہم انکا فیصلہ یہ ہے کہ :—

"با وجود اپنی تمام کمزوریوں کے جہاں تک الفاظ کے شکوہ، انداز بیان کی سنجیدگی، اور احساس کی نزاکت کا تعلق ہے، امیر کا درجہ داغ سے بڑھا ہوا ہے، امیر فن عروض کے بہتر استاد تھے، ان سے نظم کی غلطیاں نہیں ہوتیں، لیکن داغ سے اکثر لغزشیں ہو جاتی ہیں"۔

ہمارے لائق دوست کو غالباً مولانا روم کا یہ شعر معلوم ہو،

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات،
شعر میگویم بہ از قند و نبات،

فن عروض کی استادی، در شکوہ الفاظ یا مولویانہ ثقاہت کا نام شاعری نہیں اصل چیز احساس کی شدّت اور نزاکت ہے، یعنی یہ دیکھنا ہے، کہ شعریت کی روح کس کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے؟ موازنے کے لیے ضروری ہے، کہ دونوں کے ہم معنی اشعار لے کر ان کے معائب و محاسن پر بحث کی جائے، لیکن لائق مصنّف نے صرف ایک مجمل رائے پر اکتفا کیا ہے حالانکہ فیصلے کے لیے وجوہ و اسباب کا دکھانا ضروری ہے اس لیے ہم بھی طوالت کے لحاظ سے اس موضوع پر کوئی مفصلی بحث چھیڑنا نہیں چاہیے، لیکن اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں، کہ لکھنؤ کی غزل گوئی میں "نزاکت احساس" کی تلاش فضول ہے البتہ دور حاضر نے چند شعرا ایسے پیدا کردیے ہیں جن کی لطافت آفرینیوں نے غزل کو معجزہ بنا دیا ہے، اس لیے وہ فاضل مصنف کی خاص توجہ کے مستحق ہیں، ہم کو مسرت ہے، کہ لائق مصنف کی نگاہیں محض لفظی طلسم کاریوں کی فریب خوردہ نہیں ہیں بلکہ لطیف احساسات

کو ڈھونڈھتی ہیں اس لیے ہمکو امید ہے کہ آیندہ دَور حاضر کے شعرا کے کلام پر رجوع کرتے ہوئے ان کا یہ ذوق جستجو قائم رہیگا ' اور اپنی رائے کی تائید میں مثالوں سے اصرار نہ کرینگے ' موجودہ تصنیف میں مثالوں کی کمی نہایت شدّت سے محسوس ہوتی ہے ' اور ایک ادبی تذکرے کا یہ بہت بڑا نقص ہے -

علاوہ اس کے لایق مصنف نے شعرا کے انتخاب میں اصول فن کا لحاظ نہیں رکھا یعنی بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ کیا ہے ' جو فن کے لحاظ سے کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے ' کسی ملک یا قوم کی تاریخ ادب لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے ' کہ جتنے شعرا گذرے ہوں ان تذکرہ ضروری ہے ' قطع نظر اس سے کہ انہوں نے فن ادب کو کوئی خاص ترقی دی یا نہیں ' ایران نے ہزاروں لاکھوں شعرا پیدا کیے ' لیکن شعرالعجم کے فاضل مصنف نے صرف انھی شعرا کو لیا ہے ' جو کسی خاص طرز کے موجد تھے ' یا جنہوں نے فن حیات الفن شاعری میں کوئی قابل قدر اضافہ یا اصلاح کی ' ہمارے لایق دوست کو بھی اِسی اصول پر شعرا کا انتخاب کرنا چاہیے تھا ' مثلاً فن کے لحاظ سے بے شبہہ ناسخ کا تذکرہ ضروری تھا ' کیونکہ وہ ایک طرز خاص کے بانی تھے ' اگرچہ وہ طرز اُردو شعرا کے لیے تمام موزوں نہ تھا لیکن اُن کے شاگردوں کے تذکرے کی کیا ضرورت تھی ' ویر ' نوبی رشک ' وغیرہ نے شاعری کو کیا ترقی دی بجز اس کے کہ اپنے استاد کے رنگ کو اور بھی پست و مبتذل کر دیا ' خواجہ آتش کی عظمت سے کس کو انکار ہے ' لیکن صبا ' خلیل ' رند وغیرہ نے اُردو شاعری پر کیا احسانات کیے ہیں ' جن کا تذکرہ کیا جائے اسی طرح قلق ' امانت ' اسیر ' درخشاں احمد کی وہ کون سی گراں قدر ادبی خدمات ہیں '

جن کی بناء پر اُردو شاعری کی تاریخ ارتقا میں جگہ دی گئی ہے ؟ تعجب ہے کہ لائق مصنف نے حلال اور آزو تک کا تذکرہ کیا ، لیکن شعرائے دلی میں سے خواجہ میر اثر ایسے صاحب کمال کو بھول گئے ۔

فاضل مصنف نے علاوہ امیر و داغ کے اکثر ہمعصر اور ہم مذاق شعرا کا موازنہ بھی کیا ہے ، اور ان کی خصوصیات کلام کو الگ الگ دکھایا ہے ، مثلاً میر و سودا ، ذوق و غالب ، انیس و دبیر وغیرہ وغیرہ ، اگرچہ اس کام کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت تھی ، تاہم مختصر الفاظ میں جو کچھ اظہار خیال کیا ہے ، اس سے لائق مصنف کی نکتہ شناسی کا اندازہ ہوتا ہے ، ائمہ ذوق کی جس حد تک تعریف کی گئی ہے ، اُس میں ہمارے نزدیک کسی قدر مبالغہ ہے ، ذوق نے جس حد تک زبان میں صفائی ، سلاست اور روانی پیدا کی ، اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ؟ چنانچہ اس لحاظ سے (جیسا کہ لائق مصنف کا خیال ہے ،) ذوق کو غالب پر ترجیح دی جائے ، تو چنداں بیجا نہ ہوگا ، اگرچہ غالب کی اکثر غزلیں زبان کی سادگی اور حسن و لطافت کی اعلیٰ ترین نظیریں ہیں ، لیکن ذوق کے کلام میں اکثر عامیانہ اور مبتذل خیالات نظر آتے ہیں ، جن سے غالب کا دامن شاعری تقریباً پاک ہے ، واقعہ یہ ہے ، کہ غالب کی سطح دماغی اس قدر بلند ہے ، کہ وہاں تک ذوق کا وہم بھی مشکل سے پہونچ سکتا ہے ، اس لیے دونوں کا موازنہ بالکل فضول ہے ۔

اب تک عام خیال تھا ، کہ اُردو شاعری کے جدید دور مذاق کی ابتدا حالی ، اور آزاد کے زمانے سے ہوئی ، لیکن یہ کس کو معلوم تھا ، کہ اس سے بہت قبل نظیر اکبرآبادی نے جدید ذوق شاعری

کی بنیاد ڈالدی تھی ، جس پر حالی وغیرہ نے بعد کو رفیع الشان عمارتیں تعمیر کیں ، چنانچہ فاضل مصنف نے گیارھویں باب میں نہایت خوبی کے ساتھ اس قدیم شاعر کی خصوصیات شاعری کو بے نقاب کیا ہے ، اور یہ دکھایا ہے ، کہ صحیح معنوں میں اگر کوئی شاعر ہندستانی کہا جاسکتا ہے ، یعنی جس نے ہندستان کے طرز تمدن ، اخلاق و عادات ، اور مختلف قدرتی مناظر کی مصوری کی تو وہ نظیر اکبرآبادی کا وجود ہے ، انہوں نے بقول مصنف ، ہندستان کے اکثر مبلوز اور تہواروں مثلاً ہولی ، دیوالی ، بسنت ، عید وغیرہ پر بھی نظمیں لکھیں ، جن سے ان کی مذہبی رواداری ، وسعت اخلاق ، فطرت شناسی ، اور حرف رسی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

اُردو شاعری کے جدید دور ترقی کا تذکرہ کرتے ہوئے ، فاضل مصنف نے تین اسکول قائم کیے ہیں ، ایک تو قدامت پرستوں کا گروہ ہے ، جو کسی جدید انداز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ، جو ایک قدم بھی آگے بڑھنا نہیں چاہتا ، جس کے نزدیک جناب انسانی کے زندہ حقائق کی مصوری جرم ہے ، جس کی شاعری صرف بزرگوں کی صدائے بازگشت ہے یہ لوگ در اصل شاعر نہیں ہیں ، بلکہ ایک قدیم طرز کی نقالی کرتے ہیں ۔

اس میں شعرا کی وہ جماعت بھی ہے ، جو اگرچہ قدیم طرز سخن کی کامیاب پیرو ہے ، لیکن ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین کے اعادۂ پیہم نے اِس کی شاعری کو نوجوان طبقے کے لیے بالکل بد مزہ اور بے کیف بنا دیا ہے ، ہمارے لائق دوست کا خیال ہے ، کہ واقعات کی موجودہ رفتار اور جدید مذاق شاعری کے سیلاب نے اِن قدامت پرست بزرگوں کو بہت کچھ

سامنے سے ہٹادیا ہے ؟ جن کا وجود اُردو لٹریچر کے لیے کسی حیثیت سے مفید نہیں ؟ لیکن افسوس ہے ؟ کہ ملک میں اِس جماعت کا اب بھی عوام پر بہت کچھ اثر و اقتدار قائم ہے ؟ اور ہمارے فاضل دوست کو شاید نہ معلوم ہو ؟ کہ اسی مقدس گروہ میں وہ نفوس بھی شامل ہیں ؟ جو عام طور پر اقلیم سخن کے جم وکے سمجھے جاتے ہیں ؟ لیکن کم نظری اور تنگ خیالی کا یہہ عالم ہے ؟ کہ ان کے آستانۂ قدس پر کبھی کوئی شوریدہ سر کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ "ذرا گوشۂ عزلت سے سر باہر نکال کر افق حباب کی گوناگوں رنگینیوں کا نظارہ کیجئے" تو اندر سے درد ناک آواز میں جواب آتا ہے ؟ کہ "ان کو ان کے ماتمکدوں میں رہنے دیجئے اور آہ و زاری و نالۂ و فغاں کرنے دیجئے ؟ اگر وہ آپ کی بزم عشرت میں شریک ہونا نہیں چاہتے تو اِس میں آپ کا کیا نقصان ہے" اِس میں کیا نقصان ہے ؟ یہ فاضل مصنف کے غور کرنے کی چیز ہے !

دوسرا گروہ اُس کے بالکل برعکس ہے ؟ جو سر تاپا مغربی انداز خیال کا دلدادہ ہے ؟ جس کو قدیم طرز سخن میں کوئی خوبی یا لطافت نظر نہیں آتی ؟ جو بلا لحاظ اپنی قومی ضروریات ، یورپ کی کورانہ تقلید اور نقالی پر آمادہ ہے ؟ جو اسلاف کے کار ناموں کو محض دفتر بے معنی سمجھتا ہے ؟ اور ہر چیز میں مغربیت کی شان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اُس کو پروا نہیں کہ وہ جو کچھہ لکھتا ہے ؟ اس سے قوم کی روح کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے ؟ وہ کہاں تک خرد اُن کے دل و دماغ کی فطری صلاحیت کے مطابق ہے یا اِس میں اس آب و ہوا کی بھی جھلک نظر آتی ہے ؟ جس میں اُسی کی پرورش ہورہی ہے ؟

لیکن اِن دونوں فرقوں سے الگ ایک تیسرا درمیانی گروہ ہے ؟ جو خاص عظمت اور اہمیت کا مستحق ہے ؟ کیونکہ اِس کا نقطۂ نظر دونوں طرفوں کے افراط و تفریط سے پاک ہے وہ ماضی اور حال دونوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے ؟ وہ اِسلاف کے گراں بہا ترکۂ علمی کا قدر شناس ہے ؟ لیکن اِسی کے ساتھ موجودہ حالات واقعات زندگی سے چشم پوشی بھی نہیں کرنا چاہتا ؟ وہ ان شاعروں میں نہیں ہے ؟ جو ایک ملک میں جریدے ہیں اور دوسرے ملک میں لیجا کر بیچدیتے ہیں ؟ بلکہ وہ ذوق شاعری کا معمار وصناع ہے ؟ جس کی قوت متخیلہ ہمیں کی جام پیدا وار لیکر اُس کو مختلف جدید اور خوبصورت سانچوں میں ڈھالدیتی ہے اور خرد اپنی اور نیز اپنی ملک و قوم کے دل و دماغ کی ضیافت کے لیے نئے نئے سامان مہیا کرتی ہے ؟ درحقیقت یہی وہ اسکول ہے ؟ جو اردو شاعری کا صحیح معنوں میں محسن ہے ؟ اور جس کے وجود سے اُردو لٹریچر کی آئندہ ترقی کی تمام اُمیدیں وابستہ ہیں -

اس تصریح کے بعد فاضل مصنف نے اِس اسکول کے چند ممتاز شعرا مثلاً حالی ؟ آزاد ؟ سرور ؟ اکبر الہ آبادی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے ؟ اور نہایت نکتہ رسی کے ساتھ اِن کی خصوصیات شاعری پر تنقید کی ہے ؟ اور یہ دکھایا ہے کہ اِن ارباب فن کے ابر قلم کے رشحات سے اردو شاعری کا خزاں رسیدہ چمن کس طرح دفعتاً لہلہا اُٹھا ؟ لیکن تعجب ہے ؟ کہ اِس سلسلے میں فاضل مصنف نے علامہ شبلی کی جدید تاریخی ؟ سیاسی اور اخلاقی نظموں کو نظر انداز کردیا ؟ اگر چہ لائق مصنف نے علامہ مرحوم کے حالات میں اِس کی طرف معمولی طور پر اشارہ کردیا

ہے لیکن حقیقت یہہ ہے ؟ کہ نظمیں یہہ خاص اہمیت کی مستحق ہیں ؟ حالی ؟ آزاد وغیرہ نے اردو شاعری کے دائرہ خیال کو جس حد تک وسیع کیا ؟ اس سے کون انکار کر سکتا ہے ؟ لیکن سیاسی اور تاریخی نظموں کو غالباً سب سے پہلے مولانا ہی نے ؟ رواج دیا ؟ علاوہ اس کے "طنز لطیف" کی آمیزش بھی مولانا ہی کا کارنامہ فخر ہے ؟ یہہ نظمیں در اصل اردو شاعری کے سرمایۂ سخن میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں ؟ جس کو اردو لٹریچر کا کوئی مورخ آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کر سکتا ۔

علاوہ تنقید کلام کے فاضل مصنف نے جس احتیاط اور ضروری اختصار کے ساتھ شعرا کے عام حالات زندگی قلمبند کئے ہیں ؟ وہ مصنف کی ایک قابل قدر خصوصیت ہے ؟ آپ حضرات کے مصنف کی طرح ہمارے لائق دوست نے شعرا کے لطائف و طرائف پر اتنا وقت صرف نہیں کیا ہے ؟ بلکہ ان کی زندگی کے حسنہ حسنہ اور ضروری واقعات بیان کرنے کے بعد زیادہ تر اُن کی خصوصیات کلام پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے ؟ اور اکثر جدید معلومات کا اضافہ کیا ہے ؟ مثلاً عام خیال ہے ؟ کہ ولی نے سب سے پہلے اردو میں باضابطہ دیوان مرتب کیا ؟ لیکن فاضل مصنف نے اس شرف اولیت کی تردید کی ہے ؟ اور یہہ دکھایا ہے ؟ کہ ولی سے قبل گولکنڈہ کے اکثر سلاطین شاعری میں خاص شہرت رکھتے تھے ۔

اس تصریح سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ لائق مصنف نے نہ صرف قابل قدر معلومات کو یکجا کر دیا ہے ؟ بلکہ اکثر غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے ؟ علاوہ شعرا کے حالات اور عام تنقید شاعری کے ایک خاص مسئلہ ہے ؟ جس کے وجوہ و اسباب پر غور

کرنا اردو لٹریچر کے مورخ کا بہت بڑا فرض ہے ۔ یعنی دلی کو اردو کا وطن کہا جاتا ہے ؟ اس لیے فطری طور پر اس کی ابتدا وہیں سے ہونی چاہیے تھی ؟ لیکن بجائے اس کے دلی سے سیکڑوں کوس دور اردو شاعری کا مرکز ہم کو دکن میں نظر آتا ہے ؟ آخر اُس کی کیا وجہ ہے ؟ تعجب ہے ۔ کہ اپنے اہم مسئلے کی طرف کسی کی توجہ مذکول نہ ہو سکی ۔ لیکن فاضل مصنف نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے ؟ جس نے اس تصنیف کی تاریخی وقعت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے ۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے اُس دَور کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے ؟ بہمنی سلطنت کا بانی ایک مشہور برہمن مسمی گنگو کا خاص حبشی کا شاگرد تھا ۔ وہ جب تخت نشین ہوا ؟ تو اس نے نہ صرف اپنے گرو کا نام اختیار کر لیا ؟ بلکہ گنگو کو اپنا وزیر مال مقرر کر دیا ؟ گنگو سے پہلے برہمنوں کو حکومت میں کوئی دخل نہ تھا ؟ لیکن اس کی تقرری کے بعد سے ساہان دکن کے وزراے مال عام طور پر برہمن ہونے لگے ۔ ہندوؤں کی اس تقرری سے زبان کی ترقی میں دوہری تحریک پیدا ہوئی ۔ اور ہندو مسلمانوں میں باہم دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے ؟ یہاں تک کہ ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے حکومت کا حساب کتاب جو پہلے فارسی میں رکھا جاتا تھا ؟ برہمنوں کی تر گرائی ہندی میں لکھا جانے لگا ؟ جس کی وجہ سے ہندی سرکاری دفاتر کی زبان بن گئی ۔ اس لیے اس کی ترقی لازمی تھی ؟ جنوبی ہند میں ہندوؤں کی خدمات نا قابل اعتنا نہ تھی ؟ مسلمان سلاطین اپنے قیام اقتدار کے لیے اکثر ہندو حکمرانوں سے مدد لیا کرتے تھے ؟ اس سیاسی تعلق نے ہندو اور مسلمانوں میں ایک عام اختلاط کی راہ کھول دی ؟ جس سے زبان کو مختلف فائدہ پہنچا ؟

عرض گولکنڈہ اور بیجاپور کی تیرہ صدیوں کی خودمختاری کے دور میں ہندو مسلمانوں میں باہم جس قدر خوش گوار تعلقات قائم رہے ، ہندستان کے کسی اور حصے میں یہ حالت نہ تھی ، نہ صرف اِسی رواداری اور یگانگت کا اثر تھا - کہ ہندو کثیر تعداد میں سرکاری عہدوں پر مامور تھے ، اگرچہ اکثر جانب جنگیاں پیش آتی تھیں ، باہم سلاطین گجرات اور ساتھان بہمنی کو نہ بسبب فرمانروایان دلی کے جن کے نظام حکومت کو شمال کی طرف سے اکثر حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا ، نظم سلطنت اور نُر امن ترقی کے لیے زیادہ مواقع حاصل تھے ، غرض ہندو مسلمانوں کے باہمی محبت آمیز تعلقات ، سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کی کثیر تعداد کی تقرری ، دفاتر سرکاری میں ہندی کا استعمال ، عام رواداری اور فراخ دلی ، یہ اسباب تھے ، جن کی اثر سے دکنی زبان کو غیر معمولی اشاعت و ترقی ہوئی ، اور اُس نے بہت جلد ادبی حیثیت اختیار کرلی ، جنوبی ہند میں صوفیوں کی موجودگی نے اور بھی تحریک پیدا کر دی ، یہ لوگ مذہبی اور قومی تعصبات سے آزاد تھے ، عوام تک پہونچنے کے لیے وہ دیسی زبان نے استعمال کو ترجیح دیتے تھے ، ان میں سے اکثر شاعر تھے ، اور دیسی زبان میں عوام کے خیال سے شعر لکھتے تھے -

فاضل مصنف نے اُردو نثر کے مختلف مدارج ترقی پر بھی محققانہ نظر ڈالی ہے تعجب کی بات ہے ، کہ باوجود اُس کے کہ شاعری کا بازار چاروں طرف گرم تھا ، اور اُردو نثر کی ترقی صحیح معنوں میں حکومت برطانیہ کے تسلط تک رکی رہی ، یعنی جب تک انگریزوں نے اغراض حکومت کے لیے ملکی زبان کی اشاعت و ترقی

کی طرف خاص توجہ نہیں کی ' اس وقت تک اردو نثر کو خاص علمی یا ادبی حیثیت حاصل نہیں تھی ' صرف نثر مرصع ' نثر مسجع اور نثر عاری کا رواج تھا ' جن میں بجز لفظی تکلف اور آرائش کے اور کچھ نہ ہوتا تھا ' یہ نثر نہ تھی؟ بلکہ نثر کے پردے میں ایک قسم کی شاعری تھی ؟ اس کی وجہ جیسا کہ فاضل مصنف نے بتلائی ہے ؟ یہ تھی کہ در حقیقت وہ دور شاعری کا تھا ؟ فارسیت کا مذاق چاروں طرف پھیلا ہوا تھا ؟ یہاں تک کہ خط و کتابت بھی عام طور پر فارسی میں ہوتی تھی ؟ نوابوں کے مدحیہ قصائد ؟ تنقیدیں اور تبصرے ؟ یا شعرا کے تذکرے جو لکھے جاتے تھے ؟ ان کی زبان فارسی ہی ہوتی تھی ؟ شاعری گھر گھر پھیلی ہوئی تھی؟ یہاں تک کہ اکثر خطوط نظم میں لکھے جاتے تھے ؟ شاعر ہونا فضل و علم کا ضروری جزو سمجھا جاتا تھا ؟ عرض شاعری کے ہنگامہ آرائیوں میں اردو نثر کی آواز دب کر رہ گئی تھی ؟ اور کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا -

اردو نثر کی ابتدائی تصنیف عام طور پر وہ مجلس جمال کی جاتی ہے ؟ جس کو فضلی نے سنہ ۱۷۳۲ع میں محمد شاہ کے زمانے میں لکھا تھا ' یہ فارسی کی کتاب روضۃالشہدا کا ترجمہ تھا ؟ اس کے علاوہ دوسری قابل ذکر تصنیف تو طرز مرصع ہے ؟ یہ امیر خسرو کے قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے ؟ اس کی تکمیل میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے سنہ ۱۷۹۸ع میں نواب شجاع الدولہ فرمانروائے اودھ کے عہد حکومت میں کی تھی ؟ لیکن جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے ؟ موجودہ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو نثر کی بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی ؟ چنانچہ محققین کو جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے ؟ اس سے اردو نثر کی تاریخ کا آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہونا معلوم ہوتا ہے ؟

جو نثر کے قدیم نمونے دستیاب ہوئے ہیں ؟ وہ سب مختصر رسالے ہیں ؟ جن میں گنجراب اور دکن کے فقرا ؟ درویشوں اور صوفیوں کے حکیمانہ اقوال و امثال درج ہیں ؟ یہ رسالے زیادہ تر مذہبی کتابوں کے ترجمے ہیں ؟ جو اگرچہ علمی حیثیت نہیں رکھتے ؟ تاہم ان سے اس زمانے کی زبان کی نوعیت کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل ہو سکتی ہے ؟ شیخ عین‌الدین گنج‌الاسلام‌المتوفی سنہ ۷۰۵ ھ کے مذہبی رسائل ؟ معراج‌العاشقین ؟ جس کو خواجہ بندہ نواز حضرت سید گیسو دراز نے نساط‌العشق سے ترجمہ کیا تھا ؟ جال ترنگ ؟ گلباس مرتبہ شاہ میراںجی شمس‌العشاق شاکر بیجاپور وغیرہ اس زمانے کے آثار تحریر کے قابل اعتنا نمونے ہیں ۔

لیکن جیسا کہ لائق مصنف نے تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے ؟ موجودہ اُردو نثر کی حقیقی تاریخ کا مطلع اُنیسویں صدی کا آغاز ہے ؟ جب کہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو صحیح طور پر "بابائے نثر اردو" کہے جاتے ہیں ؟ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے صدر یا پرنسپل تھے ؟ ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے ' اور سنہ ۱۷۵۹ع میں بمقام ایڈن برا پیدا ہوئے تھے ؟ سنہ ۱۷۸۳ع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے طبی مشیر کی حیثیت سے ہندستان آئے ؟ اور یہ محسوس کیا کہ اُصول حکومت کے لحاظ سے انگریز افسروں کے لیے نہ صرف فارسی کے ہندستانی زبان کے سیکھنے کی ضرورت زیادہ تھی ؟ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے خود اپنا قدم اُٹھایا ؟ اور دیسی لباس پہن کر مختلف صوبوں کی سیر و سیاحت کی جہاں ہندستانی بہترین صورت میں مستعمل تھی ؟ اور دیگر مشرقی زبانوں ؟ فارسی؟ سنسکرت وغیرہ پر بھی کافی عبور حاصل کیا ؟ ڈاکٹر موصوف کی کامیابی نے کمپنی کے ملازمین میں ایک نئی روح پھونک دی اور ہندستانی زبان کے مطالعہ

کي طرف عام توجه مبذول هو گئی ؛ لارڈ ولزلی نے اس تحریک کی اهمیت محسوس کرکے کمپني کے خزانے سے ڈاکٹر موصوف کي نهایت فیاضي کے ساتھ مالي امداد کی اور سنه ۱۸۰۰ع میں برٹش عهده داروں کو ملکي زبانوں کي تعلیم دینے کي غرض سے ان کو فورٹ ولیم کالج کي پرنسپلی پر مقرر کر دیا ؛ جہاں انھوں نے رہ کر هندستانی زبان کی اشاعت و ترقي میں غیر معمولی سرگرمی سے کام لیا اور خود بھی هندستاني زبان میں قواعد ؛ علم‌اللسان ؛ لغت وغیرہ پر متعدد کتابیں تصنیف کیں ، کالج میں ان کي سعی و کوشش کي بدولت هندستاني اهل فن کا ایک مستقل گروہ جمع هو گیا تھا ، جو ان کی نگراني میں اردو هندی کی ترقي میں سر گرم عمل تھا ، ان میں سے چند قابل ذکر افراد کے نام یہ هیں ، میر امن دهلوي ، میر بہادر علی حسینی ، سید حیدر بخش حیدري ، کاظم علي جوان ، مرزا لطف علي ولا ، حفیظ‌الدین احمد ، اکرام علی خاں ، للو جي لال ؛ بینی نرائن ؛ مرزا علی لطف ۔

علاوہ ان دنیاوي اهل فن کے اس دور میں کچھ ایسے ارباب فضل و کمال پیدا هوئے ؛ جن کي بدولت اردو میں مذهبی لٹریچر کا اضافه هوا ؛ مثلاً شاہ ولی‌اللہ رحمۃاللہ علیہ کے خلف ثانی شاہ رفیع‌الدین نے قرآن مجید کا پہلا ترجمہ اُردو زبان میں کیا ؛ مولوی شاہ عبدالقادر نے سنه ۱۲۰۵ھ میں سلیس اور با محاورہ زبان میں دوسرا ترجمہ کیا ؛ مولوي اسمٰعیل دهلوی نے اکثر کتابیں اُردو میں تصنیف کیں ؛ جن میں سب سے زیادہ مشہور تقویۃ الایمان هے ۔

علاوہ تصانیف و تراجم کے اس زمانے میں لغت اور قواعد زبان پر بھي اکثر کتابیں عالم وجود میں آئیں ، چنانچہ فاضل مصنف نے

اکثر یورپین ارباب قلم کا تذکرہ کیا ہے ، جنہوں نے اس میدان میں خاص سرگرمی سے کام لیا -

عیسائی مبلغین کی جد و جہد سے اردو لٹریچر کو جو فائدے حاصل ہوئے ، ان کا بھی تذکرہ فاضل مصنف نے کیا ہے ، جس سے اندازہ ہوتا ہے ، کہ ان مبلغین نے اردو کی توسیع و اشاعت میں کس حد تک حصہ لیا ، میر محمد قطب نے انجیل متی کا ترجمہ اردو میں کیا تھا ، جو کلکتے میں سنہ ۱۸۰۵ع میں شائع ہوا تھا ، ریورنڈ ایچ مارٹن نے سنہ ۱۸۱۴ع میں بوٹانی سے اس کو اردو میں منتقل کیا ، سیرام پور کے مبلغین نے سنہ ۱۸۱۶ع سے لے کر سنہ ۱۸۱۹ع تک اس تین سال کے زمانے میں پوری انجیل کا ترجمہ کر ڈالا -

اُردو نثر کے ابتدائی مراحل ارتقا کا یہ اجمالی خاکہ ہے جس کو فاضل مصنف نے پیش کیا ہے ، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں ، کہ یہ صرف قابل قدر معلومات یکجا جمع کر دیے گئے ہیں بلکہ ان حالات و اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جنہوں نے اردو نثر کو ابتدا میں خاص طور پر متاثر کیا ، اور یہی اس تذکرے کی نمایاں خصوصیت ہے -

اس کے بعد فاضل مصنف نے غالب اور سر سید کے دور کی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے ، جو در اصل اردو نثر کی معراج ترقی کا زمانہ ہے ، یعنی اُردو زبان اس قابل ہوئی ، کہ اس میں سنجیدہ علمی اور ادبی تصانیف کی جا سکیں ، اس دور کی ممتاز ترین ہستیاں جنہوں نے اُردو کو قدیم طرز انشا کے مہمل اور غیر ضروری تکلف و آرائش سے پاک کرکے علمی اور ادبی زبان بنایا سر سید ، آزاد ، حالی ، نذیر احمد ، شبلی ، محسن الملک ، چراغ علی ، سید علی بلگرامی ، سید حسین

نگرامی ، عزیز مرزا ، وغیرہ ہیں ، جن کی خصوصیات ایسا برداری پر فاضل مصنف نے نکتہ شناسی کے ساتھ ریویو کیا ہے ، غالب کو آج دنیا عام طور پر صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے ، لیکن فاضل مصنف کی یہ رائے بالکل صحیح ہے ، کہ جس بنیاد پر ان بزرگان فن نے اردو نثر کی فلک بوس عمارتیں تعمیر کیں ، اس کا بانی اول در اصل یہی یگانۂ روزگار تھا ، جس کے رقعات کے اندار تحریر کی سادگی ، روانی اور سلاست نے اردو نثر میں ایک جدید رنگ کی شاہ راہ کھول دی ، جس کا اثر حالی ، آزاد ، سر سید وغیرہ کے طرز تحریر میں نظر آتا ہے -

اس دور میں اُردو نثر کو جو غیر معمولی ترقی اور اشاعت حاصل ہوئی ، فاضل مصنف نے اس کے اسباب پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے ، مثلاً سید احمد دہلوی کی مذہبی اصلاحات اور اُن کے موافقین اور مخالفین کی باہمی بحث آرائیاں ، جن کی وجہ سے اکثر مذہبی رسائل اور کتابیں وجود پذیر ہوئیں ، چونکہ ان کا مقصد عوام کے دل و دماغ کو متاثر کرنا تھا ، اس لئے سادہ اور سلیس طرز تحریر اختیار کی گئی ، دوسرے سامان طبع کی فراہمی نے کتابوں کی تصنیف و تالیف میں خاص تحریک پیدا کر دی ، علاوہ اس کے اخبارات اور رسائل بھی عالم وجود میں آنے لگے ، سنہ ۱۸۳۲ع میں دفاتر سرکاری کی زبان بجائے فارسی کے دیسی زبان قرار دی گئی ، جس کی وجہ سے اردو کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی ، لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے اردو لٹریچر کو متاثر کیا ، وہ دلی کالج کا وجود تھا ، جس نے نذیر احمد ، آشوب ، آزاد ، حالی ، ضیاءالدین ، ذکاءاللہ ایسے افراد کامل پیدا کیے ، جو جدید اُردو لٹریچر کے بانیان خاص میں شمار کیے جاتے ہیں ، دلی

کالج میں پہلے سے علاوہ مشرقی تعلیم کے مغربی علوم و فنون کی بھی تعلیم کا محکمہ قائم تھا سنہ ۱۸۲۷ع میں ایک انگریزی کلاس خاص طور پر قائم کیا گیا ، اگرچہ اُس وقت انگریزی زبان کے خلاف ایک عام تعصب کا جوش پھیلا ہوا تھا ، تاہم اس کا خیر مقدم امید افزا تھا ، چنانچہ سنہ ۱۸۳۱ع میں تقریباً تین سو طلبہ اس کلاس میں داخل ہوئے ، اور رفتہ رفتہ انگریزی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق عام ہوتا گیا ، اور طبیعتیں لفظی صناعیوں اور تکلف آرائیوں سے ہٹ کر سادگی ، روانی ، سلاست ، اور حقیقت سنجی کی طرف مائل ہو گئیں ، جو اس دور کا خاص کارنامہ وجہ و امتیاز ہے ، سنہ ۱۸۴۲ع میں ایک علمی انجمن قدیم دلی کالج سے متعلق قائم کی گئی ، جس کے روح و رواں پروفیسر رام چندر اور امام بخش صہبائی تھے ، اس انجمن کی بدولت اکثر کتابیں شایع ہوئیں ، جن میں سے زیادہ تر انگریزی تصانیف کے ترجمے تھے ، ان تراجم کی اشاعت نے اردو طرز انشا کو سادہ ، اور تصنیفی حیثیت سے کار آمد بنانے میں بہت زیادہ مدد دی ، سنہ ۱۸۶۴ع میں ایک دوسری علمی انجمن دلی میں وجود پذیر ہوئی ، جس کے فاضل سکریٹری رائے بہادر ماسٹر پیارے لعل آشوب تھے ، اس انجمن کی جد وجہد سے بھی اردو لٹریچر کو معتدبہ فائدہ پہونچا ، غرض یہ اسباب تھے ، جنھوں نے اردو لٹریچر کو اس قابل بنا دیا ، کہ آج اس میں علمی ، ادبی اور تاریخی تصانیف کا ایک گراں قدر ذخیرہ نظر آتا ہے -

فاضل مصنف نے سر سید ، آزاد ، حالی ، شبلی ، نظیر احمد وغیرہ کی خصوصیات انشاپردازی پر جو اظہار رائے کیا ہے ، ارادہ تھا ، کہ اس پر ذرا تفصیل کے ساتھ ریویو کرتا ، لیکن افسوس ہے ، کہ

طوالت کے خوف سے اس وقت اس فرض کو انجام نہیں دے سکتا ، لیکن اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا ، کہ علامہ سہلی کے انداز تحریر کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ، اگرچہ وہ صحیح ہے ، لیکن علامہ مرحوم کی ایسا دردانہ حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت زیادہ مختصر اور نا کافی ہے ، سر سید نے سہہ طرز جدید کے بانی خاص تھے ، لیکن ان کا طرز تحریر ضرورت سے زیادہ خشک ہے ، یہی حال حالی کا بھی ہے ، آزاد میں ضرورت سے زیادہ رنگینی ہے ، اور جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے ، ایسے رنگ خاص میں نے بدل ہیں ، لیکن وہ رنگینی سنجیدہ علمی مضامین کے لیے موزوں نہیں ، نظیر احمد کو زبان پر بے شبہہ قدرت تھی ، لیکن اکثر عامیانہ محاورے اور مبتذل فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں ، لیکن سہلی کا انداز تحریر "انجہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے ، افسوس ہے ، کہ فاضل مصنف نے مولانا کے اس وصف جامعیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کی ، اس کے لیے تفصیلی موازنہ اور مثالوں کی ضرورت تھی ، غالباً اختصار کے لحاظ سے فاضل مصنف نے اس طرف توجہ نہیں کی ، تاہم تحقیقت ناقد کے ان کا یہ ایک ضروری فرض تھا ، یعنی پہلے یہ دکھائے کہ ایسا نگاری کی اصلی خصوصیات کیا ہیں ، اور پھر اس پر نظر ڈالتے ، کہ وہ خصوصیات کس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں ، اس تفصیل سے صاف ظاہر ہو جاتا ، کہ سہلی کا طرز تحریر در اصل اردو ایسا نگاری کی معراج ہے -

موجودہ اردو ایسا نگاری میں جیسا کہ فاضل مصنف نے دکھایا ہے ، دو خاص جدید انداز نظر آتے ہیں ، ایک تو وہ رنگ ہے ، جس کی ابتدا مولانا ابوالکلام آزاد نے کی ، یعنی نئے نئے

پُر شکوہ عربی اور فارسی الفاظ اور طویل ترکیبوں کا استعمال ، لیکن ابوالکلام کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے ، اس لیے ان کا طرز تحریر اِن معائب سے محفوظ رہا ، جو عام طور پر ان کی رنگ کی نقالی کرنے والوں میں نظر آتے ہیں ، اس رنگ کی پیروی کے لیے دوق صحیح اور خاص قابلیت کی ضرورت ہے ، جو ہر شخص کا حصہ نہیں ، اس کے جواب میں کچھہ لوگوں نے ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور ہندی الفاظ کی بھرتی شروع کر دی ؟ لیکن خوش قسمتی سے اردو لٹریچر کے اس قسم کے بھی خواہوں کی تعداد نہایت محدود ہے ۔

دوسرا انداز "تخیلی نثر" کا ہے ، جس کو بعض اوقات "ٹیگورین انداز" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ، یہ صرف نثر نما شاعری ہے ، جس میں صرف خوبصورت اور پُر شکوہ الفاظ کی نمایش ہوتی ہے ، جو اکثر ابتذال کی حد تک پہونچ جاتی ہے ، مجھہ کو فاضل مصنف کے اس رائے سے بالکل اتفاق ہے ، کہ یہ دونوں انداز اردو لٹریچر کے صحیح نشو و نما کے لیے مناسب نہیں ، ہر شخص ٹیگور اور ابوالکلام نہیں ہو سکتا ، اور نہ ہر بڑے آدمی کی خوامخواہ تقلید ضروری ہے ، ہمارے نزدیک اردو انشا نویسی کا بہترین نمونہ جس کی تقلید سے اردو لٹریچر کو گراں بہا فائدے پہونچ سکتے ہیں ، وہی انداز تحریر ہے ، جس کی بنیاد سر سید نے رکھی تھی ، اور جس کو شبلی کے معجز نگار قلم نے اُٹھاکر آسمان تک پہونچا دیا اعتدال ہر چیز کے حسن کا اصلی راز ہے ؟ اس لیے ہمارے خیال میں اردو انشا نویسی کو ان دونوں انداز کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھنا بھی خواہان اردو کا سب سے مقدم اور ضروری فرض ہے ۔

اس سلسلے میں فاضل مصنف نے قدیم اُردو صحافت کا بھی تذکرہ

کہا ہے ' جس سے ظاہر ہوتا ہےکہ سنہ ۱۸۳۸ع میں آزاد کے والد باقر حسین نے دلی سے "اُردو اخبار" کے نام سے ایک اخبار نکالا' جس میں زیادہ تر علمی اور ادبی بحثیں رہتی تھیں اور دوق ' مومن ' غالب وغیرہ کی غزلیں شایع ہوتی تھیں سنہ ۱۸۵۰ع میں منشی ہر سکھہ رائے نے لاہور سے کوہ نور کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کی بنیاد ڈالی ' جس نے غیر معمولی اشاعت حاصل کی ' بعد کو ہفتے میں دوبار اور سہ بار شائع ہونے لگا اس کے بعد مختلف مقامات سے متعدد اخبار نکلنے شروع ہوئے' جن میں اودھہ اخبار کو خاص اہمیت حاصل ہے ' جس کو منشی نول کشور نے سنہ ۱۸۵۹ع میں جاری کیا تھا ' اس میں انگریزی جرائد کے اقتباسات اور خبروں کے ترجمے زیادہ تر شایع ہوتے تھے' سنہ ۱۸۷۷ع میں سر رمیش لکھنؤ سے اودھہ پنچ کا طلوع ہوا جس کی اشاعت نے اردو لٹریچر اور صحافت کو خاص طور پر متاثر کیا ' یہ خاص طور پر طریفانہ پرچہ تھا ' جس کی زبان نہایت صاف ' سادہ اور شستہ تھی' سنہ ۱۸۸۳ع میں ایک دوسرا اخبار "ہندستانی" نامی لکھنؤ سے شائع ہوا ' جس میں مسائل حاضرہ اور سیاسیات پر سنجیدہ بحثیں شایع ہوتی تھیں' سر سید کے قائم کردہ اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق ادبی اور علمی خدمت کے لحاظ سے خاص عظمت کے مستحق ہیں ' سنہ ۱۸۸۷ع میں دیسی اخبار وجود پذیر ہوا ' جس کی اشاعت نے اردو صحافت کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ' علاوہ اس کے فاضل مصنف نے موجودہ زمانے کے جرائد ادبیہ پر بھی ایک سر سری نظر ڈالی ہے ' ضرورت تھی' کہ اس موقعے پر ان رسائل کو ان کے ادبی فرائض سے ذرا آگاہ کر دیا جاتا ' کیونکہ صحیح ذوق ادب کی اشاعت بہت

کچھ انہیں کی فرض شناسی پر منحصر ہے، لیکن افسوس ہے، کہ فاضل مصنف نے اس کو نظر انداز کر دیا، ممکن ہے، کہ آیندہ کے لیے اُٹھا رکھا ہو۔

ناول اور افسانہ نگاری کے دور پر ریویو کرتے ہوئے فاضل مصنف نے دکھایا ہے، کہ اردو کے قدیم افسانے زیادہ تر ایرانی افسانوں سے ماخوذ ہوتے تھے، مثلاً الف لیلہ، داستان امیر حمزہ صاحب قرآن، طلسم ہوشربا، نوشتان خیال، حاتم طائی، کے قصے، تاج و تہار وغیرہ جن میں بحر دیووں، جادوگروں اور پریوں کے مافوق الفطرت واقعات اور دور از کار تخیلات کی سحر کاریوں کے سیرہ نگاری، جذبات صحیح کی ترجمانی اور واقعیت کا عنصر نہایت کم ہوتا تھا، مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب اور دیگر مختصر افسانے لکھ کر کسی قدر ناول کو ترقی دی لیکن اُن کا سرمایۂ خیال بھی وہی قدیم افسانے تھے، علاوہ اس کے زبان میں غیر معمولی تصنع و تکلف تھا، جو افسانہ نگاری کے لیے کسی طرح مناسب نہیں، ڈپٹی نذیر احمد نے البتہ جدید افسانہ نگاری کے میدان میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی، چنانچہ ان کے افسانوں میں بجائے حیرت انگیز اور مافوق الفطرت واقعات کے موجودہ زمانہ کے تہذیب و تمدن، اور اخلاق و عادات کی تصویر نظر آتی ہے، زبان کی سادگی اور شیرینی، انداز بیان کی دلاویزی اور لطافت نے ان کے فسانہ طرازی میں خاص حُسن پیدا کردیا ہے، سجاد حسین، جوالا پرساد برق، احمد علی شوق کی خدمات بھی اس میدان میں کچھ کم قابل قدر نہیں ہیں، لیکن اس وادی کے اصلی ہیرو پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر ہیں، جنھوں نے موجودہ میدان کے رو سے اس فن کو غیر معمولی

ترقي دي، چنانچه ان کے افسانوں اور ناولوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں، جو جدید انداز کے لحاظ سے ناول کے لیے ضروری ہیں یعنی ایک متعین پلاٹ ہو، اس کے مختلف کیرکٹر ہوں، ہر کیرکٹر کی خصوصیات علیحدہ اور متعین ہوں، واقعات میں باہم ربط اور تسلسل ہو، جو حالات بیان کئے جائیں، وہ خلاف قیاس اور فطرت انسانی کے منافی نہ ہوں، مشاہدہ صحیح اور عام تجربات زندگی پر مبنی ہو، انداز بیان دلچسپ گوئی اور بے راہ روی سے پاک ہو، زبان صاف، سادہ اور شیریں ہو، شرر نے تاریخی ناولوں کا اضافہ کر کے ایک قابل قدر ادبی خدمت انجام دی، محض سوقیانہ گپ رنگی اور بازاری قصوں سے کوئی نتیجہ نہیں، ہمارے نزدیک ناولوں میں اخلاقی پہلو کا لحاظ ضروری ہے -

دور حاضر میں بھی افسانہ نگاروں کی کمی نہیں ہے، لیکن جیسا کہ لایق مصنف نے لکھا ہے، ان میں سب سے زیادہ مستاز منشی پریم چند کا وجود ہے، جن کے مختصر افسانے انداز بیان کی دلکشی، زبان کی سادگی، ترکیبوں کی فصاحت، واقعات کی مصوّری، جذبات کی اندازہ شناسی کے لحاظ سے غیر معمولی قدر و عظمت کے مستحق ہیں، ہمارے لائق دوست نے لکھا ہے، کہ اُردو دان طبقہ کی بے اعتنائی اور ناقدر شناسی کی وجہ سے منشی پریم چند، کی توجہ حال میں ہندی کی طرف مبذول ہوگئی ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو ہم کو نہایت افسوس ہے، اور یقیناً یہ اُردو لٹریچر کی بدقسمتی ہے، اگر ہم اس یگانۂ فن کے ادبی احسانات کے اعتراف سے گریز کریں، لیکن ہمکو منشی پریم چند کی عالی حوصلگی سے توقع ہے، کہ وہ چند

یا اہلوں کے عدم اعتراف سے متاثر ہو کر اُردو کو فراموش نہ کرینگے ۔

بیار فتحپوری کی "نثر بنا شاعری" پر لایق مصنف نے جو اظہار خیال کیا ہے ، وہ صحیح ہے ، یعنی یہ معلوم ہوتا ہے ، کہ کوئی شخص خوامخواہ بلا وجہ تکلف کررہا ہے ، تصنع و تکلف خواہ نثر میں ہو یا نظم میں ، تمام ادبی لطافت کو خاک میں ملا دیتا ہے ، فاضل مصنف نے نیاز صاحب کو کسی قدر تہذیب و اصلاح کا مشورہ دیا ہے ۔

اُردو ڈراما کے مختلف مراحل ارتقا پر بھی فاضل مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے ، جس سے ظاہر ہوتا ہے ، کہ اُردو ڈراما کی بنیاد "اندر سبھا" کے زمانے سے قائم ہوئی ، جس کو ناسخ کے شاگرد امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے لکھا تھا ، لیکن یہ صحیح معنوں میں ڈراما نہ تھا ، بلکہ محض نوابین اودھ کی عیش پرستی ، اور اوباشانہ طرز زندگی کا نمونہ تھا ، تاہم عوام میں بہت زیادہ مقبول ہوا ، اور یہاں تک شہرت حاصل کی کہ جرمن زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا ، جو تمام لوگ سنہ ۱۸۹۲ع میں شایع ہوا ، طالب بنارسی اور احسن لکھنوی نے ڈراما کے عام لہجے اور زبان میں بہت زیادہ اصلاح کی ، اب گفتگو کے لیے بجائے اشعار کے معمولی فقرے استعمال کیے جانے لگے ، اندر سبھا میں گفتگو تک اشعار میں ہوتی تھی ، بیتاب دہلوی نے راماین اور مہا بھارت لکھکر اس زمین کو اور بلند کیا ، جس کو آگے چل کر آغا حشر کے نکتہ رس دماغ نے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ، اور اُردو ڈراما میں انگریزی ڈراما کے خصوصیات کی جھلک نظر آنے لگی ، لیکن اب بھی اُردو ڈراما بہت کچھ اصلاح و ترقی کا محتاج ہے ، ابھی تاریخی ، سوشل اور علمی ڈراموں کی کمی ہے ۔

مجھے کو فاضل مصنف کے ان خیالات سے اتفاق ہے ' کہ ڈراما لٹریچر کی ایک اہم شاخ ہے ' اس سے قوم اور ملک کی اصلاح میں بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے ؟ اُردو ڈراما کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری ہے ' کہ یورپین ڈراما کے بہترین شاہکار اور نمونے ترجمہ کے ذریعہ سے منظر عام پر لائے جائیں ' تا کہ لوگوں کو اس امر کا صحیح طور پر اندازہ ہو جائے کہ ڈراما کے عناصر اصلی کیا ہیں ' لیکن ہمارے لائق دوست کی اس رائے کا تسلیم کرنا مشکل ہے کہ " پردے کا وجود اُردو ناول اور ڈراما کی ترقی کے لیے سد راہ ہے ؟ کیونکہ جب تک مرد و عورت میں باہمی اختلاط کی آزادی نہ ہو ؟ اُس وقت تک صحیح جذبۂ عشق کا امکان نہیں ' جس کی ڈراما میں ضرورت ہے " یہ ایک طویل بحث ہے ؟ جس کو ہم اس موقعے پر چھیڑنا نہیں چاہتے ؟ لیکن ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں ؟ کہ مرد و عورت کا وہ آزادانہ اختلاط جس کو لائق دوست ڈراما کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ' کس قسم کا ہونا چاہیے ؟ اگر اس سے وہ آزادی مقصود ہے ؟ جو مغرب کی جنس لطیف کو حاصل ہے ؟ تو ہم اس قسم کے آزادانہ اختلاط کے خیر مقدم کے لیے تیار نہیں ہیں ؟ جس سے اخلاق کا آئینہ غبار آلود ہو جائے ؟ اور یہ ہمارے نزدیک ناول اور ڈراما کی ترقی کے لیے اس قسم کی بے باکانہ راہ و رسم ضروری ہے ؟ فاضل مصنف نے اپنے دعوے کے آغاز میں یہ تسلیم کیا ہے ؟ کہ قدیم ہندستان میں ڈراما غیر معمولی ترقی کے درجے تک پہونچ چکا تھا ؟ جیسا کہ سنسکرت کے ڈراموں سے ظاہر ہوتا ہے ؟ کیا اُس زمانے میں مرد و عورت کی اخلاقی حالت اسی قدر پست تھی ' جیسا کہ یورپ میں نظر آ رہی ہے ؟ میں پردے کی موجودہ ضرورت سے زائد سخت بندشوں میں کچھ ترمیم ضرور چاہتا ہوں ؟ لیکن جنس لطیف کو مغربی خواتین کا نیم آزادی دے کر اس کے آبگینۂ عصمت کو جو اس

کی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے ؟ ٹھکرانا نہیں چاہتا ۔

آخری باب میں اُردو لٹریچر کی عام ترقی اور کارناموں پر نظر ڈالتے ہوئے فاضل مصنف نے جن فیاضانہ الفاظ میں اُردو زبان کی عام صلاحیت اور دیگر محاسن کا تذکرہ کیا ہے ؟ وہ یہ ہیں —

"اُردو زبان میں مسلمہ طور پر بہت زیادہ وسعت ؟ شیرینی اور لطافت ہے ؟ یہ علم اور تہذیب کی زبان ہے ؟ جس میں ہر قسم اور ہر رنگ کے خیالات اور احساسات کے ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔

"قومی ترقی و اصلاح کے موجودہ دور میں اُردو جو ہندو مسلم اتحاد کا نشان ہے اس کی اہمیت کو گھٹایا نہیں جا سکتا ۔"

"اُردو صحیح معنوں میں ہندستان کی عام مشترک زبان ہے ؟ کیونکہ تمام ہندستان میں اور ان مقامات میں بھی جہاں اُردو بولی نہیں جاتی عام طور پر سمجھی جاتی ہے ۔"

یہ تنقید کسی قدر ضرور طویل ہو گئی ؟ لیکن تصنیف زیر بحث کی حیثیت اسی کی مقتضی تھی ؟ لیکن پھر بھی حقیقت یہ ہے ؟ کہ اکثر مواقع پر مجھے کو اختصار سے کام لینا پڑا ؟ تاہم جو کچھ عرض کر سکا ؟ وہ غالباً اس تصنیف کی نمایاں خصوصیات کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہو ؟ یہ تو ممکن نہیں ؟ کہ کوئی تصنیف ہر قسم کے معائب اور فروگذاشتوں سے قطعاً پاک ہو ؟ یا مصنف کی تمام رائیں مان لینے کے قابل ہوں ، لیکن جہاں تک موجودہ انداز تحقیق و تنقید کا تعلق ہے ، اِس کتاب کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

رسید کتب :-

سلطان شہید — مصنفۂ محمود خاں محمود بنگلوری

قیمت ۱۲ آنہ -

محمود خاں نمبر ۹۴ بلاکیلی روڈ کنٹونمنٹ بنگلور

اس میں سلطان ٹیپو شہید کے حالات زندگی، ان کے جنگی، علمی اور سیاسی کارناموں کا تذکرہ ہے - جا بجا ولولہ خیز نظمیں بھی درج ہیں -

شوپنہار — دفتر ایوان اشاعت گورکھپور - قیمت ۱ روپیہ ۸ آنہ -

جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہار کے حالات زندگی اور اس کا فلسفہ از جناب احمد صدیق مجنوں - بی، اے -

زہر عشق — ایوان اشاعت گورکھپور مرتبہ احمد صدیق مجنوں گورکھپوری - قیمت ۱ روپیہ ۸ آنہ -

نواب مرزا شوق کی مشہور و معروف مثنوی کو جناب احمد صدیق مجنوں گورکھپوری نے ایک عمدہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے -

تذکرۂ مشاہیر کاکوری — مطبع اصح المطابع، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ - قیمت درج نہیں ہے - مولفہ مولوی حافظ علی حیدر صاحب علوی کاکوروی -

اس میں کاکوری کے علما - فقرا، شعرا اور مشاہیر اُمرا کے نثر و نظم و کلام کے انتخابات اور اُن کے تاریخی حالات درج ہیں -

تلاش حق جلد اول و دوم — جامعۂ ملیۂ اسلامیہ پریس
قرول باغ دهلي - قیمت في جلد ۱ روپیہ -
مہاتما گاندھی کي خود نوشتہ سوانحعمري - مترجمہ ڈاکٹر
سید عابد حسین ؛ ایم - اي - پي - ایچ - ڈي -

هندستاني فونٹیکس (بزبان انگریزی) —
مطبوعہ پیرس ؛ دارالاشاعت مکتبۂ ابراهیمیہ امداد
باهمي - اسٹیشن روڈ ؛ حیدرآباد دکن - مصنفۂ ڈاکٹر
محي‌الدین قادري زور ایم - اے - پي - ایچ - ڈي -
قیمت ۲ روپیہ ۸ آنہ -
حیدرآباد کی اردو صوتیات پر مغربي انداز میں لکھي
گئی هے -

گلشن گفتار — دارالاشاعت مکتبۂ ابراهیمیہ امداد باهمي
اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن -
مصنفۂ خواجہ حسن حمید اورنگ‌آبادي -
یہ شعراے اردو کا قدیم ترین تذکرہ هے جسے سید محمد ؛
ایم - اے نے ترتیب دیا هے -

دولت غزنویہ — مولفہ مولانا محمودالرحمن ندوي
قیمت ۲ روپیہ -
شیخ علي بخش ؛ احمد بخش ؛ مالکان کتب خانہ دارالادب
اندرون بھاٹي دروازہ ؛ لاهور -
سلطان محمود غزنوي اور اُس کے جانشینوں کے دیني اور
علمي کارنامے اور غلط فہمیوں کا ازالہ -

اداریہ

ہندستانی اکیڈیمی کے اراکین اور ممبروں کا انتخاب اگر چہ بالکل سرکاری طور پر ہوتا ہے ؛ تاہم اِس کے اراکین یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ کسی علمی و ادبی ادارے کا سرکاری حیثیت میں محدود و مقید رہنا اُس کی حقیقی ترقیوں کے لیے کچھہ زیادہ مفید نہیں ہے ؛ ملکی علم و ادب مشترکہ طور پر اہل ملک کی چیز ہے اور وہ اِس دولت عامہ و ملکیت مشترکہ پر اِسی طرح کا حق رکھتے ہیں جس طرح اکیڈیمی کی یہ کارکن جماعت ؛ اِس لیے ہندستان اور خصوصاً صوبہ متحدہ کے تمام ارباب علم و فضل سے سرسنہ تعلقات قائم رکھنے اور اُن کے مفید مشوروں سے اکیڈیمی کو مستفید بنانے کی غرض سے اکیڈیمی کی مجلس منتظمہ نے یہ تجویز کی کہ اکیڈیمی کی جانب سے ایک سالانہ ادبی کانفرنس منعقد کی جائے جس میں اردو اور ہندی کے ماہرین علم و ادب یکجا ہو کر دونوں زبانوں کے وسائل ترقی پر تبادلۂ خیال کریں اور اِس طرح باہمی تجویز اور مشورے سے ملکی لٹریچر کی اصلاح و ترقی کا کام انجام پائے ؛ لوگوں میں علمی بیداری اور ادبی مذاق پیدا کرنے کے لیے مشاہیر ادب کو مختلف مباحث و موضوعات پر مضامین لکھنے اور تقریر کرنے کی دعوت بھی دی جائے ؛ اور اکیڈیمی جن لکچروں کا سالانہ اہتمام کرتی ہے وہ بھی اِسی کانفرنس کے زمانے میں دیے جائیں ۔

چنانچہ پہلی ادبی کانفرنس سنہ ۱۹۳۰ع میں منعقد ہوئی تھی جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور ایسا نرداروں نے اپنے گرانقدر علمی مقالوں سے کانفرنس کو مستفید فرمایا تھا ۔ اب دوسری

ادبی کانفرنس کا انعقاد ۴ و ۵ و ۶ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع کو قرار پایا ہے اکیڈیمی کے اراکین اور کارکن جماعت نے اردو اور انگریزی اخباروں میں اعلان شایع کرائے ہیں ؛ ہندی اور اردو کے بھی رسالوں سے دعوت ناموں اور پرائیویٹ مراسلات کے ذریعہ کانفرنس میں شرکت کی درخواست کی ہے ؛ مہمانوں کے قیام و طعام اور اُن کی آسائش و مدارات کا بھی انتظام کیا ہے ۔

ہم کو کافی امید ہے کہ جو حضرات اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ کانفرنس میں شریک ہو کر اسے ضرور کامیاب بنائینگے ۔

اس سال کانفرنس میں نہایت اہم مباحث کے پیش ہونے کی امید کی جاتی ہے مثلاً تالیف و تصنیف کے باب میں اکیڈیمی کا طریق کار کیا ہونا چاہیے ؟ دوسری زبانوں سے اگر ترجمے کرائے جائیں تو اُن کی نوعیت کیا ہوگی ؟ آیا لفظی ترجمے کرائے جائیں یا اُن کے مطالب اور خلاصے پر اکتفا کیجائے ۔ مستقل تصانیف کے لیے کن امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا ۔ پھر ان کتابوں کا درجہ ؛ انشا و ادب کے اعتبار سے کیا ہونا چاہیے ؛ علوم و فنون کی کتابوں کے لیے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ وہ طلبہ کے کام کی ہوں یا عوام اور اہل علم کے لیے ؛ اسی سلسلے میں رسم خط اور زبان کا مسئلہ بھی آجاتا ہے ۔ اصطلاحات علمیہ کے تراجم کا مسئلہ بھی اکیڈیمی کے پیش نظر ہے ۔ اس باب میں بھی اہل علم اور اختصاصین کی رائیں طلب کی جائینگی ۔

غیر ملکی الفاظ و اصطلاحات کے ترجمے کے علاوہ ایک اہم مسئلہ خود ہندستانی لفظوں کا ہے ؛ ہندستان ایک زراعتی ملک ہے مگر ہمارے ؛ شعرا اور انشا پردازوں نے اپنی تمام توجہ شہری امور کی طرف

منذول رکھي اس لیے دیہات کی صدھا چیزیں ایسی ھیں جن کو ھم دیکھتے ھیں اور جانتے ھیں مگر صحیح طور پر اُن کے نام نہیں بتاسکتے اس میں زراعتي آلات ؟ بیلوں کي قسمیں؟ زراعتي کاروبار ؟ گھاسوں ' پھولوں مچھلیوں اور چڑیوں کے نام سب آ جاتے ھیں - جن لوگوں کو اُردو کي توسیع کا خیال ھے اُن کا فرض ھے کہ " لالہ و گُل " " نسرین و نسترن " سنبل و ریحاں " ماھي سقنقور و ھما " کے علاوہ ان ناموں کو بھی متعین کرلیں جن کا مسمیٰ تو برابر ھمارے گرد و پیش رھتا ھے مگر ھمارے پاس الفاظ نہیں ھوتے جن سے اُن کو پکار سکیں -

ھمیں اُمید ھے کہ کانفرنس اس مسئلہ میں اکیڈیمي کي خاص طور پر رھنمائي کریگي -

---

ھندستاني کے پہلے نمبر میں نظم و نثر کي نسبت ظاھر کچھہ حوصلہ شکن باتیں قلم سے نکل گئي ھیں؟ جس سے بعض حضرات نے تو یہاں تک سمجھہ لیا کہ شاید نظم و نثر کو سرے سے رسالے میں جگہ نہ مل سکے گی' حالانکہ اُصولاً ایسا نہ تھا البتہ " نظم و نثر " کے نام کے ساتھہ ھي ذھن کے سامنے " غزل نکف " حملہ آوروں بلکہ بلوائیوں کا ایک ھجوم نظر آیا جس سے سہم جانا ایک قدرتي امر تھا ؟ غزل اور غزل گوئي کو کیا کہئے کہ اپني بھي کل کائنات یہی ھے ؟ لیکن یہ کیا ضرور ھے کہ اپني غلطیوں کي رعایت سے رسالے کو بھي اس سے " آلودہ " و " ملوث " بنایا جائے -

من نہ کردم شما حذر کنید

ایک محفوظ اور سنجیدہ مشورہ ھے جس کے عرض کرنے اور سننے میں طرفین کو تکلف و تامل نہ برتنا چاھیے ؟ بہر صورت غزل کو کہ اس میں یا وہ گوئیوں اور ھرزہ سرائیوں کا زیادہ امکان و اندیشہ ھے - مسلسل

نظموں کو بشرطیکہ وہ سنجیدہ ، شگفتہ اور ولولہ خیز بھی ہوں ہم نہایت شوق و مسرت سے رسالے میں لینے کے لیے طیار ہیں -

---

ہندستانی اکیڈیمی اُردو اور ہندی میں سالانہ دو جلسوں کا اہتمام کرتی ہے، چنانچہ اس کے سال اُردو میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم - اے، پی - ایچ - ڈی صدر شعبۂ عربی و فارسی - الہ آباد یونیورسٹی "سامی لسانیات" پر اُردو میں اپنا مقالہ پیش فرمائیں گے -

---

یونیورسٹی کے طلبہ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے اکیڈیمی نے ۵۰۰ روپیے اُردو اور ۵۰۰ ہندی کے لیے مقرر کیے ہیں یہ انعامات اِس صوبے کے اُن طلبہ کے لیے مختص ہیں جو یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہوں مضامین کے لیے جو موضوعات مقرر کیے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں —

(۱) کسی ادبی موضوع پر ایک مضمون -

(۲) مسلسل واقعاتی نظم -

(۳) افسانہ -

(۴) ڈراما -

(۵) طنزیات -

اِمسال اکیڈیمی نے نظم و نثر کی کتابوں پر جو انعامات دیے ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے —

(۱) "معراج سخن" پر سید خورشید حسن عروج کو ۵۰۰ روپیے -

(۲) "المبین" پر مولانا سید سلیمان اشرف کو ۵۰۰ روپیے -

(۳) "نفسیات ترغیب" پر سید وہاج الدین کنتوری کو ۵۰۰ روپیے -

۱ — ہندستانی میں جو مضامین لیے جائیں گے اُن کا معقول معاوضہ دیا جائے گا -

۲ — معاوضے کا فیصلہ مجلس مدیران کے اختیار میں ہو گا -

۳ — مضمون نگاروں کو چاہئے کہ مضامین صاف اور خوش خط حروف میں کاغذ کے ایک طرف لکھہ کر روانہ کریں -

۴ — مضمون بیس پچیس صفحے سے زیادہ نہ ہو ؛ اور اگر اس سے زیادہ طوالت یا گریز ہو تو مضمون ایسے متعدد ٹکڑوں میں ہونا چاہئے جو اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھتے ہوں -

مرتب

هندُستاني

هندستاني اکیڈیمي کا تماهي رساله

جلد ۱ | جولائي سنه ۱۹۳۱ع | حصه ۳

*ولي کے معاصر هاشم علي

کا

دیوان مراثي

(از مولانا سید سلیمان ندوي)

(مضمون پڑھنے سے پہلے میں معذرت کرلوں کہ یہ سفر کي حالت میں صرف ایمائے عہد کي بنا پر لکھا گیا ھے)

اُردو کي جائے پیدائش بننے کا فخر خواہ ہندستان کے کسي گوشہ کو حاصل ہو؟ مگر اس میں کسي شبہہ کي گنجایش نہیں کہ دکن کا ملک وہ پہلي سر زمین ہے جہاں اُردو شاعري کا بیج نصب کیا گیا؟ اور اس بے نوا بن کر وہاں نشو و نما حاصل کي؟ شمالی ہند کے رہنے والوں نے جب اس پودے کے پھول اور اُس کی بو باس کو دیکھا؟ تو بے ساختہ اُس کي آبیاري کو آمادہ ہوئے اور چند روز کے بعد اُس کي قلم اپنی سر زمین

* یہ مضمون اکیڈیمی کي دوسري اُردي کانفرنس منعقدہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں پڑھا گیا تھا -

میں لگا کر اُس کو سدا بہار بنا دیا؟ قائم کے زمانہ تک اُردو کو دکنی کا طعنہ سننا پڑتا تھا —

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اِک بات لچر سی زبانِ دکنی تھی

تاریخ اُردو کی نئی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے ؟ کہ اُردو نظم نے دلی کے تخت طاؤسی کے بجائے مسند دکن کے زیر سایہ نشو و نما پائی سلطان قلی قطب شاہ نے ۹۱۸ ہجری میں قطب شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی، تو بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ تینوں میں شیعیت اور اور تفضیلیت کی اشاعت ہوئی، ساتھ ہی عزا اور میلاد کی مجلسیں قایم ہونے لگیں، جن میں محتشم کاسی وغیرہ کے فارسی بندوں کے ساتھ ملک کی دیسی زبان میں بھی شاعری کا رواج ہوا -

یہ بھی اردو زبان کی تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ اُردو میں عشق و محبت کی داستان سرائیوں سے پہلے مذہبی نظموں کی ترانہ سنجی پیدا ہوئی چنانچہ سلطان قلی اور اس کے بھتیجے محمد علی قطب شاہ ، اور دوسرے شعراء شجاع الدین نوری اور نصرتی نے مرثیے لکھے ، لیکن غالباً مرثیوں کے صنف میں سب سے زیادہ جو شخصیت نمایاں ہے وہ ہاشم برہانپوری کی ہے -

ہاشم برہانپوری کے مجموعۂ مراثی کا نام دیوان حسینی ہے، شاہ اودھ کے کتبخانے میں اس کا ایک نسخہ تھا ، جس کا ذکر اسیر نگر کے کیٹلاگ میں ہے ، آجکل اندرا یونیورسٹی کے کتب‌خانہ میں اس کا ایک نسخہ ملتا ہے جس کا ذکر آجکل کے بعض تحریرات میں کیا گیا ہے ؟ لیکن خوش قسمتی سے مارچ سنہ ۱۹۳۱ ع کے سفر پونہ میں محبی پروفیسر شیخ عبدالقادر (دکن کالج پونہ) کے کتب خانے میں اس کا مکمل

نسخہ میری نظر سے گذرا؛ جس سے ہاشم علی اور اس کے اس دیوان مراثی کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں -

ہاشم علی برہانپوری

نام کے سوا اس شاعر کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملے، جو کچھہ معلوم ہوتا ہے وہ خود اسی مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے - اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس کے آخر میں خوش قسمتی سے کاتب نے جو شاعر کا معاصر تھا ؛ چند سطریں حوالۂ قلم کی ہیں ؛ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام علی محمد خاں ہے اور ہاشم علی اس کا عجیب و غریب مرکب نام تخلص ہے، چنانچہ اس دیوان کے آخر میں ہے —

"تمام شد دیوان حسینی گفتۂ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی -"

اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی میں مرتب ہوا ہے ؛ اس کا سال ولادت اور سال وفات نہیں معلوم مگر اُس کے اس دیوان میں اس کے ایک مرثیہ کی تمہید میں ایک فارسی عبارت ہے ، جس میں مذکور ہے کہ ۲۰ رمضان ۱۱۴۸ھ کو اُس کے ہم مشرب و ہم عقیدہ دوست حافظ فضل الدین نے خواب دیکھا کہ ضریح سے صدائے غیب آئی اور ہاشم علی کو اپنے مرثیہ سنانے کی فرمایش سنائی دی ، عبارت یہ ہے —

" از جملہ تفضلات امام شہید کہ برین عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ کلام ربانی؛ فضل الدین در عالم رویا بتاریخ بستم ماہ مبارک رمضان ۱۱۴۸ ھجری مشاہدہ نمود (ص ۷۲) - "

اس کے بعد اس دیوان میں ایک مسمط مرثیہ ہے جس کا نام شاعر نے درد نامہ رکھا ہے ؛ اُس کے آخر میں یہ دو شعر ہیں —

جب منجم نے کیا اس درد نامہ کا حساب

عین و قاف و سین و طا آیا رقم اندر کتاب (۱۱۶۸ ھ)
۱۰۰۰ ۱۰۰ ۶۰ ۸

سن کے یو تاریخ کوں سینہ میں دل ہوتا کباب

ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادي کا بچن

اس لحاظ سے یہ ولي دکني کا معاصر ہے جس کا سال وفات ۱۱۵۵ ھ ہے ۔ عام طور سے ہاشم علي اس کا نام سمجھا جاتا ہے ؟ مگر اوپر کے اقتباس سے جو اس کی زندگی میں لکھا گیا ہے ہویدا ہے کہ اُس کا نام علي محمد خاں تھا اور "ہاشم علی" دوراً اُس کا تخلص ہے؟ گو یہ اسلوب تخلص شعراء کی طرز و روش کے خلاف ہے ؟ مگر واقعہ یہي ہے کہ یہ اس کا تخلص ہے؟ نام نہیں ؟ چنانچہ اس کے دیوان کے ہر قصیدہ اور نظم کے آخر میں یہي تخلص آیا ہے ؟ مثلاً

چو طرف ہاشم علي ہے سر بسر

انقلاب و فتنۂ و آشوب و شر

بول توں بلبل صفت ہاشم علي

صبحدم میں مدح اولاد علي

زندگي دنیا کي ہے ہاشم علي خواب و خیال

جو رہا سویا وہ چوکا ؟ جاگنا ہیگا محال

تجھے ہاشم علي محشر میں دریائے گنہ سینتیں

بھروسا ہے وہ شہ اوبر وہاں سین پار اُتاریگا

عام طور سے اس کو برھانپوري کہتے ھیں؟ شاید یہ اس کي جاے پیدایش ھو؟ مگر اُس کے دیوان میں ایک سعر یہ ھے :—

گجراب میں پڑي جب یہ مرثیہ کوں یاراں
سن کر چلے ھیں روے دکھني دکھن کو اپنے

اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ اُس کا قیام گجراب میں تھا ۔

دیوان حسینی

چونکہ ھاشم علي کا یہ دیوان سرٔسر مرثیوں کا مجموعہ ھے اس لیے شاعر نے اس کا نام "دیوان حسني" رکھا ھے ؟ چنانچہ وہ خود کہتا ھے .—

توں لکھا ھے کربلا کا یوں بیان ھاسم علي
ھے یو "دیوان حسیني" نام اس دیوان کا

معلوم ھوتا ھے کہ یہ ھر سال ماہ محرم میں نیا مرثیہ تصنیف کرتے تھے ؟ کہتے ھیں .—

تجھکو ھاشم علي حسین سرور
ھر برس مرثیہ لکھاتے ھیں

اپني شاعري کي برتري کا بھي اس کو خیال تھا .—

شاعروں نے شعر بولے گر چہ رنگیں دلکشا
اے عزیزاں یو سخن ھے اس دل بریان کا

عربي سے بھي واقفیت تھي؟ بعض مصرعے پورے عربي میں ھیں —

یہ بشارت بہشت کے در پر
اد خلوا خالدین سلام علیک
ربنا اغفرلنا خطایا نا
بالنبی الامیں سلام علیک

فارسي میں بھي بعض مرثیے کہے ھیں؟ جن کي زبان اچھي خاصي ھے ؟ حافظ کي فارسي غزل ع دل مي رود ز دستم صاحبدلاں خدا را

پر مصرعے لگائے ھیں -

ایسا معلوم ھوتا ھے کہ مرثیوں کے علاوہ وہ عرلیں وغیرہ نہیں کہتے تھے چنانچہ ایک جگہ مقطع میں یہ اقرار ھے :-

بجز مدح نہیں شعرِ ھاشم علي
کہو راستي کے سخن پر سلام

دوسري جگہ ھے —

شاعري میں یوں مقرر ھے تجھے ھاشم علي
جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط

ایک اور مرثیہ کا مقطع ھے :—

شعر ھاسم علي کے تئیں یاراں
مدح مولا مني دیکھیو خالص
ھاشم علي ھمیشہ ثنا خوان ساہ کا
جز مدح و منقبت سخن اُس نے لکھا نہیں

موجودہ نسخہ

دیوان حسیني کا یہ پیش نظر نسخہ میرے خیال میں نہایت ھي پرانا ھے ؟ اور خود مصنف کي زندگي میں لکھا گیا ھے ' جیسا کہ دام ظلہ کے الفاظ سے ظاھر ھے ؟ یہ نسخہ ۲۴×۲۸ کي تقطیع پر پرانے کشمیري کاغذ پر خوشخط نستعلیق میں لکھا ھوا ھے ؟ جدول اور بیچ کي لکیریں سرخ ھیں ؟ اصل دیوان اسي خط اور جدول میں ھیں ؟ دیوان حروف ابجد کي ترتیب پر الف سے یا تک مرتب ھے ؟ مگر شروع میں بیچ میں بعض بعض حروف کي ردیفوں سے بند اور آخر میں بعض نئي نظمیں جدولوں کے بغیر دوسرے خط میں اضافہ کي گئي ھیں ؟ جس سے معلوم ھوتا ھے کہ دیوان کي ترتیب کے بعد شاعر نے جو مرثیے کہے ھیں ' وہ اپني اپني جگہ پر اپنے

اپنے حروف میں بڑھائے گئے ھیں ؟ چنانچہ نسخہ مذکور کے آخر میں یہ تصریح بھی ملتی ھے :—

"ایں چند تا مرثیہ ھندی نو کہ در دیوان مرزا صاحب مشفق مہربان انیس خفی و جلی محمد علی سلمہ رتہ نبود، احقر عباد محمد علی عفراللہ تعالی ذنبہ برائے یاد و بود نوشت ؟ امید کہ ھر کہ بخواند بدعائے خیر فقیر حقیر را یاد نماید ۔

نوشتہ نماند سیہ بر سفید

نویسندہ را نیست فردا امید

تمت تمام شد دیوان حسینی گفتہ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ھاشم علی ۔"

اس نسخہ میں (۴۲۰) صفحے ھیں ؟ اور ھر صفحہ میں تقریباً سترہ شعر ھیں؟ اور یہ کل کے کل مختلف اصناف سخن میں سر تا سر مرثیے ؟ سلام اور بیان مصائب کربلا ھیں؟ اس سے اندازہ ھوگا کہ آج سے دو سو برس پہلے اردو کے ایسے شاعر موجود تھے ؟ جنھوں نے صرف مرثیوں کا ایسا ضخیم مجموعہ یادگار چھوڑا ؟ اور اس حیثیت سے یہ نسخہ عالباً ھندستان میں اپنی طرز کا تنہا اور یکتا ھے ۔

زبان کی خصوصیات وھی ھیں جو ولی کے کلام میں ھیں ؟ مثلاً

ستیں اور سیں	بجاے	سے
یو	,,	یہ
کوں	,,	کو
سوں	,,	سے
منی	,,	میں
میانی	,,	میں

کتیں	بجائے	کے تئیں=کے لیے
مجھے	,,	مجھے
انجھو	,,	آنسو
تمن	,,	تم
همن	,,	هم
هیگا	,,	هوگا
کسوں	,,	کسي
سونے	,,	سنے
اِیتا	,,	اتنا

جمع الف نون کے ساتھہ؛ یہاں تک کہ هندي لفظوں کي بھي؛ جیسے انکھیاں؛ پلکاں؛ انجھواں؛ مت (کلمہ نفي) کو "متہ" (ھاے کے ساتھہ) چنانچہ ایک مرثیہ جس میں ردیف متہ ھے؛ ت کے بجائے ہ کي ردیف میں جگہ دي ھے -

هندي لفظوں کا بکثرت استعمال؛ جیسے بچن بات کے معني میں مُکھہ منہ کے معني میں —

رو رو سکینہ عم سوں کہی پھر نہیں سونے
بابا کے مُکھہ سوں میٹھي بچن کربلا مني

سیس سر کے معني میں؛ نمانا؛ جھکانا؛ من دل کے معني میں؛ دولن بجائے دلھن :—

بیٹھي گھونگھٹہ میں سیس نما درد سیں خموش
روتي ھے آج من میں دولن کربلا مني

سجن بمعني محبوب :—

جب سیں چلے ھیں میرے سجن کربلا مني

دیسے بمعنی دیکھے ع چہرہ خورشید سا دیسے تیرا

باج بمعنی بن ع آج تجھہ باج سیہ پوش ہوا کعبہ و عم

جگت بمعنی دنیا ع ہاشم علی ہو جگت میں سبھی ملال

اندھکار بمعنی اندھیرا ع آج تجھہ باج جگت نیچہ ہے اندھکار حسین

اوجاری بمعنی اُجالا ع دو جگ کے اُوجاری پر ایتنا ستم

چندر بمعنی چاند بھر محرم کا چندر آیا ہوتا کاسکے

قتل سرور کی خبر لایا ہوتا کاشکے

کرن بمعنی کان دونو گالوں اوپر رلعاں بڑی چھوٹی کرن ہے ہے

نین بمعنی آنکھہ کیا نور نین ہے ہے

چرن بمعنی قدم ع افسوس ہے نہ لائی گھرمیں چرن توں اپنی

اکاس بمعنی فضا ع غم کے داعاں سے بھرا سارا اکاس

داس بمعنی غلام اے شہ دیں کمریں ہاشم علی

ہے تمہارا بندۂ و مملوک و داس

ذرا اوپر کے دوسرے مصرعے کی فارسی و ہندی ترکیب کی آمیزش ملاحظہ ہو ۔

نگر بمعنی شہر سن نگر میں شور محشر ہر گلی

ہے شبِ قتلِ شہیداں آج راب

اس نگر سے کوئی خاص شہر عالباً مراد نہیں ، کہ دوسری جگہ وہ کہتا ہے —

اس درد سوں ہاشم علی لاگے دلاں میں تلملے

نگروں نگر، گلیوں گلی کہتے ہیں یاراں وا حسین

باوجود اس قدامت کے مرثیہ کے بہت سے شعر صاف ہیں —

صاف شعر

ظلم کیا کربلا ہائے فلک کیا کیا
فاطمہ کا دل جلا ہائے فلک کیا کیا
جس کے گلے مصطفا بوسہ لیا بارہا
شمر کا خنجر رکھا ہائے فلک کیا کیا
عابدین بیمار تھا شاہ گرفتار تھا
تجھکوں سزاوار تھا ہائے فلک کیا کیا
شکوۂ دوراں لکھوں غم کی یو داساں لکھوں
کاں (کہاں) تلک ہردم کہوں ہائے فلک کیا کیا

جس وقت شاہ دن سوں پیاسا جگر سدھارا
بیتاب کھول سر کوں زینب نے یوں پکارا
دیکھو رسول احمد؟ فرزند کوں تم اپے
افسوس کربلا میں بے سر پڑا ہے مارا
یہ کوفیان بیدیں، مہماں بولائے ہم کو
بن جور بن جفا سوں کرتے نہیں مدارا

ہوا پھر کر محرم کا مہینا
نبی کے آل کا توتا سفینا
سدھارا تشنہ لب فردوس کوں وہ
جہاں میں کوئی نہ تھا جس کا قرینا
سلیماں تخت کو چھوڑا ہے روتا
گرا خاتم نبی کا جب نگینا
کہا شہ بے حرم سوں نہیں ہے چارا
مجھے شربت شہادت کا ہے پینا

نہ یہ تبدیل پاوے آج تقدیر
ہوئے حق کے قضا اوپر رضینا
سکینہ نے کہا وہ دن نہ آوے
جہاں میں بے پدر ہو مجھکو جینا
یہ دشت کربلا ہے ہائے بابا
کہاں مکہ کہاں جد کا مدینا

نمونہ کلام

ان مرثیوں میں سرتاپا پُر درد مضامین، ماتم، بین، یتیمی اور بیکسی کے حسرت انگیز واقعات بیان کیے گئے ہیں، مناظر قدرت، لڑائی کا نقشہ، گھوڑے کی تعریف، تلوار کے تشبیہی مضامین اور مبالغہ کی رنگ آمیزی مطلق نہیں، بلکہ درد و غم کے صرف فطری مضامین ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں، ایک مرثیے کا عنوان ہے :—

"توجہ نمودن شہر بانو بعد از شہادت امام زادہ علی اصغر و بیان کردن حالات و مکالمہ نمودن با او"

دیکھو کہ ایک معصوم ننھے بچہ کی موت کا کتنا پُر اثر فطری بیان ہے -

کہتیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
بالے اصغر باج میں کس کا جھولاؤں پالنا
اے جان مادر کہاں ہے تو پھر کر میں تجھکو کہاں ملوں
بیٹھی اکیلی کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
بر میں سولاؤں میں کسے دودھ پلاؤں میں کسے
حامل پلاؤں میں کسے کس کا جھولاؤں پالنا
سویا ہے گردن ڈال کیوں، اولجھے زلف کے بال کیوں
رنگین لوہو میں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

تو کھول انکھیاں میں دیکھوں؟ تو بول بتیاں میں سنوں
روتا نہیں تو کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
تو چھوڑ مجھکو کہاں گیا ؟ توں دود کس کا کنوں پیا
بسرا ھے میري کیوں میا کس کا جھولاؤں پالنا
بھیگا لہو میں ھے گلا ؟ لیتی ھوں تیري میں بلا
توں پاس اپنے مجھہ بولا کس کا جھولاؤں پالنا
جاؤں ؟ ادھر میں کیا کروں ؟ یہ گود خالي لے پھروں
اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
یہ دیکھہ میرا حال توں ؟ توري موں سر کے بال کوں
میں دل کي حالت کیا کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
تھے کھیلنے کے دن ترے ؟ کیا عمر تھي کیا سن ترے
نہیں چین مجھکو بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا
نہیں بھولي مجھکو توں کبھوں؟ تجھہ یاد کرنے میں رھوں
رو رو کے تجھہ بن دن پھروں کس کا جھولاؤں پالنا
یہ بہن تیري غمگسار ؟ بیٹھي ھے روتي زار زار
تو اُٹھہ سکینا کر پکار کس کا جھولاؤں پالنا
توں روٹھہ ھت کر کہاں گیا؟ میں تجھکوں لاؤں پھر منا
مٹھہ ھوئے مجھسوں تو جدا کس کا جھولاؤں پالنا
تیري صورت پر میں فدا ؟ پھرنا نظر میں توں رھا
جب کہ لحد میں توں گیا کس کا جھولاؤں پالنا
جاتا نظر سیں دور کیوں ؟ توں مجھسوں ھوتا دور کیوں
اتنا ھے غم کا دور کنوں کس کا جھولاؤں پالنا
کہاں سبب اجل تھي گھات میں؟ گئي لیکے تجھکو ھات میں
بالا کیا جي بات میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے میرے پیارے لاڈلے ؟ پھر آ کے لگ توں مجھہ گلے
انجھوں نین سیں نہ چلے ؟ کس کا جھولاؤں پالنا
کہاں کھیلتا ھے آج تو ؟ خالي یہ گھر تجھہ باج یوں
جاتا ھے میرا راج کیوں کس کا جھولاؤں پالنا
ھاشم علی کوں نہیں تواں ؟ بابو کا لکھنا سب بیاں
کہتي تھي ھر دم با فغاں کس کا جھولاؤں پالنا

حضرت قاسم کی شادي اور شہادت کا پُر اثر سماں اِن لفظوں میں کھینچا ھے جس سے آج سو دو سو برس پہلے کے رسم و رواج ظاھر ھوتے ھیں -

محبان غم شہیداں کا دلوں سیتیں بھولاوو متہ
جگر میں شہ کي فرقت کي اگن جلنی بوجھاوو منہ
جس کی جب وصیت پر لگے قاسم کے تئیں بھیاے
کہا رخصت کرو رن کوں ؟ یہ جنگل میں بہاوو متہ
نہیں سامان شادي کا مصیبت سب مہیا ھے
یہ سر کاٹیں گے رن میانے اُسے سہرا بندھاوو متہ
پلادیں گي مجھے شربت شہادت کا حوراں ساری
نہیں پاني پیاسوں کوں سو شربت کر پلاوو متہ
براتي ساتھہ نہیں میرے چلے ھیں سب شہید ھو کر
میرے سر برقصا پھرتي دگر چھتر پھراوو متہ
طبق دیکھے ملائک کوں لے آئے نور کے ؟ رن میں
کہا قاسم نے اے امّاں بری میري لے جاوو منہ
لہو میں لال ھووینگے ؟ مرے دو ھاتھہ کنگن کے
نہیں حاجت مجھے مہندي ؟ انھو سینتن گندھاوو منہ

سینه کے دف رهیں بجتے میری شادی کے تا محشر
سو غم کی آج تم نوبت میرے بھیا کے بجاوو مته
لوهو اور خاک رن میانے لگے گی میرے تن اوپر
اوبتنا تیل مته لاؤ ؟ مجھے روتی چڑاوو مته
زمیں کے سیج پر سونا مجھے هے گا لحد میانے
رهیگی سیج سب خالی نہیں فرصت بچھاوو مته
جدائی آج هے قسمت نہیں یه روز اجل هے گا
سو دولھن ساتھه تم میرا یه عقد غم پڑھاوو مته
مقرر مہر مثل هے گی شہادت رن میں پانے کوں
سو جُلوه میں ادا کرنا یه نقدِ جاں دلاوو مته
اجل سیں تلخ اب هوتا میرا شیریں دهن دیکھو
جگر اس غم سو هے ٹوکرے ٹاتاں کو چوناوو مته
کہاں دولھن ستیں روتا سو تخت جُلوه سیں اوٹھه کر
میری دوری کی آتش سوں دل اپنا نہ جلاوو مته
عروسی کل قیامت کوں هماری هے گی جنت میں
رکھو ٹھه ناک مین اپنی سوهاگ اپنا لٹاوو مته
شہادت سن میری هرگز سنگار اترن نتورو تم
سو کاجل کو نین سیتیں نہا انھو مٹاوو مته
روا هے آج دولھن کوں سراپا لال جلوه کا
میرے لہو میں رنگو آنچل دگر رنگ تم رنگاوو مته

اس نسخه میں ایک رائے خاص لحاظ کے قابل یه هے ؟ که اِس میں اکثر ثقیل هندی حروف کو خفیف لکھا گیا هے ؟ مثلاً ٹیٹھے کی جگه ٹٹھے ؟ توڑو کی جگه تورو ؟ لوتاؤ کی جگه لوتاؤ ؟ اوبتنا کی جگه اوبتنا ؟ وغیره ؟ اس سے معلوم هوتا هے که ابھی تک فارسی کی

عادی زبانیں ہندی حروف کے ادا کرنے پر پوری طرح قادر نہیں ہوئی تھیں ؟ الف ممدودہ کو الف پر مد دیکر لکھنے کے بجائے دو الف سے لکھا ہے یعنی "آ" کو "اا" ورن میں بعض حروف کے گرنے کی پروا اُس نے نہیں کی ہے نین کی جگہ نینں ؟ نہیں کی جگہ نئیں ؟ اسی طرح عربی لفظ عروس کو عارس باندھا ہے ۔

غزل گو میر و مرزا سے پہلے کے پرانے اردو شعراء کے عرلیات کے بہت سے دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ؟ جن سے ہماری زبان کی تدریجی ترقی ظاہر ہوتی ہے ؟ مناسب ہے کہ اسی طرح مرثیہ گو میر و مرزا سے پہلے کے اس مجموعۂ مراثی کو بھی شائع کیاجائے ؟ تا کہ پتہ چلےکہ وہ زمین‌تھی جس کو میر و مرزا نے اپنی بلند خیالیوں سے آسمان بنا دیا ؟ اور معلوم ہو کہ ان مرحومین نے جس گلستان سخن کو سدا بہار بنا دیا ؟ اس کا آغاز بہار کیونکر ہوا ؟

اس نسخے کے اصل دیوان کا پہلا شعر یہ ہے ؟ جو حمد میں ہے ۔—

ابتدا ہر نامہ و ہر کام کا
لازم آیا ذکر تیرے نام کا

اور آخری شعر یہ ہے —

یہی آرزو دل میں تجھے ہاشم علی دائم
کہ مولا کے کرم سینیں نجف اور کربلا دیکھے

مگر دیوان کی ترتیب کے بعد جو نئے مرثیے اضافہ کیے گئے ہیں ؟ اس کے لحاظ سے ردیف الف میں پہلا شعر یہ ہے —

افسوس ہے ہزار کہ بوشہ گذر گیا
روتی دولھن کون چھوڑ گھونگھٹہ میں؟ گزر گیا

اور آخری شعر یہ ہے جو اردو مسدس کا فارسی بند ہے —

داشت ہاشم علی چو روے ارادت بہ نیار
کرد منظوم چنیں واقعہ در سور و گدار

مجموعہ کے شروع میں غالباً اسي زمانے کے ایک اور مرثیہ‌گو شاعر کے دو مرثیے ھیں جن‌کي زبان بھي اسي قسم‌کی ھے ؟ اور ان میں شاعر کا تخلص تقي آیا ھے ؟ یہ حسب معمول چومصرعے ھیں؟ تین مصرعے ایک قافیہ کے اور چوتھا پورے مرثیہ میں ایک قافیہ اور ردیف کا ؟ سودا تک نے اسي رنگ میں مرثیے لکھے ھیں .—

نامہ اعمال کا اُس کے ھے گناھوں سیں سیاہ
تجھہ سیں اُمید شفاعت ھے تقي کو اے شاہ
تجھہ سوا کوئي کي دو جگ میں نہیں رکھتا پناہ
ار ارل تیرے چرن سیتیں لگا ھے ھائے ھائے

مسلمانوں کا ہندستان میں آنا

(از ڈاکٹر تارا چند ایم اے - ڈی - فل)

بہت پرانے زمانے سے ہندستان اور ایسیا کے مغربی ملکوں کے مابین تجارت ہوتی آئی ہے - عرب، فلسطین، مصر، کابل، اسیریا اور دوسری قوموں کے سوداگر ہمارے ملک کی چیزیں منگاتے تھے[1] اور اپنے ملک کا مال یہاں بھیجتے تھے۔ سلیمان نے بھی جو یہودیوں کا بڑا نامی بادشاہ ہوا ہے اپنے مشہور مندر کے بنوانے کے لیے ہندستان سے سونا ہاتھی دانت اور مور کے پر منگوائے تھے[2] - مصر کے بطلیموس خاندان کے بادشاہوں نے بحر احمر کے کنارے ہندستان کی تجارت کے لیے بندرگاہوں کی بنیاد ڈالی - ایران کے بادشاہوں نے ان کی دیکھا دیکھی خلیج فارس میں بندرگاہ قائم کیے[3] - یونانی سوداگر ساحل مالابار سے چاول، ادرک، کالی مرچ، دارچینی خریدتے تھے[4] - اور یونانی و رومی مصنفین ہندستان کے جغرافیے سے واقفیت رکھتے تھے مثال کے لیے "ہیالوس اور بلنی" پہلی صدی کے، بطلیموس دوسری صدی اور کوسما جہتی صدی عیسوی کے مصنفین کے نام ہیں - اسمار مارسالی لکھتا ہے کہ لڈیا، لکادیب اور مالدیب کے لوگوں نے سپہسالار سولمر کے ساتھ سیر بھیجتے تھے - ایک کتاب ہے جس کا نام "پیوتنگر کرانی تبلس" ہے

---

1. ہنٹر - ہسٹری آف برٹش انڈیا جلد اول صفحہ ۲۰۷ -
2. ہنٹر - ہسٹری آف برٹش انڈیا جلد اول باب اول -
3. کنیتی - جے - آر - اے - ایس - سنہ ۱۸۹۸ ع -
4. کنیتی - جے - آر - ایس سنہ ۱۸۹۸ ع -

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں کرنگانور میں رومیوں کی، اور مصر کے بندرگاہ اسکندریہ میں ہندؤں کی آبادی تھی اس ہندستانی آبادی کو روم کے ظالم قیصر "کار اکلا" نے تیسری صدی کے شروع میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا؟ جنوبی ہندستان میں "آگستس" سے لے کر "رینو" تک یعنی پانچ سو برس کے سکے آج تک ملتے ہیں ؛ اور اس تجارت کا پتا دیتے ہیں جو ہمارے اور مغربی ملکوں کے مابین جاری تھی -

ایران بھی تجارت میں روم سے پیچھے نہ تھا † - ایرانیوں نے دریائے دجلہ اور فرات کے دھانے پر بصرے کے نزدیک "اوبولا" کا بندرگاہ بنایا - ساسانیوں نے حیرا کو صوبے کا پایۂ تخت قرار دیا - عربی مورخین لکھتے ہیں کہ حیرا کے باشندے دن رات اپنے مکانوں کی چھتوں پر سے ہندستان سے آنے والی کشتیوں کو دیکھا کرتے تھے خسروا نوشیرواں کے وقت میں تجارت بڑی ترقی پر تھی اس نے خود سندھ پر حملہ کیا تھا اور "دارا" نے اپنے بیڑے کو لنکا بھیجا تھا تا کہ ان لوگوں کو ؟ جنھوں نے ایرانیوں کو مار ڈالا تھا ؟ سزا دے - تاجک شاعر ‡ کا نام ہی بتلاتا ہے کہ ہندیوں اور ایرانیوں میں کتنا گہرا تعلق تھا -

§ عرب کے رہنے والوں نے ہندستان اور مغرب کی تجارت میں بڑا حصہ لیا ان کے ملک میں سمندر کے کنارے بہت سے بندرگاہ تھے جیسے عدن جنوب میں؟ اور بحر مشرق میں؟ بحر ہند کی کشتیوں میں عربی ملاح تھے اور اس سمندر کے دونوں کناروں پر ان کی بستیاں تھیں

نیورسٹس - عجائب خانۂ مدراس کے سکے - فہرست نمبر ۲-

† رینو جاگرفی - دی ایوالنا صفحہ ۳۸۲ -

‡ کار ڈیر ملانجے - ایچ - ڈیرنبور - نوٹس سورلے مسلمان دی شین - Coridier Melange H Derinburg notes sur les Musalmans de chine

§ رینو ریلا سیاں دی ریاز مے یارلیر اراب اے لا پرسان- داں لیبرینڈ اے آلاسن داں لے ۹ سی ایکل ، قرم ایک -

ہندستان کے مغربی کنارے پر چول ؟ کلیان ؟ سوپارا وغیرہ مقاموں پر آج بھی ان کے آثار پائے جاتے ہیں - رینوں کا خیال ہے کہ چودھویں صدی تک ساحل ملابار پر عربوں کا ویسا ہی اثر تھا جیسا بعد میں پرتگالیوں نے قایم کرلیا -

ساتویں صدی میں جب اسلام کا جھنڈا بلند ہوا اور عرب کی سب قومیں ایک جھنڈے کے سایہ میں جمع ہوئیں تو اس تحریک کو بہت زور پہونچا جو حضرت محمد کی پیدائش سے پہلے شروع ہوگئی تھی - عرب چاروں طرف تیزی کے ساتھ پھیلنے لگے - ان کی فوجیں جنگلوں؟ میدانوں اور پہاڑوں کو عبور کرتی ہوئی شام؟ ایران افغانستان اور بلوچستان کو طے کر کے ہندستان کی سرحد پر پہونچ گئیں - مسلم بیڑوں نے ایرانیوں کے بیڑوں کو سمندر کی آبناء گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سونپ دیا اور بحر ہند پر اپنا قبضہ کر لیا - ان بیڑوں کے ساتھ ساتھ عرب کے سوداگر بحر ہند کی ساری تجارت کے ٹھیکے دار ہوگئے -

عربوں کی کشتیاں؟ مغرب میں بحر احمر کے کنارے سے یا جنوبی کنارے سے چلتی تھیں- اور ہندستان میں ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یا تو سندھ کے دہانے میں اور کھمبائت کی خلیج (Bay of Cambay) میں پہونچ جائیں یا ملابار کے بندرگاہوں میں جا کر مال اتار دیں - پہلی صورت میں وہ ایسیا کے کنارے کنارے کشتیوں کو لگائے رکھتے تھے لیکن دوسری صورت میں برسات کی ہواؤں (Monsoon) سے فائدہ اٹھانے کے لیے بادبان کھول کر بیچ سمندر سے ڈکولم جا پہنچتے تھے - یہ کولم سے کالی کٹ کو چلتے ہوئے لدے ؟ ملایا مشرقی ممالک اور چین کو چلے جاتے تھے -

* کشتی مبدیول تھی -
+ رینو جغرافی دی انڈیا -

مسلمانوں کا پہلا بیڑا حضرت عمر * کی خلافت میں سنہ ۶۳۶ع میں ہندستان آیا اُس وقت عثمان ثقفی بحرین کا صوبہ دار تھا اور اس نے ایک فوج سمندر کے راستے سے تھانے کے بندر پر بھیجی - خلیفہ نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور عثمان کو اس حرکت سے روکنے کے لیے سخت سزا کی دھمکی دی - حضرت عثمان کے زمانے میں ہندستان کی طرف کئی بار دیکھ بھال اور توہ لینے کے لیے فوجی دستے آئے اور آخرکار سنہ ۷۱۲ع میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس صوبے کو عربوں کی مملکت میں شامل کرلیا -

جس وقت مسلمان صوبے داروں اور فوجی کمانڈروں کی للچائی ہوئی نگاہیں سندھ پر پڑ رہی تھیں اس وقت عرب کے سوداگر ساحل ملابار پر امن کے ساتھ اپنی بستیاں بسا رہے تھے† - مدراس کے ضلع کے منیول ‡ میں "استرروک" لکھتا ہے کہ ساتویں صدی سے عرب کے سوداگر ہندستان کے مغربی کنارے پر بس رہے ہیں - وہ ہندستانی عورتوں سے شادیاں کرتے تھے§ اور ان کے رہنے اور گھر بنانے میں کسی طرح مزاحمت نہیں کیجاتی تھی - بلاذری نے اپنی تاریخ میں اس بات کی تصدیق کی ہے - حجاج کے حالات میں اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک جہاز لنکا سے کچھ مسلمان لڑکیوں کو جن کے ماں باپ

---

* ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا - جلد اول صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶ -

† رولینڈ سن مقدمہ تحفۃالمجاہدین ڈی ' ڈی لینڈ آف دی نیرو ملس صفحہ ۳۶۵ -

‡ استرروک جنوبی ہندوستان (مدراس ڈسٹرکٹ منیول) صفحہ ۱۸۰-

§ ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا - جلد اول صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹-

مر گئے تھے واپس لے جارہا تھا ؟ اس جہاز پر "کچھ" کے لٹیروں نے حملہ کیا اور لڑکیوں کو گرفتار کر لیا ۔ حجاج نے راجہ داہر سے لڑکیوں کو چھڑانے کے لیے مطالبہ کیا لیکن داہر نے اس پر توجہ نہیں کی تب حجاج نے قاسم کو فوج اور بیڑے کے ساتھ داہر پر چڑھائی کے لیے بھیجا ۔

حجاج اپنے جبر و تشدد کے لیے مشہور ہے ۔ اِس نے ہشام کے گھرانے کے لوگوں کو اس قدر تنگ کیا کہ انہوں نے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لی اور "کونکن" اور کنیا کماری (Cape Comorin) کے مغربی ساحل پر ڈیرا جمایا ۔ اُن کی اولاد سے "نوائت" اور "لٹے" قومیں ہیں جو اب بھی ان مقامات پر آباد ہیں ۔

کولم میں "میپ کٹو" نام کے قبرستان میں علی بن عثمان کی قبر پر سنہ ۱۶۹ھ (سنہ ۷۸۰ء) کا کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں مالابار کے ساحل پر مسلمان آباد ہو گئے تھے ۔ مسلمانوں کا اثر بہت جلد جلد بڑھا ۔ ہندو راجاؤں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی ۔ اُن کی تجارت کے لیے آسانیاں بہم پہونچائیں ۔ انہیں زمین خریدنے، مسجدیں بنانے کی اجازت دی ۔ مالابار میں آباد ہونے ہی ان سوداگروں نے اپنے مذہب کے پھیلانے کی کوشش شروع کردی ۔ مسلمانوں میں بزرگ اور تارک نہیں ہوئے لیکن ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مذہب کی تبلیغ کرے ۔ قرآن میں لکھا ہے کہ لوگوں کو خدا کے راستے

---

۱ واٹس مسٹرز اینڈ کرگس ' جلد اول صفحہ ۳۵۳ - اور کلاڈا اینڈ جنٹیبرا گرنیر - صفحہ ۷۳ -

۲ انیر مالابار اینڈ اینجنگو ڈسٹرکٹ گزیٹیر صفحہ ۴۳۶ -

پر چلنے کا پیغام دو اور انہیں عقلمندی کے ساتھ اور رحم کے ساتھ ملاؤ - قرآن (۱۶ - ۱۲۶) اس تبلیغ کے کام میں نہ صرف مرد بلکہ عورتوں تک نے بڑا حصہ لیا ہے - حضرت حسن کی بر بوی نعیسہ نے مصر میں بہتوں کو مسلمان بنایا - اُن کے بارے میں روایت ہے کہ وہ جس گھر میں رہتی تھیں اُس کے بڑوس میں ایک ذمی کا گھر تھا - اُس کی لڑکی ایسی بیماری میں مبتلا تھی کہ اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی تھی - وہ رات دن بیٹھ کے بھل چارپائی پر پڑی کراہا کرتی تھی - ایک دن اُس لڑکی کے ماں باپ کو بازار جانا پڑا - انہوں نے نعیسہ سے لڑکی کے پاس رہنے کے لیے خواہش ظاہر کی - نعیسہ کو بڑا ترس آیا اور انہوں نے اُس کے پاس رہنا منظور کر لیا - جب ماں باپ چلے گئے تو نعیسہ نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ "اُس لڑکی کے دکھ کو دور کر" - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی اچھی ہو گئی - ماں باپ اور سارا کنبہ نعیسہ کا گرویدہ ہو گیا اور اُنہوں نے اظہار تشکر میں اِسلام قبول کر لیا -

مسلمان مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکہ قیدی تک اشاعت مذہب کے لیے طیار رہتے تھے - ایک مسلمان قیدی نے سب سے پہلے یورپ میں اسلام پھیلایا اور "بیچے بیگ" قوم کو جو گیارھویں صدی میں ڈینوب اور ڈون کے بیچ میں آباد تھی ' مسلم بنایا -

علام سرور نے خزینۃالاصفیا میں لکھا ہے کہ شیخ احمد مجدد کو جہانگیر نے قید خانے میں بھجوادیا تھا - اُنھوں نے دو برس میں سیکڑوں ہندو قیدیوں کو مسلمان کر لیا -

آٹھویں صدی میں مسلمانوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے کئی اسباب تھے — دکھن کے لوگ اُنھیں عرب کی نگاہ سے دیکھتے تھے - ان کی دولت ' اور بڑھتی ہوئی طاقت کا ان کے دلوں پر

سکہ جم گیا تھا ؟ لیکن سب سے بڑھکر مسلمانوں کے خیالات ان کے رواجوں، ان کے اطوار اور چال چلن کا اثر بڑا - مسلمانوں کا مذہب سادہ ؟ آسان اور اچھا تھا - ان کی دستش کے طریقے دلوں میں گھر کرنے والے تھے اور رات دن خدا کی یاد دلانے والے تھے -

رینان ایک فرانسیسی عالم نے خود قبول کیا ہے "میں جب کبھی مسجد میں جاتا ہوں تو میرا دل ایک نا قابل بیان کیفیت سے آمنڈ آتا ہے اور میرے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ میں مسلمان کیوں نہ ہوا"- جب رینان ایسے کٹر مُلحد اور سائنسداں کے دل پر اسلامی عبادت کا ایسا اثر ہوتا تھا تو اوروں کا کیا ذکر ہے - ایک اور بات جو بھولنی نہیں چاہیے یہ ہے کہ پہلی صدیوں کا اِسلام ایک بڑا عملی مذہب تھا - اِسلام کے ماننے والے اپنے عقیدوں کو محض زبان سے نہیں دھراتے تھے بلکہ اپنے زندگی اور چال چلن میں اُن پر پابند ہوکر رہتے تھے - اُن کی نماز کی صف بندی ؟ روزوں کی سختی ؟ جنازہ اور عُسر کے قاعدے ؟ سماج میں برابری اور مساوات کا برتاؤ ؟ مذہب کے ایسے زبردست حصے تھے کہ آدمی کے دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے -

اس کے خلاف آٹھویں صدی میں دکن میں ہندستانی دھرموں میں سخت اختلاف جاری تھا - بودھ ؟ جین اور ویدک دھرم کے ماننے والے ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے - برہمنوں کی کوشش سے بودھ اور جین دھرم جتم ہو چلے تھے اور شیو اور وشنو کا مت پھیل رہا تھا - سیوسی دنیا میں بھی ایک طوفان برپا تھا - جیر اور کرال کی طاقتیں گھٹ رہی تھیں اور نئے گھرانے اوبھر رہے تھے - مسلمان دکن میں اس وقت پہونچے

---

* ۱ ایئر ہسٹاریکل اِسکیچ آف دی ایڈمنٹ دکن -

جب سماج اور راج میں فساد برپا تھا - اُن کے آنے کا قدرتی طور پر بڑا اثر ہوا - نویں صدی کے اوائل میں مالابار کے خاندان کا جو چیرمن پیرو مل * سے ملقب تھا خاتمہ ہوا اور اُس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے آخری راجہ نے جس کی راجدھانی کودنگلور تھی اپنے دھرم کو چھوڑ دیا اور اِسلام قبول کر لیا -

مشہور یہ ہے کہ راجہ نے خواب میں یہ دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں صبح کو اُس نے خواب کی تعبیر پوچھی تو کوئی ٹھیک مطلب نہ بتا سکا - اتفاق سے مسلمانوں کی ایک جماعت جو لنکا سے لوٹ رہی تھی راجہ سے ملنے کو دربار میں حاضر ہوئی - اس کے سردار نے خواب کی تعبیر ٹھیک ٹھیک بتادی اور راجہ کو اپنے مذہب کی تعلیم کی - اس کے بعد راجہ مسلمان ہوا اور عرب کے ملک کو گیا - وہاں سے اُس نے ملک ابن دینار ، شرف ابن مالک اور مالک ابن حبیب کو مالابار بھیجا - اُنھوں نے یہاں آکر گیارہ جگہوں پر مسجدیں بنائیں اور اِسلام کی اشاعت کی -

راجہ کے مذہب بدلنے کی وجہ سے ملک میں بڑی ہلچل مچی اور اس واقعہ نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا - مالابار میں آج بھی اس واقعہ کی یاد زندہ ہے جس وقت راجہ تخت پر بٹھایا جاتا ہے تو اُس کا سر مونڈتے ہیں اور اُسے مسلمانوں کا سا لباس پہناتے ہیں - ایک مولا اُس کے سر پر مُکٹ رکھتا ہے † - گدی پر بٹھائے جانے کے بعد راجہ کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں

---

* لوگن " مالابار " جلد اول صفحہ ۲۴۵ -

† قادر حسین خاں "ساؤتھ انڈین مسلمانس" مدراس کرسچین کالج میگزین ۱۳-۱۹۱۲ صفحہ ۲۴۱ -

جو ایک ذات سے نکالے ہوئے آدمی کے ساتھ - وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا ؛ نائر لوگ اُس کو چھو نہیں سکتے - یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ راجہ آخری چیرمن پیرومل کا وائسرائے ہے اور اپنے راجہ کے لوٹنے کا انتظار کر رہا ہے -

ترانکور کے مہاراجہ ؛ تخت نشینی کے وقت ؛ تلوار کمر میں باندھتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ " میں اس تلوار کو اس وقت تک رکھونگا جب تک میرا چچا جو مکہ گیا ہے لوٹ نہ آئے " - آخری چیر من پیرو مل کی داستان کہاں تک تاریخی حیثیت سے سچی ہے کہنا مشکل ہے لیکن اس واقعے کے کچھ آثار باقی ہیں - گو نائکوں کے نام ٹھیک ٹھیک نہیں ہیں کیونکہ چیرمن پیرومل خطابی نام ہے - لیکن اتنا ماننا ہی پڑیگا کہ کو ڈنگلور کے شاہی خاندان کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ اُس کے آخری راجہ نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا -

اس میں شبہہ نہیں کہ اُس زمانے میں مسلمانوں کا بڑا اقتدار تھا - انہیں موپلا کے نام سے پکارا جاتا تھا - موپلا کے دو معنی ہیں - بڑا لڑکا یا دولہا ؛ جن لوگوں کی عزت کرنی منظور ہوتی تھی انہیں موپلا کا خطاب دیتے تھے ؛ جیسے عیسائیوں کو نصرانی موپلا کہتے ہیں - موپلوں کے بڑے اختیارات تھے ؛ مسلمان موپلا نام نوتری برہمنوں کے برابر بیٹھ سکتا تھا - حالانکہ نائر ایسا نہیں کر سکتا تھا - موپلوں کا بدسوا جسے تھنگل کہتے ہیں راجہ کے ساتھ ساتھ پالکی پر سواری کر سکتا تھا -

---

؎ لوگس " مالا بار " جلد اول صفحہ ۲۳۱ -

کوچین کے راجہ (جسے زمورن کہتے ہیں) کی عرب سوداگروں پر بڑی مہربانی کی نگاہ تھی - اس کی اجازت سے راج میں بہت سے سوداگر آباد ہوئے ان کی تجارت سے راج کو مالی فایدہ پہونچا اور اُن کے ہاتھوں کی قوت سے راج کی طاقت بڑھی -

زمورن نے آس پاس کے راجاؤں کو شکست دے کر ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیا - جہاں جہاں راجہ کا تسلط ہوا مسلمان سوداگروں نے منڈی قائم کی * اِس طرح کالی کٹ کے بندرگاہ کی بنیاد قائم ہوئی - یہاں کا قاضی جسے وہاں والے "کویا" کہتے ہیں زمورن کا بڑا مددگار تھا - اس کی طرف سے ہمیشہ دوسرے راجاؤں کے خلاف لڑا کرتا تھا - اسی مدد کے سبب سے وہ جنوبی مالابار میں سب سے طاقتور راجہ بن گیا اور اس نے "مہامکھم" کے میلے کا بندوبست جو ترموئی کے مقام پر ہوتا تھا اس کے سپرد کیا - اس سے اس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی -

کویا کے برابر علی راجہ کا گھرانا تھا جس کے مالک کولاتری راجاؤں کے بیڑوں کے سردار ہوتے تھے† -

ہندو راجہ مسلمانوں کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انھوں نے خود اپنی رعایا کو مسلمان ہونے کے لئے جوش دلایا‡ انہیں اپنے بیڑوں کے لئے ملّاحوں کی ضرورت تھی؟ اس لئے انھوں نے اجازت دی کہ مکوان قوم کے ہر گھر میں ایک یا دو آدمی اسلام قبول کرے -

نویں صدی کے بعد اسلام کا اثر دن بدن بڑھتا گیا - مسعودی نے

---

* لوگس - مالابار جلد ۱ صفحہ ۲۷۸ لعایتہ ۲۸۰ انپر مالابار اینڈ انجنکو ڈسٹرکٹ گزٹیر صفحہ ۴۴ -

† لوگس - مالابار -

‡ ایلیٹ جلد ۱ -

سنہ ۱۹۹۶ع میں ہندستان کا سفر کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ چول میں دس ہزار سے زائد مسلمان آباد ہیں۔ اُن کا اپنا سردار تھا جسے ہرامہ[۲] کہتے تھے۔ ابو دولف مسعر بن المہلہل چول کی مسجدوں کا ذکر کرتا ہے۔ ابن سعید نے تیرھویں صدی میں سمندر کے کنارے ہر جگہ مسلمانوں کو پایا۔ سرمار کو تو لوگ بے دیکھا کہ لنکا کے راجے مسلمان ساتھیوں کو باہر کے ملکوں سے لا کر اپنی فوج میں بھرتی کرتے ہیں۔ ابوالفدا (سنہ ۱۲۷۳ع سے ۱۳۳۱ع تک) لکھتا ہے کہ کولم میں ایک خوبصورت مسجد اور مسلمانوں کا چوک تھا۔ ابن بطوطہ[۳] نے کنبھایت سے لیکر سارے مالابار کے کنارے کا سفر کیا اُسے ہر جگہ پر مسلمان ملے اور وہ اچھی بھلی بھولی حالت میں تھے۔ اُس کا بیان ہے کہ گویا مسلمانوں کے وطن میں تھا۔ کنڈیاد میں مسلمانوں نے اُس سے ملاقات کی۔ کولم میں اُس نے ایک پرانی مسجد دیکھی وہاں پر اُسے حاجی درویشوں کی ایک ٹولی ملی۔

سعید[۴] نور میں بعدادی نمونے کی مسجد تھی۔ ہنور میں مسلمانوں کی سلطنت تھی اور کولم تک تر بندر گاہ میں مسافرخانے تھے، جہاں مسلمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ سب مقامات پر

---

[۱] چول - راجستھان کی زیارت " Tour nd Relation de Voyages) یاقوت کے بیان میں

[۲] ہرامہ - ہزارمہ کی بگڑی ہوئی صورت -

[۳] ابن بطوطہ کی زیارت " اس سفر کے بیان میں -

[۴] سیرل - ہی لک ب سر مارکوپولو - جلد ۱ صفحہ ۲۱۴ -

چول - ہی لک ب سر مارکوپولو - جلد ۲ صفحہ ۱۷۷ -

[۵] مترجمہ - دی ویجری اے سانگی نیتی اس سوسائٹی (Journe y et Sang u nette) جلد ۳ صفحہ ۳۰ اور بعد کے صفحے -

مسلمانوں کی عزت تھي - بارسي لور اور مکانور میں مسلم آبادي کے ساتھہ اُن کے قاضي اور مفتي تھے - منگلور میں چار ھزار مسلمان بستے تھے جن میں فارس اور یمن کے سوداگر تھے - وھاں کي مسجد میں بہت سے طالب علم پڑھتے تھے - تینوں پٹّنوں میں مسجدیں تھیں اور مسلم محلے تھے -

عبدالرزاق * پندرھویں صدي میں ھندستان آیا اِس کے تھوڑے ھي دنوں بعد پرتگال والوں نے ھندستان کا راستہ معلوم کیا ' وہ کالي کٹ کے بارے میں لکھتا ھے کہ یہاں پر بہت سے مسلمان ھیں ؛ اُن کے اپنے گھر ھیں ؛ دو مسجدیں ھیں جہاں وہ ھر جمعہ کے دن نماز پڑھتے ھیں -

ان بیانوں سے معلوم ھوتا ھے کہ ھندستان کے مغربی کنارے پر مسلمان اپنے مذھب کے قائم ھونے کے کچھہ ھي دن بعد آ کر بسے - اور اُن کي تعداد ' دولت اور طاقت بڑی تیزي سے بڑھي - ھندستان کے مشرقی کناروں پر بھي عربوں کي پرانے زمانے میں بہت قدر و عزت ھوئي - جب دارا نے پانچویں صدي قبل مسیح میں دجلہ اور فرات کے دھانوں کو رکوادیا اور مصر کي تجارت کو فنا کردیا تو یہ تجارت یمن کے عربوں کے ھاتھہ لگي - عربوں اور یہودیوں کی نوآبادیاں لنکا اور جنوبي ھند میں قائم ھوئیں - یہاں پر یونانیوں اور رومیوں کے سوداگر پہلے ھي سے کاروبار کرتے تھے - اُن کے جہازوں کو بھي عرب ملّاح چلاتے تھے - اس لیے جب رومۃالکبریٰ کا خاتمہ ھوا تو عرب سوداگروں نے اُن کي جگہ لی - عرب سوداگر حول منڈل (کارومنڈل) کے کنارے سے انڈمن ' آسام ' برھما ھوتے ھوئے چین چلے جاتے تھے -

---

* میجر انڈیا ان دي فٹینتھہ سنیچری ' سفرنامۂ عبدالرزاق --

عربوں نے مذہب اسلام قبول کرنے کے بعد اِس تجارت کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا - سلیمان ابو زید سیرافی اور مسعودی کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اِن راستوں سے اچھی طرح واقف تھے - اِن مسلم عربوں کی بڑی منڈی تنے ولی ضلع کے کائل پٹنم شہر میں تھی - نسب کالڈویل نے اس مقام پر مسلمانوں کے سکے ساتویں صدی (۷۱ ھجری) سے لیکر تیرھویں صدی تک کے پائے -

یہاں پر مسلمانوں نے اپنا مذہب پھیلانے میں بہت کوشش کی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی ہندو قوموں نے اپنا مذہب تبدیل کردیا - مدراس صوبے کی مسلم قومیں اپنی ابتدا اُسی زمانے سے لگاتی ہیں - مُدرا اور ترچناپلی کے راوتنوں* میں کئی پشتوں سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ اِنہیں ناپھزولی نے مسلم بنایا - ناتھز کی قبر آج بھی ترچناپولی میں موجود ہے - اور اُس پر اُس کے مرنے کا سال سنہ ۴۱۷ ھجری کُھدا ہے - ناتھز کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ترک شاہزادہ تھا لیکن اُس نے سلطنت چھوڑ کر فقیری اختیار کرلی تھی - وہ عرب ، فارس اور شمالی ہندستان میں گھومتا ہوا دکھن میں ترچور (ترچناپلی) میں آیا - یہاں آکر وہ بس گیا اور یہیں اُس نے اپنی باقی زندگی گزار دی - وہ عبادت اور خیرات کرنے میں مشغول رہتا تھا اور اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا -

سید ابراہیم شہید نے جس کی پیدائش ۱۰۱۲ ع کے لگ بھگ ہوئی ، پانڈیوں کے راج پر تیرھویں صدی کے شروع میں چڑھائی کی - کہتے ہیں کہ بارہ برس تک اُس نے ان پر حکومت کی لیکن آخر میں اِس کی شکست ہوئی اور وہ مارا گیا - اس کی قبر اروائی میں ہے -

---

* قادر حسین خاں - پہلے حوالہ دیا گیا ہے -

بابا فخرالدین ایک فقیر تھا۔ جو پتن کونڈا میں رہتا تھا، اُس نے وہاں کے راجہ کو مسلمان بنایا اور وہاں پر مسجد تعمیر کی۔ ڈوتےکل ذات اُسی کو اپنا مرشد مانتی ہے۔ اُس کے مرنے کا زمانہ (سنہ ۱۱۶۸ع) ۵۶۴ ہجری ہے۔

مدورا کے ضلع میں مسلمان ۱۰۵۰ع میں داخل ہوئے؟ اُن کے سردار کا نام ملک ا لملوک تھا، اِسی کے ساتھ ایک بڑا درویش حضرت علی بار شاہ بھی آیا۔ یہ مدورا کی حضور کچہری میں دفن ہے۔ گوری پالن گاؤں میں ایک مسجد ہے جس کے لیے کُن پانڈیا نے گیارھویں یا بارھویں صدی میں چھ گاؤں خرچ کے لیے خیرات میں دیے تھے۔ پانڈیوں کی خیرات کو سولھویں صدی میں ویرپا نائک نے جائز کے بعد قائم رکھا۔

مشرقی ساحل کے راجہ مسلمان سوداگروں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھتے تھے۔ وہ نہ سخت محصول لگاتے اور نہ طوفان زدہ کشتیوں کو جو اُن کے بندرگاہوں میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہوتی تھیں مغربی راجاؤں کی طرح اپنے قبضہ میں کر لیتے تھے۔ ایک برائے نام محصول وصول کر لیتے تھے جو کسی کو گراں نہیں گزرتا تھا†۔

اس دور اندیشی کی وجہ سے تجارت کو بڑی ترقی ہوئی، اور کئی منڈیاں قائم ہوگئیں۔ جول منڈل کے ساحل پر اپنے جہاز گزرنے لگے کہ اُس کا نام عربی میں معبر (راستہ) پڑ گیا۔

وصّاف ؟ لکھتا ہے کہ معبر سمندر کے اُس کنارے کو کہتے ہیں جو کولم سے تلور تک پھیلا ہوا ہے۔ اِس کی لمبائی تین سو

---

* ٹلسن "مدورا" صفحات ۶۹ و ۸۶ -

† آئیگر - ساؤتھ انڈیا - اینڈ ہز محمڈن انویڈرس -

‡ ایلیٹ - جلد ۳ صفحہ ۳۲ -

فرسنگ ہے - یہاں کا راجہ اپنے کو "دیو" سے ملقب کرتا ہے - چین، ماچین، ہند اور سندھ کے بیس قیمت مال سے لدے ہوئے بڑے بڑے جہاز جب یہاں سے گزرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اونچے جہاز ہوا کے بادبان لگائے ہوئے پانی پر تیر رہے ہیں - خلیج فارس کے جزیروں سے عراق اور خراسان، روم و فرنگ کے ملکوں سے خوبصورت و خوشنما چیزیں یہاں آتی ہیں اور یہاں سے چاروں طرف جاتی ہیں، کیونکہ یہ ہندستان کی تجارت کا مرکز ہے -

بارھویں صدی میں مسلمانوں کی بڑی آبادی اس صوبے میں تھی - وصاف لکھتا ہے کہ کامل دنگم میں کس کے حکمران ملک الاسلام جمال الدین نے یہاں گھوڑوں کی تجارت قائم کی تھی - ہر سال دس ہزار گھوڑے فارس سے معبر آتے تھے اور اُن کی قیمت کا اندازہ دس لاکھ دینار تھا -

رشید الدین نے لکھتا ہے کہ سنہ ۱۲۹۳ ع میں جمال الدین کامل پر قابض ہوگیا تھا اور اُس کا بھائی تقی الدین عبدالرحمن بن محمد طوی اُس کا نائب مقرر ہوا -

مارکو پولو نے لکھا ہے کہ محی الدین سندر پانڈیا کا وزیر تھا اور اِس کا بیٹا سراج الدین اور دوسرا نظام الدین اُس کے بعد جانشین ہوا - پانڈیا راجہ نے جمال الدین کے اپنے وجیہ الدین احمد کو اپنا نائب بنا کر چین کے بادشاہ قبلہ خان کے یہاں ۱۲۸۷ ع میں بھیجا تھا - مسلمانوں کی اور بھی بستیاں تامل ملک میں آباد تھیں -

---

اطلاعت جلد ۳ صفحہ ۳۲ -

† ادایت جلد ۱ صفحہ ۶۹ و ۷۰ -

‡ یول، حوالہ دیا جا چکا ہے

امیر خسرو * نے خزائن‌الفتوح میں لکھا ھے (علیگڈھ کا ایڈیشن صفحہ ۱۶۱ و ۱۶۲) کہ کندور (کنانور) کے شہر میں مسلمانوں کی بستی تھی ؛ جس کو ملک کافور نے مسلم ھونے کی وجہ سے معاف کر دیا ؛ گو کہ وہ لوگ قتل کیے جانے کے قابل تھے - ابن بطوطہ † نے ملک کافور کے حملے کے کچھہ برسوں بعد اس صوبے کا سفر کیا - وہ لکھتا ھے کہ اُس وقت مدورا پر غیاث‌الدین ادم غازی حکومت کرتا تھا - اور راجہ بیر بلّال کی فوج میں بیس ھزار مسلمانوں کا دستہ تھا - بیر بلّال کے صوبےدار ھری ایااوڈیار کے ماتحت "ھوناور" میں ایک مسلمان حاکم تھا - ان بیانات سے یہ صاف طور پر معلوم ھوتا ھے کہ ظہور اسلام کے تھوڑے ھی دنوں بعد مسلمانوں نے ھندستان پر اپنی تہذیب ؛ مذھب اور خیالات کے پھیلانے کا موقع حاصل کر لیا - ساتویں صدی سے تیرھویں صدی تک ان کا تعلق تجارت کی صورت میں تھا - اور سوداگروں کی حیثیت سے شروع میں اُن کی آؤبھگت ھوئی ؛ جب ھندو راجہ اُن سے واقف ھو گئے تو اُن کی وقعت اور بھی بڑھہ گئی - وہ بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ھوئے - اُن میں سے وزیر ' بیڑوں کے کمانڈر ؛ ایلچی ؛ افسران محاصل اور فوج کے کپتان وغیرہ مقرر ھونے لگے - اُن کو اپنے مذھب کی پابندی کے لیے مسجدیں بنانے کی اور اپنے مذھبی پیشواؤں اور فقیروں کو خانقاھوں میں رکھنے کی اجازت تھی - صرف یہی نہیں بلکہ وہ کُھلّم کُھلّا

---

* اپلیٹ جلد ۳ صفحہ ۹۰ -

† ابن بطوطہ دی ٹریوری سائگینیٹی جلد ۳ - صفحہ ۱۹۹ اور سائوتھہ انڈیا پنڈ ھر محمڈن انویڈرس -

اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے تھے اور کہیں کہیں تو راجہ خود اس تبلیغ میں مدد کرتے تھے - لیکن صرف جنوبی دکھن تک اس پُر امن اثر کے حدود نہ تھے بلکہ شمالی ہندستان میں بھی مسلمانوں کا ہندؤں سے بہت دنوں تک اِسی طرح کا تعلق رہا - یہ سچ ہے کہ آٹھویں صدی کے اوائل میں عربوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا ؟ لیکن مُلتان اور سندھ کو چھوڑ کر اور کوئی حصہ تین سو برس تک اُن کے قبضے میں نہیں آیا -

اس مغربی صوبے پر تو مسلمان حاکم تھے لیکن کاٹھیا واڑ ؟ گجرات اور کونکن میں وہ صرف سوداگروں کی حیثیت سے رہتے تھے - دائبل ؟ سومناتھ ؟ بھروچ ؟ کھمبائت ؟ سندان ؟ اور چول وغیرہ بندرگاہوں میں مسلم نوآبادیاں تھیں اور مسجدیں ؟ خانقاہیں اور محلے قائم تھے -

مغربی ہندستان کے ہندو راجاؤں نے بھی اُن کا خیر مقدم کیا - سلیمان ؟ مسعودی ؟ ابن حوقل اور ابو زید یہ سب سیاح ؟ بلہارا ؟ یعنی گجرات کے بلہبی راجاؤں کی بڑی فراخدلی سے تعریف کرتے ہیں - اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کی دوستی اور محبت تسلیم کرتے ہیں - سلیمان لکھتا ہے " ہندستان کا کوئی اور راجہ عربوں سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتا جتنی کہ بلہبہ راے ؟ اور اُس کی رعایا راجہ کے مثال کی تقلید کرتی ہے - مسعودی جہاں جہاں گیا اس نے اپنے ہم مذہبوں کو مذہبی عبادات میں آزاد پایا - گجرات کے راجہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے " اس کے راج میں اسلام کی عزت اور

---

* رینو ؟ ریلا سیاں دی ویار -

حفاظت هوتي هے - ملک کے هر حصے میں بڑی بڑي مسجدیں هیں جہاں روز پانچوں وقت نماز پڑھی جاتي هے *- "

الاصطخری † نے سنه ۹۵۱ ع میں هندستان کا سفر کیا - وه کہتا هے که گجرات کے سب ملکوں میں مسلمان آباد هیں اور راجا نے مسلمانوں هي کو اُن کا افسر بنایا هے - ابن حوقل نے قنّوج، سندان، سیمور اور کهمبایت میں جامع مسجدیں دیکھیں - ادریسي نے گیارهویں صدي میں مسلمان سوداگروں کو بڑي تعداد میں اہل واڑے میں تجارت کرتے پایا - وه لکھتا هے که راجا اور اُس کے وزراء اِنهیں عزت کے ساتھه اپنے دربار میں بلاتے هیں - اور اُن کي هر طرح مدد کرتے هیں -

شمالي هندستان کے مغربي ملکوں میں مسلمانوں کي حالت ویسي هي هوگئي تهي جیسي مغربي اور جنوبي هندستان میں - محمود غزنوي کے حملوں کے پہلے هي اِنهیں اپنے مذهب اور رسوم کے پهیلانے کا موقع مل چکا تها - هندو راجا خود اُن کے اثرات پهیلانے کے باعث تهے - محمد عوفي ‡ لکھتا هے که جب کهمبایت کے هندوؤں نے مسلمانوں سے جهگڑا کیا تو مهاراجا سدهه راج نے کل معاملے کي جانچ کي اور اور فسادیوں کو سزادي - مسلمانوں کا جو نقصان هوا اُس کا بدلا دیا اور اپنے خرچ سے اُن کي مسجد بنوادي - یهی نهیں بلکه کئي هندو راجاؤں کي فوج میں مسلمان سپاهي بهرتي تهے - سومناتھ کے راجا کي فوج میں کئي مسلم افسر تهے - احمدآباد کے فصیلی اپنے کو بگهیل راجاؤں کے خراساني سپاهیوں کے خاندان سے بتاتے هیں§ -

---

* ایلیٹ جلد ۱ صفحه ۲۹ -

† ایلیٹ جلد ۲ صفحه ۱۶۴ -

‡ ایلیٹ جلد ۲ صفحه ۳۶۱ -

§ مصنفه میر غلام علي آزاد مآثرالکرام صفحه ۶ -

مسلمان فقیر اور صوفي، سوداگروں اور سپاهیوں کے ساتھ ساتھ چلتے تھے - نویں صدي* میں ابو حفص رابع بن صاحب‌الاسدی البصري ایک تارک‌الدنیا محدث سندھ میں آیا - اُس‌کي وفات ۱۶۰ ھ (سنه ۷۷۶ع) میں‌هوئي - دسویں‌صدي‌میں‌مشهور صوفي‌منصورحلاج † سمندر کے راستے سے‌هندستان پهونچا اور خشکي کے راستے شمالي‌هندستان هوتا هوا ترکستان گیا، گیارهویں صدی میں بابا راهن‡ درویشوں کے ساتھ بغداد سے بهڑوچ آیا - کہا جاتا هے کہ اُس نے راجا کے لڑکے کو مسلمان بنایا - سنه ۱۰۹۷ع میں بوهروں § کا شیخ یمن سے گجرات آیا - سنه ۱۰۹۴ع اور ۱۱۴۳ع کے بیچ میں نورالدین|| یعني نورستگر نے گجرات کے کئي کهڈوا اور کوریوں کو اپنے مذهب کا پیرو بنایا -

محمود کے حملوں کے بعد بہت سے مسلمان عالم اور درویش هندستان میں آئے ، جن کا ذکر خالي از طوالت نہیں هے - عربي اور فارسي کي سوانح‌عمریوں کي کتابوں میں سیکڑوں نہیں هزاروں نام ملتے هیں - کچھ کے نام یہاں دینا نامناسب نہ هوگا -

علي بن عثمان، الهجویري¶ جس نے کشف‌المحجوب تحریر کي، غزنی کا رهنے والا تھا - لاهور میں آ کر بسا اور ۴۶۵ ھ (سنه ۱۰۷۲ع) یا ۴۶۹ ھ (سنه ۱۰۷۶ع) میں اُس کی وفات هوئی - شیخ اسمعیل**،

---

* میر غلام علي آزاد ماثرالکرام صفحه ۶ -

† کیمبرج هسٹري آف انڈیا (گزٹیر آف گجرات) صفحه ۵۲۸ -

‡ ایک میسي ثبات کتاب الفنا و سنن مقدمه صفحه ۵ -

§ فارس - " راس مالا " -

|| آرنلڈ - پریچنگ آف اسلام باب هندستان -

¶ کشف‌المحجوب مرتبۂ نکلسن مقدمه -

** آرنلڈ متذکره بالا -

بخاري گيارهويں صدي کے شروع ميں يہاں آيا - فريدالدين عطار *
جو تذکرةالاوليا اور منطق‌الطير کا مصنف ہے بارهويں صدي ميں يہاں آيا -
شيخ معين الدين چشتي† سنه ۱۱۹۷ع ميں اجمير پہونچے ؟ يه کہا
جاتا ہے که راے پتهورا اُس وقت زنده تها - اجمير کے مندر کا مہنت
راے ديو تها ؟ اور سلطنت ميں اجمال بڑا جوگي تها - اِن دونوں
نے شيخ معين الدين چشتي کے هاتهوں پر مذهب اسلام قبول کيا -
چشتيه سلسلے کے بڑے بڑے صوفيوں ميں قطب الدين بختيار کاکي ؟
فريد الدين گنج شکر ؟ نظام الدين اولياء وغيره وغيره تهے - سہروردي
سلسله والوں ميں جلال‌الدين‡ بريري ؟ وندريوں ميں جلال الدين
بخاري ؟§ بابا فريد پاک|| بتني تهے -

عبدالکريم جيلي¶ جس نے اهل تصوف کے زبردست عالم ابن‌العربي
کي کتاب کي شرح اور انسان کامل لکهي ہے سنه ۱۳۸۸ع ميں يہاں
آيا - اسي صدي ميں سيد محمد گيسو دراز** نے مہاراشتر ميں اسلام
پهيلايا - پير صدرالدين†† نے خوجه فرقے کي بنياد ڈالي ؟ اور سيد
يوسف الدين‡‡ نے مومن فرقے کي - اِن صوفيوں کے علاوه بہت سے فقير جو
کسي ملک سے تعلق نہيں رکهتے تهے اور جن کا مذهب کسي قاعدے

---

* تذکرةالاوليا مرتبۂ نکلسن -

† عبدالحق اخبارالاخيار صفحه ۲۲ -

‡ ايضاً ايضاً ايضاً صفحه ۴۵ -

§ ايضاً ايضاً ايضاً صفحه ۶۰ -

|| نکالف دي سکهه ريليجن جلد ۳ صفحه ۳۵۶ -

¶ نکلسن - اسٹڈيز اِن اسلامک مسٹي‌سيزم صفحه ۸۱ -

** آرنلڈ متذکره بالا -

†† بابيے گزٹير جلد ۹ حصه ۲ صفحه ۴۰ -

‡‡ ايضاً ايضاً ايضاً صفحه ۲۷ -

کا پابند نہ تھا ؟ ـ ملک میں پھرتے تھے ـ سچی سرور * ست گُر پیر اور شاہ مدار† کے نام اِن میں بہت مشہور ہیں ـ

بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام تلوار کے زور اور مسلمان بادشاہوں کی طاقت کے سہارے سے اس ملک میں پھیلا ـ ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا ، کیونکہ مسلمان بادشاہوں میں صرف تین یا چار ایسے ہوئے جنہوں نے مذہب کے پھیلانے کی کوشش اپنی قوت حکمرانی کے ذریعہ کی ـ لیکن تیرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک پانچ سو برس کے ہندستان کی تاریخ میں سیکڑوں چھوٹے بڑے سلطانوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں میں صرف تین یا چار کی وجہ سے ہم یہہ نہیں کہہ سکتے کہ حکمرانی کی قوت سے مذہب پھیلایا گیا ـ فیروز ، سکندر ، زین‌العابدین ، اورنگ‌زیب اور تیپو سلطان کے ناموں کے علاوہ کوئی ایسا نام مشکل سے ملیگا جس کے لیے کہا جائے کہ اُس نے اسلام کے پھیلانے میں حکومت کی طاقت سے کام لیا ـ

یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ دولت ، عہدوں، مرتبوں اور خطابوں کے لالچ سے بہت سے ہندوؤں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ـ حاکموں کی خوشامد کرنے والے آدمیوں سے بہت کچھہ کرا لیتی ہے ؟ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح مذہب کا پرچار تلوار کے ڈر سے ہوا ـ

سچ تو یہ ہے اسلام کا اثر تیرھویں صدی تک دکن میں بلا کسی غیر واجبی دباؤ کے پڑا ـ شمال میں بادشاہت قائم ہونے سے پہلے ہی مسلمان آچکے تھے ـ بادشاہت کے قائم ہو جانے کے بعد اسلامی تہذیب کی اشاعت نہ صرف امیروں ، مالکوں اور سلطانوں کے باعث

---

* ارننڈ دی سینٹس اینڈ مارٹرس آف انڈیا ـ

† ایضاً ایضاً ایضاً

بلکہ زیادہ تر فقیروں، درویشوں اور صوفیوں کی وجہ سے ہوئی - یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صوفی اور فقیر اسلام کے مبلغ ہوتے ہوئے بھی حکومت کی اندھا دھند پیروی نہیں کیا کرتے تھے - حکومت کے مذہبی محکمے کے قاضیوں اور مفتیوں سے اِن درویشوں کی ہمیشہ اَن بَن رہتی تھی - یہی ٹھیک بھی ہے - قاضی کٹّر قانون کے پابند، درویش خدا کی بندگی میں مست، صابطوں میں بندھے ہوئے لوگوں میں اور پریم کے متوالوں میں کیسے نبھ سکتی تھی - مسلمان سلطنتوں کی تاریخ کے صفحات اِن جھگڑوں سے بھرے پڑے ہیں - درویش سلطنت کی اندھی اطاعت نہیں کرتے تھے - لیکن مصلحت اندیش بادشاہ اِن سے بہت سے کام لیا کرتے تھے - بادشاہ ان سے صلاح لیتے، سفیر کا کام کراتے اور سپہ سالاروں، صوبہ داروں اور امیروں کے جھگڑے نبٹواتے تھے - کمزور رعایا انہیں اپنا مددگار، دکھ درد کا ساتھی اور شاہی بے انصافیوں سے بچانے والا سمجھتی تھی -

یہ واقعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بہت سے صوفی فقیر اونچے اور فیاض طبیعت کے لوگ ہوتے تھے - اِن میں سے کتنے ہی ایسے تھے جنہوں نے گھر بار، اور مال دولت، کو لات مار کر دنیا سے منہ موڑ لیا تھا اور خدا کی محبت میں دنیا کو ترک کر کے ذکر، شغل اور مراقبے میں طبیعت کو غرق کر دیا تھا - اِن فقیروں کی اتنا طاقتور تھی، اِنہیں کسی کا خوف نہ تھا، اُن کا دل بندگی اور محبت کی کیفیتوں سے لبریز تھا، وہ اسلامی یکجہتی اور مساوات کے اصولوں کے حامی تھے - اسی لیے اچھوتوں، گرے ہوئے لوگوں اور غریبوں کو سماج راج، پنڈتوں اور عالموں کے ستائے ہوئے مصیبت زدوں کو

ان کي باتوں میں الہام ؛ ان کے کاموں میں کرامات اور ان کي سیرت میں خدائی کی جھلک نظر آتي تھي ۔

غریب اور مصیبت زدہ لوگ ھی نہیں امیر ؛ راجا ؛ اور پروھت بھي کبھي کبھي اِن کے روحانی انوار سے متاثر ھو جاتے تھے ۔ اور ان کي طرف کھنچ آتے تھے ؛ اور اپنے پرانے رسم و رواج کو چھوڑ کر اُن کے عقیدوں اور اُن کے سلسلوں کو قبول کر لیتے تھے ۔

مثنوي حزن اختر اور خصوصيات مصنف

(از مولانا احسن مارهروی اُردو پروفیسر انٹرمیڈیٹ کالج علیگڑھ)

۲ - اِنہماک نشاط اور اس کے متعلقات

دنیا اور دنیا کے عیش و نشاط کے لیے عریب واحد علی شاہ ہی مورد الزام نہیں؟ بلکہ جب سے مسلمانوں میں عجمی معاشرت پیوست ہوئی ہے اُس وقت سے اِس وقت تک کوئی خلیفہ؟ کوئی ظل اللہ؟ کوئی بادشاہ؟ کوئی والی ملک اور کوئی فارغ البال انسان اپنی شبستان عشرت میں ثریا نشین بن کر دعاے گنج العرس پڑھنا نظر نہیں آیا - بات یہ ہے کہ اکثر پرانی داستانیں کرم خوردہ کتابوں میں دب کر فرسودہ ہو چکی ہیں اور بعض نیم مردہ حکایتیں جو ابھی زبانوں پر باقی ہیں وہی دنیا میں نقل مجلس بنا کر طشت از بام ہوتی رہتی ہیں -

"بد اچھا بدنام برا" یہ مثل جان عالم اختر پر پوری صادق آتی ہے اور ہمارے خیال میں اس کا سبب تضییع زیادہ تر خود اُن کی تصانیف ہوئی ہیں -

گُل و گلچیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

بدنام عیش پرستوں میں جس قدر دھلی کے محمد شاہ رنگیلے اور لکھنؤ کے جان‌عالم پیا تمام بادشاہوں میں پیش پیش ھیں اِس قدر کوئی دوسرا بادشاہ نظر نہیں آتا ۔ لیکن حقائق نظر فریب اگر ھٹادیے جائیں تو جسمِ عیش پرستی کی عام عریانی نمایاں ھوجائے گی ۔ اس مضمون میں سلاطین ماضی کی پردہ‌دری منظور نہیں ؟ مثلاً ایک واقعے کی مطابقت و مماثلت دکھا کر ناظرین کو قرائن قایم کرنے کا موقع دیا جاتا ھے ۔

محمود غزنوی کی ایاز نوازی محتاج تشریح نہیں؟ اور قصص و حکایات سے قطع نظر کر کے صرف ایک مشہور واقعہ لکھا جاتا ھے ۔—

"ایک دن بزمِ عیش میں بادۂ و جام کا دور تھا؟ محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ پی کر بدمست ھوگیا ؟ اسی حالت میں ایاز پر نظر پڑی؟ اُس کی شکن در شکن زلفیں چہرے پر بکھری ھوئی تھیں ؟ محمود نے بے اختیار اُس کے گلے میں ھاتھ ڈالدیے؟ لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش‌تقوی میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھدے؟ ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی ؟ صبح کو جب محمود سو کر اُٹھا تو ایاز کی صورت دیکھ کر سخت مکدر ھوا ؟ بار بار اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا ؟ ندما اور مقربین دم بخود تھے آخر علی قریب نے جو خاص خاص تھا عنصری۔ کو بلا کر صورتِ‌واقعہ بیان کی ؟ عنصری نے محمود کے سامنے جا کر یہ رباعی پڑھی ۔—

گر عیب سر زلف بت ار کاستن است

نے جاے بہ غم نشستن و خاستن است

وقت طرب و نشاط و مے خواستن است

کاراستن سرو ز پیراستن است

یعنی معشوق کی زلفیں اگر ترش گئیں تو رنج و غم کی کیا بات ہے ؟ یہ تو اور خوشی کا موقع ہے اس لیے کہ جب سرو چھانٹ دیا جاتا ہے تو اور زیادہ موزوں ہو جاتا ہے ؟؟

(شعرالعجم جلد اول ـ ص ۶۲)

اسی عسوہ پرستی کے سلسلے میں واجد علی شاہ کا انداز دیکھیے :—

" واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ عورتوں کے عشق میں دیوانے ہو رہے تھے ـ اور بعض جسبنوں سے اس درجہ محبت تھی کہ قید میں جب اُن کے وصل سے محروم تھے تو ہر وقت اُنھیں یاد کیا کرتے اور بار بار اُن سے یادگار محبت کے طور پر اُن کی خاص خاص چیزیں مانگ بھیجا کرتے؟ بعض فرمایش پوری کر دیتیں تو خوش ہوجاتے اور بعض ناز آفرینی اور شوخ ادائی کے انداز سے یہ بھیجتیں تو شکایت کرتے ـ دلدار محل سے اُن کی مسی مانگی اُنھوں نے بھیج دی ؟ اختر محل سے اُن کی زلفوں کے بال منگوائے اُنھوں نے بھیج دیے جن کو ہمیشہ سرہانے نظر کے سامنے رکھتے اور بار بار سونگھتے ـ ؟؟

(مقدمہ حزن اختر نوشتہ مولوی عبدالحلیم شرر ص ـ ۲۲)

اس بیان کی تصدیق خود بادشاہ یوں کرتے ہیں ؟ :—

طبیعت بہت میری گھبرائی جب

کیا نائے قیصر کا چھلّا طلب

کٹے ناخنِ دستِ معشوق سے

طلب یہ کیا دل کے صندوق سے

منگائی پھر اِک شے یہ اک یار سے
مسّیِ شب آلودہ دلدار سے
یہ اختر محل سے کہا اے قمر
ردا بھیج دے اسے تو موئے سر
کہا جعفری سے کہ اے خوش جمال
مجھے چاہیے تیرے منہ کا اُگال
کہ آگے بھی بھیجا تھا تونے اُگال
منگا کر مرا خوش ہوئی تھی کمال
اس اختر کا تو کھا چکی ہے اُگال
نہ کر بھیجنے میں تو اب قیل و قال
انگوٹھی بھی بھیجی تھی تونے مجھے
دیا سفل تجھہ جوس گلو نے مجھے
دُلائی بھی اِک؟ اِک دوپٹہ بھی یار
مجھے بھیجا تھا سک نہیں زنہار
اُتنا بدن کا عنایت ہوا
مجھے بھوک پھر ماں کا بھیجوا ردا
کہا جعفری نے کہ سن اے جواں
کہاں میں؟ کہاں تو، کہاں یہ بیاں
منگا اُس سے جس کو دیے ہیں ہزار
بہت جس کا سینے میں ہو تیرے پیار
نہ بھیجوں گی میں تجھہ کو اتنا اُگال
دیا کچھہ نہ اُس نے سوائے ملال
دیا ملکۂ ملک نے یہ پیام
کہ میرا ہے دنیا میں معسوں نام

مثلاً اُن کے ناخن جو کرتي ہوں پیار
وہ بھیجیں جو ہوں آپ کی دار دار
جو مانگے ہیں ناخن نہیں ہیں وہ اب
یہ حجام کا کام سیکھا ہے کب
دیا مجھہ کو دلدار نے یہ جواب
نہ بھیجي مسي تو نہ کرنا عتاب
طبیعت مری ہے نہایت علیل
نکلتي نہیں بھیجنے کي سبیل
تو پھر بولی یوں قیصرِ نامدار
نہ کر مجھہ کو معشوقوں میں توشمار
مرے پاس چھلا کہاں اے جواں
کہاں ہے کہاں ہے کہاں ہے کہاں
کسي کي نہ مجھہ پر عنایت ہوئي
کسي کی نہ رنداں میں چاہت ہوئی
نہ بھیجي کسی نے مجھے کوئي چیز
کسي نے نہ دي دوستي کي سمیز
مگر ہاں اک اختر محل ہے لئیق
وہ رنداں میں میري ہوئي ہے رفیق
وہیں موئے سر مجھکو بھجوا دیے
بنا جس طرح مجھکو پہونچا دیے
رکھے موئے سر میں نے دل کے قریں
یہ سمجھا کہ دل میں ہے وہ مہ جبیں

(از مثنوي حزن اختر مطبوعہ سلطان المطابع - ص۱۲۸ تا ۱۳۰)

هرچند محمود اور اختر کے زمانوں میں کم و بیش آٹھ سو نو سو برس کا تفاوت ہے لیکن دل کے جذبات کا عالم متغیر نہیں؟ یہ امر آخر ہے کہ اس فطری شوق و ذوق کو عشق و مستی سے تعبیر کیا جائے یا ہوس پرستی سے -

تم جسے چاہو چڑھالو سر پر - ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھہرے

واجد علی شاہ کی عیش سامانیوں اور اُن کی تصدیق و تکذیب کا بغیر ثبوت کامل ہمیں کوئی حق نہیں - بجز اس کے کہ شاہ موصوف کے کلام نظم و نثر کا کچھہ اِنتخاب درج کردیا جائے جس سے ناظرین خود اندازہ کر سکیں کہ ان گرد و پیش واقعات اور ایسے ماحول میں قرائن کیا رہنمائی کرتے ہیں -

اس سے پہلے کہ ان کے خود نوشت اقتباسات اشعار کو پیش کیا جائے شاہ اختر کی دینداری اور اخلاقی استواری کا موازنہ بھی محمود عزنوی کے حوش تقویٰ سے کر لینا چاہیے جیسا کہ شعرالعجم کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے .—

مولوی علی حیدر طباطبائی اور مولوی عبدالحلیم شرر جنہوں نے اپنی آنکھوں سے کم و بیش مٹیا برج کی مٹی ہوئی بہاریں دیکھی ہیں لکھتے ہیں —

۱ - ۲۳ شوال ۱۲۷۳ ھ (۱۸۵۶ع) صبح کا وقت تھا بادشاہ وظیفے میں مشغول تھے کہ دھنی طرف ، مڑ کر دیکھا کہ دریاے بھاگیرتی میں تین جنگی جہازوں نے ایوان شاہی کے محاذی لنگر ڈال دیا "ماخوذ از رسالۂ آدیب مارچ سنہ ۱۹۱۲ع صفحہ ۱۵۷)

۲ - "لوگوں میں شہرت ہے کہ عیش پرستی نے اُن کو زناکاری میں مبتلا کر دیا تھا مگر عہد شاہی کے واجد علی شاہ کو میں نہیں جانتا ؟ مٹیا برج کے واجد علی شاہ

شاہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تو اتقا و پرہیزگاری ، خدا ترسی اور خدا پرستی کی مجسم تصویر تھے حضرت جان عالم کو اگر واقعی الزام دیا جا سکتا ہے تو موسیقی کا الزام ہے - اِس فن کو اُنھوں نے ابتدائے عمر سے حاصل کیا تھا جس کی طرف طبعی رجحان تھا اور اُس کا شوق اُن کے دل و دماغ میں اِس درجہ راسخ ہو گیا تھا کہ اچھا گانا چاہے کیسے ہی اتقا و پرہیزگاری پر آمادہ ہوں تو نہ توڑوا دیا کرتا - (مقدمۂ حزن اختر نوشتہ شرر صفحہ ۱۰ و ۱۱)

ناٹک ساگر کے مصنفین نے "شاہان اسلام اور ہندستانی ڈراما" کے تذکرے میں واجد علی شاہ کے راجہ اندر بننے اور اندر سبھا وغیرہ کی جو بحث کی ہے اُس کا سلسلہ بہت طویل ہے - رسالہ اُردو اورنگ آباد اور دلگداز لکھنؤ میں کئی مضامین اس کے متعلق شائع ہوئے ہیں - ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ واجد علی شاہ نے اِندر سبھا امانت کا ڈراما قیصر باغ میں شروع کیا یا اپنا رہس مبارک ، اور وہ راجہ اندر بنے یا کنھیا جی - جس کو اِس مباحثے کی تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ ناٹک ساگر صفحہ (۳۵۴) اور رسالہ اُردو اورنگ آباد (اپریل سنہ ۱۹۲۷ع) کا مطالعہ کرے -

---

اِس مضمون میں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ واجد علی شاہ کا انہماک بساط کس قدر تھا اور اس کے متعلقات کیا تھے ، جن کا وقوع اختلاف کے باوجود ثابت ہے یعنی شاہ اختر خواہ راجہ اندر بنتے ہوں یا کنھیا جی ، بہر حال یہ منہمک نشاط

اب رہی اسباب و متعلقات کی تحقیقات ؟ وہ حسب ذیل اقتباسات سے حاصل کی جائے —

۱ - اپنے پیارے جوڑے کو حال درد دل پُر ملال لکھتا ہوں ؟ رنگ ہجر و وصال لکھتا ہوں - اے بلقیس ! اے رشک برجیس ! بڑی دور سے ہم آئے ہیں ؟ جہاز کنول تمہارے لئے بارہ دری سکندر باغ میں منگوائے ہیں ؟ صاحب ؟ تم کہاں ہیں ؟ یہاں ہیں نہ وہاں ہیں - خدا کے واسطے سچ بتاؤ ذرا ہاتھ تو ادھر لاؤ - میرا دل دیکھنا کیسا دھڑکتا ہے - مثل طائر مذبوح پھڑکتا ہے - لو پھر میں اب سوار ہو جاؤں تمہارے واسطے بھی گاڑی چوکڑی تیار کروا منگواؤں - کوچوانوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھوا دوں - جوانان چمن پھر رہے ہیں کوئی قصہ چھیڑ کر انہیں بھی کھسکا دوں ؟ آب شبنم سے برگ درختاں دھو جائیں ؟ ملکۂ عالمیاں سلامت ! اب ہمارے تمہارے وصل کے موقعے ہو جائیں - حمام سکندر باغ تیار ہے حکم دیجیے تو خرابے کا پانی حوض کی تہ میں بھی حرارۂ بالا کھلوا دوں - آبشاروں کو اپنے حال زار پر رلوا دوں ؟؟ (رسالہ مخزن لاہور مرحوم شاہ اودھ کے خطوط ستمبر سنہ ۱۹۰۵ع -)

۲ - جانِ جاں ! تم جو بدر عالم کو جان عالم کی دلہن لکھتے ہو - جواب بدر عالم —

اے خورشید تاباں جس روز سے تم برج حمل کو گئے ہیں بدر سے ہلال ' غمگیں کمال ہوئی جو دلہن کہتے ہو ؟ حق تعالیٰ وہ دن لائے کہ دولہا مع براتی آئے -

عروس شب گھونگھٹ فراق کو ھٹا کر مصحف رخسہ
دکھائے ؟ شربت وصل پلائے جب دلھن کہنا ۔ ؟؟

۳ ۔ جانِ عالم ! جب ھمارا دل تمھاري محبت میں گھبرا
تھا بغیر دیکھے چین نہ آتا تھا ؟ بے تاب ھو کر تمھار
دیکھنے کو آتی تھي ؟ اور جس وقت جلسہ معشوقو
کا تمھارے پاس پاتي تھی ؟ جل بھن کر خاک ہ
جاتي تھي ۔ عاشق ھیں مگر جلے تن ھیں ؟ اُ
عاشقوں میں نہیں ھیں کہ ھمارے سامنے تم اوروں
. . گلوریاں دو ؟ ھمیں جلاؤ ؟ کیا کریں ھمیں تو برداشہ
غیر کے سایہ دیکھنے کي بھی نہیں ؟ دیکھہ کر چلي آتی
تھي ھماري بھن صاحبہ ھم کو دھمکا کر بار رکھتی
تھیں نہیں تو ھم اسي زمانے میں تم سے لڑتے ا
اپني جان دیتے ۔

۴ ۔ میرے اختر جنیا بر واضح ھو کہ حسب سرشتۂ قدیم
زنجیرھاے منتي ایک طلائي اور ایک نقرئي اِس پابند
سلسلۂ عشق بے بھجوائی ھیں اے پیارے جاني کہ
سلامتیاں منائي ھیں ؟ جان عالم تم کو میرے سر کی
قسم بر فور پہنچنے کے اِن زنجیروں کو گلے میں
ڈال لیجیے گا اس مفتونہ دور اُفتادہ کو شاد کیجیے گا
کس واسطے کہ دور ھوں ؟ اِس سے مجبور ھوں ا
پاس ھوتي جس طرح تم پہنتے پہناتي ارمان دل
گا نکالتي مرا اُٹھاتي ۔ .. ..

(خطوط نواب بدر عالم ؟؟ موسوم
تاریخ بدر ؟؟ مرتبۂ واجد علي شاہ اختر صفحہ ۔ ۲۶ و ۳۲ و ۳۳ و ۴۳

ایسے مکتوبی مضامین اگر چہ لفظاً معیارِ مرسل کا لباس مستعار پہنے ہوئے ہوتے ہیں لیکن معنیً اپنے موضوع حقیقت کے دامن گیر رہتے ہیں -

مثنوی حزن اختر میں جہاں جہاں اپنے پسندیدہ مشاغل اور بیگموں کے تذکرے کیے ہیں اُن اشعار کو پڑھکر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس کا مصنف نہ صرف طبعاً اور فطرۃً عیش پسند اور کمزور طبیعت کا آدمی ہے بلکہ عیش وعشرت طور سے نسائیت کی طرف زیادہ رجحان رکھتا ہے - ایک جگہ اپنے ضعف ونقاہت کے بیان میں لکھا ہے:—

یہ احوال اعضا ہے جیسے کباب
نہ زلفوں میں بل ہے نہ وہ پیچ و تاب
کلائی کا عالم یہ ہے کم ہوئی
کہ پنجہ جو گُل سے کیا خم ہوئی
یہ گالوں کا عالم ہے اے خوش جمال
ہوے بدر کامل سے گھٹ کر ہلال
لویں کانوں کی دونوں مرجھا گئیں
گُل تر کی کلیاں تھیں کُمھلا گئیں
وہ سینہ جو تھا تختۂ نور سا
وہ مُکھڑا جو تھا خوشنما حور سا
ہوئے اس قدر دونوں غم سے نحیف
کمیں میں ہوں جس طرح سے دو حریف

مثنوی حزن اختر صفحہ (۸ و ۹ و ۱۰)

ان اشعار میں زلفوں کا پیچ و خم ، کلائی کی گل سے پنجہ کشی - گالوں کا بدر کامل و ہلال ہونا کان کی لوس اور گل تر کی کلیاں پھر سب پر طرہ یہ کہ اپنے چہرے کو مکھڑا کہنا ،

کسي طرح کسي مرد آدمي کے منہہ سے بھلا نہیں معلوم ہوتا -
الخلاصہ ؟ یہی وہ متعلقات نشاط ہیں جن کي وجہ سے وہ
باوجود ذي علم ؟ خوش اطوار ؟ سلیم‌الطبع اور دین دار ہونے کے اپنے
اوقات اچھے مشاغل میں بسر نہ کر سکے اور آخر میں ہمیں پھر کہنا
پڑتا ہے کہ یہ سب اُن کي بے محل صاف گوئیوں کا نتیجہ ہے
کہ اُن کے بعد مورخین و مصنفین کو اس قسم کے استدلال و اجتہاد کي
گنجایش نظر آئي؟ جس کي تائید میں نانک ساگر کے (صفحہ ۳۶۱) پر
یہ عبارت (صحیح یا غلط) لکھي گئي -

"یہ تو مسلمہ ہے کہ واجد علي شاہ رہس میں بارت کیا کرتے تھے
اور یہ بھي مخفي نہیں کہ اختر پیا کي تمام زندگي ایک
ڈراما ہے جس میں وہ کبھي نئي نویلي دلہن ؟ کبھي
سہاگ‌لُٹي بیوہ ، کبھي دردوں کي ماري رنڈي کي شکل میں
دکھائي دیتے ہیں -

بہر حال اب اس تذکرہ انہماک نشاط کو مولوي عبدالحلیم شرر
مرحوم کي اس عبارت پر ختم کیا جاتا ہے —

جب ہم بہت سے بزرگان دین کو صحبت غنا کا لطف
اٹھاتے دیکھتے اور تعرض نہیں کرتے ہیں تو واجد علي شاہ
مرحوم کے معاملے کو بھی خدا پر چھوڑ دینا چاہیے -
خدا معاف کرنے والا ہے اور امید ہے کہ برگشتہ بخت
تاجدار اودھ کے اس جرم کو وہ اُن کی اور نیکیوں کي
صلے میں معاف کردے گا -"

(۳) زوال سلطنت

یہ عنوان بہت پیچیدہ اور دردناک ہے؟ پیچیدہ اِس لیے کہ اِس‌میں

بے شمار سیاسی عقدے ہیں ؟ اور درد ناک اس لحاظ سے کہ ایک بھولا بھالا خوش‌مزاج بادشاہ بیٹھے بٹھائے اُن مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا جس کے لیے وہ بنایا نہیں گیا تھا - لہذا معاملات سیاست میں اِس سے زیادہ تفتیش و تلاش یا تصفیہ وتنقیح کا موقع نہیں کہ چند ایسے واقعات قلم بند کردیے جائیں جن سے زوال سلطنت کی حقیقت تاریخی واضح ہو جائے :—

۱ - خان بہادر مولوی محمد مسیح الدین کاکوروی جو واجد علی شاہ کے سفیر بن کر ولایت گئے تھے اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں :—

" قریب دو برس کے میں خانہ نشین رہا کہ اتنے میں اودھ کی سلطنت سرکار انگریزیہ نے ضبط کرلی؟ جس‌دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر میں تھا بتاکید میری طلبی ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلا کے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن ضبطی کے مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہاں تک تاکید تھی کہ اُسی طرف سے میں روانہ ہو جاؤں اور پھر گھر میں نہ جاؤں ایسے اضطراب میں مجھکو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منکسر ہوئی . اُس کی صبح کو کلکتے کی طرف روانہ ہوا اور بادشاہ کو اُن کے خیر طلبوں نے صلاح دی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہوں اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکہ معظمہ کے حضور میں اور پارلیمنٹ میں بذات خود اصالتاً پیش کریں حقیقت میں یہ رائے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے تو دو برس جو اُنھوں نے قلعے میں رہنے سہنے سے مصیبت جھیلی اُس سے محفوظ رہتے

اور غالب گمان قریب بہ یقین کے ہے کہ جو مآل
اب بادشاہ کے واسطے ہوا اُس سے سراسر بہتر ہوتا ۔
الغرض پہلے تو بادشاہ نے اسی عزیمت پر کلکتے کی
روانگی کا قصد کیا چنانچہ اسی بندوبست کے واسطے
پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد خود
بھی روانہ ہوئے مگر چوں کہ جبلت سے ضعیف القلب
ہیں اور دریا کے سفر سے اُن کو نہایت خوف و خطر۔ بھاکلکتے
میں پہنچ کر رائے بدل گئی ۔ اپنی عزیمت موقوف کی؟
ملکۂ کشور بنی والدہ ماجدہ کو اور مرزا حامد علی بہادر
ولی عہد کو اور مرزا جواد علی سکندر حشمت اپنے بھائی کو
ولایت کی روانگی کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر
کیا ۔ اور قبل روانگی کے راقم نے بادشاہ کے حضور میں
عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلۂ عالم قدری کو اور
اپنے عزیزوں کو اس سفر دور دراز میں بھیجتے ہیں
بہت صعب امر ہے اور انجام اُس کا موقوف نہایت
صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ
پر ہے اگر پیچھے سے گھبرا کے نقدی قبول کر لینا منظور
ہے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ہیں ؟
مجھے حکم ہو تو راقم یہیں بہت اچھا بندوبست
سلطان عالم کے واسطے کرا دیوے ۔ اِس پر ارشاد ہوا
کہ میں بھیک مانگوں گا دریوزہ گری کروں گا مگر زنہار
ایک حبہ نقدی میں نہیں قبول کرونگا زنہار تم اس
طرح کی گفتگو کبھی نہ کیجیو ۔ عرض راقم مع سارے
قافلے کے ۱۸ جون ۱۸۵۶ ع کو بنگال نام جہاز

پر سوار هوا اور جهاز نے کلکتے سے لنگر اُٹھایا - اب
چوں کہ وهي سب نالائق لوگ جو سلطنت کي
ضبطي کے باعث هوئے تھے سب پادشاہ کے همراہ تھے
اور وهي دراندازیاں اور سازشیں اور جوڑ بندیاں بدستور
تھیں ' ملکۂ کشور کے ساتھہ بعضے مفسد جن کی کرنیل
سلیمن نے شکایتیں لکھی تھیں اور وہ چھپ کے بلیو
بک (Blue Book) میں ارباب پارلیمنٹ کے پاس
پیش تھیں کہ وجوہ ضبطی سلطنت میں ایک وجہ
مفسدہ پروازی اُن لوگوں کي لکھي گئي تھی ' اُن ایک
سو چالیس آدمی کے زمرے میں جو همارے ساتھہ
روانہ هوے شریک هو گئے ' بعضے لوگ جو لکھنؤ میں
قدیم سے جعل ساز مشہور تھے اُن کو ان مفسدوں نے
پیچھے بلا لیا کہ دوسرے جہاز پر سوار هو کے اسکندریہ
میں شامل هو گئے اور بعضے خواجہ سرا جہلا اور
بعضے دو دو پیسے کے آدمي تینوں صاحبوں کے همراہ
گئے کہ وهي سب اُن تینوں سرکاروں میں پیش پیش
اور با اقتدار تھے - چنانچہ بعد لندن میں پہنچنے کے
کرنیل سیکسن جو اُس عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپني
کے چیرمین تھے ایک دن وہ راقم سے کہنے لگے کہ
مولوي صاحب هم آپ کے بڑے شکر گزار هیں کہ
آپ همارے دعووں کے سب گواہ همراہ لے کے آئے هیں -
پہلا فساد جو مرزا ولی عہد بہادر کے همراهیوں سے هوا
وہ یہ تھا کہ بعضے رقوم جواهرات گراں بہا کے جو
بادشاہ نے حضرت ملکۂ معظمہ کي نذر کے واسطے همراہ

کیے تھے وہ مرزا ولی عہد کے مفوض ہوے تھے اور
ایک خواجہ سرا حبشي اُن کي طرف سے خزینہ دار
تھا جب بندر سویز میں جہاز کا لنگر ہوا چونکہ
وہ بڑا بھاری جہاز گھاٹ تک نہیں جا سکتا تھا اس
واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب
اُتار کے گھاٹ پر لے جاتے تھے ؟ رستے میں اُن خواجہ
سرا صاحب نے جو خزینہ دار تھے ظاہر کیا کہ وہ
رقوم جواہرات گراں بہا جس کي قیمت واقعي مجھے
نہیں معلوم تھی مگر میري تخمین میں دو تین
لاکھہ روپئے سے زیادہ کے نہ تھے کم کا احتمال ہے
اُنہوں نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت
اُن کو ایک خاصدان میں رکھکے اپنے ایک خدمتگار کي
تحویل میں سپرد کیا تھا جو ڈیڑھہ دو روپئے مہینے
کا اُن کے پاس نوکر تھا اُس کے ہاتھہ سے وہ خاصدان بحر
زخار میں گر پڑا عرض لندن پہنچ کے بادشاہ کے
مقدمے کا بہت عمدہ بندوبست ہوا اور ایک خوبصورتی
سے ملکۂ معظمہ سے ملاقات ہوئی کہ جب سے انگلستان
کي سلطنت قائم ہوئي ہے کبھي وہاں ایسا امر ظہور
میں نہیں آیا تھا یعني زنانہ دربار ہوا کہ کوئي
مرد وہاں نہ تھا راقم نے خزینہ بادشاہ کا گرواپا
اُس کو ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھہ میں لے لیا اور
جب تک بیٹھي رہیں وہ ہاتھہ میں رہا . .. بعد
اس کے ملکۂ معظمہ نے دونوں شاہزادوں کو اور راقم
کو حکم دیا کہ اُس کے تیسرے دن ہم تینوں آدمی

کھانے کي میز پر حاضر ھوں . لیکن تقدیر نے مختار
نہ کیا یعني دوسرے دن کلکتے سے تار برقی پر خبر آئي
کہ بادشاہ کو قلعے میں مقید کیا ھے وہ سارا بندوبست
جو وھاں ھوا تھا سب ملتوی ھو گیا . الغرض جب
بادشاہ کے مقید ھونے کي خبر وھاں پہونچي اور معلوم
ھوا کہ ھندستان میں نہایت زور سور سے غدر شروع
ھو گیا ھے جو تدبیریں مقدمے کي درستی کي ھم نے
کي تھیں وہ سب برھم ھو گئیں اور پارلیمنٹ میں جو
درخواستیں گزری تھیں اپنے مشاورین کی صلاح سے اُن
کو ملتوي کرا دیا یعنی پیروي اُس کی موقوف کی ؛
حقیقت میں مقدمہ بادشاہ کا بہت روبراہ تھا بہت
قرائن سے ھم کو نہایت امید ظفر کي تھي مگر ھندستان
کے غدر نے اُس کو بگاڑ دیا ؛ پارلیمنٹ کے دونوں
ھاؤس کے بہت بڑے بڑے عمدہ ممبر ھمارے معین
اور مددگار تھے اگر کچھہ نہ ھوتا تو اِس میں شک
نہ تھي کہ دو تین لاکھہ روپیہ بادشاہ کا درماھہ ھو جاتا
اور شہر لکھنؤ اور حوالي اُس کے بادشاہ کے قبضے میں رھتے
جب ھم لوگ لندن میں پہونچے تو کمپنی کي
طرف سے یہ بھي تحریر گئی تھي کہ اگر بادشاہ چاھیں
تو چھہ لاکھہ روپئے کا ملک واگزاشت کر دو کہ
اُن کے قبضے میں رھے عرض یہ تھي کہ لکھنؤ اور
حوالی اُس کے بادشاہ کے قبضے میں رھیں مگر پہلے
تو ھندستان کے غدر نے معاملہ خراب کیا پھر بادشاہ
کي بے صبري نے بالکل سب ابتر کر دیا کہ وہ عہد نامہ

جو پہلے آیا تھا اُس کو قبول نہ کیا اور بغیر کسي
عہد نامے کے بارہ لاکھہ روپیے قبول کر لیے جو عالباً
اُنہیں کي ذات تک باقي رہیں گے۔

(ماخوذ از سیر اودھہ مطبوعہ الناظر پریس از صفحہ ۹۳ تا ۹۸)

۲ ۔ منشي جالپا پرشاد سکریٹري اودھہ اخبار لکھنؤ اپنے
ایک مضمون میں لکھتے ہیں —

" بحیثیت ایک شاہ اور فرماں روا کے واجد علي شاہ
ایک مایوس ، ناکام اور قاصر شخص تھے اور ایک
حد تک آرام طلب اور مردہ دل ہونے کے سبب
سے وہ اپنے ملک کي حکومت میں بہت کم یا
کوئي حصہ نہ لیتے تھے ۔ اُن کے قوم ڈھاري ، اُن کے
حرم ، اُن کی رقاصہ عورتیں اُن کے اوقات اور توجہ کو
مستغرق و مصروف رکھتي تھیں ۔ پس کوئی تعجب
نہیں کہ ہر مقام پر ظلم و تعدي اور بد عملي
پھیلي ہوئی تھي کرنیل سلیمن صاحب
ریذیڈنٹ لکھنؤ کے پاس اخبار نویسوں کي ایک
جماعت تھي جو ان واقعات کی رتّي رتّی خبریں دیا
کرتے تھے ، جو اُن کے دربار میں اُن کے حرم میں اور تمام
صوبۂ اودھہ میں گزرتے تھے اور اس طرح ایک
عیش پسند بادشاہ کي محافل اور مشاغل کے
حالات رزیڈینسي کي رپورٹوں میں قلم بند کیے
جاتے تھے ۔ مندرجۂ ذیل خبروں سے اُن واقعات
کا کچھہ خیال پیدا ہو سکتا ہے جن سے یہ
رپورٹیں تیار کي جاتي تھیں ۔—

حضرت آج اپنے تامنجان پر سوار ہو کر فلاں محل کو
تشریف لے گئے اور وہاں فلاں فلاں محلات
مو جود تھے ؛ جن کو دو جوڑ مینڈھوں کی
لڑائی دکھائی گئی جو بڑے جوش و خروش
کے ساتھ لڑے ؛ تیتروں کی بھی لڑائی ہوئی -
دو سو روپئے کا ایک دوسالہ اُس جمعدار کو
مرحمت ہوا جس نے اس وحشیانہ جنگ کا
انتظام کیا تھا ؛ اس کے بعد حضرت نے ایک
نئی گائن کو سنا اور پھر چار بجے شام تک
کنکوے بازی سے اپنا دل بہلاتے رہے ؛ بعد ازاں
خواب استراحت فرمایا - فلاں موضع ؛ فلاں پرگنہ
فلاں ضلع سے خبر آئی کہ رام سنگھ زمیندار
مال گذاری دینے سے انکار کرتا ہے جو
عامل نے اس سے طلب کی تھی ؛ اس پر
اُس کا مکان جلا دیا گیا ؛ وہ زخمی ہوا
اور اُس کے دو بیٹے اور بھائی بھاگ گئے -
جیون خاں داروغہ کبوتر خانے کو دو ہزار
کا ایک خلعت عنایت ہوا جس نے ایک
ایسا کبوتر پیش کیا تھا جس کا ایک بازو
سیاہ اور دوسرا سفید تھا - بادشاہ نے خاص
محل کو اپنی جدید غزل سنائی جس میں
گل و بلبل کے عشق کا مضمون تھا -

اس لہو لعب کے لحاظ سے واجد علی شاہ اپنے مذاق میں
کسی طرح یکتا و تنہا نہ تھے اُن سے پہلے اُن کے سلفین کے پاس

بھي اُن کے گويئے اُن کے ناچنے والي عورتيں ؟ اُن کے جانور خانے اور چڑياخانے تھے ؟ اُن کي نسبت غالباً اُن کے زمانے ميں جنگلي جانوروں کي لڑائي عام پسند تھي ؟ کنکوے بازي اور کبوتر اُڑانا بہت کم پسند کيا جاتا تھا ؟ ہر چند کہ وہ لوگ بھي اپنے مساعل سور و سرود کو اپني سلطنت کے فرائض کا تابع رکھتے تھے مگر واجد علي شاہ نے اسے بئيں ايک ايسے تعيّش اور تنعّم ميں ڈال ديا جس کي کوئي حد و انتہا نہ تھي ؟ آخر کار برتش گورنمنٹ کي مداخلت اور دست اندازي کا وقت آگيا جس کي نسبت اُن کو بارہا دھمکي دي گئي تھي وہ سخت سے اُتارے گئے اُن کي سلطنت کا انتحان اور انتزاع عمل ميں آيا اور وہ بطور شاہي قيدي کے کلکتے کے ايک حنوبي نواح ميں رہنے کے لئے بھيجے گئے اگر چہ وہ اپنے بئے وطن مين بغير اُس جسم و حشم اور طبل و علم کے رہنے پر مجبور ہوئے تھے جس ميں وہ لکھنؤ ميں محصور تھے تاہم اُن کو اُن تکلفات کے ترک کر دينے ميں کوئي مشکل نيس نہيں آئي جس کو اُنہوں نے بطور ايک بادشاہ کے اختيار کر ليا تھا ؟ وہ بہت جلد عيش و عشرت ميں منہمک ہو گئے اور گذشتہ زمانے کو فراموش کر ديا - متيا برج گارڈن ريج ميں اُن کا حرم ويسا ہي کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جيسا لکھنؤ ميں تھا ؟ اُن کے مغنّي اور مطرب ؟ ڈوم اور ڈھاڑھي ؟ اُن کي رفاصہ عورتيں اُن کے ساتھ آئي تھيں ؟؟ -

رسالہ العصر لکھنؤ جلد ۳ نمبر (۱)

۳ - مولوي علي حيدر طبا طبائي ايک چشم ديد واقعہ يوں لکھتے ہيں —

نواب سيد اميد علي خاں بارہ کے رہنے والے ہائي کورٹ

کے وکیل تھے متیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے ؟ بتدریج ایسی ترقی کی اور اِس قدر تقرب حاصل کیا کہ وزیرالسلطان خطاب ہوا اور تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے تو ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں ؟ غدر کے زمانے میں انہوں نے میجر کوئینا قلعہ دار ولیم فورٹ کو ایک جھوٹی خبر پہونچائی تھی کہ راجہ مان سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے ملے اور ایک فرمان مزین بمُہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھ غدر کر کے انگریزی تسلط اٹھادیں میجر کوئینا نے فوراً یہ واقعہ نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہوا ۔

(رسالہ ادیب الہ آباد مارچ ۱۹۱۲ء)

۴ ۔ فتح بہادر بیگ وکیل لکھنؤ اپنے ایک مضمون (فرماں روا بان اودھ) میں لکھتے ہیں :—

جب کرنل سلیمن صاحب ریزیڈنٹ مقرر ہو کر لکھنؤ آئے اُن سے اور وزیر اعظم سے بسبب معطلی و اخراج سہ ہزار وصی علی خاں کے بعاے سخت بیدا ہوئی اور یہ ناچاقی روز بروز ترقی کرتی گئی ۔ کرنل سلیمن نے ملک اودھ کا دورہ کیا اور بد انتظامی سلطنت کی متواتر رپورٹیں ولایت کو روانہ کیں دسمبر ۱۸۵۴ء میں جنرل اُترم صاحب ریزیڈنٹ صوبۂ اودھ ہوے ۔ مختصر یہ کہ کرنل سلیمن اور جنرل اُترم

کي رپورٹ پر نقش ارتباط و مراسم سابقه یک قلم مٹ گیا اور پیشگاه صدر سے بادشاه پر بد انتظامي کا الزام قائم هوا - بتاریخ یکم فروري ۱۸۵۶ع جنرل اُترم صاحب نے بادشاه کو خبردي که سرکار کمپني انگریز بهادر ۷ فروري سنه ۱۸۵۶ع سے ملک اودهه پر اپنا قبضه کرےگي آپ کو بندوبست کے واسطے ایک هفتے کی مهلت هے * بادشاه نے بغور سماعت اس بات کے کل کار و بار سلطنت کو بند کر دیا نوبتوں کو چرخ سے گروا دیا اور تمام ملازمین اور تعلقه داروں کے نام اس مضمون کے احکام جاری فرمائے که خود بدولت واسطے استغاثے کے سمت لندن جاتے هیں تم سب تعمیل احکام اهالیان کمپني بهادر میں مصروف رهو ۴ فروري سنه ۱۸۵۶ع کو ریذیڈنٹ مع دیگر افسران فوج بادشاه کے پاس آئے اور مخاطب نام نواب گورنر جنرل بهادر پیش کیا - بادشاه نے اُسے پڑھ کر بے اختیار ایک آه دل در درد کھینچ کر فرمایا که خداوندا تو شاهد حال هے که یه مجھپر جفا اور جبرصریح هیں اور حملهٔ انتظام سے میرا گھر مجھسے چھپنا جاتا هے -

۷ فروري سنه ۱۸۵۶ع بذریعه ایک اشتهار کے جو خاص لکھنؤ شهر میں مشتهر کیا گیا سرکار کمپني بهادر نے کل دفاتر شاهي پر قبضه کر لیا -

(رسالهٔ رمانه کانپور جون سنه ۱۹۲۰ع)

---

* مفصل اشتهار تاریخ نثر اُردو مولفه راقم مضمون کے صفحه (۳۹۷) میں درج هے -

ان اقتباسات میں سلطنت اودھ کی تباہیوں کے سچے حالات اُن اہل قلم کی تحریروں سے منتخب کیے گئے ہیں جن کی روایات تاریخی درائت کے معیار پر ہر طرح قابل اعتبار ہیں ؛ اس کے بعد مزید توضیح چنداں ضروری نہ تھی ؛ لیکن چونکہ زوال سلطنت کمال عیش و عشرت کی بدولت رونما ہوا ہے اس لیے مثنوی حزن اختر کے مختلف مقامات سے کچھ ایسے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن کو پڑھکر اندازہ ہوگا کہ انتہائے پریشانی و بے سر و سامانی کے عالم میں بھی جان عالم کے وہی تھات تھے جس کے طفیل میں اُن کو یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا ۔

قیدخانے میں جو تکلیفیں واجد علی شاہ مرحوم نے اُٹھائیں اُس کی مختصر تشریح یہ ہے —

نفس سرد مہری سے ژالہ ہوا
بدن غم غم کا پیالہ ہوا

جگر جل گیا گرمی رنج سے
تنفر ہوا اک قلم گنج سے

بدن تار مسطر سے مل مل گیا
کلیجا مصیبت سے ہل ہل گیا

نمی تک نہیں نام کو آنکھ میں
نہ نیند آتی ہے شام کو آنکھ میں

نہ کھانے کا اسباب ہے کچھ نصیب
نہ پانی کا ہے ذکر لب کے قریب

ہوا بھی جو آتی ہے آزے ہیں ہوش
کف غم سے بیزار ہے پائے پوش

وہ گرمی کا رخ سامنے کی وہ دھوپ
اُڑاتی ہے تا طاقتی رنگ و روپ
پھر اُس پر غضب چار سنداس ہیں
کہ مجھ دل جلے کے وہ سب داس ہیں
تپش یہ جو ہوتی ہے برسات کی
یہ گھٹس جو ہوتی ہے ہر رات کی
اُبھرتی ہے ہر عطر داں کی جو بو
کہ جس طرح مرچوں کی ہو بند جو
سلگتا ہے اِس سے دماغ ضعیف
ہوا جاتا ہے اور بھی دل نحیف
مجھے ڈیڑھ سال اس بلا میں ہوا
ہوا قرب دو سال اے مہ لقا
نہیں حال اندوہگیں پوچھتا
ابھی تک تو کوئی نہیں پوچھتا
دو وقتہ تو آتا ہے گھر سے طعام
یہ کیا جان کرے آدمی گر کلام
کھلی دیگچی دیکھ لیتے ہیں سب
تو پھر پیس بندہ وہ آتا ہے جب
جو کچھ جاتے مجھ تہ پڑ پڑ گئے
قلم کس زباں سے سنائے اُسے
جڑیں پڑگئیں ریش بھی ہے دراز
جھاؤں سے آتا نہیں چرخ تار

مگر یہ پشتینی عیش پرست بادشاہ اسی درمیان میں
جب ذرا سا بھی اطمینان پاتا ہے تو اس طرح فرماتا ہے :—

سما کا جو حمام میں نے کیا
مہینا وہ سال کا تھا لکھا
مگر سر پلٹ کر بہتر ہوئے
کہ ہم تندرست اور بہتر ہوئے
ہوئیں بند کی گھر میں بیماریاں
لگی کھلنے خلعت کی گل کاریاں
مرے آدمی سب اکٹھا ہوئے
محل بھی جو تھے سب وہ یکجا ہوئے
ہوا ہر طرف راج گانا شروع
درخت خوشی کے جمے سب فروع
قہاقہ مچی تھی محل میں تمام
وہ نرم ضرب بھی ہوئی جب کہ شام

رندان کی سختیاں اور نگرانیاں یوں بیان کی جاتی ہیں —

وہ تکلیف ہے جس سے دل تنگ ہے
سب و روز رندان کا یہ رنگ ہے
رس ہے نہ کوتھی نہ باغ کلاں
مگر میرے کس کام کی اے جواں
ہر اک اس کا در بند ہے آہ آہ
وہ گرمی وہ گرمی کہ دل ہے تباہ
کھلے ہیں جو در تو ادھر دھوپ ہے
نہ ہے رنگ کوتھی کا نہ روپ ہے

اس اوسط کے درجے میں دل شق ہیں ہم
نہ اوپر نہ نیچے معلّق ہیں ہم
کئی خط کئے لات کو بھی رقم
ہوے سرفراز ایک سے بھی نہ ہم
کسی خط کا لکھا نہ ہم کو جواب
خدا جانے کس امر پر ہے عتاب
منگاؤ نوشتہ جو منسی کے ہاتھ
تو آتا ہے کرنیل صاحب کے ساتھ

ان تمام بندشوں میں سب سے زیادہ جس بات کا رنج ہے وہ صرف ماہرویوں کا فراق ہے -

کوئی رنج زنداں میں ایسا نہیں
جو اس بے سر و پا کو پہنچا نہیں
مگر درد فرقت ہے سب سے سوا
ہر اک غم دنیا ہے اسی نے بھلا
صبا بھی نہیں دیتی پیغام یار
کیا غم نے مجھکو ضعیف و نزار
وہ شام الم ہے سحر تک نہیں
مرے ماہرو کی خبر تک نہیں

قید ہونے سے پہلے اپنے عہد شاہی کے متعلقین کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے —

کبھی سر نہ رکھتا تھا میں کجکلاہ
اودھ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ

ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
فقط سترہ سو تھے اہل قلم
طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم
فقط پندرہ سو تو تھے چوبدار
رعایا وعیرہ کا کیا ہے شمار
کروں ساتھہ ستر محل گر شمار
تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار

قید کے عالم میں ہمراہیوں کی تفصیل یہ ہے —
اسامی ہمراہیاں کر رقم
جو لائے ہیں کلکتے میں ساتھہ ہم
زن و مرد اہل قلم اہل فوج
کہ ہو ایک چشمے کی جس طرح موج
کسی طرح تھے پانچ سو سے نہ کم
ملازم رفیق اور محل ذی حشم

محبوسی و مجبوری کے باوجود جس الوالعزمی اور سیر چشمی سے شاہانہ مصارف جاری رکھے اُن کی تشریح اقرار عجز کے ساتھہ اس طرح کی گئی ہے —
یہ اختر جو ہے خاک بائے جہاں
یہ شاہ اودہ تھا کبھی اے جواں
مگر اب ہے محبوس اہل فرنگ
طبیعت سے جاتی رہی ہے اُمنگ

نہیں پوچھی جاتی خطا بے خطا
بہت تنگ اس جا پہ ہے دل مرا
جو تاریخ تک آج کی اُٹھہ چکا
وہ سب مدل اخبار میں نے لکھا
یہ بخشش نہیں ہے عنایت نہیں
بھلا اتھتا ہے بار بخشش کہیں
غریبوں کی ہے یہ فقط روٹی دال
جنے بھون کر کھائیں جائے ملال
خدا کی قسم دے کے ہوں شرمسار
یہ وہ ہیں کروں جن پہ میں جاں نثار
نہیں ہوتی اس میں کبھی ہان چاشت
مگر لکھہ لیا ہے پئے یاد داشت
دیے منشی صدر کو یوں پانچ الف
کہ تو اپنے کاموں میں کر ان کو صرف
چل و پنچھرار اور پھر چار سو
کرو بیس زائد جو گنتی ہوئے تو
یہ لندن روانہ کیے خرچ کو
کہا بیٹے ماں بھائی سے اس کو لو
پھر اک دفعہ ہمتاد و نہ الفِ یار
کرو تین سو زائد اُس پر شمار
یہ بار دگر بھیجا لندن میں زر
کہ کھاؤ اسے جب ملک بیٹھکر
کیے دفعہ چوتھی سن اے باتمیز
محل خاص ہے وہ جو مجھکو عزیز

چل و پنج الف اور پھر چار سو
دیے اُن کو اور یہ کہا ہیں یہ جو
دیے پھر مجاہد کو گیارہ ہزار
پُھنا ہے جو مدرا وہ رستم سعار
دیے بست و پنج الف اور چار سو
شمار انگلیوں پر کرو اس کو تو
انہیں کو دیے جو سزاوار ہیں
جو محبوبۂ خاص دلدار ہیں
جو ہیں جعفری بیگم خوش پری
دیے شش ہزار و سہ صد اُن کو بھی
دیے پنج الف اُس کو سن اے نگار
کہ ہے نام حسن بائی کا دوالسار
دیے کربلائی کو پھر اک ہزار
کیے وقت رخصت یہ اس پر نثار
ہوے بھائی اُن کے جو ہیں آغا جان
دیے پانسو اُن کو اے مہربان
جو تھے چھوٹے بھائی یہاں میرے ساتھ
کہو مرزا جعفر تو نام آئے ہاتھ
اُسے بھی دیے پانسو اے عزیز
مرے ساتھ تھا وہ سراپا تمیز
پھر اختر محل پر عنایت یہ کی
دیے تیس ہزار اُن کو اے منّعی
دیے ملکۂ ملک کو بیس ہزار
کہ آئے نہ سینے پہ اُس کے غبار

کیے نذر قیصر بھي گیارہ ہزار
وہ راھي ھوئی لے کے اے غمگسار
کیے صرف زنداں میں پھر چار الف
ھوے کارخانے میں بالکل وہ صرف
کیے نذر ساداب چھہ سو پچاس
خدایا مجھے نذر آئے یہ راس
ھر اک ماہ تنخواہداروں کو یار
دیا کرتا ھوں اک قلم دس ھزار
طلا لاکھہ سکّوں کا باقي ھے اب
اسے بھی اُٹھاؤں گا اے خوش نسب
نہیں صورت آمد اے یار اب
اسي کا بہت ھے الم اور تعب
پلیں گي یہ کس طرح جانیں جو ھیں
کھچیں گي یہ کیونکر کمانیں جو ھیں

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھکر سنگ دل سا سنگ دل بھي متاثر ھوے بغیر نہیں رہ سکتا اللہ ! اللہ ! کیا انقلاب ھے آج ان سانحات کے پڑھنے والے حیرت و افسوس کي تصویر بن جاتے ھیں پھر اُس شخص کا کیا حال ھوا ھوگا جس پر خود یہ وارداتیں گزري ھیں - ساري مثنوي کو پڑھنے کے بعد واجد علي شاہ کی تمام کمزوریوں کا مرقع صاف صاف نظر آ جاتا ھے - شاھانہ الوالعزمیاں اور خصوصیات خانداني بدرجۂ اتم اُن میں موجود تھیں لیکن طبیعت اس قدر کمزور پائي تھي کہ ذرا سي سختي میں گھبرا جاتے تھے اور وہ باتیں زبان و قلم سے نکال بیٹھتے تھے جو کم از کم ایک ۳ کرور ملک والے بادشاہ کے لیے خود داري کے منافی ھیں - وہ بادشاہ

جس کے دربار میں بڑے بڑے صوبہ دار اور ہم عصر والیان ملک بآدب و احترام آتے ہوں وہ اپنے قید کے زمانے میں گورنر جنرل کے القاب میں یہ عبارت لکھتا ہے —

"ذکر عنایات و الطاف اریکہ آرائے سلطنت و حشمت رونق بخش سریر شوکت و عظمت نواب مستطاب معلی القاب اشرف الامرا گورنر جنرل بہادر خلداللہ ملکہ و سلطنتہ ۔"

اور پھر اپنے نام جو خطوط منجانب گورنر جنرل موصول ہوتے ہیں اور اُن میں پرانے القاب و آداب جو بجنسہٖ بہ تغیر درج ہوتے ہیں اُن کو بافتخار یوں ظاہر کیا جاتا ہے —

ابھی تک تو ہے لاٹ صاحب کو دھیان
یہ معلوم ہوتا ہے ہیں مہربان
سناؤں میں تفصیل اس کی تجھے
بگوشِ دل اس کو اگر تو سنے
بوقتِ حکومت جو تھا رسم یار
وہ آداب و القاب ہے بر قرار
جو تھا خلد اللہ میں مُلکہ
وہ بدلا ہوا دام اور مجدہ
رر افشاں وہی خط وہی عرض وطول
خریطہ بھی رر بست کا با اُصول

ارادہ تو یہ تھا کہ ان سب تشریحات کے بعد مثنوی حزن اختر کا ایک ایسا مسلسل انتخاب پیش کیا جائے جس سے بالترتیب تمام واقعات ناظرین کے سامنے آجائیں مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ اب تک جتنے اقتباسات کیے گئے ہیں وہ بھی کافی مقدار میں قلمبند

ہو چکے ہیں ؛ مزید طوالت کو تحصیل حاصل سمجھا گیا اور اب یہ تریجدی مثنوی کے اُن ۳ حسرتناک شعروں پر ختم کی جاتی ہے جن سے کمال سخنوری ؛ جمال عشوہ گری اور زوال اختری کے مرقع یکجا نظر آتے ہیں —

رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے
سبھوں نے کنوے میں ڈھکیلا مجھے
عیال اور اطفال لوتے گئے
جہاں میں میرے لال لوتے گئے
کوئی مضطرب ہے کوئی نالہ کش
کوئی پیٹتا ہے تو آتا ہے غش

فاعتبروا یا اولی الابصار

ایک ادبی استفسار

(از مولوی سراج الحق، مچھلی شہری)

کچھ دنوں سے اخبار اور رسائل میں ایک لفظ "سنہری" رائج ہو گیا ہے، خواہ وہ مذکر اسم کی صفت ہو خواہ مؤنث اسم کی - اور "سنہری کتاب" اور "سنہری موقع" وغیرہ بے تکلف استعمال ہو رہا ہے بلکہ اس پر اصرار بھی ہے - میں آج تک مذکر کی صفت کے لیے سنہرا اور مؤنث کی صفت کے لیے سنہری لکھتا تھا جب پہلے پہل (غالباً سنہ ۱۹۲۵ع) میں نے ایک افسانے کا نام "سنہری بچھو" پڑھا تھا (یہ افسانہ کسی انگریزی افسانہ نگار کے ایک دلچسپ ناول "گولڈن اسکورپین" کا ترجمہ ہے اور پنجاب کے کسی صاحب منشی تیرتھ رام فیروزپوری نے کیا ہے) تو میں نے اس وقت اس کو پنجابیت پر محمول کیا تھا لیکن آج ارباب قلم کی یہ روش عام اور اس پر اصرار تام دیکھ کر مجھے اپنے روزمرہ اور ذوق لسان پر اعتماد باقی نہ رہ گیا اور اس کی صحت میں کچھ شک سا آ چلا میں نے اس کی تحقیق کرنی چاہی چنانچہ لغات کی طرف رجوع کیا تو وہاں عجب عجب تماشے نظر آئے اور میں کوئی صحیح نتیجہ اور نئی معلومات نہ حاصل کر سکا اگر میں کچھ سمجھ سکا ہوں تو اتنا کہ جو کچھ ہم (اور ایک مجھی پر کیا موقوف ہے عام طور پر لوگ جو) بولتے ہیں وہی صحیح ہے -

اب ذیل میں اس لفظ سنہری کی بابت مجھے تین گذارشیں کرنی ہیں (۱) ارباب لغت کے ارشادات - (۲) رواج عام - (۳) قیاس لغوی

(۱) ۔ لغت میں اس کی بابت یہ درج ہے —

(الف) ۔ فرہنگ آصفیہ (مطبوعہ اسلامیہ پریس لاہور ؟ جلد ۳

صفحہ ۱۱۳ سنہرا (ہ) صفت (۱) پہلا کا بمعنی ؟

سونے کے رنگ کا ۔ مذہّب ۔ زراندود ۔ طلائی ۔ طلاکار

زرّیں ۔ زر ۔ سونے کا ۔—

(رشک)—یہ طلائی رنگ جسم یار گہرا ہو گیا

جو انگرکھا چھو گیا تن سے سنہرا ہو گیا

(آتش)—مے کی تکلیف نہ کیونکر کریں اِن آنکھوں کے جام

موے سر ؟ ابر سیہ ۔ بری ؟ سنہرا بعوبذ

(۲) زرد ۔ پیلا سنہری (ہ) صفت ۔ (۱) پہلی کا بمعنی ۔ سونے

کے رنگ کی ۔ زریں ۔ مذہّب ۔ زر ۔ طلائی —

(رنگین)—دابت حامے دھری طلسم جسی

سنہری لپ بسیہ بول حال بری

(ناسخ)—اے بری بونے جو پہنی ہے سنہری انگیا

آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجکو

(ناسخ)—سورج بو بنا سنہری اوگی

سورج کی کرن کرن بنی ہے

(۲) زرد ۔ طلائی رنگ ۔ چنبئی رنگ ۔ بسنتی رنگ ۔—

(ناسخ)—وصف حسن میں بے کیے بھرے سنہری رنگ کے

خود بخود ہر صفحۂ دیواں مذہب ہو گیا ؟؟

(ب) فرہنگ شعق (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ طبعہ اول

صفحہ ۴۰۴) سنہرا وہ جبر جو زبان پر مذکر جاری ہو اور

رنگ اُس کا طلائی ہو —

ناسخ—مل گیا سونے کے گہنے سے سنہرا جوڑا

رنگ کہتے نہیں اکسیر اسے کہتے ہیں

مے کی تکلیف نہ کیونکر تا سنہرا نعوذ (یہ شعر اوپر آچکا ہے)

سنہرا رنگ طلائی رنگ —

(ناسخ) — جب سے اُس بت کا سنہرا رنگ ہے بیش نظر

حلقۂ انبی جسم تر کا حاتم زر ہو گیا

(ذوق) — مصحف رخ پہ ترے رنگ سنہرا نکھرا

واہ کیا خوف ہے سونا سر قرآن چڑھا

سنہری وہ حجر جو بیان در موتب جاری ہو اور رنگ اُس کا طلائی ہو —

(ناسخ)—اے تری توبے جو پہنی ہے سنہری انگیا الخ (یہ شعر آچکا ہے)

سنہری رنگت - رنگ طلائی —

(ناسخ) — مجھ کو تیری سنہری رنگت کے

کبھی دیکھیں نہ رنگ سونے کا

(ح) لغات آزاد مطبوعہ کرنیلی پریس لاہور صفحہ ۱۰۴)

سنہرا - زر اندود - مذہب -

(د) سرمایۂ زبان اردو (مولفہ صامن علی جلال لکھنوی مطبوعہ انوار المطابع صفحہ ۱۰۹) سنہری بتخانی معروف کے ساتھ - جو جاتی کہ زر اندود اور مطلا ہو اور نام ایک رنگ کا بھی ہے اُسے طلائی بھی کہتے ہیں چنانچہ شیخ ناسخ فرماتے ہیں —

وصف جب میں نے کیے تیرے سنہرے رنگ کے

جود تجھ پر صفحۂ دیوان مذہب ہو گیا

(تنبیہ) یہاں لفظ سنہرے کو تائے مدور کے ساتھ یعنی آمالۂ سنہرا لکھنا خطا ہے اس واسطے کہ سنہری نام ایک رنگ کا ہے جس اس رنگ کی طرف جو اس سے موتب منسوب ہو خواہ لاے مذکر - بہر طور اس کو تائے معروف کے ساتھ

پڑھیں گے - قیاس پر رنگ اگری - بسنتی - چمپئی
کے -

(۵) نوراللغات (مولفہ سید نورالحسن نیّر ' مطبوعہ نیّر پریس لکھنؤ ' جلد ۳ صفحہ ۳۷۶) سنہرا (۵) صفت مذکر - سونے کے رنگ کا ' زریں - سنہری (۵) صفت مؤنث وہ چیز جو سونے کے رنگ کی ہو - نام ایک رنگ کا جس کو طلائی بھی کہتے ہیں :—

(ناسخ) — وصف جب میں نے کیے تیرے سنہرے رنگ کے
خود بخود ہر صفحۂ دیواں سنہری ہو گیا

جلال نے سرمایہ زبان اردو میں لکھا ہے کہ " یہاں لفظ سنہری کو یائے مجہول کے ساتھ یعنی امالۂ سنہرا پڑھنا خطا ہے اس واسطے کہ سنہری نام ایک رنگ کا ہے - الخ یا چمپئی کے " (جیسا اوپر گزر چکا) سنہری رنگت ' سونے کی سی رنگت -

عرض یہ پانچ لغات مجھے ملے میں نے ان میں جو کچھ اس لفظ کے بابت دیکھا سب نقل کر دیا اگرچہ خوامخواہ کا طول ہو گیا ہے مگر تمام عبارتیں یکجا اور بیش نظر ہو گئی ہیں اب میں ان عبارت کی بابت کچھ عرض کرتا ہوں -

یہ تو ظاہر ہے کہ سنہری صفت مونث واقع ہو تو اس میں کسی قسم کا اعتراض کسی کو نہیں - رہی مذکر کی صفت اور لفظ '' سنہرا '' کا وجود تو سوا جلال لکھنوی کے کہ ' وہ ایسا کوئی لفظ ہی نہیں مانتے باقی سب کو تسلیم ہے کہ سنہرا ایک لفظ ہے ضرور ' چنانچہ شفق نے '' سنہرا جوڑا '' '' سنہرا تعویذ '' '' سنہرا رنگ '' '' رنگ سنہرا '' کی چار مثالیں ناسخ آتش اور ذوق کے کلام سے دی ہیں -

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غلطی کا منشا صاحب فرہنگ آصفیہ اور جلال لکھنوی کی عبارتیں ہیں ۔ معلوم نہیں ان دونوں میں متقدم کون صاحب ہیں اور کس نے کس سے استفادہ کیا ۔ بہر حال سید احمد صاحب نے سنہری کے معنے زرد اور سنہلی رنگ لکھ کر ناسخ کا ایک شعر نقل کر دیا جلال نے ادّعائے استادی میں اُس سے ایک کلیہ بنایا کہ سنہرے نہیں ہے ؟ سنہری ہے اور جو چیز بھی زرد اندود ہو (خواہ مذکر خواہ مؤنث) سنہری ہی کہی جائیگی پھر وہی شعر ناسخ کا سند میں پیش کر دیا پھر ایک قیاس کیا کہ اگری اور چمبئی کی طرح سنہری بھی صفت نسبت ہے ۔ صاحب نوراللغات نے تو اور بھی کمال کیا چونکہ وہ سنہرا لفظ کو صحیح مانتے اور مذکر کی صفت جانتے ہیں لہذا ناسخ کے اُسی مراعی یا استنادی شعر میں رنگ کے ساتھ تو سنہرا ہی پڑھا ہاں دوسرے مصرع میں سنہری لکھ دیا لیکن ہم کو دیوان ناسخ مطبوعہ نولکشوری پریس لکھنؤ ؟ دیوان دوم میں صفحہ ۳۵ پر یہ غزل ملتی ہے —

مطلع) — واعظا حُبّ ذَہَب تیرا جو مذہب ہوگیا

عیب کیا شُرب شراب اپنا بھی مشرب ہو گیا

اس غزل کا تیسرا شعر یہ ہے —

وصف جب موروں کیے اُس کے سنہرے رنگ کے

خود بخود ہر صفحۂ دیواں مذہّب ہو گیا

واضح ہو کہ دیوان ناسخ میں '' سنہرے رنگ '' بجائے مجہول لکھا ہے پھر اب نہیں معلوم کہ آیا سید احمد صاحب دہلوی اور جناب جلال لکھنوی کو جناب ناسخ سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا اور انھوں نے خود انھیں کی زبانی سنا تھا کہ اس جگہ سنہری نہیں بلکہ بخنائی معروف کے ساتھ سنہری ہے ۔ لیکن اگر انھوں نے بھی دیوان سے دیکھ کر یہ شعر لکھا ہے

دو ۹۹ فیصدی قیاس ہوتا ہے کہ دونوں حضرات نے اس لفظ کو پڑھا ہی غلط ۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ بھی ناسخ دوسرے اشعار میں بقول شفق لکھنوی خود بھی سنہرا جوڑا اور سنہرا رنگ فرماتے ہیں اور ان کے ہم عصر آتش سنہرا تعویذ لکھتے ہیں ۔ جب سنہری رنگ قافیہ میں نہیں ہے تو کیسے حکم لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تحتانی معروف ہی کے ساتھ ہے ۔

خیر؟ صاحب فرہنگ آصفیہ تو اس " سنہری رنگ " کو غلط پڑھ کر غلطی میں پھنسے ورنہ وہ سنہرا کو صحیح مانتے اور روپہلا کو بھی صحیح مانتے ہیں اور ایک کو دوسری کا نقیض جانتے ہیں لیکن جلال لکھنوی نہ سنہرا کوئی لفظ مانتے ہیں نہ روپہلا "سرمایہ زبان اردو" میں صفحہ ۱۹۴ پر ایک لغت قائم کرتے ہیں "روپہلی جو کہ نقرئی ہو" یعنی اس میں بھی عموم ہے مذکر اور مونث دونوں کے لیے؟ حالانکہ یہ لفظ بھی عام ہے نوراللغات (جلد ۳ صفحہ ۲۱۰) روپلی کے ذیل میں ہے روپہلا (ہ۔واو عبر ملفوظ) صفت مذکر ۔ چاندی کے رنگ کا جیسے روپہلا موتاب روپہلی (ہ) صفت مؤنث فرہنگ شفق میں ناسخ کا یہ شعر روپہلا کی سند میں آیا ہے ۔

جب روپہلا چوٹی میں موتاب ڈالا یار نے
سنبلستاں میں گُل شبّو نظر آیا مجھے

اب ہم نہیں سمجھتے کہ یہ روپہلا اور سنہرا کے الفاظ کیوں لغت سے نکالے جارہے ہیں اور کتنے آدمی اس کو مانیں گے ؟

(۲) استعمال اور رواج عام —

جہاں تک مجھے معلوم ہے خود لکھنؤ میں آج بھی اور دلی میں بھی یہ لفظ برابر مذکر کے لیے سنہرا اور مونث کے لیے سنہری بولا جاتا ہے جس کا ثبوت ایک تو وہی اشعار ہیں

جو اوپر گزر چکے دوسرا ثبوت ؟ ذوق سلیم کا فتوی ہے - آج بھی اردو بولنے والے عام اس سے کہ وہ اہل زبان ہونے کے مدعی ہوں یا نہیں ذرا دو چار مرتبہ "سنہری موقع" "سنہرا موقع" "سنہری بچھو" "سنہرا بچھو" کہہ کر اپنے ذوق سے دریافت کریں اپنے کانوں سے پوچھیں اور جو کچھ جواب ملے از روے انصاف اسی کو مانیں -

(۳) قیاس لغوی :—

جلال لکھنوی نے (اگر میرا خیال ما سبق صحیح ہے تو) ناسخ کا شعر غلط پڑھ کر ایک قیاس یہ بھی کیا ہے کہ اگری سنتی اور چسنی کی طرح یہ بھی صفت نسبت ہے - جلال استاد کہے جاتے ہیں مگر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ یہ کیا کہہ رہے ہیں ؟ مجھے تو اگر کہنے کی اجازت دیجائے تو عرض کروں کہ جلال کا قیاس یہاں غلط اور قیاس مع الفارق ہے - انھوں نے اگری کو لکھا ہے کہ بر وزن جگری ہے بر وزن اجنبی نہیں ہے گویا یائے نسبت کے اس مشہور قاعدے کے موافق کہ اگر اسم کے آخیر میں الف ہو تو وی یا ئی لگاتے ہیں ورنہ صرف ی بڑھاتے ہیں پھر کیا انصاف ہے کہ لفظ سونا سے صفت نسبتی لسنہری بنائیں - سنہری اگر صفت نسبتی ہوسکتی ہے تو صرف لفظ سنہر سے بشرطیکہ یہ کوئی لفظ بھی ہو مگر ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لفظ اب تک "سونے" کے معنوں میں دیکھا یا سنا نہیں گیا - سونا سے جب صفت نسبتی بنائیں گے تو چسنا پر قیاس کر کے سونئی بر وزن چسنئی بنائیں گے یا دنیا پر قیاس کرکے سونوی بر وزن دنیوی یا سوناوی بر وزن دنیاوی کہینگے مگر روز مرہ گواہ ہے کہ یوں بولتے نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ قیاس لغوی و لسانی کے مطابق سونا سے سنہری نہیں بنا ہے بلکہ زبان اردو

میں یہ لفظ بالکل خلاف قیاس صفت نسبت ہی بن کر استعمال ہوتا ہے اور ایسے الفاظ کو ان صفات نسبت کے قواعد کے مطابق رکھنا اور اصول و ضابطہ میں لانا زبردستی ہے -

اب ایک ہی بحث اور رہ جاتی ہے کہ سید احمد دہلوی اور جلال لکھنوی دونوں صاحبان لکھتے ہیں کہ سنہری؟ طلائی رنگ کو بھی کہتے ہیں - تو ممکن ہے کہ کسی خِطّہ میں کسی رنگ کو سنہری کہتے ہوں اور وہ سند نہیں - لیکن چونکہ دونوں صاحبان نے استناد کیا تھا ناسخ کے ایک شعر سے جس کو دیوان میں یائے مجہول ہی سے لکھا ہے اس لیے اغلب یہ ہے کہ اب اس امر کے ماننے کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ کوئی رنگ ہے بھی -

ممکن ہے بعض حضرات کو یہ خیال گزرے کہ یہ استفسار کا ہے کو ہوا یہ تو خود قول فیصل کے طور پر پیش کیا گیا ہے مگر اصل یہ ہے کہ میں نے ارباب لغت کی رائیں یکجا کر دی ہیں اور اپنے شکوک اور خیالات کا اظہار بھی کر دیا ہے اس سے میری غرض یہ ہے کہ ان امور کو پیش نظر رکھکر ماہرین زبان اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں -

---

ضلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاحیں

(پروفیسر محمد نعیم الرحمان ، ایم اے)

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ، آیندہ صفحوں میں میں نے ان اصطلاحات کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے ، جو ضلع الہ آباد کے معماروں میں تعمیری کام اور اُس کے مسالے ، اوزار و آلات وغیرہ کے متعلق رائج اور مستعمل ہیں ۔ چند سال کا عرصہ ہوا کہ مجھے الہ آباد میں ایک عمارت کی تعمیر کے دوران میں مسلسل طور پر معماروں اور اُن کے مددگار کاریگروں اور مزدوروں سے سابقہ رہا ، میں نے اس موقعے سے یہ فایدہ اُٹھایا کہ کاریگروں کی جو اصطلاحیں روزانہ میرے کان میں پڑتی تھیں ان کو قلمبند کرتا جاتا تھا ، اور چونکہ یہ زمانہ چار پانچ مہینوں پر حاوی اور خاصا طویل تھا ، اور میں برابر اسی فکر میں تھا کہ اصطلاحیں جمع ہوتی رہیں ، اس لیے ان کا ایک معقول ذخیرہ فراہم ہو گیا یہ چیز بجائے خود اس قدر مفید اور دلچسپ ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اب تک اس طرف توجہ کیوں نہیں کی گئی ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ پہلا ہی موقع ہے کہ اہل پیشہ میں سے معماروں کی اصطلاحیں ایک مجموعی صورت میں پیش کی جارہی ہیں ، اور مجھے اُمید ہے کہ اہل علم و فن ان کو دلچسپ پائینگے ۔

چونکہ مجھے محض اپنی سمجھ یا اپنے اندازے پر اعتماد نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا ، اِس لیے ان اصطلاحی الفاظ کے تلفظ اور اُن کے معنی کے متعلق جو کچھ سمجھا اُس کی تصدیق اور تشریح ان کاریگروں سے بھی کرا لی ۔ اس امر میں میں نے بالخصوص اُن معماروں

سے رجوع کیا جو سن رسیدہ اور پرانے تجربہ کار تھے - اس کے بعد مزید اطمینان کے لیے میں نے یہ کیا کہ نہ صرف اسی وقت اور کاریگروں سے بھی ان تمام امور کی تصدیق کرائی ؟ بلکہ اس کے بعد بھی اس دو ڈھائی برس کے عرصے میں جب کبھی الہ‌آباد اور اُس کے مضافات کے معماروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ؟ اُن سے بھی یہ دریافت کر لیا کہ اِن کا تلفظ اور اِن کی تشریح وہی ہے - اس طرح بالآخر مجھے یہ اطمینان ہوا ؟ اور ہے کہ یہ اصطلاحیں الہ‌آباد اور اُس کے نواح میں ضرور مستعمل ہیں ؟ اور اسی خیال سے عنوان میں میں نے اس کی تصریح کر دی ہے - مختصر یہ کہ میں نے یہ تمام اصطلاحیں من و عن اُسی تلفظ کے ساتھ درج کی ہیں ؟ جو ان لوگوں کی زبانوں پر رائج ہے - میں نے اس میں مطلق تصرف نہیں کیا ہے ؟ اور نہ کر سکتا ہوں - صحت ادا کی طرف سے اطمینان کرنے کے لیے میں نے قوسین میں قریب قریب ہر لفظ کا تلفظ بھی لکھہ دیا ہے ؟ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ صرفی اصطلاحات کے لحاظ سے اس کا شمار کلمہ کی کس نوع میں ہے -

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ مجموعہ ؟ جس میں کم و بیش ڈھائی سو اصطلاحیں شامل ہیں ؟ ہر لحاظ سے مکمل ہے - بہت ممکن ہے کہ کچھہ اصطلاحیں چھوٹ گئی ہوں ؟ اور میری نظر سے اوجھل ہو کر اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئی ہوں - تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان اصطلاحوں کا بہت بڑا حصہ اس میں ضرور آ گیا ہے - میں نے اکثر الفاظ کی لسانی اصلیت اور بناء بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے - البتہ جو الفاظ بالکل صاف اور واضح یا مشہور ہیں ؟ اُن کے متعلق میں نے ایسی صراحت کو غیر ضروری سمجھہ کر ترک کر دیا ہے

لیکن ایسے معروف الفاظ کے علاوہ اور بھی چند الفاظ (مثلاً بریل ، پیالا ، پوتا ، سدل ، وغیرہ) ایسے رہ گئے ہیں ، جن کی لسانی تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے - مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سے قاصر ہوں، اور فی‌الحال اس کام کو دوسروں کے لیے چھوڑتا ہوں - لیکن میں حتی‌الوسع خود بھی اس سے غافل نہ رہوں گا اور ان کو حل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس میں شک نہیں کہ یہ تحقیق نہایت درجہ دلچسپ ہوگی کہ یہ اصطلاحیں ہمارے ملک کی کس کس زبان سے تعلق رکھتی ہیں' - میں نے ، ہمارے ملک اس لئے کہا کہ یہ ظاہر ہے ، اور یہی فطرت کا تقاضا ہے ، کہ زیادہ تر اصطلاحیں ہماری دیسی زبانوں ہی سے ماخوذ ہونگی ، گو یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں ایسے الفاظ بھی ہوں جن کے متعلق بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ ان کا علاقہ کسی زبان سے نہیں ہے بلکہ ضلع الہ‌آباد کے معماروں اور مزدوروں کے عمارت اور اس کی اینٹوں کی طرح ان کو بھی خود ہی بنانا اور گڑھنا ہے! اس مجموعے میں چند الفاظ انگریزی سے اور چند عربی اور فارسی سے ماخوذ ہیں ، باقی سب صریحاً ہندی یا سنسکرت اصل سے ہیں -

میں نے ان اصطلاحوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے قلمبند کیا ہے ، اور متعدد مقامات میں شکلوں سے بھی کام لیا ہے ، جن سے اُمید ہے کہ اصطلاحوں کے سمجھنے میں کافی مدد ملیگی -

ان صفحوں میں ذیل کی مختصر علامتوں سے کام لیا گیا ہے :

امذ	اسم مذکر
امث	اسم مؤنث
تع	تعلق پر غور کرو
حد	حس (یا ، حن) کو دیکھو
صف	صفت

الف

اپراوا—امذ (الف کے پیش سے - هندي· اوپر ؟ اوپري ؟ اُپرالا) -
کسي قسم کي چناي یا کسي چیز کا وہ رخ جو اوپر کی طرف
سے دیکھنے سے نظر آئے - بالائي؟ اوپر کا رخ - اسے اُپرایا بھي
کہتے هیں - اس کے مقابل یعنی نیچے کے رخ کو براوا یا
برایا کہتے هیں - دیکھو متھالا -

اُپراپا—امذ - مترادف هے اپراوا کا ؟ حد -

آتھہ پہل—صف - (آتھہ=آتھہ) آتھہ پہلوں والا (والي) ؟
هست پہل؟ وہ جس میں آتھہ نکھہ هوں - اس کو آتھہ ماس
بھي کہتے هیں -

آتھہ ماس—صف - (آتھہ = آتھہ ؟ ماس = سنسکرت واس वास
=گھر ؟ خانہ ؟ پہل کے معني میں) - اس کا تلفظ آتھہ ماسس
(س سے پہلے نون غنہ کے ساتھہ) بھي کیا جاتا هے - مترادف
هے آتھہ پہل کا ؟ جد -

اُجَک—امذ - (الف کے پیش؟ ج کے سکون؟ اور ب کے زبر سے -
عامی بولی اُجک؟ اُرک = بیوقوف؟ احمق - ترکي ·
ارک ؟ اوربک — ترکي قبیلے کا نام) دیتن کي وہ قسم جسے
اُلّو بھي کہتے هیں - دیکھو دیتن -

اُجھالا—امذ - (پہلے الف کے پیش سے ؟ هندي اُجھالنا ؟ اُچھال ؟
اُجھالا) - حالی کا هر ایک سرا ؟ اُس حالت میں کہ جب
حالي کو تاڑ کے اوپر تنتی (جد) رکھہ کر دونوں (سروں کي)
طرف سے باندھہ دیتے هیں - دیکھو تاڑ؟ حالی -

آدّھا—امذ - (پہلے الف کے زبر اور د ھ کی تشدید سے - هندی
آدھہ ؟ آدھا ؟ آدھہ) - آدھي اینت - لمبائي کے لحاظ سے اگر

اینٹ کو توڑ کر دو ٹکڑے کر لیے جائیں، تو ہر ایک ٹکڑا ادھا کہلائیگا - دیکھو پھری، کھنڈا -

آڑانا—امذ -(پہلے الف کے زبر سے - تغ آڑنا ، آڑانا ، آڑ ، آڑا ، آڑواڑ)
وہ خط جو کسی مُستطیل یا مربع شکلِ کے دو مقابل کے زاویوں کو ملانے سے پیدا ہو ، کونا کوئی دیکھا - ذیل کی شکلوں میں ا ب آڑانا ہے —

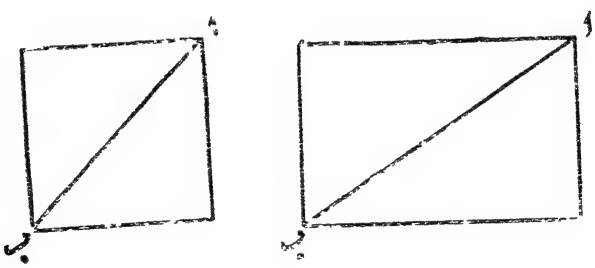

آسار—امذ - ,پہلے الف کے زبر سے - عربی اثر کی جمع آثار، فارسی معنی میں) - دیوار کا آثار ، دیوار کی چوڑائی، موٹائی -

اُلو—امذ - (تلفظ : مشہور منحوس پرندے کے نام سے واو معروف سے) - بیٹن کی ایک قسم ، جسے اُحنک بھی کہتے ہیں - دیکھو بیٹن -

اِنٹَہا—امذ - (الف کے زبر ، نون غنہ ، اور ت کے زبر سے = اینٹ ہار اینٹ والا یا والی) - اینٹیں لانے والا مزدور ، وہ مزدور جو راج کو چنائی کرنے کے لیے اینٹیں لا لا کر دیتا ہے - اس لفظ کا دوسرا تلفظ اینٹہا بھی ہے -

اندھا گولا—امذ - وہ گولا (حد) ، جو بہت کم دکھائی دے اور اپنی ہستی کو پوری طرح جتلا نہ سکے - دیکھو گولا -

آندھیاری—امث (الف کے زبر سے - ہندی اندھا اندھیرا ، اندھکار)

(۱) ذات کے اوپر جو حصہ باہر کو نکل کر بنایا جاتا ہے، اُس کی ایک صورت - دیکھو بہادری - اندھیاری کی ایک صورت بہ ہو سکتی ہے — اس شکل میں الف سے لے کر ب تک (نقطے دار خط کے ساتھ ساتھ) اندھیاری ہے -

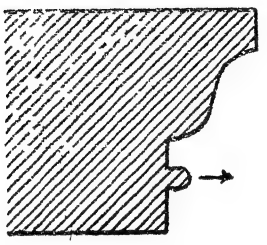

(۲) اینٹ کی جنائی میں (یا پتھر میں گڑھ کر بھی) چوڑی کے نیچے جو ڈھال یا ترماھٹ دیتے ہیں، خواہ وہ ڈھال کم ہو یا زیادہ، اندھیاری کہلاتا ہے -

اول—صف - (و کی تخفیف سے بھی بولا جاتا ہے - عربی · اول=پہلا) اینٹ کی صفت · اول درجے کی، سب سے اچھی قسم کی اینٹ -

ایز—امب - (یائے مجہول سے تغ · ایزی - عموماً ز سے پہلے نون غنہ بھی بولا جاتا ہے) - پتے یا چوڑی کے اوپر اینٹ (یا پتھر) کو گڑھ کر جو لہر دار سی جنائی کی جاتی ہے، وہ ایز (یا اینز) کہلاتی ہے - دیل کی شکل میں نقطہ دار خط کے ساتھ ساتھ الف سے ج تک ایز ہے -

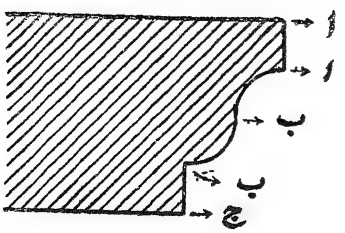

اس کے مختلف حصوں کے نام یہ ہیں (۱) پہلے الف سے دوسرے الف تک تتا ہے - (۲) دوسرے الف سے پہلی ب تک گہل ہے - (۳) پہلی ب سے دوسری ب تک بھولن ہے، اور اسی کو چوبر بھی کہتے ہیں، اور

(۴) دوسري ب سے ج تک کا نام جنیا ؟ یا "ایز کي کور" ھے -
ایز کي کور—امث - دیکھو حنیا (۴) -

اینتہا—امذ - یاے معروف ؟ اور تَ کے زبر سے) - دوسرا تلفظ ھے
انتہا کا ؟ حد -

ب

بانکري—امث - (بانک ؟ بانکا ؟ بانکپن=تیڑھا ؟ مڑا ھوا ؟ ترچھا ؟
خمیدہ) - لوھے کي ایک سیخ جس کا ایک سرا ڈیڑھ دو
انچ کے طول میں کسي قدر گولائي کے ساتھ مڑا اور بٹا
ھوا ھوتا ھے - گویا اُس کي شکل ھاکی کھیلنے کے ایک
چھوٹے سے ٹلّے کي سي ھوتی ھے - یہ آلہ "رولدار"
پیتن (جد) بنانے کے کام آتا ھے - یہي بٹا ھوا سرا پیتن کے
مسالے پر رکھ کر دبادیا جاتا ھے ؟ جس سے پیتن کی لکیریں
بن جاتي ھیں - اس کي شکل یہ ھے

بانکري دار—صف - ایک قسم کي پیتن، دیکھو پیتن (۳) -

بٹي مارنا—مصدر - (تغ بٹا=کسی؟ نقص؟ عیب؟ پتھر؟ پتھر کا ٹکڑا)
گھوٹنا ؟ گھٹائي کرنا ؟ پالش کرنا ؟ چمکانا ؟ صاف ؟ برابر کرنا-
جب بلسٹر کے مسالے (خاص کر حوے) کا ذرّہ گھل مل کر
ایک ھو جاتا ھے ؟ اور اُس کی خامي کا دور جاتا رھتا
ھے ؟ تو اُسے کٹّي سے گھوٹ (رگڑ) کر برابر اور صاف کیا
جاتا ھے - اس طرح نہ صرف یہ کہ مسالے کے سب
ذرّے مل کر مسالے کو مضبوط اور سطح کو صاف اور برابر

کردیتے ھیں ؟ بلکہ سطح پر ایک چمک بھی آ جاتی ھے -
اسی کو "بتی مارنا" کہتے ھیں -

برھا—امذ - (ب اور ر کے زبر سے سنسکرت برھہ :बर्हः مور کی دم کا پر
وہ پتا (حد) " جس میں نیچے کی طرف کھانچ ھو-
(دیکھو کھانچ) - جب کسی کار نس میں ؟ یا دیوار کے بالکل
اوپر سرے پر پہنچ کر ؟ پتا بناتے ھیں ؟ تو اُس پتے میں
نیچے کی طرف ایک انچ (یا پتے کی مقدار کی نسبت
سے کم یا زیادہ) گڑھ کر نیم دائرے کی شکل میں گہرا
کر دیتے ھیں - اس گہرائی اور پتے کو ملا کر "برھا"
کہتے ھیں - اس کی غرض یہ ھوتی ھے کہ جب پانی دیوار
کے سر پر گرے تو بہتا ھوا پتے کے نیچے پہنچ کر اِس کھانچ
سے لپٹتے ھی نیچے تک جائے اور تمام دیوار پر بہتا اور
اُسے خراب کرتا ھوا نہ جائے - برھا کی شکل یہ ھے اس
میں الف سے ب تک برھا ھے

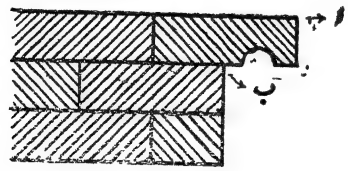

بڑیری—امث - (پہلی ی مجہول اور دوسری معروف) - دھنّی ؟
شہتیر ؟ جس پر کھپریل کی چھاؤنی چھانے کے وقت تھاتھہ
(تھاتھر) کے پاس رکھے جاتے ھیں -

بَرَبل—امث - (ب اور ر کے زبر سے) - یہ دوسرا نام ھے گُتّی کا ؟ حد -
بسولی—امث - (واو معروف سے - یعنی بسولا ؟ بڑھئی کا اوزار) معمار
کا پیسہ . ھتوڑی کی قسم کا لوھے کا ایک آلہ جس کے

آخر میں دھار ہوتي ہے ؛ اور ایک طرف لکڑي کا دستہ لگا ہوتا ہے - راج لوگ اس سے اینٹ تراشنے ؛ گڑھنے اور توڑنے کا کام لیتے ہیں - اس کے جس حصے میں دھار ہوتي ہے ؛ وہ لوہے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے ؛ جو ہتوڑی کے سر سے الگ ہوتا ہے - جب دھار کند ہو جاتي ہے تو اُسے نکال کر تیز کر کے پھر لگا لیا جاتا ہے -

بَکَس—امذ - (ب اور ک کے زبر سے - انگریزي . بوکس box صندوق) چنائي یا کسي قسم کا تعمیري کام شروع کرنے سے پہلے اینٹوں کا ذخیرہ کرنے کے لیے اُن کو ایک جگہ ایک (پتلي یا چوڑي سي) دیوار کي صورت میں جمع کر کے ترتیب وار رکھا جاتا ہے - اس مرتب اور مجموعي صورت کو "بکس" کہتے ہیں - جب اینٹیں تعداد میں زیادہ ہوتي ہیں ؛ تو عام طرز پر پان سو یا ایک ہزار کا "بکس" بناتے ہیں - گویا اس کي مجموعي ہیئت ایک بڑے سے صندوق کي ہوتي ہے -

بَگَلس—امذ - (ب اور ل کے زبر سے) - بہادري (جد) کي ایک وضع ہے؛ جو عموماً ایک مثلث کي شکل میں کھڑکي یا دروازے کے اُوپر باہر کي طرف بناتے ہیں - اس شکل میں ا ؛ ب ؛ ج بگلس ہے -

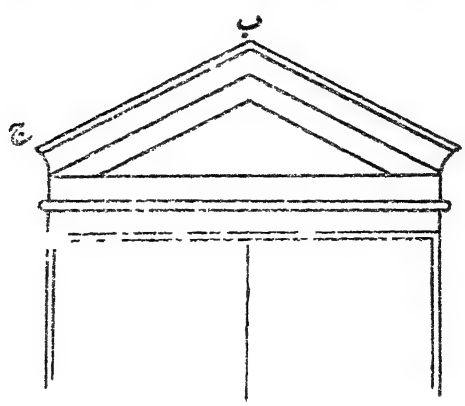

بلّی—امث ۔ (ب کے زبر اور ل کي تشدید سے) ۔ لکڑی کا شہتیر ؛ موٹي سي لکڑي ؛ جس کو چھت پر ڈالنے یا پاڑ کي ٹھڑیا وغیرہ بنانے کے کام میں لاتے ھیں ۔ بَلّیاں عموماً ساکھو کے درختوں کے پورے پورے تنوں کی ھوتي ھیں ؛ اور اُن کی لمبائی بھی قریب قریب پورے درخت کی اونچائی کے برابر ھوتی ھے ۔

بند دار (ذات)— ا ؛ صف ۔ ذات کي ایک قسم ھے ؛ جس کو "چدري ذات" بھي کہتے ھیں ۔ دیکھو ذات ۔

بوندي مار—صف ۔ (واو معروف اور نون غنہ سے ۔ بوند ؛ پاني کا قطرہ) ۔ اینٹ کي صفت ھے وہ اینٹ جسے پاني کي بوند مار گئي ھو ؛ ایسي اینٹ جس پر ٹھتے میں تیار ھونے کے وقت ؛ یا تیار ھو جانے کے فوراً بعد ؛ کسي سبب سے پاني کي بوندیں پڑ گئي ھوں ۔ ایسي اینٹ میں جگہ جگہ سوراخ سے ھو جاتے ھیں ؛ اور جگہ جگہ سے بَھي ھوئي سي معلوم ھوتي ھے ۔ چونکہ اس میں شور بہت جلدي اثر کرتا ھے ؛ اس لیے ایسي اینٹ کو عمدہ اور مضبوط تعمیري کام میں استعمال نہیں کیا جاتا ؛ اور اسے عیب دار شمار کیا جاتا ھے ۔

بہادري—امث ۔ (گویا فارسي لفظ بہادر سے اسم کیفیت ھے) ۔ وہ چنائي جو محراب کي ذات کے اوپر دیوار سے آگے کو نکلي ھوئی بنائی جاتي ھے ۔ اس کی کئي قسمیں ھیں ؛ مثلاً ۔ صرف ایک اینٹ ؛ یا اندھیاري ؛ یا چوڑی اور اینٹ ملے ھوئے ؛ یا دانتوا ؛ یا اور طرح طرح کي سجاوٹ کي چنائیوں

کو ملا کر بہادری بناتے ہیں - غرض کہ جو کچھہ اور جس قسم کی جڑائی (چنائی) بھی ذات کے اوپر باہر کو نکلی ہوئی بنائی جائے وہ "بہادری ہے" - دیکھو بگلس -

بیالا—امث - (ب کے زبر سے) - وہ سوراخ یا موکھا ؟ جو پیتی (جد) کے رکھنے کی وجہ سے دیوار میں رہ جاتا ہے - دیکھو پیتی ؟ باز -

بے تاو—صف - فرش یا دیوار کی وہ استرکاری جس کا تاؤ (جد) خراب ہو جائے - اگر تاو کی حالت سے کچھہ اور زیادہ عرصہ گذر جائے تو استرکاری (پلستر) کو "بے تاو" ہو جانا کہتے ہیں - یہ ضروری ہے کہ جیسے ہی پلستر (مثلاً فرش کا) تاو کی حالت پر پہونچے ؟ ویسے ہی اس کی گھٹائی کردی جائے - اگر صحیح وقت کے بعد گھٹائی کی جائے گی ؟ تو وہ ٹھیک نہ ہوگی اور پلستر مضبوط نہ ہوگا - اس خرابی کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ فرش "بے تاؤ ہو گیا" - دیکھو تاؤ -

بیضاوی—الف ؟ صف - (=بیضاوی : عربی . بیضوی ؟ انڈے کی شکل کا) ذات کی ایک قسم ہے - دیکھو ذات -

بیل—امث - (یائے مجہول سے سنسکرت : ویلا वेला حد ؟ انتہا) سیدھہ ؟ الگ، قطار کا سیدھا ہونا، سیدھی لکیر ؟ سیدھا کنارہ ؟ سیدھی کور یا کگر : غرض کہ ہرقسم کی سیدھہ کو "بیل" کہتے ہیں - "بیل میں ہونا" سروع سے آخر تک ایک ہی حد پر ختم ہونا یا ایک ہی حد سے سروع ہونا - بیل کی شکل میں الف سے ب تک کی اینٹوں کو کہا جائیگا کہ ایک ہی "بیل" میں ہیں -

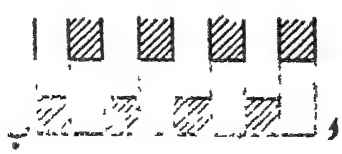

بیلچا—امذ - (یاے مجہول سے ؟ فارسي . بیل کا مصغر ؟ بیلچہ) - بیلچے پھروا ؟ خوصاً ولایتی پھروا جس سے کام کرے میں ھاتھہ نیچے سے اوپر کی طرف کو چلتا ھے - "پھروا" اور "بیلچا" میں عام طور پر یہی فرق سمجھا جاتا ھے ' اور کاریگر لوگ اسے اصطلاحی فرق کے ساتھہ بولتے ھیں کہ "پھروا" دیسي قسم کا اوزار ھے جس سے "الٹے ھاتھوں" کام ھوتا ھے ؟ مگر "بیلچا" وہ ھے جو ولایتي اوزار ھے اور نیچے سے اوپر کو چلایا جاتا ھے - بیلچے کا استعمال (زمین وغیرہ کو) کھودنے کے لئے نہیں ھوتا ' بلکہ مٹّي ' چونا گچّي وغیرہ مسالے کو اُٹھانے ' بنانے ' یا سونپنے کے کام آتا ھے -

بیل‌دار—امذ - وہ مزدور جو پھروا (بیل ' بیلچہ) چلانے کا کام کرتا ھے - "بیل‌دار" اور "مزدور" میں یہ فرق ھے کہ "بیل‌دار" بیلچے سے کام کرتا ھے ؟ مگر "مزدور" ھر وہ شخص ھے جو راج‌گري کے سوا اور سب طرح کے کام کرتا ھے - دیکھو مزدور -

بیڑا—امذ - (یاے مجہول اور نون غنہ سے) - باڑ میں وہ بانس (یا لکڑیاں) جو تھوڑا (جد) میں باندھے جاتے ھیں اور زمین سے متوازی رھتے ھیں - یہ بانس زیادہ بڑے نہیں ھوتے - اگر یہ زیادہ لمبے ھوں تو اُن کو "دھانگڑ" کہتے‌ھیں - دیکھو دھانگڑ-

بھ

بھاگنا—مصدر - سیدھي سطر یا قطار سے ؟ سیدھي بیل سے باھر ؟ ھٹا ھوا ھونا - "بیل بھاگ رھي ھے" قطار ؟

سطر ؛ لکیر ؛ ریل ٹیڑھی ہوئی جارہی ہے ؛ سیدھہ بگڑتی جاتی ہے -

بھرا پیٹ—صف - وہ چُنائی (چُنائی) جس کا پیٹ بھرا ہو ؛ جو پُر ہو ؛ بھری ہوئی ہو - چنائی کرتے وقت (عام اس سے کہ وہ اینٹ کی ہو یا پتھر کی) کمہ (حد) لگا کر جوڑ دینے کے بعد بھی جب ایک ردّا ادورا ہوجاتا ہے تو پورے ردّے پر مسالا (مٹی یا چونا یا سیمنٹ) گھول کر پھیلا دیتے ہیں ؛ جس سے وہ درزوں میں سے ہو کر اندر بھر جاتا ہے - اس طرح جب چنائی کے اندر (پیٹ میں) سب مسالا پہنچ جاتا ہے اور اور وہ ہر طرف سے اینٹوں کو پکڑ لیتا ہے ؛ تو اُسے "بھرا پیٹ" کہتے ہیں -

بُھرکی—صف - (بھ کے پیش سے) - اینٹ کی صفت ٹوٹی ہوئی اینٹ ؛ خاص کر وہ جو سیدھی نہ ٹوٹی ہو بلکہ کسی زاوئے پر ٹوٹی ہو ؛ یا جس کا کوئی کونا جھڑا ہوا یا کوئی کور ٹوٹی ہوئی ہو اسے "کھڑھی" بھی کہتے ہیں - دیکھو روڑا ؛ کنل -

نَھنّا—اسم - (نھ کے زبر اور ن کی تشدید سے) - وہ چنائی جو نئے یا کسی اور قسم کی چُنائی (مثلاً چوڑی ؛ گولے ؛ ایڑ وغیرہ میں) کے اوپر ایک نصف دائرے کی شکل میں بنائی جاتی ہے - ذیل کی شکل میں الف سے ب تک نَھنّا ہے

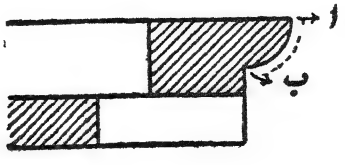

بَھوکا—امذ - (بھ کے زبر سے) - توکرا ؟ خاص کر اُس حالت میں کہ جب اُس میں کوئي مسالا (اینٹ ؟ پتھر ؟ کنکل ؟ روڑا ؟ گِٹی وغیرہ) بھرا ہوا ہو - دیکھو پلرا ؟ ٹلری -

پ

پاڑ (یا پاڑھہ)—امث - بانسوں اور کَلموں کا وہ تانتہ یا مچان ؟ جس پر بیٹھہ کر معمار دیوار چنتے ہیں - سب سے چھوٹی اور سادہ پاڑ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو بانس (یا بلّیاں) زمین پر سیدھی عمودوار کھڑی کرتے ہیں ؟ اور مضبوطي کے لیے ایک سرا کچھہ دور تک زمین میں گاڑ دیتے ہیں یہ بانس " تھڑیا " کہلاتے ہیں - پھر دو اور بانس لے کر اُن میں سے ہر ایک کا ایک سرا دیوار پر رکھتے ہیں اور دوسرے کو ایک ایک عمودی بانس سے باندھہ دیتے ہیں یہ " پیٹیاں " ہیں - اسی طرح ایک اور بانس زمین اور دیوار کے متوازی طور پر عمودی بانسوں سے باندھہ دیتے ہیں - یہ بانس " بنتیرا " ہے - پھر دونوں پیٹیوں پر ایک چالی (جد) رکھہ کر اُسی پر راج بیٹھتے اور کام کرتے ہیں - یہ مکمل پاڑ ہے -

پتھر پایا—امذ - (پایا=فارسی پایہ) - ستون کی وضع کی تعمیر ؟ جو ایک دیوار کے بیچ میں (صرف ایک مرتبہ یا ایک سلسلے سے) یا عمارت کے ایک کونے میں اس طرح بناتے ہیں کہ وہ بذات خود پورا ستون نہیں ہوتا بلکہ باقي کي دیوار سے ذرا آگے کو بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ستون کی طرح دکھائی دیتا ہے - اس کا یہی باقی دیوار سے باہر کو نکلا

ہوا ہوتا ہے وہ خصوصیت ہے جس کے سبب سے یہ "پتھر پایا" کہلاتا ہے ۔

پَتّا—امذ ۔ (ت کے زبر اور تّ کی تشدید سے) ۔ وہ سیدھی ، معمولی ، مگر اُبھری اور باہر کو نکلی ہوئی چنائی جو چوتی ، گولا ، ایز وغیرہ قسموں کی چنائی میں کی جاتی ہے ۔ ذیل کی شکل میں الف ب پتّا ہے ۔

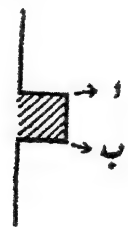

پتری—امث (پ کے زبر اور ت کے سکون سے) ۔ چونے ، یا چونے اور سیمنٹ کی وہ تہ جو ایک پتّی کی شکل میں کارنس کے نیچے یا منڈیر کے سروں پر عموماً ڈیڑھ یا دو انچ کی چوڑائی میں اور دیوار سے آدھ انچ اُبھری (یعنی باہر کو نکلی) ہوئی بنائی جاتی ہے ۔ اس کی چوڑائی کارنس وغیرہ کی وسعت کی نسبت سے کم یا زیادہ بھی ہوسکتی ہے ۔

پتّی—امث (پ کے زبر اور تّ کی تشدید سے) ۔ دیوار بنانے میں اینٹوں کی وہ جوائی (چنائی) جس میں اینٹیں اپنے طول میں اس طرح رکھ کر چنی جائیں کہ اُن کے عرضی ضلعے ایک دوسرے سے ملے رہیں ، جیسے اس شکل میں

" پتّی " لگانا پتّی کی چنائی کرنا ۔

پَچھیت - امث (یاے معروف سے) دوسري صورت ھے پچیت کي' جد

پچیت — امث (پ کے زبر اور یاے معرف سے) مکان کي پیچھے والي 'پشت کي دیوار' پچھواڑے کي دیوار' دالان کے پست پر کي دیوار -

پَکا ڈھولا — امذ - کھڑکي یا دروازے کي ڈاٹ اور چوکھٹ کے اوپر والے سیروے کے بیچ کی چنائي - اس کو سنچا بھي کہتے ھیں -

پکھہ — امذ - (پ کے زبر سے سنسکرت پکش पक्ष - ضلع' پہل' پہلو) - (۱) چار سے زیادہ — پانچ' چھہ' سات' آٹھہ' دس' بارہ وغیرہ — ضلعوں (پہلوں) والی شکل (کی چنائي) کا کوئي ضلع یا پہل - (۲) وہ چھوٹا سا پہل جو کسي دیوار کے باھر کي طرف والے کونے' یا فرش کی کگر یا اُس کے کنارے' کو مار یا گڑہ کر یا اگر اُس پر مسالا لگا ھے تو اُسے دبا کر برابر کردینے سے پیدا ھوجائے - دیکھو پکھا -

پَکھا — امذ - (پ کے زبر اور کھ کي تشدید سے پکھہ' پکش) ایک تکون یا چو کور (مثلث' مربع' مستطیل) شکل کا ایک ضلع یا پہل - پکھہ اور پکھا میں فرق یہ ھے کہ پکھا تین یا چار پہل کي شکل کے ایک پہل کو کہتے ھیں' اور پکھہ میں شکل کے پہل چار سے زیادہ نہیں ھونے چاھئیں -

پلَستر — امذ - (پ کے زبر اور زیر' دونوں طرح - انگریزي پلاستر Plaster عموماً پ کے زبر سے) دیکھو پلستر -

پَلرا — امذ - (پ کے زبر سے تغ ؟ فارسي پَلّه) توکرا ' حس میں تعمیر کے کام کے لیے مسالا وغیرہ رکھا جاتا ھے - چھوٹے توکرے (یا توکري) کو "پلري" کہتے ھیں - دیکھو بَھوکا -

پلَري — امث - (پ کے زبر سے) توکري ، چھوٹا توکرا - دیکھو پلرا ' بَھوکا -

پلستر — امذ - (پ کے زبر سے عموماً ' اور زیر سے بھي - انگریزي پلاستر Plaster) فرش یا دیوار وغیرہ پر مٹي یا چونے کي تہ یا لپائي ' چونے یا مٹي کي استرکاري ' کھگل ' گچکاري - دیکھو پلاستر -

پُلوئی — امث - (پ کے پیش ' اور واو معروف سے) - پیٹي (حد) کی وہ قسم حس میں موٹے بانسوں کی حگہ پتلے بانس استعمال کیے حائیں ' یا یہ کہ بانس کا پتلا سرا اس کام میں لایا جائے - پیٹی اور پُلوئی میں صرف یہ فرق ھے کہ پیٹی موٹے بانس کی ھوتی ھے اور پلوئی پتلے بانس کي -

پَن چیر — امذ - (پ کے زبر ' اور یاے معروف سے - پن=پانی + چیر — چیرنا سے) - کوئي اُبھری ھوئی چیر (مثلاً منگراوا ' گُنیا وغیرہ) یا حگہ حہاں پانی گر کر اِدھر اُدھر دونوں طرف کو بہ جائے ؟ وہ چیر یا حگہ حو پانی کو چیر کر اِدھر اُدھر بہادے - دیکھو کھبرا ؟ منگراوا ؟ کنیا -

پَوتیا — امذ - (پ کے زبر سے) - دیوار کا وہ حصہ حو دروازے کی عمودي چوکھٹ (بَاي) سے لے کر دیوار کے کونے تک ھوتا ھے - اس طرح اگر کسی دیوار میں صرف ایک

دروازہ ہو تو اُس کے دونوں طرف کا حصہ "پوتیا" کہلائیگا - ذیل کي شکل میں "ا ب" اور "ب ا" دونوں پوتیاں ہیں -

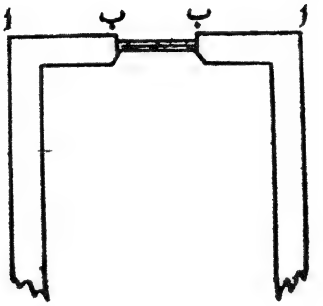

پونڈا—یا پَونّا—امذ - (پونا، تین چوتھائي حصہ) - پوری اینٹ کا تین چوتھائي حصہ جو اُس کي لمبائی میں سے کاٹ یا توڑ کر نکالا گیا ہو - ذیل کی شکل میں ا ب ج د پونڈا ہے -

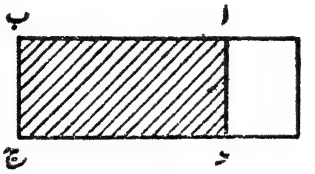

پیالے دار (ڈاٹ) - امث - ڈاٹ کي ایک قسم ہے - دیکھو ڈاٹ (ا ب)-

پیٹن—امث - (پ کے ربر اور ٹ کے ریر سے - انگریزي پوائنٹنگ Pointing) - اینٹ یا پتھر کي جڑائی میں (خواہ وہ فرش میں ہو یا دیوار وغیرہ میں) اینٹوں کي درزوں میں چونا یا سیمنٹ بھرنا - پیٹن کي چار قسمیں ہیں: (ا) لپواں (تغ لیپنا، لیپ) جس میں درزوں

میں چونا یا سیمنٹ بھر کر اُسے کنّی کی ٹیک (جد) سے اوپر سے لیپ کر چکنا کر دیا جاتا ہے - اسے انگریزی میں "فلش پوائنٹنگ" (Flush Pointing) کہتے ہیں (۲) اَلّو (واو معروف سے) ' جس میں درزوں میں مسالا بھر کر اندر ہی اندر اُسے لیپ کر اس طرح صاف اور برابر کردیا جاتا ہے کہ اینٹ کی درز دکھائی دیتی رہے اس کا انگریزی نام "رف پوائنٹنگ" (Rugh Pointing) ہے - اس کو "اُجبک" بھی کہتے ہیں - (۳) بانکڑی دار ' جس میں درز میں مسالا بھر دیتے ہیں ' پھر اُسے بانکڑی (جد) سے اینٹوں کی درزیں بنا کر نمودار کردیا جاتا ہے - یہ انگریزی محاورے میں "رولڈ پوائنٹنگ" (Ruled) ہے - (۴) کنّوا (کاف کے زبر اور تشدید کے پیش سے) ' جس میں درزوں کے اندر مسالا بھرنے کے بعد اُن کے اوپر بھی اس طرح مسالا جمایا جاتا ہے کہ وہ ½ انچ اُبھرا رہے - پھر اُسے اس طرح صاف کرتے اور چکناتے ہیں کہ وہ خوشنمائی سے ہر درز کی جگہ پر اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے - پیٹن کی یہ قسم سب سے زیادہ خوشنما ہوتی ہے - پیٹن کو "ٹیپ" بھی کہتے ہیں -

پیٹھہ (کارنس کی)—امث - (یاے معروف سے) - کارنس کی اوپر کی سطح ' جس کا رخ اوپر کو یعنی چھت (یا آسمان) کی طرف ہوتا ہے -

پیٹی—امث - (پہلی ی مجہول) - وہ بانس ' جو پاڑ میں زمین کے متوازی ہوتا ہے اور جس کا ایک سرا دیوار پر اور ایک ٹھڑیا (جد) سے بندھا ہوتا ہے - دیکھو پاڑ -

"پیٹی" کا جو سرا دیوار پر رکھا جاتا ہے ؛ ظاہر ہے کہ چنائی کرتے وقت اُس کے آس پاس اور اُوپر ہی چنائی ہوسکتی ہے - اس طرح چنائی ہو جانے کے بعد جس جگہ پیٹی کا وہ سرا رکھا گیا تھا ؛ وہاں ایک موکھا رہ جاتا ہے اسے "پٹی کا در" کہتے ہیں - اگر پیٹی کا یہ سرا دیوار کے آثار کے آدھہ میں رکھا ہو اور دوسری طرف سے دیوار چنی جا سکے تو یہ "در" آدھے ہی آثار تک رہتا ہے - لیکن اگر پیٹی کا سرا اتنا لمبا ہو کہ وہ آثار کے آر پار دوسری طرف نکل جائے ؛ اور اس طرح دیوار میں بالکل آر پار ایک سوراخ رہ جائے ؛ تو ایسے سوراخ کو "بیالا" کہتے ہیں - دیکھو پلوئی -

پَیکار—امذ - (پ کے زبر سے) - وہ حدّائی جو کسی دروازے یا کھڑکی کے دونوں طرف ؛ دائیں اور بائیں ؛ ذات کے نیچے کی حد تک پہنچ گئی ہو - اس شکل میں ا، ب، ج، د، پیکار ہے -

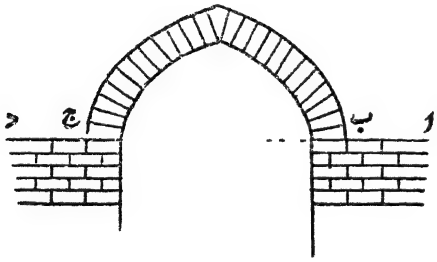

پھ

پُھٹ—امذ - صف - (پھ کے پیش سے) - ایک راج جو کسی جگہ اکیلا ہی کام کر رہا ہو -

پھَرّی—امث - (پھ کے زبر ؛ اور ر کی تشدید سے) اینٹ کا وہ آدھا ٹکڑا ؛ جو اینٹ کی موٹائی میں سے دو برابر کے ٹکڑے کاٹ کر نکالا جائے - ہر ایک ٹکڑا "پھرّی" کہلاتا ہے -

اس شکل میں ا ب ج نقطہ دار خط کے اوپر اور نیچے ایک ایک پھری ہے -

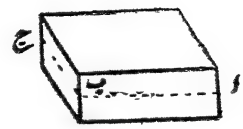

دیکھو ادھا ؛ کھنڈا -

پَھروا—امث - (پھ کے زبر اور ر کے پیش سے) - پھاوڑا ؛ بیلچہ ؛ گل‌صفا زمین کھودنے یا مٹی ؛ چونا ؛ ملیا وغیرہ ہٹانے اور صاف کرنے کا لوہے کا بنا ہوا اوزار ؛ جس کے ایک طرف لکڑی یا بانس کا لمبا سا دستہ لگا ہوتا ہے ؛ جسے پکڑ کر پھروا چلایا جاتا ہے - دیکھو بیلچا -

پَھسیل—امث - (پھ کے زبر ؛ اور یائے مجہول سے - یہ دوسرا (اور بگڑا ہوا) تلفظ ہے فصیل کا ؛ حد -

پِھلکا—امث - اس کا دوسرا اور بہتر تلفظ ہے فِلکا ؛ حد -

پُھولن—امث - (واو معروف ؛ اور ل کے زبر سے - پھولنا ؛ پھولا ؛ پھول—ابھرا ہوا ہونا) - دیکھو ایرن - پھولن کو "چوتر" بھی کہتے ہیں -

ت - تھ

تاؤ—امث - (تاؤ فارسی تاؤ تاب=طاقت ؛ مضبوطی ؛ چمک) - جب فرش یا دیوار وغیرہ کی چونے کی استرکاری اس حالت پر پہنچ جائے کہ چونے کے سب ذرّے گل کر اور گھل مل کر ایک جان ہو گئے ہوں اور چونا اس قابل ہو گیا ہو کہ اس کی گھٹائی کردی جائے ؛ تو اس حالت کو "تاؤ" اور "تاؤ پر آنا" کہتے ہیں - دیکھو بے تاؤ -

تِجائی—امث - (تِ کے زیر سے) - (۱) اونچان ؛ اُتھان ؛ اُونچائی -
(۲) دیوار میں چنائی کا وہ حصہ جو کھڑکی یا دروازے میں ؛
اوپر کی طرف ؛ چوکھٹ کے آگے اور پیچھے (یعنی اندر اور
باہر دونوں طرف) کھلا رہ جاتا ہے - یہ نام صرف اوپر کے
حصے کی ایسی چنائی کے لیے ہے ؛ نیچے کی چنائی کو
"تجائی" نہیں کہتے - دیکھو کوڑی -

تَراوا— امذ - (تَ کے زبر سے - تغ : تلا ؛ تلی ؛ ترائی) - کسی
قسم کی چنائی کا یا کسی چیز کا وہ رخ جو نیچے کی طرف
سے دکھائی دے ؛ تلے کا ؛ نیچے کا رخ - اسے "ترایا" بھی کہتے
ہیں - اس کے مقابلے میں اوپر کے رخ کو اپراوا یا اپرایا کہتے
ہیں -

تَرایا—امذ (تَ کے زبر سے) - وہی ہے جو تراوا ہے ؛ جد -

تُرپا—امث - (تَ کے پیش سے) - لکڑی لوہے ؛ اینٹ ؛ پتھر ؛
سیمنٹ کنکریٹ کے (مختلف وضعوں اور شکلوں کے) بنے
ہوئے بارو ؛ جو دروازے یا کھڑکی کے دائیں بائیں دونوں طرف
دیوار میں چنائی کر کے یا میخوں سے جڑ کر بنائے جاتے
ہیں ؛ اور جن پر سائبان کا جھاپ (جد) ٹکتا ہے -

تَگار—امذ - (تَ کے زبر سے - فارسی : تغار) - وہ گڑھا جو (زمین
میں) مٹی کا گارا یا چونا بھگو کر سوندنے اور چنائی کے لیے
تیار کرنے کی غرض سے بنایا جاتا ہے - یا تو یہ گڑھا زمین
میں بنایا جاتا ہے یا زمین پر اینٹوں کا فرش بچھا کر اور
چاروں طرف ایک چھوٹی سی دیوار کھڑی کرکے تیار کیا
جاتا ہے - مٹی کے گارے کا تگار عموماً زمین میں گڑھا کھود
کر بناتے ہیں ؛ اور چونے کے لیے اینٹوں کے فرش سے - بڑے

تکار کو "تکار" اور چھوٹے کو مصغر کر کے "تکاري" کہتے ھیں -

تکاري—امث - چھوٹا تکار - دیکھو تکار -

تمدا—امذ - (تَ کے زبر سے بغ دکھني ؛ تمدالو؛ ھندی توٗنبا ؛ توٗنبی) - تین یا لوھے کا تام لوت ؛ ڈونگا ؛ جس میں پانی بھر کر ایک آدھ اینٹ ؛ تھوڑا سا گارا یا چونا یا تھوڑی سی چنائي وغیرہ کو بھگوتے ھیں - عام طور پر تمبے یا لوھے کے کھلے مُنہ کے ڈبّے سے بھی تمدے کا کام لے لیتے ھیں -

تمنچا—امذ - (تَ اور میم کے زبر سے - فارسي طماچہ ؛ طمانچہ ؛ تپانچہ=تمنگچہ ؛ تھپڑ) - ایک (یا تناسب کے لحاظ سے زیادہ) اینٹ کی وہ چنائي ؛ جو قریب قریب کی دو محرابوں کے درمیان میں عمودی شکل میں دیوار سے ذرا باھر کو نکلي ھوئي ھوتی ھے اس کي شکل یہ ھے -

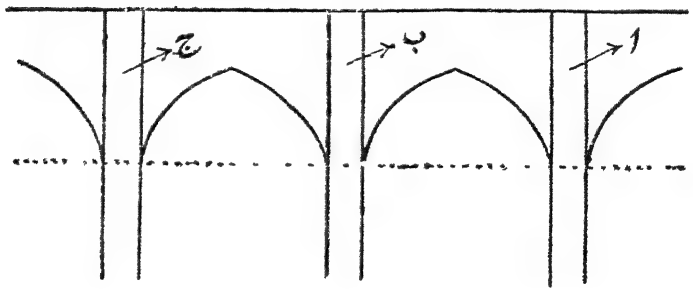

اس میں الف ؛ ب اور ج تمنچے ھیں - (۲) محراب کی ذات اور دروازے کي چوکھٹ کے درمیان میں نیم دائرے یا جیسي شکل پیدا ھو) کي شکل کي چنائي - ذیل کي دونوں شکلوں

میں ا ، ب ، ج ، د کے درمیان میں گھري ہوئي جگہ کی چنائي تمنچا ہے :-

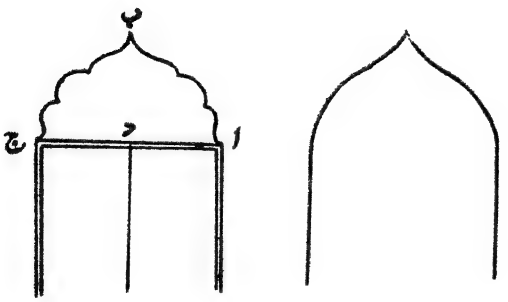

اس کو "نکل (نقل)" اور "پکا ڈھولا" بھي کہتے ہیں -

توڑا—امذ - (واو مجہول سے) - چنائي میں اینٹوں کو اس طرح لگانا کہ ان کا عرضي پہلو ساتھہ ساتھہ رکھا جائے "توڑا لگانا" یا "توڑے کي جڑائي کرنا" کہتے ہیں - دیکھو پٹی - توڑے کي شکل یہ ہے :-

تھاپي - امث - (بغ - تھپکنا ، تھپکی) - لکڑي کا بنا ہوا اوزار جو ایک موٹی سي کٹّي کي شکل کا ہوتا ہے - اس سے فرش یا دیوار (وغیرہ) پر استرکاري کرنے کے لیے مسالا (خاص کر چونا) لگاکر آہستہ آہستہ پیٹتے (تھپکتے) ہیں تا کہ مسالا ایک جي جان ہوکے دیوار (یا فرش) کی چنائي کو پکڑلے اور مضبوط ہوجائے - اگر تھاپي سے اس طرح نہ تھپکا جائے تو استر (پلستر) پھٹ جاتا ہے اور مضبوط نہیں ہوتا -

نظم و نثر پر ایک نظر

(از اصغر حسن اصغر مرتب رسالہ

حقیقت کی جستجو فطرت انسانی کو ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی، لیکن حقیقت خود جس طرح ایک نقطہ ناپیدا کنار ہے، اُسی طرح کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں تک پہونچنے کے لیے طلب و جستجو کی راہیں بھی کتنی بے حد و بے شمار ہوں گی، اِس لیے کہ ہر دماغ اپنے مخصوص ماحول اور اس طرح اپنی مخصوص ساخت و صلاحیت کے اعتبار سے مختلف و منفرد واقع ہوا ہے۔ شاید اسی لیے ایک حکیم نے حق و صداقت ہی کو انفاس خلائق کے برابر بتایا تھا۔

اس اعتبار سے انسان نے اپنے خاموش "اعمال" سے کون کون سی منزلیں طے کیں، کس کس طرح اور کن کن گوشوں سے صداقت اور حقیقت کو بے افگندہ نقاب کر کے عالم آشکارا کیا، یہ تمام امور اور اُن کی تفصیلات تاریخ تمدن کے اہم ترین ابواب ہیں، لیکن اسی ضمن میں اس کے "اقوال" بھی اس کے اعمال سے کم اہمیت نہیں رکھتے، اس کے "اعمال" نے اگر سوسائٹی میں تنظیم پیدا کی ہے، انتشار اور فتاحتوں کو دور کر کے ملکوں اور شہروں کو سنوارا ہے اور ہر طرف امن و فارغ البالی کی لہریں دوڑا دی ہیں تو ٹھیک اُسی طرح اس کے "اقوال" نے بھی "علم و ادب" کے نام سے ذہن انسانی کے تاروں کو فطرت سے ہم آہنگ بنایا ہے، اور دل و دماغ کی فضا کو حقائق و معارف کے نغموں سے معمور کردیا ہے، تاہم علوم و معارف کا سمندر

آج بھي اُسی طرح بے پایاں ھے جس طرح خود انسانیت کا ذوق جستجو :—

نہ حُسنش عاینے دارد نہ سعدي را سخن پایاں

بمیرد تشنہ مستسقي و دریا ھمچناں باقي

معلوم یہ ھوتا ھے کہ طلب و جستجو میں ایک حرکت دوام کی سي کیفیت ھے ' انسان اپني استعداد کے اعتبار سے کہیں ھو مگر اس کا ذوق جستجو ھر وقت اور ھر ساعت مصروف کار رھتا ھے - اُس نے اول اول جب اس جلوہ گاہ فطرت میں آنکھیں کھولي ھوں گي ' بہتے ھوئے دریاؤں ' رنگ برنگ کے پھولوں اور چمکتے ھوئے ستاروں کو دیکھا ھوگا تو اس کے حیرت کا کیا عالم ھوا ھوگا اور اس کے جذبات اور احساسات پر کیا گذري ھوگي ' "شعر و شاعری" کي کل کائنات اسی جذبے اور احساس کے دم سے وابستہ ھے ' شاید اسی لیے دنیا نے اپني تاریخ ادب میں اولین درجہ شعر کو دیا ھے -

آج ھم حیرت اور اُس حیرت سے اور جو کیفیتیں پیدا ھوتی ھیں اُن سے معمولي طور پر واقف ھیں ' لیکن سوسائٹي کی رسمیات اور فوت فکری کي عنان گیریوں سے اگر ایک لمحہ بھی رستگاري میسر ھو اور یہ جو تصورات اعیان و مظاھر حس حیرت اور حس جمالیاتي کیفیت کا ھم سے مطالبہ کر رھے ھیں وہ پوری طرح ھم پر طاری ھو سکے تو شاید اس وقت ھم اس لفظ کے حقیقي معنے سمجھ سکیں ورنہ کیا معلوم کہ دنیاے حیرت میں جذبات کی گفتگو کیا ھے اور شاعري کی زبان کیا ؟ :—

محرم ایں ھوش جز بیھوش نیست

مرزباں را مُشتری چوں گوش نیست

کسی کا قول ہے کہ فلسفہ جذبات کو منضبط اور شبہے کو رفع کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شاعری اسے جذبے اور حیرت کو دو چند بنانا چاہتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ شاعری کی یہ کوششیں اگر مسکور ہوئیں تو خود اُس شاعری کی نوعیت کیا ہوگی بلکہ یہ کل کائنات اُس وقت کہاں سے کہاں پہونچی ہوئی ہوگی؟ عارف رومی نے اسے واضح کرنا چاہا مگر —

قاس اگر گویم چہاں برہم زنم

کہہ کہہ کر سکوت اختیار کیا؟ اصل یہ ہے کہ یہ عالم آب و گل، اور یہ زمان و مکان، شاعرانہ جذبات کے اس آشوب و عاریگری کو گوارا بھی نہیں کر سکتے، فطرت کی نظر قیام عالم اور اس کے توازن پر رہتی ہے وہ کسی دبنے اور کھو جانے والی ذہنیت کا دامن پکڑ کر اس متلاطم در لا کا کیڑا کر دیتی ہے جسے عالم فکر و ہوس کہتے ہیں۔ لیکن انسان کا فطری ذوق جستجو یہاں بھی معطل نہ رہ سکا، صرف اس کی کیفیت تبدیل ہوگئی یعنی اب اُس بہتے ہوئے دریاؤں میں جہازرانی کا سود و زیاں، رنگ برنگ کے پھولوں میں فن باغبانی اور چمکتے ہوئے ستاروں میں فلکیات کے مسائل نظر آنے لگے، پہلی حالت میں اگر مجرد کہانیاں کی نامنتاہیوں سے ذوق جستجو کو سکون و سرور حاصل ہوتا تھا تو دوسری حالت میں استدلال و تجربات کے ذریعہ حقیقتوں کو متعین کرنے سے۔ لیکن چونکہ انسان کی فطرت میں کم و بیش یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہیں اس لیے بعض ذہنوں پر اول الذکر کا اور بعض پر آخرالذکر کا غلبہ ہوتا ہے؟ سمجھنے کے لیے اول الذکر کو ذوقی و جذباتی اور آخرالذکر کو علمی و عقلی کہنا غالباً بے جا نہ ہو۔

علم و عقل کے بارے میں ہم بداہتاً یہ دیکھتے ہیں کہ اُس میں عوام و خواص کی تخصیص ہے، یعنی عوام و خواص کے علم و عقل

میں باہم تفاوت ہے جس سے اہل علم و اہل عقل کی جماعت عوام سے بالکل ممتاز ہو جاتی ہے، اسی طرح ذوق و جذبہ گو عوام و خواص میں مشترک ہے تاہم اُن میں بھی تفاوت ہے جس سے صاحبان ذوق کی جماعت بھی اہل علم کی طرح عوام سے ممتاز ہوتی ہے، اور جس طرح ؟ علم و عقل میں کسب و اکتساب کو دخل ہے، اُسی طرح جذبات و احساسات میں بھی رفعت و پاکیزگی پیدا کی جاسکتی ہے -

جذبات و حسیات بے پایاں و غیر محدود ہیں اور جب وہ کسی طرح لفظ و بیان، عبارت و اشارت کا لباس اختیار کر لیتے ہیں تو سننے والے اور پڑھنے والے کی صلاحیتوں میں بھی وہی جنبش پیدا ہوجاتی ہے اور اُس کے تار جذبات سے بھی وہی نغمے بلند ہونے لگتے ہیں جنہوں نے اول اول کہنے والے کو بیتاب کردیا تھا - شاعر یا صاحب ذوق کا طرز بیان عام طرز بیان سے مختلف ہوتا ہے، اس کی کیفیت تبھی اُسی لفظ اور اُسی طرز بیان کو منتخب کرتی ہے جو اُس کی غیر محدود حقیقتوں کی متحمل ہو سکے - مجرد حقیقت عام اس سے کہ لفظ و بیان میں کتنی ہی خوب کیوں نہ ہو مادی صورتوں کی کی طرح متعین نہیں ہوسکتی - شاعر اس کے لیے وہ انداز اختیار کرتا ہے جو جذبات و حسیات کی غیر محدود فضا تک سننے والے کے ذہن کو پہونچا سکے، اس لیے جذبات جن مجرد حقائق تک لیجاتے ہیں اُن کو لفظ و بیان میں مسلسل و متشکل کرنا شاعری ہے شاید اسی لیے تشبیہ و تمثیل مجاز و استعارہ، غلو و مبالغہ شعر کے ضروری عناصر قرار پائے -

برخلاف اس کے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ منطقی استدلال اور علمی تجربات کے ذریعہ حقیقتوں کو متعین کرے - تعین ا

اور صحیح تعین کے لیے ہمیشہ ایسے الفاظ اور ایسے طرز بیان کی ضرورت ہوتی ہے جو صاف و سادہ ہوں ، جن میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو اور سننے والے یا پڑھنے والے کا ذہن اُس شے سے ہٹ کر کسی دوسری طرف منتقل نہ ہو سکے ۔ اس لحاظ سے عام طور پر ذوقی امور یعنی شعر کے لیے نظم اور عقلیات کے لیے نثر موزوں سمجھی جاتی ہے لیکن اگر نظم و نثر کا اس نقطۂ خیال سے جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہم نظم و نثر کے کل دفتر کو صحیح صحیح طور پر "ذوقیات" و "علمیات" کے تحت میں نہیں لا سکتے ، ہمیں اکثر نظم کی شکل میں علمی و عقلی باتیں ملیں گی اور نثر میں ذوقیات و وجدانیات کے کرشمے نظر آئینگے ۔ شاید ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا ، اس لیے کہ عقلی و جذباتی تو دو ذہنی حالتیں ہیں جو جدائی نہیں جاتیں بلکہ ہوتی ہیں اور ہر چند کہ وہ کم و بیش سب میں موجود ہیں مگر اُن پر وہ قدرت حاصل نہیں ہوتی جو نظم و نثر کی ہیئت ظاہری کی ترتیب پر ہوا کرتی ہے اِس لیے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تاثر کے ساتھ جذبات کو منتقل و منتشر کرنا شاعری ہے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس نظم میں جذبات ، کہ وہی جذبات کی برانگیختگی کا ذریعہ و سامان بھی ہیں ، نہ شامل ہوں اُسے شعر کہنا ہرگز درست نہ ہوگا ۔ کیا یہ شعر ، شعر کہا جا سکتا ہے ؟ :—

عشق کو کیوں بے خودی محدود ہے

عشق بے حد ہے خودی محدود ہے

یہ شعر ممکن ہے ہمارے ذہن کو کسی واقعے یا صداقت تک پہونچاتا ہو مگر اس سے ہمارے جذبات و حسیات میں کوئی تموّج و تلاطم نہیں ہوتا ، ممکن ہے یہ ایک بلند صداقت ہو لیکن

شعر نہیں ' اس سے ہمیں ایک اعلیٰ درجے کی بات معلوم ہوتی ہے مگر ہم پر کسی قسم کی کیفیت ہرگز طاری نہیں ہوتی - عشق اور بے خودی کی حکیمانہ تحلیل ' عشق اور بے خودی کی لذتوں سے بہرہ یاب نہیں بنا سکتی بلکہ صرف معقولات و معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے جو یقیناً بہر سے بھی نہ آسانی ممکن ہے - لیکن عشق و بیخودی سے متکیف ہو کر جو شعر کہا جاتا ہے اُس میں حکیمانہ نکتہ سنجیوں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی صرف اُس تاثر کی ترجمانی کافی ہوتی ہے مثلاً :—

چشم من نگاہے کرد لعل او حدیثے گفت

ہوش مست و بیخود شد بیخودی نہ ہوش آمد

یہ کہنا مقصود نہیں کہ شعر کا ایک ذوقی چیز ہونا شاعر کو معلوم نہ تھا بلکہ عرض یہ کرنا ہے کہ شاید اِس خیال سے کہ نظم میں قدرتی طور پر ترنم و موسیقیت ہے اور وہ طبعاً لوگوں کو مرغوب ہوتی ہے اِس لیے معقولات و معلومات کو بھی کبھی کبھی نظم کر دیا جاتا ہے تا کہ زبان زد عام ہو کر کافی طور پر مفید ثابت ہو سکیں - بہر صورت اِس طریق کار میں کتنی ہی بڑی مصلحت بینی کیوں نہو ' لیکن منصفانہ تنقید اُنہیں شعر کا خطاب کسی طرح نہیں دے سکتی اِسی طرح مولانا حالی مرحوم کی بھی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کی افادیت سے قطعاً اِنکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اُنہیں شعر کہنا ، یکسر شعر کی توہین ہوگی ، لیکن اب ایک نظر ملاحظہ ہو :—

"آنکھیں کُھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی اور خواہش اور ولولوں کی سبلم سے خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا - اپنی

طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا ۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اِس صبح فریب کے لیے نہ تو سود و نہیں کی دوپہر ہے نہ نا اُمیدی و ناکامی کی شام ۔ یہ سارا سبزستان امید اور نگارخانہ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کامجوئیوں کے لیے بنایا گیا ہے اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لیے چشم براہ جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی ۔ معلوم نہیں اپنی ہی گفتہ عبارت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی ، یا تو گرفتاران عالم سراب کی ہوش ربائیوں کے لیے خود ساز تسلی کا نوائے فریب ہی یہی تھے ۔ (تذکرہ ۲۹۲) ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر ایک خاص حیثیت رکھتی ہے اُس کو مثال میں پیش کرنا عالماً عام طور پر صحیح نہ سمجھا جائے مگر علامۂ سبلی ایسے زبردست ادیب کو لیجئے جس کی جامعیت اور جس کی صحت ذوق یقیناً مُسلّم ہے ، سیرۃالنبی میں " ظہور قدسی " کے عنوان سے لکھتے ہیں :—

"چمنستان دہر میں بارہا بہاریں آ چکی تھیں چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اِس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں حیرت ہو کر رہ گئی ہیں" ۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں نیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردیے ، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے چرخ کُہن مدت ہائے دراز سے اِسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا کہکشاں

قضا و قدر کی بزم آرائیاں ؛ عناصر کی حدت طراریاں ؛ ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں ؛ ابر و باد کی تر دستیاں ؛ عالم قدس کے انفاس پاک ؛ توحید ابراہیم جمال یوسف ؛ معجز طرازیِ موسیٰ ؛ جاں نوازیِ مسیح ؛ سب اِسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں اور شہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئینگے ۔ توحید ؛ غلغلہ اُٹھا ؛ چمنستان سعادت میں بہار آ گئی ؛ آفتاب ہدایت کی شعائیں ہر طرف پھیل گئیں ۔ اخلاق انسان کا آئینہ پرتَوِ قدس سے چمک اُٹھا ۔
(سیرۃالنبی جلد ۱ ؛ صفحہ ۱۲۳) ۔

اگر شعریت کی تعریف وہی ہے کہ کہنے والے نے جوش و جذبات سے متاثر ہو کر لکھا ہو اور اُس کا اثر بھی پڑھنے والے کے جوش و جذبات کو برانگیختہ کردے تو کیا یہ دونوں عبارتیں اُس کی صحیح صحیح مصداق نہیں ہیں ؟ ۔

خود علامۂ شبلی مرحوم شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا بتاتے ہیں یعنی اُس کو سن کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہو ؛ اور یہی خصوصیت ہے جو شاعری کو علوم و فنون سے ممتاز بناتی ہے ۔ اُن کے نزدیک شعر کا تخاطب جذبات سے ہے اور علوم کا عقل سے ؛ علوم استدلال سے کام لیتے ہیں اور شاعری متحرکات سے ؛ اسی طرح ڈراما اور افسانے کے وہ حصے جن میں جذبات کو مشتعل کیا گیا ہو شعر میں داخل ہیں ۔

اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا غالباً بیجا نہ ہو کہ بعضوں کے نزدیک شاعری اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں ہیں ؛ ان کے نزدیک شاعر کا تخاطب خود اپنے نفس سے ہوتا ہے لیکن خطیب یا مقرر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے احساسات

---

* شعرالعجم جلد چہارم صفحہ ۴ ۔

و جذبات پر نظر رکھتا ہو ؟ شاعر کے لیے اگر یہ صحیح ہے کہ پہلے وہ خود متاثر ہوتا ہے اس کے بعد دوسرے اس سے متاثر ہو جاتے ہیں ؟ تو ایک حقیقی واعظ و خطیب کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہو اس سے خود بھی متاثر ہو ورنہ اُس کا تمام بیان ایک نغمۂ بے آہنگ اور ایک جسد بے روح بن کر رہ جائے گا ؟ امام ابو بکر شبلی نے حضرت جنید بغدادی سے فرمایا کہ "دراز کہ ما بس پردہ میگفتم تو در بازار آشکارا کردی و بر منبر گفتی ؟" "گفت کہ اے امام وقت خود می گویم و خود می شنوم کہ ھل فی الدارین غیری"۔ یہ ہے ایک خطیب کی صحیح ذہنیت جس کا اظہار خود ایک خطیب ہی کی زبان سے اس طرح ہوا ہے ؟ لیکن جو خطیب یا واعظ آج کل ہمارے سامنے ہیں اگر وہ صرف دوسروں ہی کے چشم و ابرو کو دیکھتے رہتے ہیں تو اس سے ایک حقیقی خطیب کی عظمتوں پر کوئی حرف نہیں آتا آج ہمارے سخنور ؟ یہی اگر نرم سخن کی رونق بڑھاتے اور لوگوں کی واہ وا کے لیے مذاق عوام کی پیروی کرتے ہیں اور حقیقی زندگی کے تقاضوں کے خلاف شاعری کو ردیف و قافیے کی بازیگری اور مشق و مزاولت کا ایک کرتب بنائے ہوئے ہیں ؟ تو اس سے شعر و شاعر کی اصلی تعریف کسی طرح تبدیل نہیں ہو سکتی ؟ اردو میں خطابت کی اعلیٰ ترین مثال موجودہ مذاق کے موافق مولوی ابوالکلام آزاد کے یہاں جس قدر ملتی ہے اتنی شاید ہی کسی اور کے یہاں ہو ؟ ذیل کی سطروں کو ملاحظہ فرمائیے کس قدر خطیبانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔

ـ وہ راز جسے میں نے چھپا کر تم کو بتایا تھا تم نے اس کو بازار میں مشہور کردیا اور منبر پر اس کا اعلان کردیا ۔ جواب دیا کہ اے امام وقت خود ہی کہتا ہوں اور خود ہی سنتا ہوں کیا دونوں جہان میں میرے سوا کوئی اور بھی ہے ۔

"افسوس کہ تم حقیقي اور سچي بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے ؟ تم سائش کے پجاري ، شور و ھنگامے کے بندے اور وقتي جذبات و انتشار ھیجان کي محلوں ھو ؟ تم میں نہ اختیار ھے نہ نظر ؟ نہ تم جانتے ھو نہ پہچانتے ھو ؟ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ھو اتني ھي تیزي کے ساتھہ فرار بھي کر جاتے ھو ؟ تمھاري اطاعت جس قدر سہل ھے اور تمھاري ارادت جتني سستي ؟ اتناھي تمھارا انحراف آسان ھے اور اُسي نسبت سے تمھاري مخالفت بھی ارزاں پس نہ تو تمھاری تحسین کی کوئي قیمت ھے نہ تمھاری توھین کا کوئی وزن ؟ نہ تمھارے پاس دماغ ھے نہ دل؟ وساوس ھیں جن کو تم افکار سمجھتے ھو ؟ خطرات ھیں جن کو تم عزائم کہتے ھو؟ خدا را بتلاؤ میں تمھارے ساتھہ کیا کروں؟ بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ھو ؟ بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ھوں؟ تمھاري بھیڑوں اور غولوں میں سچي جستجو کا چہرہ اُسي طرح مفقود ھے جیسا کہ ھمیشہ سے مفقود رھا ھے - اب تک حقیقت شناسي کی کوئي گیرائي تم میں نظر نہیں آئي - تم مجھے بلاتے ھو کہ استقبال سے بھرے ھوے ریلوے اسٹیشنوں پر اُتارو اور ایسے پُر جوش اِنسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ھاتھوں میں فتحمند فوجوں کي طرح جھنڈیاں ھوں اور پھر اتنے انسان میری گاڑي کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ اُن کے ھجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ھو جائے مگر آہ ! میں تمھاري اِن بھیڑوں کو لیکر کیا

کروں جب تمہارے دلوں میں سنّاٹا چھایا ہوا ہے اور تمہارے اِس خوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مُرجھائی ہوئی ہیں ؟ افسوس ! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو ؟ تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو ؟ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اِس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب‌الوطن ہوں ۔—

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جُفت خوشحالاں و بد حالاں شدم

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جُست اسرار من

تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں" لیکن میں ہواؤں میں پانی کی تو سونگھ لینے کا جوگر ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہے ۔ "

ان مثالوں سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ ان میں کشش و جاذبیت ہوتی ہے اس لیے قدرتی طور پر لوگوں کو خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی اپنی تحریروں کو ایسی ہی دلکش اور جاذب نظر بنائیں - حالانکہ جذب و کشش کی علت اصلی لکھنے والے کی قلبی و ذہنی کیفیت ہے ، اِسے لفظ و بیان کے عرض و سطح پر تلاش کرنا فضول ہے ، لمپ کی روشنی اس کی لو سے ہے ، اور بجھے ہوئے لمپ پر فاسفورس ملنا دوسری چیز ہے - جس طرح نظم میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ شعر کی دلکشی کو دیکھ کر وہ لوگ جن کا ذہن یکسر شعریت سے خالی اور نا آشنا ہوتا ہے وہ بھی کسی کے اچھے

شعر سے الفاظ و تراکیب لے کر کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ' یا حسرت و بیکسی ' فنا و بقا' یا اور اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس ظاہری تیب تاب سے ان کا شعر بھی شعر ہو جائیگا حالانکہ اعلیٰ قسم کی شاعری کے لئے ایک مخصوص زندگی ایک مخصوص طرز تخیّل اور ایک مخصوص اُفتاد نظر کی ضرورت ہے جس سے شاعر کی انفرادیت و شخصیت طیار ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح نثر میں بھی بعضوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ مشکل الفاظ ' پیچیدہ تراکیب اور شاعرانہ طرز بیان سے ان کی عبارتوں میں وزن پیدا ہو جائیگا ' عوام اور نا واقف لوگوں کا ذکر نہیں ' لیکن جو لوگ صحیح ذوق اور صحیح نظر رکھتے ہیں وہ اس طرح کی نثر کو بھی اُتنا ہی نا پسند کرتے ہیں جتنا اُس مصنوعی نظم و شعر کو۔

کسی چیز یا کسی واقع کی علمی توضیح و تشریح کے معنی یہ ہیں کہ بغیر کسی جذبے کی آمیزش کے اُسے پیش کیا جائے ' لیکن اگر اس کے بیان میں کسی قسم کا شاعرانہ رنگ روغن استعمال کیا جاتا ہے تو یہ ایک قسم کی ادبی فریب کاری ہے جس سے ہر شایستہ و سنجیدہ شخص کو اجتناب کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک مضمون جس میں اجنتا کے بتوں کا تذکرہ ہے ' عبارت کا یہ طرز اختیار کیا گیا ہے —

"بودھوں کی یادگار فن کا حصۂ کثیر اجنتا کا سرمایہ ہے" جو عظمت و حکمت کے زیور سے سراپا مرصع ہے ' جذبات کی شائستگی، پاکباری وسادگی اس صنعت رنگین کے وہ زریں اوصاف ہیں جن کی بدولت پیکران حسن آفریں چشم نظارہ بار کو ایک ہی جلوے میں مسحور کرلیتے ہیں.... صانع کی شوخی تحریر کے فریادی

نقوش کا ہر عضو بدن بخوبی نمایاں ہے ، اس سے
ان کا حسن کمر یزور بے نقاب ہوکر اور دوبالا ہو گیا
ہے . . ملاس و تصنع کو ذرہ بھر بھی دخل نہوے
کے باعث مصور کا قسرار اورد کی دلداریوں کا سرمندہ
احسان ؟ نہیں ۔ وغیرہ وغیرہ "۔

خط کسیدہ لفظوں اور فقروں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بدان کو
ورنی اور رنگیں بنانے کے لیے شاعری سے مستعار لئے گئے ہیں ، حالانکہ ان
کا ورنی اور رنگین ہونا سرے سے غیر ضروری تھا بلکہ ان کا صاف اور سادہ
ہونا ہی اُن کا اصلی حُسن تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ نظم و نثر یا یہ الفاظ دیگر شاعرانہ و علمی بیان کو
باہم اُتنا ہی مختلف ہونا چاہیے جتنا اُن دونوں کے اصل سر چشمے
(یعنی جذبہ و عقل) مختلف ہیں ؟ یہ دونوں کی مستقل دو جداگانہ
حالتیں ہیں اور دونوں کے حُسن بھی مختلف ہیں حُسن عنوان کے نقطہ
نظر سے حسن ہے یہ ضروری نہیں کہ جذبات کے نقطۂ نظر سے بھی حُسن ہو ؟
ایک کی کمی کو دوسرے سے پورا کرنا ، کمی پورا کرنا نہیں ہے بلکہ اُس
میں اندمال اور بھدا پن پیدا کر دینا ہے ؟ عطر اور قورمہ دونوں اپنی اپنی
جگہ پر اچھے ہیں لیکن قورمے میں عطر ملا دینا اور عطر میں تھوڑا
سا شوربہ ٹپکا دینا در اصل دونوں کو عارب کر دینا ہے ۔

میرے اس بیان کی غرض یہ ہے کہ نظم و نثر کی ہیئت ظاہری
یعنی ان کی عبارتوں پر اس طرح کا عمل پیمائش نہ صرف کیا جائے
لیکن لکھنے والے کے دل میں اگر عقل اور جذبے کا خود ہی اجتماع ہو
تو اس سے ہمارے ادب میں ایک خاص قسم کی کیفیت اور خوبصورتی
پیدا ہو جائیگی ۔

اس قسم کی نثر نہ تو بقول شخصے واقعات کی کھتونی کی طرح خشک ہوتی ہے اور نہ کیفیات و جذبات کی شدت سے ہمیں کسی دوسرے عالم میں پہونچا دیتی ہے ' اس کے پڑھنے سے ہمیں لطف بھی آتا ہے اور ایک گونہ واقعات و معلومات کی اطلاع بھی ہوتی ہے - اس کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :—

"یہی ساعت تھی جس نے کسی زمانے میں حیدرآباد دکن کے نمسارک کو نذیر احمد کا شیدائی بنا رکھا تھا ، سر سالار جنگ اول استیت ڈنر پر ہیں ، طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے - چھری کانٹوں کی دھیمی موسیقت میں دفعتاً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے ، ارشاد ہوتا ہے کہ نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے - ایک مدت کے بعد جلیل القدر میزبان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق الادب امیرالامرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے اور چہرے پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہئے ، نذیراحمد کے خوان ادب کا یہ لقمۂ تر تھا جس سے شاہی میر بھی بے نیاز نہ رہ سکی لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے جسے ہم اگلنا جانتے ہیں مگر نہ بے تمکی رواباب سابقہ کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی - "

(مہدی حسن افاوی الاقتصادی)

ادب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سوسائیٹی کو اس سے مسرّت حاصل ہو، جس نثر میں علم و فن کے اعتبار سے کوئی بڑا افادی پہلو نہ ہو لیکن اسے پڑھ کر اگر صاحبان علم و فن ایک لمحہ کے لیے غم غلط کرسکیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایک بہترین غرض پوری ہو گئی ؛ اس طرح کی نثر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ لغت و قواعد پر بہت زیادہ عبور حاصل ہو بلکہ ضرورت ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں عقل کے ساتھ ایک خاص قسم کی شگفتگی اور لطافت بھی ہو - مثال میں یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں :—

'' خشک اور سنجیدہ فلسفے سے شکایت تو صرف یہ ہے کہ وہ کائنات کو اس کی شاعری سے محروم کر دینا چاہتا ہے اور اس فاتحانہ انداز سے کہ گویا اُس نے کائنات کا سارا طلسم توڑ دیا ۔ شاعر بھی رموز حقیقت کا انکشاف چاہتا ہے لیکن اُسی حسن ادا کے ساتھ کہ حُسن زار حسن کا متمنی ہے مگر فلسفی ہر حسن کو نا قابل توجہ سمجھتا ہے ۔ شاید وہ یہ نہیں جانتا کہ شاعری کی طرح فلسفہ بھی ایک دھوکا ہے ۔ فرق صرف اِس قدر ہے کہ شاعری لطیف ترین دھوکا ہے اور فلسفہ نہایت خشک اور غیر دلچسپ - '

(سجاد انصاری مرحوم)

اس شگفتگی میں ہلکا ہلکا طنز بھی ہے ' لیکن طنز ' شگفتگی اور رنگین خیالی کا ناقص امتزاج بھی ملاحظہ ہو :—

''مجھے حیرت تو مغرب کی ذکاوت مذاق اور

کثافت تخیّل پر ہے ؟ انہیں انبساط و مسرّت اس تصوّر سے نہ ہوئی کہ اُن کے اجسام خاکی کی پرورش فردوس بریں کی اُس فضائے کی ہے جس کی دلفریبیاں آج بھی انسان کو حریص و طامع بنائے ہوئے ہیں ؟ دنیا باوجود اپنی تمام بہشت آفرینیوں کے اس فضا کے ایک ذرے کی بھی قیمت نہیں رکھتی ؟ مغربی دل و دماغ کو اگر تسکین ہوتی ہے تو اس نتیجے سے کہ انسان حقیقۃً ہیولیٰ ارتقائی ہے جس کی پرورش کنار فردوس میں نہیں بلکہ آغوش میمونی میں ہوئی تھی - حقیقت انسانی اُسے مضطرب کر رہی تھی ؟ حقیقت میمونی نے اسے مطمئن کر دیا - اس سے بحث نہیں کہ نظریہ ارتقا صحیح ہے یا غلط ؟ تخیلات و توہمات کبھی صحیح یا غلط نہیں ہوا کرتے ان کے لئے صرف لطافت و کثافت کا امتیاز ممکن ہے - ؟؟ (سجاد انصاری مرحوم)

اصل یہ ہے کہ ایک بات کے کہنے کے بیشمار طریقے ہیں ؟ یہی مختلف طریقے جن سے بیان کی حسنیت و نوعیت تبدیل ہوتی ہے لکھنے والے کی شاعری یا نثر نگاری کا درجہ متعین کرتے ہیں ؟ جب کوئی شخص کچھ لکھنا یا بیان کرنا چاہتا ہے تو اپنی ذہنی اور نفسی کیفیتوں کے ساتھ اُسے پیش کرتا ہے اور اس طرح اُس بات یا واقعہ کی حالت میں اسے زبان سے کچھ اضافہ کر دیتا ہے ؟ اس کی یہ ذہنی و نفسی کیفیت اس کی انفرادیت و شخصیت ہے اور اس اضافے کا عام طریق عمل اُس کا ''طرز'' کہلاتا ہے ؟ خلاصہ یہ کہ علمی و عقلی نثر جس میں کیفیت نفسی کم یا بالکل کار فرما نہ ہو وہ بیان محض اور نفس الامری تحمل کی زبان ہے اور شاعری کیفیات و جذبات کی ؟

نثر جس قدر کیفیات و جذبات سے قریب تر ہوتی جائے گی اسی قدر شعریت میں تبدیل ہوتی جائے گی اسی طرح نظم جس قدر نفس الامری تخیل اور بیان محض بنتی جائے گی اُسی قدر شعریت سے محروم ہوتی جائے گی - مثلاً ایک سوچ و حسین نوجوان کھڑا مسکرا رہا ہے - بغیر کسی جذبے اور کیفیت کے اگر اس واقعے کو دیکھا جائے تو سب اس واقعے کو اسی سادہ طور سے بیان کر دینگے مگر جذبے کی زبان ہی کچھ اور ہے وہ کیفیت نفسی کے زور سے منظر کی حالت ہی تبدیل کیے دیتی ہے اور اسے اس طرح ایک طرفہ ہنگامہ بنا دیتی ہے :—

ہے سراپا حسن وہ رنگیں ادا جانِ بہار

حُسن پر حُسنِ تبسم، صبحِ خندانِ بہار

یا بہار کے موسم میں قوت نامیہ کے فیض سے سبزہ و گل پر جنبش اور لہلہاہٹ سی ہے ؟ مگر اس کا شدید تاثر واقعے اور منظر میں اس طرح روح پھونک دیتا ہے -

سبزہ و گل لہلہائے ہیں سبو کا زور ہے

موج رنگا رنگ ہے یا جوشِ طوفانِ بہار

انفرادیت و شخصیت یا کیفیت نفسی کا شدید ہونا ہی انسان کا حصہ نہیں - عام آدمی زیادہ تر دوسری شخصیتوں کی آواز بازگشت ہوتے ہیں - اسی لیے نظم و نثر کا مخصوص طور ایک زبردست انفرادیت و شخصیت کی علامت ہے - صاحبانِ طور کے بیان سے یہ معلوم ہو گا کہ جو بات معہ تاثیر یا اپنی کیفیت نفسی کے انہوں نے پیش کی ہے اس کے لیے وہ طریقۂ بیان قطعی ناگزیر تھا غرض کہ اس طرح کا بیان اگر اوزان اور قوافی کے حدود میں ہو تو اُسے شعر منظوم کہینگے اور اگر ان پابندیوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو اُس بیان پر شعر منثور ، خطابت اور ادبی نثر وغیرہ کا اطلاق ہوگا -

شاعر کے بارے میں بعضوں کا قول ہے کہ قوم میں اس کی حیثیت مثل ایک بچے کے ہے ' بچہ جس عالم میں ہوتا ہے کون اس کا اندازہ کر سکتا ہے ؟ ۔ وہ چاند کی شعاؤں کو گھنٹوں دیکھتا رہتا ہے اور خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے ، ایک ذرا سی تتلی کے اُڑ جانے سے وہ گھنٹوں روتا ہے ، اور ایک معمولی سے رنگین کھلونے کو پا کر من جاتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے ' اس طرح ہمہ تن وہ ایک کیفیت محض اور ایک جذبۂ بے اختیار ہوتا ہے ، اور اسی لیے اپنی خوب دیکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے صاحب عقل کو مسحور کر لیتا ہے ؟ صاحب عقل نہ سمجھتا ہے کہ وہ بچے کو کھلا رہا ہے حالانکہ بچہ اپنی استعداد کی مخفی قوتوں سے خود اُسے کھلاتا ہے اور اپنی بار برداریوں کے لیے اُسے مضحکانہ حرکات کے لیے مجبور کر دیتا ہے ، ٹھیک اسی طرح شاعر بھی اُس مقام پر ہوتا ہے جہاں فکر و ہوش اور علم و عقل کی مخلوق کی رسائی نہیں ، اُس بلندی ، سے اس کی آواز میں یقین' جوش اور وجدان کی وہ کیفیتیں ہوتی ہیں جن سے ہم متاثر تو ہوتے ہیں مگر مجال دم زدن نہیں رکھتے' اس کی باتیں سن کر ہمارے جذبات میں ایک ہیجان و تلاطم تو پیدا ہو جاتا ہے مگر ایک برابر والے انسان کی طرح اُس سے ردو قدح نہیں کر سکتے ، شاعر ، مستعار کائنات کا قائل نہیں وہ زمینیات کے پردے کو چاک کر کے زمین و آسمان کا نظارہ کرنا چاہتا ہے ۔

وہ اگر محاسن و معائب کی صف میں نہیں پہونچ گیا ہے ۔ اور اپنے مذاق میں شائستگی و پاکیزگی رکھتا ہے تو وہ اپنا طریق کار بھی خود ہی بہتر جانتا ہے ، مذاق کی شائستگی و پاکیزگی میں نے اس لیے کہا کہ خارجی قواعد و ضوابط معلوم کرنے پر بھی اصلی دلیل راہ اس کی یہی چیز ہے ۔

برخلاف اس کے ایک نثر نگار (یعنی علمی وعملی تحریر لکھنے والا شخص) ہماری ہی معمولی سطح پر ہماری ہی نوع کا ایک آدمی ہوتا ہے، اس کی گفتگو آپس کی گفتگو ہوتی ہے، وہ نہ ہم پر اپنے جوش ملکوتیت کا دباؤ ڈال سکتا ہے اور نہ اپنے روحانی ملہمات سے ہمیں مرعوب کر سکتا ہے اس کی دنیا وہی دنیا ہے جس سے ہم لوگوں کے اور اپنے تجربات سے بنی ہوئی ہے، "مدطوبہ نکولس" نہیں بلکہ صحیح معنوں میں شعر اگر کسی اور عالم کی آواز ہے تو نثر دعوی علمی و عملی تحریر اور سرمایہ سوسائٹی کی دلچسپی گفتگو اور ایک معمولی تبادلۂ خیال ہے گفتگو کو خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو کسی کو بھی رہنا چاہیے، یہ نہیں کہ وہ چیخ بن جائے یا موسیقی کا رنگ اختیار کرلے۔

شعر کی مخصوص بنیادی خوبی اگر "منتہیت" کہی جائے تو نثر اور علمی و عملی نثر کی عمدگی اس کے "انصاف" پر منحصر ہے۔ منتہیت اگر والہانہ و بے اختیارانہ اظہار چاہتی ہے تو انصاف کا تقاضا اختصار اور صبر و استدلال ہے۔ "انصاف" کسی خاص شخص یا کسی خاص واقعے کے متعلق نہیں بلکہ اس سے مراد علم "عادت انصاف" سے ہے جو نثر نویس اور اس کے بیان سے متعلق ہو۔ علمی و تنقیدی بیان کے لیے نثر نگار کا دل جب مطمئن ہو اس کے ساتھ ساتھ عقل بھی ہوتا ہے، وہ اپنے تخیل اور جذبات کے ان تمام متقاضیوں اور خوشنمائیوں سے دبا ہوا چلتا ہے جو اصل موضوع سے متعلق نہیں ہوتے، اور اس طرح اس کے تکمیل کے بعد انہی خود ایک خوشنما اور خوبصورتی طیار کر لیتا ہے۔

ایک عمدہ علمی نثر کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں ہم لکھنے والے کی تجسس و سائس میں مبتلا نہیں ہوتے

اور نہ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں کوئی خاص سوال پیدا ہوتا ہے ، بیان کی اہمیت ، اس کی سنجیدگی اور اس کی خوبیء ترتیب ہماری توجہ کو اس درجہ مصروف رکھتی ہے کہ ہمیں ان امور کی فرصت ہی نہیں ملتی ، اس طرح کا ایک نمونۂ نثر ملاحظہ ہو —

"یہ حرف جو ہر ملک کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں ؟ اُس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آوازیں آب و ہوا وغیرہ کے وجوہ سے اُن لوگوں کے گلے سے بہ آسانی نکلتی ہیں ؟ مگر دوسرے ممالک کے لوگ انہیں وجوہ سے اُن کو ادا نہیں کر سکتے ؟ یا بدقت ادا کرتے ہیں - اِنسان کا گلا آلۂ موسیقی کے اُصول پر بنا ہے اور اسی طور سے اُس میں تار بھی بندھے ہوئے ہیں ؟ سانس کے ہوا میں ملنے سے زبان ؟ تالو ؟ ہونٹ ؟ دانت اور خلاے دہن کی مدد سے آواز میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں -

اُردو ؟ فارسی ؟ عربی حروف پر اگر نظر ڈالی جائے تو گویا وہ دیکھنے میں مختلف آوازوں کی علامات ہیں - لیکن در حقیقت اِن حروف کے نام سے کوئی سادہ آواز پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ خاصے الفاظ ہیں مثلاً الف ؟ عین ؟ جیم وغیرہ وغیرہ حروف نہیں بلکہ پورے الفاظ ہیں چہ جائے کہ اُن سے سادہ آوازوں کا کچھ بھی خیال پیدا ہوتا ہو - اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اُس زمانے کی یادگار ہیں جب کہ اِس قسم کی تحریر ایجاد نہیں ہوئی تھی بلکہ لوگ اپنے خیالات تصویر میں بنا بنا کر ظاہر کیا کرتے تھے - اول اول تو جس شے کا بیان

کرنا مقصود ہوتا تھا ؟ اس کی تصویر بنا دیتے تھے ۔ مثلاً گائے یا عورت کا بنانا مقصود ہے تو گائے یا عورت کی تصویر کھینچ دیتے تھے ۔ دوسرے دور میں یہ اصلاح ہوئی کہ شے سے اُس کا فعل ظاہر کرنے لگے مدلاً آنکھ سے نظر یا دو ٹانگوں سے رفتار مراد لینے لگے ؟ تیسرے دور میں یہ ہوا کہ شے سے اِس کے مدار خصائص یا ظاہری علامت سے اصل شے مراد لینا لگی مدلاً لومڑی کی تصویر سے مکّاری ؟ یا تخت سے سلطنت مقصود ہوتی تھی ۔ چوتھے دور میں ایک شے کے اظہار میں یہ ترکیب کرنے لگے کہ اُس شے کے بولنے میں جو آوازیں پیدا ہوتی تھیں اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک تصویر بناتے تھے ۔ "

(مولوی عبدالحق بی ۔ اے)

غرض کہ انسانی ذہن کی حقیقت تک رسائی، جذبے اور عقل ہی کے دم سے وابستہ ہے " کلام یعنی نظم و نثر کی عمدگی کا مفہوم یہ ہے کہ لکھنے والے کے ذہن کے سامنے جو حقیقت آئی ہے وہ اپنے لفظ و بیان سے اُس کی صحیح‌صحیح ہم‌آہنگی کر سکے " یعنی اس کے ذہن نے اُس حقیقت کو اگر غالب طور پر جذبے کے ذریعہ محسوس کیا ہے تو اُس کی تحریر کو نظم و نثر یا نظم و شعر سے قریب تر ہونا چاہیے ؟ اور اگر انکشاف حقیقت میں جذبے کا عنصر حقیقت اور عقلیت کا عنصر نمایاں ہو تو اُسے اسی حیثیت کا طرز اختیار کرنا چاہیے۔

اس اعتبار سے وہ تحقیق جو شدید جذبات و احساسات کے ساتھ کی جاتی ہے اُس کا مقصود وہ موزونیت ہے جسے اُس کی اصطلاح میں حُسن کہتے ہیں لیکن جس تحقیق میں غلبۂ عقل

ہو اُس کا مقصود وہ مطابقت ہے جو منطقی استدلال سے موجودات کی ماہئیت میں صرف کی جاتی ہے اور جسے حکمت کی زبان علم و صداقت کے نام سے پکارتی ہے -

لیکن ذرا غائر نظر سے دیکھیے تو "موزونیت کا اظہار" خود ایک طرح کا عمل مطابقت ہے اور "مطابقت" بھی نام ہے "حسن و موزونیت" کی تشکیل و صورتگری کا ؟ اس لحاظ سے جذبے اور عقل کا طرز جستجو اور ان کی روشیں گو باہم جداگانہ ہیں مگر دونوں ایک ہی بے پایاں حقیقت کی طرف گرم عناں ہیں —

(اقبال)—ہر دو منزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل و حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

"ہندستانی" بغیر واؤ کے صحیح ہے

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ایم - اے - پی - ایچ - ڈی)

["ہندستانی" کے ہجوں پر "ہندستانی" بلا واؤ اور "تماہی" کا لفظ انجمن ترقی اردو کے اعزازی مصححوں نے اِس خیال سے تجویز کیا تھا کہ اکیڈیمی کے اردو اور ہندی رسالوں میں جس حد تک ممکن ہو باہم یکسانیت پیدا ہو سکے، اسے بعض لوگوں نے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا اور تعریض و تنقیص کا سلسلہ شروع ہو گیا -

ہمارے ادارہ کے معزز مدیر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم - اے پی - ایچ ڈی کے اِس مقالے سے معلوم ہوگا کہ "ہندستانی" بلا واو فارسی میں جائز ہے، اور جب بولنے میں "ہندستانی" کی ہیئت صوتی صاف صاف بلا واو کے معلوم ہوتی ہے اور ہندی میں بھی اِس کا تلفظ ایسا ہی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اردو اور ہندی میں اِسے ایک طرح کیوں نہ لکھا جائے -

"تماہی" کے بارے میں بھی ہمارے معزز کرمفرما نے ایک علحدہ مضمون مرحمت فرمانے کا وعدہ کیا ہے جسے ناظرین آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائینگے - مرتب]

"ہندستان" یا "ہندستانی" کے بلا واو لکھنے پر بعض صاحبوں کو اعتراض ہے - اُس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اردو بولنے والے عام طور پر اِس لفظ کا تلفظ مخصوص پیش کے ساتھ کرتے ہیں اور فصحا کی زبان پر بھی "ہندستان" اور "ہندستانی" ہے، گو کہ "ہندوستان" اور "ہندوستانی" بھی غلط نہیں - اِس لیے "ہندستان" اور "ہندستانی" صحیح ہے، اور "ہندوستان" اور "ہندوستانی" بھی -

شاید کچھ لوگوں کو اِس جواب سے اِس وجہ سے تشفی نہ ہو کہ اُن کے خیال کے مطابق فارسی میں "ہندوستان" ہی ممکن ہے، ہندیوں نے بیجا تصرف کر کے "ہندستان" بولنا شروع

کر دیا ۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے ۔
اِس لیے فارسی کی طرف رجوع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

فارسی میں بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ اُن میں آ ، وَ یا یَ لکھتے بھی ہیں اور حذف بھی کردیتے ہیں ۔ کچھہ لفظ ایسے ہیں کہ اُن میں وَ کے لکھنے کی ضرورت نہیں یا وَ لکھنا اُن لفظوں میں غلط ہے مگر کاتب اکثر اُن میں بھی وَ لکھہ دیا کرتے ہیں ۔ کاتبوں کے اِس غلط طرز عمل کا یہ اثر ہے کہ مخصوص طرز کتابت کی پیروی میں اردو میں بعض غلط لفظ رائج ہو گئے ہیں حالانکہ عوام کی زبان پر لفظ کا وہ تلفظ ہے جو فارسی کی رو سے صحیح ہے ۔ اِس کی بہترین مثال " دکان " ہے کہ اُس میں واو لکھنا بھی غلط ہے اور بولنا بھی ۔ اِس غلطی کی تکرار کتابت میں اتنی ہوئی کہ بہت سے لوگ " دکان " کو (جو صحیح ہے) عامیوں بلکہ جاہلوں کی بول چال سمجھنے لگے اور " دوکان " کا لفظ (جو قطعاً غلط ہے) اُن کی زبانوں پر بھی چل پڑا ۔ شاعروں نے اپنے کلام میں " دکان " کو راہ دی * جیسے —

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

متاخرین نے بھی " دکان " کہا —

دکاں بند کر کے رہا بیٹھہ جو
تو دی اُس نے بالکل ہی لُٹیا ڈبو (اسمعیل میرٹھی)

بعض لفظوں میں تلفظ کے لحاظ سے واو نہیں ہے ، صرف پیش کے ظاہر کرنے کو واو لکھتے ہیں اور اُسے " واو بیان ضمہ " کہتے ہیں یا

---

* فارسی شاعروں کے کلام میں اِس لفظ کی دو ہی صورتیں ملتی ہیں " دکاں " اور " دکّاں " جن میں دوسری صورت معرب ہے اگر کہیں " درکاں " لکھا ہوا ملتا ہے تو وہ کاتبوں کا تصرف ہے ۔ ایسے مقامات پر " دکاں " پڑھنا چاہیے ۔

"واو مسروق" کہ لکھا جاتا ہے پڑھا نہیں جاتا، جیسے خواجہ وغیرہ میں۔

کچھ لفظ ایسے ہیں جن کا تلفظ دونوں طرح صحیح ہے اور اِس لیے اُن کو کبھی واو کے ساتھ لکھتے ہیں کبھی بغیر واو کے؛ جیسے "اوستاد" و "اُستاد"۔ "اوستام" و "اُستام"۔ "اوفتاد" و "اُفتاد"۔ "اومید" و "اُمید"۔ "نوسدان" و "نُسدان"۔ "روستم" و "رُستم"۔

اِن لفظوں کی قدیم تر صورتیں وہ ہیں جن میں واو ہے اور وہ واو اصلی ہے۔ اِس لیے اہل لغت نے بلا واو کی صورتوں کو "مخفف" کہا ہے۔ صرف "نسدان" کے متعلق یہ سمجھ ہوسکتا ہے کہ اُس میں سے واو تعریب کی بنا پر گرا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خود ایران ہی کی زبان میں اور بہت سے لفظوں کی طرح "نوسدان" کا واو بھی گر گیا اور "نوسدان" کے پہلو بہ پہلو ایک ہم معنی لفظ "نسدان" قائم ہو گیا اور اُس سے مرکبات بھی بنے؛ جیسے "نسدان آہرو"، "نُسدان بیرا"، "نسدان دادہ"، "نسدان سرا"، "نسدان سرین" (موسیقی کی ایک لے)۔ یہ مرکبات کچھ نئے نہیں ہیں بلکہ پرانے ہیں اِس لیے خود "نسدان" اُن سے بھی پرانا ٹھہرتا ہے۔ "نسدان" کی مزید تخفیف ہوکر "نُسب" بنا؛ معنے وہی رہے جو "نوسدان" اور "نسدان" کے تھے۔ خود یہ مخفف در مخفف لفظ اِبتدا پرانا ہے کہ "نُسب" ایران کے ایک مقام کا نام بھی صدیوں سے چلا آتا ہے اور جب

---

* اِسی طرح دو لفظ ہیں کہ اُن میں ی بولتے اور لکھتے بھی ہیں اور نہیں بھی؛ جیسے "مہمان" و "مہمان"۔ "تیشہ" و "تش"، "نشتر" و "نشتر" وغیرہ۔

سنہ ۳۰ ھجری میں مسلمان فاتحوں نے سیستان کی طرف رخ کیا تو من جملہ اور مقامات کے بُست کو بھی فتح کیا * -

اِس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ خود "بست" ایک بہت پرانا لفظ ہے اور "بستان" لازماً اُس سے بھی پرانا - اِس لیے یہ ماننا قرین صحت ہوگا کہ جس زمانے میں عربوں کا تسلّط ایران میں ہوا اُس وقت دونوں صورتیں "بوستان" اور "بستان" فارسی زبان میں دوش بدوش استعمال ہوتی تھیں- یہ تمام قرائن اِسی بات کے ہیں کہ عربوں نے ایرانیوں سے "بستان" سُن کر اسے جیوں کا تیوں اپنی زبان میں لے لیا یا یوں کہیے کہ "بوستان" اور "بُستان" دونوں لفظ سنے اور دوسرے کو اختیار کیا، اِس لیے کہ وہ عربی زبان کے موافق پڑتا تھا-

لفظوں کو مخفف کرنے کی طرف فارسی زبان اِس قدر مائل رہی ہے کہ عربی لفظوں اور ناموں تک میں اکثر تصرّف ہوا - چونکہ فارسی لفظوں سے شروع کا الف گر گیا تھا؛ جیسے ابر سے بر اور اسوار سے سوار وغیرہ، اِس لیے ابوبکر سے بوبکر، ابوعلی سے بوعلی ہو گیا یہاں تک کہ ابو اسحاق سے بو اسحاق اور بو اسحاق سے بسحاق بن گیا - "بسحاق اطعمہ" کو کون نہیں جانتا -

یہی حال "ہندوستان" کا ہوا - پہلے "ہندستان" ہوا پھر "ہندسان" اِسی طرح "ہندو بار" سے "ہند بار" چنانچہ فارسی کے لغت نویسوں نے یوں لکھا ہے :-

(۱) "فرہنگ جہانگیری" (نولکشوری)، جلد ۲، صفحہ ۱۱۰ -

---

* دیکھو "فتوح البلدان" بلاذری، مطبوعہ لائیڈن سنہ ۱۸۶۶ ع - ص ۳۹۴، ۳۹۶ - ۳۹۷

"هندستان مصحف هندوستان است - اوستاد فرخی فرماید

گر ز خود تو سیمی نگردد بر رنگبار*

ور ز خسم تو سمومی در وزد بر هندستان

هندوان را آتش سوزنده روید شاخ رمح

رنگیان را شوسهٔ زرین بر آید جیر زان"

(۲) "بهار عجم" (نولکشوری، سنه ۱۹۱۶ع، جلد ۲، صفحه ۴۹۷ —

"هند - بالکسر و هند و بار و هند و زار و هندوستان دیار معروف - هندستان مصحف ان و آنرا سواد اعظم + نیز گویند و هندستان اعلب که در اصل هند اسپهان بود . که در هندی اصلی بمعنی مکان و ماوا است و برین قیاس عربستان و فرنگستان و مانند آن - اُستاد فرخی —

گر ز خود تو الخ -"

(۳) "برهان قاطع" —

"هندسان با سین بے نقطه، بر وزن هندوان، مصحف هندستانست و هندستان مصحف هندوستان -"

---

* اِن دونوں شعروں کا معنی یہاں "دیار عجم" کے مطابق دیا گیا ہے سوا لفظ "هندسان" کے - "جہانگیری" اور "بہار" دونوں میں "هندسان" ہے جو بحر میں نہیں سماتا، اِس لیے درست نہیں ("جہانگیری" میں (جو بہت ہی غلط چھپی ہے) اِن شعروں کا متن بھی غلط ہے؛ مثلاً "رنگبار" کے بجائے "جویبار" "حشم" کی جگہ "رحم" اور "زرین" کی جگہ "ارغوان" ہے -

+ ترکی والی چھاپے میں "عظیم" ہے جو صحیح نہیں - دیکھو "مصطلحات الشعراء" (وارستہ) معنی بخلاصۂ بہار عجم مطبوعہ سلطان المطابع، لکھنؤ، بہ تصحیح و توضیح مولوی جمیل احمد (۱۲۷۰ ہجری)، ص ۳۰۰، حاشیہ ۱ -

"برهان قاطع" کي اِس تشریح سے "جهانگیری" اور "بهار" کي عبارتیں صاف هوگئیں - اور اب پورے یقین کے ساتهه کہا جا سکتا هے کہ اُستاد فرخي کے شعر میں "هندساں" هي هے ، "هندستان" نہیں - "هندساں" شاعروں کے کلام میں زیادہ نہیں ملتا مگر اِس کا تو یقین هو گیا کہ چوتهی صدي هجری میں "هندساں" زبان میں داخل هوچکا تها ، اِس لیے "هندساں" (جس کا وہ مخفف هے) اُس سے بهی پہلے زبان میں رائج هوگیا هوگا -

شمس الدین محمد ابن قیس رازي نے فن عروض و قافیہ میں اپني لاجواب کتاب "المعجم فی معاییر اشعارالعجم" ساتویں صدی هجري کے اوائل میں لکهي - اُس میں قافیے کي بحث میں ایک مقام پر لکها هے —

"و بعضي ترکستان و هندستان بهم جائز داشتہ اند همچنانک † در هندبار و زنگبار گفتیم -" (ص ۲۱۱) -

جس عبارت کي طرف مصنف نے اشارہ کیا هے وہ یہ هے —

"و بعضي هندبار و زنگبار بهم روا داشتہ اند یعني هر ایک اسم ولایتي است - و قیاس آنست کی ، روا نباشد همچنانک † لاله زار و کشت زار -" (ص ۱۹۵) -

اِس سے پوري طرح ثابت هوگیا کہ ایران کے متقدمین شعرا "هندستان" (بلا واو) عام طور پر استعمال کرتے تهے -

---

* میرزا محمد ابن عبدالوهاب قزوینی کی تصحیح سے سنہ ۱۹۰۹ ع میں لندن اور لائیڈن سے شایع هوئی -

† قدیم رسم خط هے = "همچنانکہ -"

‡ قدیم رسم خط هے = "کہ" -

ان اقتباسوں کے بعد اس کی ضرورت نہیں کہ شاعروں کے کلام سے سوانحہ نویس کیسے کیسے نتائج نکالیں مگر ایک دوست نے مجھے لکھا کہ فردوسی اور سعدی نے تو "ہندوستان" (واو کے ساتھ کہا ہے) - ایک اور صاحب سعدی کے "بوستان" سے یہ مصرعہ نقل فرماتے ہیں -

"کہ سوختی تحویل بہ ہندوستان"

فردوسی کا مصرعہ بھی یاد ہے -

"کہ تا بنگل بہ دو بہ ہندوستان"

اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے کہیں نہیں کہا کہ "ہندوستان" (مع واو) کا وجود ہی نہیں - فردوسی کے شاہنامے میں کئی ہزار شعر ہیں، ایک مثنوی "یوسف و زلیخا" بھی فردوسی کے نام سے مشہور ہے مگر بحر تو فردوسی کی ایک بھی ہے - سعدی کی بوستان بھی اسی بحر (متقارب) میں ہے - اس بحر میں "ہندوستان" سمانے کی جگہ نہیں ہے - "ہندوستان" کا لفظ دو - تین رباعیوں وغیرہ کا مضمون اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ان میں "ہندوستان" یا "ہندوستان" کو ڈھونڈنا عبث ہے - اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ جب کوئی شاعر ہمارے ملک کا نام لینا چاہتا ہے تو بطور اختصار پہلے "ہند" یا "ہندو" کہتا ہے پھر بحر میں کھپ جاتا ہے - فارسی شاعروں کے ہاں کہیں کہیں خصوصاً قافیے کی ضرورت سے "ہندو" یا "ہندو" اور "ہندوار" کے صیغے ملتے ہیں - "ہندوستان" کا وجود طویل ہونے کے سبب بحروں میں سما نہیں اور اکثر قافیہ ہوا ہے جیسے فردوسی اور سعدی کے شعروں میں جن کے مصرعے اوپر نقل ہو چکے ہیں ورنہ اس کے "ہندوستان" بہت کثرت سے فارسی شاعروں نے نظم کیا ہے - ہم نے یہ مثالیں اکٹھا کر کے شمار کی ہیں تو "ہندوستان" ہی کا نام زیادہ رہتا ہے -

تھوڑي سی مثالیں مختلف شاعروں کے کلام سے حاضر ھیں :—

۱ - ابو سعد ابن مسعود ابن سعد ابن سلمان لاھوري * جس نے سنہ ۵۱۵ ھجري کے بعد وفات پائی ، پانچویں چھٹي صدی ھجری کے سربرآوردہ سخنوروں میں تھا - آزاد بلگرامي نے * '' خزانۂ عامرہ '' میں انتخاب اُس کے کلام کا دیا ھے پانچ ساڑھے پانچ صفحے سے زیادہ نہیں - اُس میں بھي ' ھندستان '' تین جگہ آیا ھے اور '' ھندوستان '' کہیں نہیں ' گو کہ انتخاب ایسي بحروں میں سے بھي ھے جن میں '' ھندوستان '' کھپ جاتا ھے - وہ تین شعر یہ ھیں —

(۱) دخترے خرد دارم و پسرے
تا دو جواھر ''یوم ھندستان'' - (خزانۂ عامرہ ، ص ۱۵)

(۲) خرام کرد میان دیار ھندستان
گذشت رایت عالی ز گنبد دوار (خزانہ ، ص ۱۷)

(۳) بر سفال اے بہار ھندستان †
اے بتاب از تلاے تا بستان (خزانہ ، ص ۲۰)

۲ - مولانا نظامي گنجوي کی مثنوی '' شیریں و خسرو '' ‡ کا قصہ ھندستان سے تعلق نہیں رکھتا پھر بھي اُس کا نام کہیں کہیں آ گیا ھے - بحر ایسي ھے جس میں '' ھندوستان '' اور

---

* ثولک ورک - نولکشور اشاعت - سنہ ۱۹۰۰ع

† اِن تینوں شعروں میں علمي سے '' ھندستان '' چھپا ھے - کتاب میں چھاپے کی غلطیاں بہت ھیں -

‡ اِس کا جو نسخہ میرے سامنے ھے - وہ نہایت خوش خط ھے - مطبع کا نام یا چھپنے کا سال کہیں درج نہیں - خط کی شان ایرانی ھے غالباً ایران ھي کا چھپا ھوا ھے کتابت کي غلطیاں کہیں کہیں نظر پڑیں -

'' ھندستان '' دونوں کي گنجائش ھے مگر صرف ایک جگہ '' ھندوستان '' ، اور ایک جگہ '' ھندوستاني '' - ملا وہ بھي قافیے میں - بخلاف اِس کے '' ھندستان '' چار جگہ آیا ھے . -

(۱) گرش باید نیک فتح الٰہي

ز ھندستان فرو شوید سپاھي (ص ۱۳)

(۲) در آمد قاصدي از رہ بہ تعجیل

ز ھندستان حکایت کرد باطل (ص ۶۸)

(۳) مرا چون کر کنن سینہ جہ خاری ؟

بداد دیلِ ھندستان جہ آري (ص ۱۴۰)

(۴) بہ ھندستان حقیقت می دوانندی

غلط شد رہ بباطل باز ماندي (ص ۲۰۲)

۳ - حضرت امیر خسرو کي مثنوی '' دول رانی خضر خاں '' بھي ھرج مرج میں ھے جس میں لفظ کي دونوں صورتیں آ سکتي ھیں - سر سری نظر سے دیکھنے - '' ھندوستان '' کو چار ھي پانچ جگہ نظر پڑا ، اُس میں سے بھي ایک جگہ '' ہندستان '' کا قافیہ واقع ھوا ھے -

---

سپاھي توتیاے جسم از آنست - کہ فراس رد ھندوستانست - (ص ۲۳۷)

† مخطوطہ ملتي ھندوستاني - جو رز د ت آمدہ در زند خواند - (ص ۱۶۲)

‡ صفحہ ۱۷ پر دیو بھي مصرع مصنف مصرع کے ساتھ آیا ھے صرف دوسرے مصرعے میں فرق ھے —

فرو رفت ز ھندستاں سپاھی —

§ کتاب میں '' خواری '' ھے جو درست نہیں - یہ کاتبوں کي عام غلطي ھے جیسے '' درخاستن '' آرزو کرنا ' کے لئے '' در خواستن '' لکھہ مارتے ھیں -

‖ مولانا رشید احمد انصاری صاحب سالم مرحوم کي تصحیح و ترتیب سے سنہ ۱۹۱۷ء میں علي گڑھ سے طبع ھوئي -

'' ہندستان '' نو جگہ ملا اور کہیں قافیے میں نہیں -
ملاحظہ ہو :—

(۱) کسی کو گنگ ہندستان بود دور
ز بدل و دجلہ لاف ، ہست معذور (متن ، ص ۴۳)

(۲) دول رائی کہ ہست اندر زمانہ
ز طاؤسان ہندستان نگانہ (متن ، ص ۴۴)

(۳) از آن سلطان غازی بے مدارا
بہ ہندستان زد اسلام آشکارا (متن ، ص ۴۸)

(۴) چنان کو ز آہن سمندر ساختی
ز دود از رخی ہندستان ساختی (متن ، ص ۴۸)

(۵) از آن پس سال چندین را بہ زندہ بود
کہ زوراوند و ہندستان یکی بود (متن ، ص ۶۲)

(۶) کنون از فتح ہندستان دہم شرح
دہم ذکر ایاز کو ساست را طرح (متن ، ص ۶۳)

(۷) و بدل ہم ز ہندستانست وردی
کہ از نام عرب بند شہر کردی (متن ، ص ۱۳۲)

(۷) سہ گونہ رنگ ہندستان زمین است
سیاہ و سرخ و گندم گون ہمین است (متن ، ص ۱۳۴)

(۹) بہ سمی قاف ترکستان درندہ
بسوئی ملک ہندستان خزندہ (متن ، ص ۲۲۲)

۴ ـ اشرف ماربدرانی کہتا ہے ـــ

داد از رانیان ہندستان

نِ ہندستان (''چراغ ہدایت'')

۵ ـ میر عبدالجلیل بلگرامی نے نواب امین الدولہ کے بیٹے ارشاد خاں کی شادی پر ایک مثنوی کہی تھی جس کے چند شعر ''خزانۂ عامرہ'' میں نقل ہوئے ہیں ـ اُن میں سے ایک شعر یہ ہے ـــ

چو داماد آن عروسِ شرمگین دید

بہندستان نگارستانِ چین دید (''خزانۂ عامرہ'' ص ۳۹+)

۶ ـ میر غلام علی آزاد بلگرامی کا شعر ہے ـــ

خطِ مشکین خال رخسارِ ترا بر سر رسید

فوجِ ہندستان بہ تسخیرِ ملکِ عنبر رسید (ایضاً، ص ۱۳۲)

۷ ـ آنند رام مخلص بھی بڑے پائے کے شاعر تھے، کہتے ہیں :ـــ

بر دلِ ما تیرہ روزان زان صفت مژگان گذشت

آنچہ از فوجِ دکن بر ملکِ ہندستان گذشت (ایضاً ص ۴۲۶

''ہندوستانی'' اور ''ہندستانی'' شعر میں دونوں بہت کم دکھائی دیتے ہیں ؟ اِس لیے کہ ''ہندی''، ''ہندوی''، ''ہندوانی'' ''مہنّد'' زیادہ آسانی سے شعر میں کھپتے ہیں اور ''ہندوانی'' اور ''مہند'' ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں، ''ہندوستانی'' اور ''ہندستانی'' کی نوبت کم آئی ہے ـ شواہد کی چنداں ضرورت بھی نہیں، ''ہندستان'' کے شواہد کافی تعداد میں دیے جا چکے

+ کتاب میں اِس جگہ غلطی سے ''ہندوستان'' چھپا ہے جو بحر میں قلاقل ڈالتا ہے ـ

اور ادب پر اُن کے لکچروں کا مجموعہ ہے - کتاب کا پہلا حصہ اِن لکچروں کا مقدمہ ہے؟ جس میں فارسی زبان کی تاریخ سے بحث کی ہے؟ دوسرے حصے میں گیارہ لکچر ہیں - دوسرے لکچر کے عنوان پر ''۱۹ فروری ۱۸۷۲ ع'' درج ہے اور یہی تاریخ تیسرے لکچر پر بھی ہے - چوتھے لکچر کے عنوان پر ''یکم مارچ ۱۸۷۷ ع'' لکھا ہے - اور کسی لکچر پر کوئی تاریخ درج نہیں - اِن تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن لکچروں کا سلسلہ سنہ ۱۸۷۲ ع میں یا شاید اُس سے کچھ پہلے شروع ہوا اور کئی برس جاری رہا - جیسا کہ کتاب کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے - ایران کے سفر سے واپس آکر مصنف نے لکچروں پر نظر ثانی کی اور سنہ ۱۸۸۷ ع میں کتاب چھپنے کے لیے تیار ہوگئی - مگر کتاب کے پہلے حصے کے شایع ہونے کی نوبت سنہ ۱۸۹۸ ع میں آئی - اِس اشاعت کا اہتمام آزاد مرحوم کے شاگرد مولوی سید ممتاز علی صاحب مالک مطبع رفاہ عام ؟ لاہور نے اپنے '' دارالاشاعت '' سے کیا - دوسرا حصہ الگ نہیں شایع ہوا بلکہ پوری کتاب ایک ہی جلد میں منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام ؟ لاہور میں چھپ کر سنہ ۱۹۰۷ع میں شایع ہوئی - مصنف اُس وقت حیات تھے - اِس مکمل کتاب کی لوح ایک ہی ہے مگر ہر حصے کے صفحوں کا شمار الگ الگ ہے - پہلے حصے کے ۱۰۶ صفحوں میں جہاں '' ہندوستان '' یا '' ہندوستانی '' کا لفظ آیا ہے واو کے ساتھ ہے - دوسرے حصے کے دوسرے صفحے پر بھی (جو مضمون کے اعتبار سے پہلا صفحہ ہے) - پہلی ہی سطر میں '' ہندوستان '' کا لفظ آیا ہے وہ بھی واو کے ساتھ ہے - لیکن اُس کے بعد سے

"هندستان" اور "هندستاني" بغیر واو کے هے؟ سوا صفحه ۸۵ کے جهاں پھر "هندوستان" هے، اُس کے بعد پوري کتاب میں بغیر واو کے - صفحه ۲ پر "هندوستان" کے هونے کا سبب غالباً یه هے که کاتب پہلے حصے میں جس طرح لکھتا چلا آیا تھا قلم سے اُسي طرح نکل گیا - صفحه ۸۵ پر ظاهرا مجمص سهو قلم واو کا دمه دار تھا - ایک امکان یه بھی هے که جس اصل قلمي نسخے سے کاتب نے لکھا اُسی میں اِن دونوں جگهوں میں زیر بحث لفظوں کا املا واو کے ساتھه هو - اِس صورت میں ممکن هے که مصنف هي کا سهو قلم هو -

اِن دو موقعوں کے سوا دوسرے حصے کي حالت یه هے که اُس کے ۳۱۵ صفحوں میں خود مصنف کی عبارت میں جہاں کہیں یه لفظ آیا هے "هندستان" یا "هندستانی" (بغیر واو کے) لکھا هوا هے - البته جہاں کہیں کسي دوسرے مصنف کی کوئی عبارت نقل کي گئی هے اور اُس میں "هندوستان" آ گیا هے وه التزاماً واو کے ساتھه نقل کیا گیا هے - شمار کیا تو حوالیس (۴۴) جگه "هندستان" اور بائیس جگه "هندستاني" ملا - یه بات بھي خاص توجه کے قابل هے که من جمله حوالیس کے چار جگه فقرے کا پہلا لفظ "هندستان" هے اور جلي قلم سے بغیر واو کے لکھا هوا

---

* صفحه ۷۴ پر جو عبارت "تورک تیموري" سے نقل کي هے اُس کی پہلی تو سطروں میں چار جگه "هندوستان" آیا هے - صفحه ۷۶ پر شرف الدین علی یزدي کے "ظفر نامۂ تیموري" کی عبارت کا نمونه دیا هے جس میں دو بار "هندوستان" آیا هے - اِن تمام اقتباسوں میں واو کو حذف نہیں کیا هے - صفحه ۲۹۴ پر درجي کا یه شعر نقل هوا هے جس میں بحر کی وجه سے واو ضروری تھا —

"بهندوستاں آنچه تو پار کردي - در اهل سلاسل نه کرد است حذر"

یه خاص اهتمام مجمص کاتب کي رائے پر مبني نہیں هو سکتا —

ہے (ص ۷۱ ، ۸۶ ، ۹۳ ، ۹۵) - آگے چل کر صفحہ ۲۳۸ پر دسواں لکچر شروع ہوتا ہے - اور لکچروں کی طرح اِس لکچر کی سرخی بھی بہت ہی جلی نام سے لکھی ہوئی ہے - وہ سرخی یہ ہے —

"فارسی در ہندوستان میں آکر کیا کیا رنگ چڑھے -"

کتاب کا یہہ رنگ دیکھہ کر یقین ہو گیا کہ دوسرے حصے میں واو التزاماً حذف کیا گیا ہے مگر یہ سمجھہ میں نہ آیا کہ پہلے حصے میں یہ التزام کیوں نہیں کیا گیا - معاً خیال اِس طرف گیا کہ اکیلا پہلا حصہ ایک بار پہلے بھی چھپا تھا - چنانچہ "دارالاشاعت" والا نسخہ دیکھا تو اُس میں ہر جگہ واو پایا - یہی احتمال ہوا کہ دوسری اشاعت کے لیے جب کتابت ہوئی تو پہلا حصہ کاتب نے "دارالاشاعت" والے نسخے سے نقل کیا اور دوسرا حصہ غالباً مصنف کے مسودے سے - اب قطعی شہادت کی ضرورت ہوئی -

دوسری اشاعت کی لوح اور خاتمہ پر کاتب کا نام تھا جس سے معلوم ہوا کہ پوری کتابت کی کتابت منشی محمد اسد اللہ صاحب آسیوئی نے فرمائی ہے ، جو لاہور کے نامور خوش نویس ہیں - مخدومی مولانا خلیل الرحمان صاحب نے مجھہ پر کرم فرما کر منشی صاحب ممدوح کو لکھا کہ دوسرے حصے میں "ہندستان" اور "ہندستانی" (بلا واو) اُنھوں نے محض اپنی رائے سے لکھا یا کسی نے اُن کو ہدایت کی تھی کہ یوں لکھا جائے - اِس استفسار کے جواب میں جو خط منشی محمد اسداللہ صاحب نے مولانا خلیل الرحمن صاحب کو لکھا * اُس کے وہ حصے جو اِس بحث سے متعلق ہیں یہ ہیں —

---

* یہ خط منشی صاحب کے ہاتھہ کا لکھا ہوا ہے جو اُنھوں نے لاہور میں ۲۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ ع کو تحریر کیا -

"سخندان فارس" آزاد صاحب کی زندگی میں لکھا - اُنہوں نے کوئی ہدایت نہیں کی - صرف لکچر کے مرکز کی بابت کہا کہ اِس طرح (لکھو) لکھو، یا جب کاپی دیکھی ہاتھ اُٹھا کر دعا دی؟ اور بس - مضمون آزاد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اور بہت صاف اور خوشخط تھا، جگہ جگہ جیبیاں لگی ہوئی تھیں - آغا صاحب† نے کوئی ہدایت نہیں کی تھی اور نہ عبارت میں کوئی تصرف کیا، بالکل اصل کے مطابق رکھا، نہ میں نے کسی طرح کا رد و بدل کیا آزاد صاحب نے اکثر جگہ سنئے؟ دفینے وغیرہ کو (سنہ؟ دفینہ) لکھا؟ اُسی طرح میں نے لکھا - ابتدا میں سخندان فارس؟ حصہ اول میر صاحب‡ نے چھپایا اُس کے بعد آغا صاحب نے دونوں حصے یکجا چھپائے - میری عادت ہے کہ جس طرح کا مضمون ہو اُسی طرح لکھنے کی کوشش کرتا ہوں - صحت کی حالت میں§ مصنف جس طرف چاہے اور جو مناسب سمجھے بنوائے؟ بنا دیتا ہوں -

---

† یہ ہدایت ظاہرا صرف پہلے لکچر کی سرخی کے متعلق تھی جس میں لکھو کے لفظ کے کاف کا مرکز سیدھا نہیں ہے، لمبت دار ہے - واقعی سیدھا مرکز اِس جگہ اور بن گیا ہوتا - (دیکھو حصہ ۲ صفحہ ۲) -

† آغا صاحب سے مراد ہیں آزاد مرحوم کے بھتیجے آغا ابراہیم صاحب -

‡ میر صاحب یعنی سید ممتاز علی صاحب مالک دارالاشاعت لاہور -

§ یعنی کاپیوں کی تصحیح کے وقت -

حصۂ اول میں بے چھپے ہوئے سے نقل کیا ؟ جو میر صاحب نے چھپایا اور محبوب عالم کاتب مرحوم نے لکھا تھا ۔ اور دوسرا حصہ اصل مضمون سے نقل کیا اور جس طرح کا مضمون میرے سامنے تھا اُسی طرح میں نے لکھا ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر میں نے پہلے حصے میں بڑھایا تو دوسرے حصے میں کیوں نہ لکھا ۔ یہی خیال آتا ہے کہ جس طرح مضمون میں تھا اُسی طرح میں نے لکھا ۔ نہ اِس کی کوئی ہدایت بھی نہ میں نے از خود لکھا ، جیسا تھا ویسا لکھہ دیا ۔ "

کاتب کتاب کی اِس تحریر کے بعد اِس میں شک کی گنجائش نہیں کہ آزاد مرحوم نے " ہندستان " اور " ہندستانی " التزاماً بغیر واو کے لکھا اور وہ اِنھیں صورتوں کو فصیح جانتے تھے ۔ اِس دلیل کے اور لفظوں کی بھی وہی صورتیں آزاد مرحوم نے پسند کی ہیں جو عام طور پر اردو کی بول چال میں رائج ہیں چنانچہ " ہسیار " اور " ہسیاری " کو بھی بغیر واو کے لکھا ہے ۔

(۱) " کیونکہ وہ [بادشاہ] پاسبان ہے ۔ پاسبان کو ہسیار رہنا چاہیے ۔ " (ص ۲۵ ۔ ۱۲۴) ۔

(۲) " لشکر دار کے حکم سے افسر بین دفعہ آ کر دیکھہ جاتا تھا کہ پہرہ پر ہسیار ہیں یا نہیں ۔ " (ص ۱۲۶)

(۳) " درندے جانوروں کو سامنے گھدرا لائے ۔ اور اُسی ہشیاری سے روکے کہ ایک جانور بھی نکلنے نہ پایا ۔ " (ص ۱۳۸) ۔

اِن کے سوا اور بھی بہت سے لفظ اِس کتاب میں اُسی صورت میں پائے جاتے ہیں جس طرح اردو کی بول چال میں سنائی دیتے ہیں ۔

انگریزی دانی کے اثر سے اب اکثر لوگ "سر" بولتے اور لکھتے ہیں لیکن حضرت آزاد علیہ الرحمہ نے اپنی دراپی زبان کو بگڑنے نہیں دیا ۔ فرماتے ہیں :—

"رفتہ رفتہ رئیس سمند چودھری یا لمبردار یا سردار قبیلہ کو کہنے لگے" ۔ (ص ۱۲۹) ۔

فارسی جاننے والے اصرار کرتے ہیں کہ "خربزہ" اور "تربز" لکھو مگر فارسی کے اِس محقق کا قلم اردو تحریر میں یوں گُہر ریز ہوتا ہے —

"حجروں میں انگور، خربوزے، تربوز لٹکائے ہیں کہ قندیلیں قمقمے نظر آتے ہیں" ۔ (صفحہ ۱۸۵) ۔

"عزیزانِ وطن ! جب تک ممالک سرد سیر میں رہ کر موسموں کی حالتیں آنکھوں سے نہ دیکھی ہوں اکثر کتابوں کے خاص، خاص مقاموں کا مزا نہیں آتا ۔ ہ (ص ۱۸۷)

یہ عمل ہے اُن بزرگوں کا جو جانتے تھے کہ اردو کیا ہے اور زبان کسے کہتے ہیں ۔

---

* اِنتقاد

(نتیجۂ فکر جناب حوش ملیح آبادی)

یہ نظم نا تمام و نا مکمل حالت میں مدت ہوئی طبع ہوچکی ہے لیکن اب مکمل و مربوط کر کے آپ کی خدمت میں روانہ کی گئی ہے — "حوش"

رحم اے نقّادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو!
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو؟
شاعری اور منطقی تحقیق یہ کیسا فتنۂ عام؟
کُرسیِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام!
کیوں اُٹھا ہے جنس شاعر کے پرکھنے کے لیے؟
کیا شمیمِ سنبل و نسرین ہے چکھنے کے لیے؟
آہ اے نادان! تجھے آتا نہیں یہ بھی خیال
رنگ ہے نوعِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال
منطقی کانٹے نہ رکھتا ہے کلامِ دل پذیر!
کاش اس نکتے کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر
لب کو پھر انتقاد اک لَے سے کُھلنا چاہیئے
پنکھڑی در قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیے!
شعر فہمی کے لیے ہیں جو شرائط بیشتر!
سوچ تو دورا اُترتا بھی ہے اُس معیار پر؟
جلنے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا روئے داغ
آنچ سے جس کی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ؟

---

* جناب حوش ملیح آبادی نے یہ نظم ادبی کانفرنس کے لیے مرحمت فرمائی تھی۔

دل سے اے دوجھ او ردائے علمِ کتاب
حسن مطلق کو بھی دیکھا ہے در افگندہ نقاب ؟
تو بتا اسرار ہستی کا لگایا ہے کبھی ؟
عالمِ محسوس سے باہر بھی جایا ہے کبھی ؟
کیا وہاں بھی اُڑ کے پہونچا ہے کبھی اے نکتہ چیں
جس فضا میں کانپتا ہے سپہرِ روح الامیں ؟
خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دُھنتا ہے تو ؟
قلب فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو ؟
اُن بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے بارياب ؟
خاک کو جن کے تبسم نے بنایا ہے گُلاب
طور معنی پر بھی او نا فہم چڑھ سکتا ہے تو ؟
کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو
یہ نہیں ، تو پھر لے آنکھیں ، یہ جلوہ اور ہے
تیری دنیا اور ہے ، شاعر کی دنیا اور ہے
شعر کی تحلیل سے پہلے مری تقریر سُن
خود زبان شاعری سے شعر کی تفسیر سُن:-
دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار
نطق پر تو پندرہ تک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ، پرکیفِ ادب
ڈھل کے پھر وہ گوہرِ غلطاں کا پانی ہے لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخش تاج زر فشاں ،
پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں
جن کے اسرارِ درخشاں روح کی منزل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں تہ ، موتی دل میں ہیں!

شاعری کا خاساں ہے نطق کا لوتا ہوا
اس کا شبسہ ہے زباں کی تہبس سے توتا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دل سر سار پر
توت کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر
رہتے ہیں بیدار دل کی محفلِ خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں
جن کے جاں پرور اثر سے دل ہیں سب پکڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے
شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال
سانس کی گرمی سے ہو جاتا ہے اس شیشے میں بال
نُطق سے خدمت ہو کیونکر سرِّ موجوداں کی؟
خامشی تفسیر ہے باریک محسوسات کی
اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی بولے "کائنات"!
شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ نا تمام
مشتبہ سا اک اشارہ، ایک مبہم سا کلام!
نشّے میں اک لغزشِ نا کلک گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی!
بے حقیقت لَے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارضِ محدود پر سایہ سا لا محدود کا!
ظُلمتِ اجمال میں تنویر تفصیلات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرّات کی!
جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹتا رنگیں ستارے کا اندھیری رات میں!

شعر کیا؟ کچھ "سوچنا" دل میں بےلطف دل بستی
شعر کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا "نہیں"!
شعر کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ خیال
شعر کیا؟ عشق اور حکمت کا "مقامِ اتصال"!
شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گُل پر، بیند میں، شبنم کے گرنے کی "صدا"!
بر ردائی اور خاموشی کی باہم "گفتگو"
لفظ و معنی میں توازن کی مسلسل "آرزو"!
بحر میں حسنِ قمر کی اک اُچٹتی سی صدا
جھانکنا فطرت کے روزن سے عروسِ بحر کا!
مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ بارک ہے، آ سکتا نہیں
تو سمجھتا ہے جو کہنا چاہیے تھا، کہہ گیا
پوچھ یہ شاعر سے وہ کیا کہہ سکا، کیا رہ گیا؟
کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں، اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں!

تبصرے

نورالغات کی خامیاں

(از حضرت نثار فتحپوری)

اکثر و بیشتر مجھ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ اس وقت سب سے بہتر لغت اُردو زبان کا کون ہے اور میں ہمیشہ اس کا جواب یہی دیتا ہوں کہ اگر "سب سے بہتر" کا مفہوم "کمتر غلط" ہے تو بیشک کوئی رائے دیجا سکتی ہے ، لیکن اگر اس سے مقصود کسی ایسے لغات کا معلوم کرنا ہے جو واقعی سند و استناد کی ضرورت کو پورا کر سکے ، تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان میں یہ اپنی بڑی کمی ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے ۔ تعلیم یافتہ و مہذّب ممالک میں لغت نام ہے ایک ایسی کتاب استناد کا جو اصطلاحی و لغوی تراکیب کا فیصلہ کرنے والی سمجھی جاتی ہے اور اس کا فیصلہ ، "لفظ آخریں" کی حیثیت رکھتا ہے ۔ لیکن ہمارے یہاں لغت نام ہے ایک ایسے مجموعہ کا جس میں بغیر کسی تحقیق و کاوش کے مختلف کتابوں اور لغتوں سے بہت سے الفاظ و محاورات چن لیے جائیں اور یوں ہی بلا چھان بین کیے ان میں نقل کر دیا جائے ، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اغلاط سے پُر ہوتا ہے اور سند ہونے کی حیثیت سے گرا ہوا ۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہاں اس اہم کام کی ذمہ داری صرف ایک شخص پر نہیں ہوتی ، بلکہ پوری جماعت اس کو مرتب کرتی ہے اور جب تک ایک ایک لفظ پر کافی غور نہیں کر لیتے اور اساتذۂ وقت سے استصواب کر کے باہم تبادلۂ خیالات و بحث و نقد کے بعد

پورا اطمینان حاصل نہیں کر لیتے اُس وقت تک اس کو درج نہیں نہیں کرتے ۔ بر خلاف اس کے یہاں اس کام کو صرف ایک شخص انجام دیتا ہے اور وہ بھی اس قدر جلدی جلدی کہ دوسرے کو خبر کیا ' خود اپنے آپ سے بھی مشورہ کرنے کی مہلت نہیں ملتی ۔

اس وقت تک اُردو میں صرف ایک لغت امیراللغات ایسا تھا جس کی ترتیب کے لیے ایک سے زائد آدمی معین ہوئے تھے ' لیکن افسوس ہے کہ تکمیل سے قبل ہی وہ انجمن درہم برہم ہو گئی اور یہ اہم کام انجام کو نہ پہونچ سکا ۔

فرہنگ آصفیہ کو اُردو لغتوں میں خاص شہرت و اہمیت حاصل ہے ، لیکن اول تو وہ اب دستیاب نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ وہ بھی انفرادی سعی کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے اسقام و اغلاط سے معرا نہیں ہے ۔

حال ہی میں مولوی نورالحسن صاحب نیر کاکوروی نے نوراللغات کے نام سے ایک اُردو لغت کئی جلدوں میں شایع کیا ہے اور اِس میں کلام نہیں کہ اُنھوں نے اپنی عمر کے اُس حصہ میں جب انسان مشکل ہی سے کسی کام کرنے کا اہل رہجاتا ہے اور ایسے زمانہ میں جب کہ قدر شناسی کے فقدان کی بھی عام شکایت کی جاتی ہے ؟ ایسا ضخیم و بسیط لغت تیار کر کے اپنی قوت عمل اور احساس فرض کا پورا ثبوت دیا ہے ؟ لیکن جس وقت ہم اُس پر ایک قابل استناد لغت ہونے کی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں ؟ تو ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی اُن تمام نقائص سے پاک نہیں ہے جو دوسرے لغتوں میں پائے جاتے ہیں ۔

ہمارا مقصود اِس مضمون سے یہ نہیں ہے کہ ہم مؤلف نوراللغات کی محنت کی اہمیت کو کم کریں اور نہ ہم ایسا

کر سکتے ہیں ؟ کیوں کہ جتنا اور جیسا کام اُنھوں نے کیا ہے وہ یقیناً ہر شخص کے بس کا نہ تھا اور دوسرے سے شاید اتنا بھی ممکن نہ ہوتا لیکن جس حد تک صحیح تنقید کا تعلق ہے ؟ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ابھی اِس میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے اور اگر کبھی دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت آئے جس کی بظاہر کوئی اُمید نہیں تو اِن اغلاط کو تو ضرور رفع کر دیا جائے جو بہت نمایاں طور پر اس میں نظر آتی ہیں -

نوراللغات میں مختلف قسم کی غلطیاں نظر آتی ہیں کہیں تو سرے سے معنے ہی غلط دے گئے ہیں اور کہیں توجیہہ و تمثیل نا درست ہے ؟ اِس کے ساتھ تضاد بیان بھی پایا جاتا ہے اور تطویل بیجا بھی - ہم نے سرسری طور پر صرف الف اور آ کی ردیف پر نگاہ ڈالی ہے اور اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پوری کتاب میں کتنی غلطیاں ہوں گی اور کس کس قسم کی - پہلے ہم نوراللغات کی عبارت جلی قلم سے نقل کرینگے اور اِس کے بعد خفی قلم سے قوسین میں اپنا اعتراض پیش کرینگے -

آر — ایک نوک دار لوہا جو کوڑے میں لگاتے ہیں -

(آر ؟ باریک میخ کا نام ہے جو بیلوں کے ہانکنے کی لکڑی میں لگائی جاتی ہے - کوڑے میں کبھی آر نہیں لگائی جاتی - بعض لوگ یہ ضرور کرتے ہیں کہ اِس لکڑی میں چمڑے کے دو تسمے بھی باندھ دیتے ہیں اور اِس کی صورت کوڑے کی سی ہو جاتی ہے) -

آر پار — اُس سوراخ کی نسبت کہتے ہیں جو ایک طرف سے دوسری طرف ہو جائے - فصحا وار پار بولتے ہیں -

(فصحا کبھی وار پار نہیں بولتے بلکہ ہمیشہ آر پار ہی استعمال کرتے ہیں ؟ چنانچہ خود صاحب نوراللغات نے لفظ پھمبا کی تشریح کرتے ہوئے

آر پار کا لفظ استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو نوراللغات جلد ۱، صفحہ ۶۹۴ -)

بد وضع—ناموزوں - نامناسب -

(اُردو میں یہ لفظ اوباش کے معنے میں مستعمل ہوتا ہے - نہ کہ ناموزوں و نامناسب کے معنے میں - صاحب نوراللغات نے اس معنے میں اس کو فارسی کا لغت قرار دیا ہے ' حالانکہ یہ درست نہیں -)

بدن پھوٹ جانا—بدن میں زخم ہو جانا (مثال) چاہے اپنی لونڈی ہو چاہے غیر کی ، آپ نے مارا کیوں اور پھر اس طرح کہ لہولہان ہوگئی ، سارا بدن پھوٹ گیا -

(مؤلف نے یہ مثال خود وضع کی ہے جو غلط ہے - بدن پھوٹنا اس وقت کہتے ہیں جب کسی کسنہ یا گرم دوا ، یا آتشک و جذام کی وجہ سے جسم میں دانے یا زخم نمودار ہو جائیں - محض ضرب کی وجہ سے جسم کا زخمی ہو جانا بدن پھوٹنا نہیں ہے -)

برج کبوتر—اوران میں بلند خانہ دار عمارت کبوتروں کے واسطے جنگل میں بناتے ہیں — کبوتر کی دھابلی -

(برج کبوتر کے معنے صحیح ہیں - لیکن دھابلی کہہ کر غلط کر دیا کیونکہ دھابلی لکڑی کی بنتی ہے اور بلند عمارت سے متعلق نہیں ہوتی - خود انھوں نے دھابلی کے معنے بنائے ہوئے کبوتروں کے رہنے کا دربا بیان کیے ہیں ، حالانکہ دربا اور دھابلی دونوں بالکل جدا چیزیں ہیں -)

برفانی پہاڑ—وہ پہاڑ جو برف سے جمے رہتے ہیں -

(یوں کہنا چاہیے کہ وہ پہاڑ جن پر برف جمی رہتی ہے -)

بڑا گھر—معنی بمعنی ۵ پاخانہ -

(بڑا گھر کبھی پاخانہ کے معنے میں مستعمل نہیں ہوتا - جیل خانہ کے معنے میں البتہ عوام کی زبان پر ہے -)

بڑائی کرنا — معنی ۱۰۰ خود ستائی کرنا -

(خود ستائی کے معنی صرف اس وقت پیدا ہوں گے جب کوئی اشارہ بنی داب کے طرف ہو - صرف بڑائی کرنا خود ستائی نہیں ہے -)

بڑھنا — پھیلنا ، اُگنا ، نمو ہونا -

(اول و آخر معنی صحیح ہیں - اُگنے کے معنے میں اس کا استعمال نہیں ہوتا سند میں داغ کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے -

گھٹ کے یوں حواسِ دل شام و سحر بڑھتی ہے

جس طرح ہو کے تمام شاخ شجر بڑھتی ہے

حالانکہ اس شعر میں بھی بڑھنے کے معنے اُگنے کے نہیں ہیں -)

بزرگوں کا تھیکرا — معنی ۱۰۰ موروثی مکان -

(مکان کی تخصیص صحیح نہیں - ہر موروثہ یا مسکونہ جائیداد جو بزرگوں سے چھوڑی ہو اور راہ انکسار بزرگوں کا تھیکرا کہلاتی ہے)

بطن الوادی — پہاڑ کا اندرونی حصہ -

(اول تو اُردو کے لفظ میں درج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا ، دوسرے یہ کہ اس کے معنے بھی غلط بتائے - بطن الوادی اُس راستہ کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہو -)

بغل — اُس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جو انگرکھے ، اچکن ، سدروانی وغیرہ میں موتھے کے نیچے لگایا جاتا ہے -

(سدروانی میں بغل کا چوغلا نہیں لگایا جاتا) -

بکھاری — بھاری - کھاری ، اناج کا گودام -

(ان معنوں کا مفہوم علیحدہ علیحدہ ہے ، کھاری وہ زمین جس کنواں سا کھود کر بنائی جاتی ہے ، گودام وہ جگہ جہاں بہت سا غلہ وغیرہ بھارت کے لئے رکھا جائے اور بکھاری وہ کوٹھری ہے جو گھروں میں غلہ رکھنے کے لئے مخصوص ہوتی ہے -)

نکھڑ — معنی ۳ و ۴ - احاطہ - ۵ گائے بھینس کے رہنے کا مکان -

(یہ لفظ جاٹوں اور گوجروں کی زبان کا ہے اور وہ لوگ اس کو نکھار یا باکھل کہتے ہیں چنانچہ مہجور اور دلسوز جو جاٹوں کی زبان کا ماہر ہے لکھتا ہے -

مہاری باکھل میں آئیو دلسوز
تو کو جلوا کھراؤں ناحر کا

واضح یہ ہے کہ اس قسم کے جتنے لفظ جہاں سے دور کی طرف آئے ہیں ان میں اختلاف لہجہ کے وجہ سے عوام بجائے لام کے ر بولنے لگے جیسا سالی اور سارے اولال کی جگہ اولار - ناولے کے بجائے ناورے - متوالے کی جگہ متوارے - اسی طرح باکھل یہاں باکھر ہوگیا اور نکھل، نکھر بن گیا - اور صحیح لفظ باکھل طرح نہیں کیا گیا - یہ اُن نکھر لکھنا چاہیے یہ نکھڑ (یہ صم ہا) جو بالکل غلط ہے - چنانچہ معنی ہے (باء مع الالف) میں باکھل - باکھر اور نکھر تینوں لفظ لکھے ہیں اور معنی مویشیوں کے باڑے کے لکھے ہیں - یہاں بھی جتنے بیان کیے ہیں، میں ۴ احاطہ، گائے بھینس کے رہنے کا مکان - معلوم نہیں اصل لفظ کے ساتھ یہ تمام معنی کیوں نہیں لکھے اور غلط لفظ کے ساتھ کیوں شامل کر دیے اصل یہ ہے کہ صحیح لفظ باکھل ہے اور مویشیوں، ڈھوروں کے رہنے کے مکان کو کہتے ہیں ۴ مویشیوں کے رہنے کا باڑا معنی ہیں -)

دستور سے یہ بھی لگا جانا - صاحب پاس ہو جانا -

(ناسخ) — لگ گئی ساری فرقت میں یہ سنگریزے دیکھ
اُٹھ جنوں مار رہا میں تو دانہ ہی بسر چلے

(صاحب فراس ہونا صحیح نہیں - ایک شعر میں صاحب فراس

اس وقت کہلاتا ہے جب وہ ضعف و ناتوانی یا ازدیاد مرض کی وجہ سے اُٹھ بیٹھ نہ سکے - چنانچہ خرد مؤلف نے صاحب فراش ہونے کے یہی معنی لکھے ہیں - بستر سے بیٹھ لگ جانا ؟ یہ معنی رکھتا ہے کہ ذرے ذرے بیمار کی بیٹھ رخمی ہو جائے ؟ چنانچہ ناسخ کا جو شعر سند میں پیش کیا گیا ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں اور دوسرے مصرعہ نے بالکل صاف طور پر نمایاں ہیں کیونکہ بستر کا ساتھ چلنا اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ پیٹھ کے زخم سے چنگ جائے -)

بگولا—معنی نمبر ۲ غول بیابانی -

(غول بیابانی کے معنی میں بگولا کبھی استعمال نہیں کیا گیا -)

بل کرنا—معنی نمبر ۴ قربانی کرنا -

(یہ بھی غلط ہے - یہ لفظ اصل میں بلی ہے اور اسی سے بلی‌دان کرنا یہ معنی جبراً کرنا مستعمل ہے - تنہا بل کرنا اس معنی میں درست نہیں -)

بل گئی—قربان گئی -

(بل بل جانا محاورہ ہے - تنہا بل گئی درست نہیں -)

بلائے جان—معشوق کے صدقے -

(مومن)—مُوے نہ عشق میں جبتک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

(اُردو میں بلائے جان کوئی محاورہ نہیں جو معشوق کے صدقے ہونے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور نہ مومن نے اس معنی میں یہ لفظ لکھا - شعر کے دوسرے مصرعہ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جب تک دل ہلاکت جان کا باعث نہ ہوا بلائے جان ہی رہا - اس میں صدقے اور قربان سے کوئی واسطہ ہی نہیں - معلوم نہیں صاحب

نوراللغات نے یہ مفہوم کیونکر پیدا کیا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے اس کا عام محاورہ ہونا کیونکر ثابت ہو سکتا ہے جبکہ یہاں زیادہ سے زیادہ صرف مجازی معنی میں یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے -)

بلبلانا — مشتاق ہونا ؟ خواہشمند ہونا -

(اس لفظ کے معنی صرف بیتاب ہونے ؟ بیقرار ہونے ؟ درد سے تڑپنے کے ہیں - اشتیاق و خواہش کا اس سے کوئی تعلق نہیں -)

بلّی — تھوئی - سال کے درخت کی لانبی شاخ -

(بلی ؟ تھوئی کو ہرگز نہیں کہتے - بلّی نام ہے ایک لمبی یا ترا شیدہ لکڑی یا دھنی کا - بلکہ فی الاصل بلی وہ ہے جو لمبے درخت کو جڑ سے اوپر کی شاخ تک کاٹ کر ایک لکڑی گولے کی طور پر نکال لی جائے - یہ لکڑی باڑ وغیرہ باندھنے کے کام آتی ہے یا چھپر کے سہارے کے لیے ستون پر رکھی جاتی ہے - اس میں سال کے درخت کی قید بھی عجیب بات ہے ؟ جامن وغیرہ کی بھی بلی ہوتی ہے - تھوئی بالکل جدا چیز ہے جو ستون کے جگہ کام آتی ہے - چنانچہ خود مؤلف نے جہاں تھوئی کے معنے بیان کیے ہیں وہاں بلّی کا نام تک نہیں لیا - رہا رسک کا یہ شعر —

ٹوٹ جائے گی یہ بلی کھپریل کی جوڑ بجوڑ

دیکھ لینا ایک دن گردوں کا چھپر اُڑ گیا

اس میں بھی بلّی کے معنی تھوئی کے نہیں ہیں بلکہ اُس لکڑی کے ہیں جو چھپر کے سہارے کے لیے ستون کے اوپر رکھی جاتی ہے -)

بندری — بندر کی مادہ -

(بندر کی مادہ بندریا کہلاتی ہے - لکھنؤ دہلی میں ہر جگہ بندریا بولتے ہیں - بندری غلط ہے) -

بھڑبھڑیا — معنی نمبر ۱ جو فضول باتیں کرتا ہو ؟ ضبط نہ کر سکتا ہو ؟ صاف دل ؟ بیوقوف کا ہلکا - معنی نمبر ۳ گنّی -

(معنے نمبر ۱ درست ہیں ؟ لیکن معنی نمبر ۳ صحیح نہیں - بھڑبھڑیا اُسے کہتے ہیں جو ضبط نہ کر سکے اور دل کی بات فوراً زبان پر لے آئے ؟ گنی بالکل دوسری چیز ہے -)

بوئی — ایک قسم کی گھاس -

(گھاس کہنا غلط ہے ؟ کیونکہ بوئی کی بڑی بڑی جھاڑیاں ہوتی ہیں -)

بوئیاں — چھوٹے سے سکڑے منہ کی جس میں اندر روئی کی لوئی رکھتے ہیں -

(بوئیاں بون کے ساتھ غلط ہے - گھر دھوئی لکھتے ہیں —

تجھ کو ہے حق نے کیا مالکِ سخن کا سرفراز
ہیں تجھا کرتے سمندر طبع کو ناں بوئیے

حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کاوں کھوئی عمر
کاشکے ہم سیکھتے اُن سے بنانے بوئیے

ظاہر ہے کہ اگر صحیح لفظ بوئیاں ہوتا تو اس کی جمع بوئیے نہ آتی بلکہ بوئییں آتی - بوئیا ایک خاص وضع کی ٹوکری ہے جو گیہوں کی بالی سے بنائی جاتی ہے اور اس میں چرخہ کاتنے والیاں روئی کے گالے وغیرہ رکھتی ہیں -)

بھاڑ — وہ چولھا جس میں بھڑبھونجے چنے بھونتے ہیں ؟ نمبر ۲ بھٹی ؟ نمبر ۳ تنور -

(تینوں معنے صحیح نہیں - کیونکہ بھاڑ نہ چولھا ہے ؟ نہ بھٹی - نہ تنور ؟ بلکہ وہ زمین میں سرنگ کی طرح بنایا جاتا ہے ؟ بھٹی لوہار کی ہوتی ہے اور تنور نانبائی کا اور ان سب کی ساخت

علیحدہ علیحدہ ہے - علاوہ اس کے جتنے بھونڑے کی تخصیص بھی عجیب ہے -)

بھاراؔ—جوس کی ہوئی دوا -

(ایسا کہنا چاہئے کہ جوس کی ہوئی دوا کی بھاپ -)

بھداؔنہ—صحیح بھپ‌دانہ ہے بمعنی بھی کا بیج - ایک قسم کا چھوٹا بوٹ - ایک قسم کا انار -

(مؤلف کا بھداؔنہ کی صحت میں بھی‌دانہ کہنا غلط ہے کیونکہ جس کو وہ بھی سمجھے ہیں وہ خود بہ ہے اور فارسی میں اُسے بہہ کہتے ہیں اِس لئے یہ کہنا کہ صحیح بھی‌دانہ ہے درست نہیں - بوٹ اور انار کی کسی قسم کو بھداؔنہ کہنا دوسری بڑی غلطی ہے - کیونکہ وہ بوٹ یا انار جس میں دانہ نہ ہو اُسے بھداؔنہ کہتے ہیں نہ کہ بھداؔنہ -)

بھربھراؔنا—چہرہ مرجھانا -

(جب چہرہ پر ہلکے سے ورم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو کہتے ہیں چہرہ بھربھرانا ہوا ہے - مرجھانے کا تعلق چہرہ کے سرخ ہونے سے ہے نہ کہ ورم و اماس سے -)

بھرنا کر دینا—جلا دینا -

(بالکل غلط معنی ہیں - بھرنا کر دینا بعینہٖ وہی معنی رکھتا ہے جو کچومر نکالنے کے ہیں)

بھاڑسا ٹھنڈا—خت بت مارا جانا -

(بھاڑ سا ٹھنڈا - کنایۃً موت کی گرم بازاری کو کہتے ہیں جو کسی وبائی مرض یا لڑائی کے وجہ سے پیدا ہو -)

بھتؔ—معنی بھتر ۳ بھتی ؟ بھار - مثال - بھت بڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان :—

(بھت کو بھتّی کا مخفف کہنا صحیح نہیں - بھت مخفف ہے بھات کا -

بھت ؟ بھتیاری ؟ بیسوا ؟ بینوں داب گُذاب
آتے کی آدر کرس حاب نہ پوچھیں ناب

علاوہ اس کے جو مثال دی ہے وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ بھت بڑے الخ - بھت بڑے کے معنی ضایع ہوے ؟ برباد ہوے کے ہیں)

بھائیں بھائیں کرنا—بچھڑے کی آواز -

(ممکن ہے نواح کا کوئی میں بچھڑے کی اواز کو بھائیں بھائیں کہتے ہوں - لیکن بھائیں بھائیں کرنا عام طور پر اُس ویران مکان یا سنسان مقام کی نسبت استعمال ہوتا ہے جہاں غیر معمولی وحشت و ویرانی ٹپکتی ہو -)

بے صرفہ—بہت زیادہ ؟ بے احتیاطی سے -

(رشک)—میں پیا کرتا ہوں یونہی بادۂ عشق عالی
جس طرح بے صرفہ بیچاتا ہے دیوانہ شراب

(بے صرفہ کے معنے بیکار و بے سود کے ہیں اور رشک کے شعر میں بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ دیوانہ کو شراب کی حاجت نہیں اور اگر وہ شراب پیتا ہے تو اس کو بے صرفہ ہی کہیں گے -)

مرزا غالب نے بھی بے صرفہ اس معنے میں استعمال کیا ہے —

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

اب چند وہ محاورات و لغات ملاحظہ فرمائیں جو صرف مؤلف نوراللغات کی اُپج کہلائے جانے کے قابل ہیں اور جنھوں نے خواہ مخواہ

کتاب کو صحیم بنانے کے لیے بغیر کسی حوالہ و سند کے داخل محاورات کرلیا ہے - مثلاً :—

آبلے بھرنا—چھالے میں مواد کا بھر جانا

(یہ کوئی محاورہ نہیں - یہ مفہوم صحیح ہے کیونکہ چھالا جب پڑتا ہے اس میں اُسی وقت سے مواد بھرا ہوا ہوتا ہے -)

آس چھوٹنا—ناامید ہونا - مایوس ہونا -

(آس چھوڑنا مسموع ہے ، آس چھوٹنا مسموع نہیں - اس کے بجائے آس ٹوٹنا بولتے ہیں -)

بدزبان—گالی گلوچ ، گستاخ ، سخت کلامی -

(مؤلف نے اس لفظ کو فارسی کہا ہے ، حالانکہ فارسی میں کہیں اس معنی میں مستعمل نہیں ہوا - بعض گنوار ضرور اسی طرح بولتے ہیں کہ دیکھو بد زبان منہہ سے نہ نکالنا ، لیکن اس معنے میں یہ بالکل اردو ہے فارسی سے اسے کیا واسطہ -)

برا دن کرنا—بری رات کرنا - تکلیف میں بسر کرنا -

(اِس معنی میں دن اور رات دونوں جمع کے ساتھہ ، اِسی طرح استعمال ہوتے ہیں - برے دن کٹے - بری راتیں کٹیں -)

بساھا—بکسر اول ، کتا جس کے بیس ناخن اور رھریلے دانت ہوتے ہیں -

(اصل لفظ بَسہاَ ہے - ممکن ہے یہ لفظ بس (بہ معنی زہر سے) بنا ہو یا بیس سے اِس شبہہ کی بنا پر کہ جس کُتے کے بیس ناخن ہوتے ہیں وہ بہت زہریلا ہوتا ہے -)

بغل میں منہہ ڈالنا -- سر نیچا کرنا خجالت ظاہر کرنا -

(بالکل غلط ہے - محاورہ گریباں میں منہہ ڈالنا اور بغلیں جھانکنا ہے -)

بکری کرے گھاس سے یاری تو چرنے کہاں جائے—مثل - جو شخص اپنا رزق دوستی کی وجہ سے چھوڑ دے تو وہ کس طرح بسر کرے -
(یہ محاورہ غلط ہے - صحیح یہ ہے - گھوڑا گھاس دانے سے یاری کرے تو کھائے کیا -)

بکری اپنی جان سے گئی کھانے والے کو مزہ نہ آیا -
(اِس میں بجائے بکری کے مرغی ہونا چاہیے اور بجائے مزہ کے سواد -)

بہرا بہشتی - اندھا دورخی -
(یہ مثل صرف اِس وجہ سے ہے کہ ب کی ردیف میں اضافہ ہو جائے اُلٹی لکھی - اصل یوں ہے اندھا دورخی بہرا بہشتی اِسی طرح کی تقدیم و تاخیر اِس محاورہ میں کی گئی ہے - بھانمتی نے کنبہ جوڑا - کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا - دوسرا ٹکڑا پہلے ہونا چاہیے -)

آٹے کے ساتھ گھن نہ پس جائے -
(محاورہ گیہوں کے ساتھ گُھن پسنا ہے -)

مؤلف نے لغات کو بڑھانے میں بھی بہت بے اعتدالی سے کام لیا ہے
مثلاً آپ کی دال یہاں نہ گلے گی -
(اصل محاورہ دال گلنا ہے - اِس میں لفظ آپ کا اضافہ کر کے خواہ مخواہ الف کی ردیف میں شامل کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا - یا آجتک نرے ہبنگ ہگ رہے ہیں - اس میں آجتک کا اضافہ بالکل بے محل ہے - یا آخر آدمی نے کچا دودھ پیا ہے -

اس میں بھي آخر کا اضافہ درست نہیں - یا بڑا کمر توڑ - محاورہ کمر توڑ ھے اس میں بڑا شامل کرنے کي کیا ضرورت تھی -)

اس طرح کے سیکڑوں محاورات ھیں جو بلا ضرورت کسي لفظ کے ساتھہ ملاکر کتاب میں شامل کر دئے گئے ھیں اور بیسوں حکایتیں درج کر کے انکا ایک ایک فقرہ لے لیا اور محاورات میں شامل کردیا ھے -

بہت سے ایسے محاورات بھي نظر آتے ھیں جن کي سند میں کوئی شعر کسی کا ملا اور اُسے بے تکلف درج کردیا در آنحالیکہ خود اُن اشعار میں وہ محاورات غلط استعمال کیے گئے ھیں اور اس سے قبل اس زمانہ میں ان پر اعتراض بھي ھوئے ھیں مثلاً آبرو اُڑجانا-آبرو گرہ میں باندھنا- آج کدھر سے خورشید نکلا - بخت جلا - خانہ خرابی برپا کرنا - بڑا بول پیش آنا- بغل کا گھونسہ - وغیرہ کہ یہ تمام محاورات غلط نظم کیے گئے اور اُن کو صحیح جان کر لغت میں داخل کردیا گیا -

لغت کے ابتدا میں متروکات کي جو بحث مؤلف نے چھیڑي ھے وہ بہت کچھہ محل نظر ھے - کیونکہ جو متروکات انھوں نے شمار کرائے ھیں اُن میں نصف سے زاید اب بھي مستعمل ھیں -

---

یہ مضمون صرف ایک سرسري نظر کا نتیجہ ھے اور وہ بھي ردیف الف و با کے متعلق ورنہ پوري کتاب کي اگر چھان بین کی جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ھو سکتی ھے -

---

منتخبات هندی کلام - مرتبۂ ڈاکٹر جعفر حسین ' پی ' ایچ ' ڈی - ملنے کا پتہ - دی حیدرآباد بک ڈپو ' چادر گھاٹ ' حیدرآباد دکن - ڈسائی اکٹیو سائز ' ۲۲۵ صفحات — مجلد قیمت فی جلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار - ۲ روپیہ ۱۲ آنہ حالی -

اُردو کے ادبی حلقوں میں ہندی شعر و ادب سے دلچسپی اور مذاق پیدا کرنے کی روز بروز زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس اعتبار سے ڈاکٹر جعفر حسین صاحب نے اپنی کتاب منتخبات ہندی کلام کے ذریعہ جو مخلصانہ کوشش کی ہے وہ صرف قابل ستائش ہی نہیں بلکہ قابل شکر بھی ہے -

شروع میں لائق مرتب نے ایک مقدمہ تقریباً ۲۵ صفحات کا سپرد قلم کیا ہے جس میں ہندی شاعری کی خصوصیات اور مسلم شعراء کی خدمات کا ذکر ہے - اس کے بعد ہندی شاعری کے منتخبات شروع ہوتے ہیں ، جو ہر طرح کے اخلاقی ، عاشقانہ اور فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہیں - چونکہ ہندی کے الفاظ کا صحیح تلفظ اُردو کے رسم الخط میں مشکل ہے اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی حروف میں بھی اُنہیں واضح کر دیا گیا ہے -

انتخاب اور ہندی اشعار کے ترجمے سے لایق مرتب کے حسن مذاق کا اندازہ ہوتا ہے ' البتہ اشعار کی تشریح میں بعض مقامات پر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ شعر کی اصلی اسپرٹ کو نیستسمہ دلا دیا گیا اور وہ بالکل مغربی سانچے میں ڈھل کر رہگئی ہے ' اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اشعار کے مطالب

میں موجودہ حالات و مذاق کا رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے ، حالانکہ اعلیٰ شعر و ادب کے لیے ضرورت ہے کہ اس کا مطالعہ اس کی اصلی اسپرٹ میں کیا جائے ۔ پھر صورت کتاب بہ حیثیت مجموعی دلچسپ ہے اور نہایت سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے ، امید ہے کہ اس کے ذریعہ اُردو کا حلقۂ شعر و ادب ہندی شعراء کے اعلیٰ تخیّلات و جذبات سے لطف اندوز و مستفید ہونے کی کوشش کریگا ۔

اردو شہ پارے (جلد اول) ۔ ۳۵۶ صفحات ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم ؔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی ، ملنے کا پتہ ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد ہاشمی ؔ اسٹیشن روڈ ۔ حیدرآباد دکن ۔ قیمت درج نہیں ہے ۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ملک کے ایک ذہین اور ہونہار نوجوان ہیں اور اپنے اندر فضل و کمال کے ساتھ ؔ جوش عمل اور ولولۂ کار بھی رکھتے ہیں ۔ اب سے قبل ان کی ؔ روح تنقید ؔ اور ؔ اُردو اسالیب بیان ؔ وغیرہ کتابیں ملک میں شائع ہوکر کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں ۔

زمانۂ قیام یورپ میں بھی ان کے ذوق عمل نے ان کو بیکار نہیں رہنے دیا چنانچہ ادبیات اردو کے اُس نایاب ذخیرے کی مدد سے ؔ جو لندن ؔ انڈیا یونیورسٹی اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں ہیں ؔ آپ نے ''اردو شہ پارے'' کے نام سے ایک کتاب تین جلدوں میں لکھنے کا قصد فرمایا ؔ زیر تبصرہ کتاب ان میں کی پہلی جلد ہے جو مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے ۔

اس جلد میں لائق مرتب نے صرف شاہکاروں اور شہ پاروں کے جمع کر دینے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اُن مصنفین کے تذکروں اور ان کے

عہد و ماحول کے ذکر پر ۱۷۰ صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے - ظاہر ہے کہ ولایت کے کتبخانوں سے مصنفین و شعراء کے کارناموں کو اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کرکے شائع کر دینا کوئی بہت بڑا کام نہ تھا مگر ان کے حالات کا جمع و تلاش کرنا پھر مختلف حالات و روایات کو غور و تحقیق کے ساتھہ رد و قبول کرنا بڑی محنت و لیاقت کا کام تھا -

اس مقدمہ کے چار باب ہیں - باب اول میں اردو کے متعلق ان ابتدائی کوششوں کا ذکر ہے جو شمالی ہند میں حضرت امیر خسرو اور خواجہ مسعود سلمان وغیرہم سے ہوئیں (یہیں اس امر کی تحقیق بھی کر دی ہے کہ اردو زبان کی بنیاد خواجہ مسعود کے زمانہ میں پڑ چکی تھی جو حضرت امیر خسرو سے پہلے گزرے تھے) یا جو گجرات میں بہاءالدین باجن ؟ خوب محمد اور گام دھنی کے ذریعہ رونما ہوئیں یا جو دکن میں حضرت گنج‌العلم اور خواجہ بندہ نواز کے ہاتھوں عمل میں آئیں - مگر اس کا مواد زیادہ نہ تھا لہذا یہ باب صرف ۱۱ صفحات میں ختم ہو گیا ہے -

باب دوم میں بیجاپور کے اُن اردو کارناموں کا ذکر ہے جو شاہ برہان جانم - آسی - مقیمی - صنعتی - رستمی - ملک - امین - سیوا - اور مومن بیجاپوری و غیرہم کے زمین میں ہیں - یہ ذکر ہے سنہ ۱۴۶۰ع (۸۹۵ ھ) سے سنہ ۱۶۸۶ع (۱۰۹۷ھ) تک کا -

یہ بیان تفصیلی ہے اور ۵۲ صفحات میں ختم ہوا ہے - شاہ برہان جانم کا ذکر پہلے پہل رسالہ اردو میں نکلا تھا -

تیسرے باب میں گول کنڈہ کے اردو کے اُن کارناموں کا بیان ہے جو فیرور - محمود - وجہی - احمد - شوقی - خیالی - عواصی - قطبی - ابن نشاطی اور نوری وغیرہم کے باعث ظاہر ہوئے - یہ ذکر سنہ ۱۵۰۸ع

(۹۱۶ھ) سے سنہ ۱۶۸۷ع (۱۰۹۸ھ) کا ہے اور ۴۵ صفحات میں ختم
ہوا ہے - چوتھے باب میں وہ شاہکار مذکور ہیں جو سنہ ۱۰۹۸ھ سے
سنہ ۱۱۵۰ھ تک مغلوں کی فتح دکن کے بعد عالم وجود میں آئے -
تقریباً ۵۰ صفحات میں اس کا ذکر ہے - اِس میں شمالی ہند کے
تین شعراء (افضل - حیون - جعفر) کا بھی ذکر کیا ہے اس کے بعد
۱۰ دکھنی شعرا اور ۲ نثر نگاروں کا تذکرہ ہے جن میں نصری ' عشرتی
اور ولی ' اورنگ آبادی معروف و آشنا ہیں -

غرض اس ۱۷۰ صفحات کے مبسوط مقدمہ کے بعد تقریباً ۱۵۰
صفحات میں کتاب یعنی منتخبات نظم و نثر اردو ہے جس میں
نظم کا حصہ ۱۲۷ صفحات پر اور نثر ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے -

فاضل مرتب چونکہ مشرقی طرز تصنیف کے ساتھ ساتھ مغربی
طریقۂ تصنیف سے بھی باخبر ہیں اس لئے انھوں نے اس میں
متعدد امور کے اضافہ سے اپنی تصنیف کو مفید ' سہل المطالعہ اور
حالۂ حال کی تصانیف کے موافق بنا دیا ہے - مثلاً مقدمہ کے ہر
باب کے شروع میں فہرست مضامین اور فہرست شعراء دیدی ہے اور ہر
باب بلکہ ہر دور میں ایک ایک تمہید ہے جو اس باب یا دور کے
حالات پر مجموعی رائے ہے - فہرست شعراء و مصنفین کے سنہ اور تاریخیں
بھی درج ہیں - پھر اصل کتاب یعنی انتخاب کلام سے قبل
فہرستیں ہیں ایک بلحاظ مضامین دوسری بلحاظ مصنفین -

دوسری فہرست میں پھر سنین شعرا اور مختلف نسخوں کے
مآخذ کا ذکر کردیا ہے مگر ان سب سے زیادہ مفید آخر کے ضمیمے
ہیں جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہر مصنف کی دیگر
تصانیف کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں اور مرتب نے اُن کے حالات
کن مآخذ (یا مرتب ہی کے لفظوں میں کن "علیہمات") سے

حاصل کیے ہیں۔ اس قسم کی فہرستوں اور ضمیموں سے کام لینا یا ان کو مرتب کرنا، ممکن ہے، بعض لوگوں کی نگاہوں میں ضیع اوقات و صفحات ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے محنت اور وقت کی بچت ہوجاتی ہے اور مہذب ملکوں میں تو بغیر ان امور کے کوئی تصنیف مقبول اور بلند پایہ ہو ہی نہیں سکتی۔

سب سے آخر میں ایک فرہنگ بھی شامل کردی گئی ہے جس میں قدیم مصنفین کے الفاظ و لغات کا، جو اب نامانوس اور متروک ہیں، شافی حل بھی حتی‌الوسع کیا گیا ہے۔

پھر اسی کے ساتھ، شعرا و سلاطین کی سات تصویریں اور وصلی و قطعات کی چار تصویریں بھی شامل کر کے کتاب کی رونق میں اضافہ کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے شاہ کاروں کا یہ مجموعہ، موسوم بہ "اردو سہ پارے"، عرق ریزی اور محنت کا ایک بہترین نتیجہ، اور معلومات و تحقیقات جدیدہ کا ایک اچھا ذخیرہ ہے اور بجائے خود ایک شاہکار۔ لیکن ہم کو بعض مقامات کے طرز بیان پر اعتراض ہے۔ انھوں نے بعض لوگوں کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ مشرقی تہذیب اور اردو مذاق کے موافق، اُس سے حقارت یا سوء ادب مترشح ہوتا ہے مثلاً انھوں نے امیر خسرو کا حال یوں لکھا ہے۔

"امیر خسرو الٹنہ اس عہد میں تھا اور اُس مقام پر تھا...۔ (چند سطروں کے بعد) جس زمان میں وہ شعر گوئی کرتا تھا۔"

ممکن ہے یہ عبارت، انگریزی کا ترجمہ ہو یعنی ممکن ہے فاضل مرتب نے اپنی کتاب کے کچھ اجزا پہلے انگریزی میں

لکھے ہوں پھر ان کا ترجمہ اردو میں کردیا ہو پھر صورت تحریر کا یہ آہنگ ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔

اِس کے علاوہ لفظوں اور محاوروں کی بعض غلطیاں بھی اس میں ملتی ہیں جو نہوتیں تو بہتر تھا۔ مثلاً صفحہ ۱۳ پر بہاؤالدین باجن کے ذکر میں لکھتے ہیں "وہ نہ تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہیں نہ ہی معتبر و موثق" یہ "نہ ہی" پنجاب کی پیداوار ہے اور غیر فصیح بلکہ غیر صحیح۔ صفحہ ۶ پر ہے "شہ یاروں کے مد نظر" مد نظر کا استعمال اس طرح غلط ہے۔ خود زور صاحب نے اس کا صحیح استعمال بھی ایک آدھ جگہ کیا ہے۔ یوں لکھنا چاہئے "شہ یاروں کے متعلق یا شہ یاروں کو مد نظر رکھتے ہوئے" صفحہ ۷ پر "دونوں صاحبین" صاحب کا تثنیہ (اور جمع بھی) واعلی حالت میں غیر فصیح ہے۔ ہاشمی اور ولی کے ذکر میں ہے "ترنویس تھا" ترگو پر قیاس کر کے ان معنوں میں الفاظ گڑھنا مناسب نہیں۔ "اسی طرح سنہری دور" بھی غلط ہے سنہرا دور ہونا چاہیے۔ لیکن یہ تمام باتیں بہت ہی خفیف اور معمولی ہیں یہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اس دور کی ایک بہترین پیداوار ہے اور ہم جناب زور کو ان کے اس قابل قدر کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

روح جذبات—جناب اکبر حیدری کے کلام کے مجموعہ، طابع و ناشر عشرت رحمانی ایڈیٹر "نیرنگ" دہلی۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ۔

یہ کتاب جناب اکبر حیدری کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب اکبر حیدری کسی تعارف کے محتاج نہیں [illegible] کا نام

اکثر ملک کے ادبی رسائل میں نکلتا رہتا ہے - آپ جدید طرز کی نظمیں بہت کامیابی کے ساتھ لکھتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اجتہاد کے دُھن میں زبان و بیان کی شگفتگی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے - روح جذبات کی بیشتر نظمیں قابل تحسین و ستائش ہیں کاغذ نفیس اور طباعت وکتابت دیدہ زیب ہے -

مصباح التعرف لارباب التصوف—ملنے کا پتہ - قاضی انتظام علی خاں ، قاضی گڑھی - کاکوری ضلع لکھنؤ—قیمت ۲ روپیہ -

شاہ علی حیدر ابن حافظ شاہ علی انور قلندر کاکوروی نے کمال محنت و جانفشانی سے شیخ عبدالکریم جیلی اور مولانا جامی وغیرہ کی تصانیف سے صوفیہ کی اصطلاحات ردیف وار جمع کر کے ترتیب دی ہیں ، اور ساتھ کے ساتھ اُن کی توضیح و تشریح بھی کردی ہے ، یہ کتاب شائقین علم تصوّف کے لیے نہایت کار آمد و مفید ہے -

(ا)

اداریہ

ہندستانی اکیڈیمی کی دوسری ادبی کانفرنس امسال توقع سے زیادہ کامیاب رہی ؛ اس باب میں آنریبل جسٹس سر شاہ محمد سلیمان بالقابہ چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد کی سرگرمیاں و دلچسپیاں سراوار ستائش بھی ہیں اور قابل مبارکباد بھی -

کانفرنس کی تاریخیں ۴ ، ۵ اور ۶ اپریل سنہ ۳۱ قرار پائی تھیں ملک کے سرآوردہ حضرات کے لیے اتفاق سے یہ زمانہ سخت مصروفیتوں کا تھا ؛ اسی زمانے میں اکیڈیمی کے ادب نواز صدر ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ سیاسی مہمات میں مصروف تھے ؛ اسی طرح وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ؛ سر عبدالقادر ؛ مولوی عبدالحق بی - اے ؛ خواجہ حسن نظامی ؛ ڈاکٹر ذاکر حسین ؛ ڈاکٹر محی الدین قادری وغیرہ بھی شدید مصروفیتوں کے باعث کانفرنس میں شرکت نہ فرماسکے ؛

جنرل سکریٹری ہندستانی اکیڈیمی نے ۴ تاریخ کے اجلاس میں ان تمام حضرات کے پیامات پڑھ کر سنائے ؛ جن میں اکیڈیمی اور اس کی ادبی کانفرنس کے مقاصد سے ہمدردی و دلچسپی اور اس کی کامیابی کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا - سر تیج بہادر سپرو کی عدم موجودگی کی باعث ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان بالقابہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھ کر سنایا (جسے ناظرین نے ہندستانی کے اپریل نمبر کےساتھہ ملاحظہ فرمایا ہوگا) سکریٹری صاحب ہندستانی اکیڈیمی نے اکیڈیمی کی کارگزاریوں کی رپورٹ پڑھ کر سنائی پھر مسٹر میکنزی ڈائرکٹر سرشتہ تعلیمات صوبۂ متحدہ نے ایک دلچسپ

انداز میں اکیڈیمی کے کاموں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا ، اور اس کو مفید و کارآمد بتا کر اس کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرمائی -

۵ اپریل کو کانفرنس کے شعبۂ اردو کا پہلا اجلاس زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر ، میڈھال میں منعقد ہوا - حاضرین کے سامنے ذیل کے مسائل پیش تھے -

(۱) علوم و فنون کی کس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کرانا مناسب ہوگا -

(۲) عورتوں اور بچوں کے لیے مفید مطالب پر کتابیں طیار کرانے کی کیا صورت اختیار کی جائے -

مذکورہ بالا مسایل پر کافی بحث و گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ مندرجۂ ذیل تجویزیں بطور سفارش اکیڈیمی کی کونسل میں پیش کیجائیں -

۱ - فی الحال موضوعات ذیل پر جو کتابیں غیر زبانوں میں ہیں ان کا ترجمہ کرایا جائے :-

(الف) سوسیا لوجی -

(ب) فنون لطیفہ (نقاشی و مصوری وغیرہ) -

(ج) سائنس کی عام کتابیں -

۲ - اکیڈیمی کی جانب سے اس کا اعلان کیا جائے کہ ایک انعام اُن تصنیفات میں سب سے بہتر تصنیف پر دیا جائے گا جو خاص طور پر عورتوں کے لیے مفید ہوں -

۳ - اکیڈیمی کی جانب سے اس کا بھی اعلان کیا جائے کہ اُس تصنیف پر جو بچوں کے لیے باعتبار زبان اور مضمون مفید ہو

اور مقابلے کی کتابوں میں سب سے بہتر ہو ایک انعام دیا جائے گا -

اس کے بعد عالی جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے ایک مبسوط مقالہ اردو لسانیات کے عنوان سے پڑھ کر سنایا جس کو حاضرین نے کمال شوق و مسرت سے سنا - جناب صدر نے اپنی تقریر میں جناب کیفی کے مقالے کی بہت تعریف فرمائی ' اس کے بعد جنرل سکریٹری ہندستانی اکیڈیمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا -

اِس شعبہ کا دوسرا اِجلاس ۶ اپریل سنہ ۳۱ع کو دو بجے زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر میوہال میں ہوا - عالی جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنا محققانہ مضمون محمد ہاشم برہان‌پوری کے دیوان مراثی کے متعلق پڑھ کر سنایا - پھر نواب صدر یار جنگ نے کلیات میر حسن - مثنویات اعظم‌الدولہ سرور اور مثنوی حکیم قدرت اللہ خاں قاسم دہلوی پر ایک عالمانہ مضمون پڑھ کر حاضرین کو محظوظ فرمایا - اُس کے بعد مسٹر بی - ٹی ورما صاحب پروفیسر فرگیوسن کالج پونا نے ایک دلچسپ مضمون ابراہیم عادل شاہ کے متعلق پڑھا -

اِن مضامین کے علاوہ چند اور مضامین بھی تھے جو وقت کی کمی کے باعث نہیں پڑھے جا سکے - چند ضروری مسائل جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں حاضرین کے سامنے پیش کیے گئے -

(۱) زبان کو عام فہم اور سلیس بنانے اور اُس کو غیر مانوس الفاظ وتراکیب سے پاک رکھنے کے لیے کیا وسائل اختیار کیے جائیں -

(۲) وضع اصطلاحات علمیہ کے لیے کیا اُصول اختیار کیے جائیں -

چونکہ اکیڈیمی کی کونسل نے ماہرین کی ایک کمیٹی مسئلہ

اول پر غور کرنے کے لیے پہلے ہی بنا دی تھی جس کی رپورٹ وصول نہیں ہوئی تھی اِس لیے یہ مسئلہ خارج از بحث سمجھا گیا - مسئلہ دوم کے متعلق کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ قرار پایا کہ "کونسل سے اِس امر کی سفارش کی جائے کہ اُن اصطلاحی لفظوں کے علاوہ جو ہندی اور اردو میں رائج ہیں یا جو دونوں میں مشترک (رائج) ہو سکیں سائنس کی اصطلاحوں کے لیے جدید الفاظ کی اختراع سے یہ بہتر ہوگا کہ وہی اصطلاحیں بجنسہ اختیار کرلی جائیں یا "مورّد" بنا لی جائیں جو دیگر ممالک میں رائج ہوں" -

چند تجویزیں اور پیش ہوئی تھیں - مگر اب وقت تنگ ہو گیا تھا اِس لیے جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کر کے جلسہ برخاست کیا گیا -

---

جیسا پہلے بھی عرض کیا گیا ہے اکیڈمی جن سالانہ لکچروں کا اہتمام کرتی ہے وہ بھی کانفرنس کے موقع پر دیے جاتے ہیں - امسال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ؟ ایم - اے ؟ پی - ایچ - ڈی صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے "سامی لسانیات" پر اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا تھا - اردو زبان میں یہ چیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے یقیناً نئی ہے - یہ خطبہ اکیڈیمی کی جانب سے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوگا ؟ اس وقت ناظرین اس کی اہمیت اور زبردست عالمانہ تحقیق و تجسس کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں گے -

---

"ہندستانی" کے سررشتہ "پرشاسنی" کا لفظ ایڈیٹوریل بورڈ کے اعزازی ممبروں نے تجویز کیا تھا ؟ اس پر بعض بزرگوں کو

اختلاف ہوا لیکن مخالفت کی حد تک نہیں مگر بعضوں نے اس پر اس شد و مد سے آواز بلند کی گویا وقت کا اہم ترین مسئلہ یہی تھا ۔

ابتدا میں ہمارا خیال تھا کہ لوگ وقتی اور مقامی مصالح کی اہمیت کا لحاظ کرینگے اور رسالے کے عام مضامین سے اس خفیف امر کی تلافی ہو جائے گی ؟ چنانچہ ہمارا یہ خیال صحیح نکلا اکثر ارباب فہم خاموش بھی ہو گئے ؟ مگر بعض حلقوں میں اب تک اسی زور شور سے طعن و تنقیص کا سلسلہ جاری ہے اس پر ہمارے ادارے کے معزز ممبر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم' اے۔ پی۔ایچ۔ڈی آئندہ اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ مرحمت فرمائینگے ؟ لیکن ہم بھی آج کی صحبت میں مختصراً کچھ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں :—

"تماہی" پر اصولی اعتراض یہ ہے کہ ہندی اور فارسی لفظ کو ملا کر اس قسم کا تصرف ناجائز یا ناموزوں ہے ۔ لیکن لغوی حیثیت سے ان لفظوں کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا ؟ ۔

(۱) تِمائی

(۲) بِراہا ؟ بِراہی —

(منیر)—صدقے اُترتے سراسی چوراہے پر تمام
کیوں ایک راہ تیری بِراہی میں رہ گئی

(۳) تِسالا (تین برس کا) ۔

(۴) چوراہا (جہاں ہر چار طرف کو راستہ جاتا ہو) ۔

(بحر)—گرا ہے کوئی دُتلا اُس بت کافر کے صدقے کا
کہ چوراہے کو اکثر پوجتے ہندو نکلتے ہیں

(۵) چوگُلا—گل چار برگہ - چار پنکھڑی کا پھول -

(بحر)—بہار عالمِ امکاں نہایت بے حقیقت ہے

عناصر کو سمجھہ اک چوگُلا ہے باغ فانی کا

(۶) چوگوشیا -

(۷) چومنزلا—چار منزل کا مکان -

(۸) سہ رخا—سہ پہل -

کیا مذکورہ لفظوں کی ساخت و صورت بالکل "ماہی" کی نہیں ہے ؟

چھہ ماہی کے لیے بعض صاحبوں کو اصرار ہے کہ صرف مُردے کی چھہ ماہی ہوتی ہے ؟ سند میں غالب کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے —

رسم ہے مُردے کی چھہ ماہی ایک

خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

لیکن اس شعر میں یہ ممانعت کہاں ہے کہ چھہ ماہی کو اُس کے اصلی معنوں میں نہ استعمال کیا جائے ؟ غالب ہی کا شعر اس کے بعد کا ملاحظہ فرمایئے :—

مجھکو دیکھو کہ ہوں بقید حیات

اور چھہ ماہی ہو سال میں دو بار

یہاں چھہ ماہی دو معنی ہے ' ایک مردے کی چھہ ماہی دوسری چھہ مہینے تنخواہ دیے جانے کی رسم -

اس لیے یہ کہنا کہ چھہ ماہی صرف مُردے کی چھہ ماہی کو کہتے ہیں ' ہمارے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا - صاحب فرہنگ آصفیہ نے بھی شش ماہی کے معنے چھہ ماہی اور نصف سال کے دئے ہیں اور مردے کی چھہ ماہی کا خفیف سا بھی اشارہ نہیں کرتے -

پھر صورت ہندی اور فارسی لفظوں کو ملا کر اُن پر تصرف کرنے کا جہاں تک اصولی تعلق تھا اس کی مثالیں دیدی گئیں، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس پر قیاس کر کے کوئی نیا لفظ نہیں ڈھالا جا سکتا ؟ لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ "ماہی" کوئی نیا لفظ نہیں ہے اور نہ اس زمانے کے لوگوں کے مخترعات میں ہے۔

صاحب فرہنگ آصفیہ سہ بندی کے معنوں میں سہ ماہہ اور تماہہ دیتے ہیں (جس سے مراد ہے) وہ قسط جو تیسرے مہینے ادا کی جائے۔

لغوی حیثیت سے جہاں تک "ماہی" کے جواز و عدم جواز کی بحث تھی ؟ ختم ہوگئی مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ لغوی حیثیت سے کسی لفظ کے صحیح و جایز ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا و ادب میں بھی اُسے ضرور جگہ دیجائے "ماہی" اصولی حیثیت سے صحیح ہو لیکن سہ ماہی کے ہوتے ہوئے اس کا استعمال ایک غیر ضروری اجتہاد تھا۔

لیکن صورت یہ پیش آئی کہ ہندستانی اکیڈیمی کے اُردو اور ہندی کے رسالوں کے لیے ایک ایسے نام کی تلاش ہوئی جو دونوں کے لیے یکساں کام دے سکے اور جس طرح ہندستانی اکیڈیمی کا اطلاق اُردو اور ہندی دونوں شعبوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے اسی طرح خیال ہوا کہ رسالوں کا نام بھی ایسا ہونا چاہیے جس سے لفظی ترجمہ میں کمی ہو اور ہندی اور اُردو میں جو خلیج حائل ہے بڑھنے نہ پائے اس خیال کے زیر اثر اردو اور ہندی ایڈیٹوریل بورڈوں نے ماہی کے لفظ

کو رسالہ کے سر ورق کے لیے قبول کر لیا ان تمام حالات کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ "تماشہ" کے متعلق کسی منصف مزاج شخص کو اعتراض کی گنجائش باقی رہ سکے -

---

هندستاني

هندستاني اکیڈیمي کا ماهي رساله

جلد ۱ | اکتوبر سنه ۱۹۳۱ع | حصه ۴

کلیات میر حسن دهلوي

(از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی)

مختصر حالات میر صاحب

اُردو میں شاعر هزاروں؟ استاد بیسیوں گذرے - مگر یه فخر سوائے میر حسن کے کسي کو حاصل نهوا که شاعري اُن کے خاندان میں سات پشت تک جاری رهی - اور اُردو پر کیا منحصر هے شاید هي کسي زبان میں اس کي مثال ملے - ساتویں پشت میں میر نفیس صاحب تھے - اُنهي پر یه سلسله ختم هوا - موصوف سے مجھکو بھي ملاقات کا شرف حاصل هوا تھا - یه واقعه ادب کے لحاظ سے دلچسپ هے که اس ملاقات کے محرک خواجه عزیزالدین عزیز لکھنوي تھے - واسطۂ تعارف میر محمد علی عارف - رفیق ملاقات علامه شبلي -

میر حسن کے پر دادا میر امانی خراسان کے مشهور مردم خیز شهر هراۃ سے دلی میں آکر آباد هوئے تھے - میر حسن کي شهادت هے که بڑے فاضل اور هست قلم خطاط تھے - کبھی کبھي شعر بھي کهتے تھے - والد میر غلام حسین ضاحک تھے - عالم، فاضل، ناثر - موسیقي میں ماهر - فارسي اور اردو دونوں میں شعر کهتے تھے -

غزل کي سہلي هزل تهي - زبان وہ جو بقول میر حسن از آدم تا انتہا
نہ کسی نے بولي نہ لکھی - غزل چالیس پچاس شعر سے کم نہ
هوتي تهی - مثنیں کلام کا نمونہ :—

دردبس اگر روز اجل آہ نہ هوتا
قصہ تها محبت کا نہ کوتاہ نہ هوتا
اُس آن بهے آنسو جس آن کہ جی ڈوبا
تب جان سے هم اٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

میر حسن کا نام غلام حسن تها - پرانی دلي کے محلہ سید واڑہ میں
پیدا هوئے - فارسی کی تعلیم پائی - شروع سے شاعری کي طرف خاص
میلان تها - دلی میں خواجہ میر درد کی صحبت میں رهے - اودہ میں
میر ضیاء کے شاگرد هوئے - خود لکھتے هیں کہ میر ضیاء کي طرز مجھسے
نبہہ نہ سکی اِس لیے درد - سودا - اور میر کی پیروی کي - آگے چل کر اِن
تینوں استادوں کے طرز کلام جدا جدا دکھائے جائینگے -

آغاز شباب میں اپنے والد کے ساتھہ دهلي سے فیض آباد آئے -
فیض آباد سے اُٹھہ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی - نواب سالارجنگ
کي سرکار میں تعلق تها - اُن کے فرزند میرزا نوازش علی خاں
سردار جنگ کی صحبت میں رهتے تهے - ایک جگہ لکھتے هیں -
" دلی کے چھوٹنے کا داغ دل پر اخیر تک رها - " ایک جگہ کہا هے :—

هماری دلی کا یہ دل آزار تحفہ هے
یہ تحفہ اُس کو ملا اِس دیار کا پہونچا

دوسری جگہ زیادہ دلگداز ادائے میں فرماتے هیں —

دلي سے نکلا آئی تهی یہ میر کی غزل
جس کا یہ شعر هوش سے بیهوش کر گیا
یہ چهبڑ دیکھہ هنس کے رخ زرد پر مرے
کہتا هے میر رنگ تو اب کچھہ نکھر گیا

دي حجه مہینے کی آخری تاریخوں میں بیمار ہوئے - محرم کے عشرے میں وفات پائی - سنہ ۱۲۰۱ ہجری تھا - مصحفی نے تاریخ کہی —

چوں حسن آں بلبل شیریں زباں
رو آرمید گلزار رنگ و بو بتافت
پس کہ شیریں بود تاریخش مصحفی
شاعر شیریں زباں تاریخ یافت
۱۲۰۱

تذکرۂ گلشن ہند میں وفات سنہ ۱۲۰۵ ہجری میں لکھی ہے - جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں - بقول آزاد عمر پچاس (۵۰) برس سے زیادہ پائی - تذکرۂ مصحفی میں عمر ساٹھ سال کی لکھی ہے (اِس اطلاع کے لیے میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا ممنون ہوں) حلیہ یہ تھا - داڑھی منڈی ہوئی - رنگ تھوڑا - قد اچھا بڑا - (میر تقی مرحوم تک یہ قد قائم تھا) -

لباس — سر پر پگڑی - بڑا سا جبہ -

اخلاق — طریف - خوش طبع - شیریں مزاج - مہذب - بیہودہ اور معیوب کلام زبان سے نہ نکالتے تھے - (افسوس ہے کہ کلام کے دو ایک حصے سخت فحش ہیں) - نہ برا کہا نہ برا سنا -

اولاد میں چار فرزند - اُن میں سے ایک محسن - خلیق - خلق شاعر - دو خلیق اور خلق صاحب دیوان - اِن سب کا انداز کلام والد کے کلام سے ملتا ہوا تھا -

تذکرۂ آب حیات میں آزاد لکھتے ہیں " دیوان اب نہیں ملتا . . . زمانہ بدل گیا اور بدلتا جاتا ہے -

کلام

وہ وقت تو گیا پھر یہ وقت بھی نہ پائینگے - آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو اِس کتاب میں درج کرتا - اسی سلسلے میں میر آزاد نے تذکرۂ گلزار ابراہیمی سے میر حسن کے خط سے اصل عبارت نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ہرقسم کا کلام آٹھہ ہزار شعر تھا - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلام اُس وقت تک مدون ہو چکا تھا - خمخانۂ جاوید سے واضح ہے کہ محسن اردو لالہ سری رام کے کتابخانہ میں دیوان حسن کا ایک صحیح نسخہ موجود تھا - میری خوش قسمتی کہ کلیات حسن کا نادر نسخہ لکھنؤ سے مجھکو بھی مل گیا - حبیب گنج کے مختصر سے کتب خانہ میں اس کا نمبر $\frac{۵۱۵}{۶۲}$ ہے - تقطیع بڑی ہے - ۱۲ × ۸½ انچ - سطر فی صفحہ متن میں کہیں ۱۵ اور کہیں ۱۷ - حاشیہ پر فی صفحہ ۱۴ سطر - حجم چار سو صفحے - کاغذ باریک کشمیری - جدول سرخ ' سنہرا ' طلائی ' لاجوردی - پہلا صفحہ ندارد - دوسرا صفحہ درافشاں مطلا - گلکار طلائی و رنگ آمیز - خط جلی نستعلیق صاف - آخر سے ناقص سنہ ۱۲۵۶ ہجری کا لکھا ہوا - بڑی خوبی یہ کہ اکثر صحیح ہے - غلطیاں کم ہیں - تقریباً سات ہزار اشعار ہیں - اس میں سے غزل کے اشعار چار ہزار کے قریب ہیں - باقی دیگر اقسام - کاتب نے ترتیب یہ رکھی ہے کہ متن میں غزلیات ہیں - غزلیات کے بعد فردیات (۴۱) فردیات کے بعد رباعیات (۱۵۴) رباعیات کے بعد تضمین (۳) مخمسات (۱۴) آخر کا مخمس سخت فحش ہے - مسدس ایک - یہ بھی بہت فحش ' اور عظیم کی ہجو میں ہے - حافظ کی مشہور غزل ' دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا ' کو تضمین کیا ہے - مسدس کے بعد واسوخت ہے - عام واسوختوں کے خلاف یہ مسدس ہے - بند کا ہر شعر فارسی ہے مختلف شعرا کا - واسوخت کے بعد مثلثات (۳۱۰) تاتمام مثلثات پرنسخہ تمام ہو جاتا ہے - حاشیہ پر سات قصیدے ہیں - گیارہ

چھوٹی بڑی مثنویاں - تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن فارسی میں بھی شعر کہتے تھے - ایک شعر اس نسخہ میں بھی ہے —

اگر از دشمنانم بغ برکس دفع دشمن کن
وگر از دوستانم چارۂ درد دل من کن

تبصرۂ کلام

کلیات کے بعد تذکرۂ میر حسن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرحسن کو اساتذۂ فارسی کے کلام پر پورا عبور تھا - اساتذہ کی طرز کو خوب پہچانتے تھے - اس مناسبت کا جلوہ اُن کے کلام میں صاف عیاں ہے - میر آزاد نے آب حیات میں میر صاحب کو شعرا کے چوتھے دور میں شمار کیا ہے - معاصر جرأت - انشاء وغیرہ ہیں مگر میرحسن زمانۂ وفات کے لحاظ سے اُن سے مقدم تھے -

جرأت کی وفات سنہ ۱۱۲۵ ہجری میں ہے - انشاء کی سنہ ۱۲۳۳ ھ میں - یہ واقعہ ہے کہ جن شعراء اردو کو فارسی کلام پر عبور رہا ؟ اُن کا کلام بلند پایہ شعر حاصل تھا - جب اُردو شعراء نے اُردو کلام کو سامنے رکھا کلام اُس پائے سے گرگیا - بوالہوسی کے مضامین نے پست تر کردیا - سن چکے ہو کہ میرحسن نے ابتداء عمر میں خواجہ میر درد کی صحبت کا فیض پایا تھا - اسی فیض کا اثر تھا کہ تصوف کا رنگ اُن کے کلام میں برابر نمایاں رہا - نمونے آگے آتے ہیں - کلام کا عام انداز وہ ہے جس کو میر تقی میر اور خود میر حسن ؟ ادائیہ ؟ کہتے ہیں - سوز و درد کے ساتھ حسن و عشق کی داستان گویا آپ بیتی بیان کرتے ہیں - مبالغوں سے بچتے ہیں - بال کی کھال نہیں نکالتے - پیچ در پیچ استعاروں یا دور از حال تخیل کا نشہ نہیں - اسی لئے اکثر کلام دلنشیں اور دلگداز ہے - پڑھنے والا پہلی نگاہ میں متاثر ہوتا ہے - بار بار پڑھنے اور غور کرنے پر لفظ و معنی کی دلاویزی قائم

بلکہ برقی بذبر رہتی ہے - محض الفاظ کا طلسم یا محاوروں کی نمایش نہیں - اگرچہ مسی اور بالی کے مضمون جا بجا آئے جاتے ہیں تاہم حسن و ہوس کے عامیانہ مضامین سے بہت کچھ بچتے ہیں - کلام صاف ہے - تعقید بہت کم ہے - ابہام کے پاس نہیں - جو عرلیں بطور ایہام لکھی ہیں اُن سے بیزاری کا اِظہار کیا ہے - معلوم ہوتا ہے فرمائش سے مجبور ہوگئے تھے - لغطی رعایتوں سے بھی عام طور پر دامن بچایا ہے - کہیں باندھ گئے ہیں - تو اِسطرح —

(۱) بھلی ہے مجلس دنیا میں سچ پوچھو تو بیہوشی
کہ متوالا وہ ہی اس بزم میں ہے جو کہ مست والا

(۲) کھلے بندوں نہ پھر تو اس ادا سے
نہیں ہوجائینگے سب رہ گذر بند

(۳) جھڑے ہیں پلکوں سے موتی دختر رز کی تاک میں
یہ ہوا یہ موسم اور یہ ابرنیساں دیکھکر

دور چہارم کے متروک الفاظ - تک - جاگہ - بیت - ابدھر اودھر - کیدھر - سو - روز کب تئیں (کب تک کی جگہ) - آنکھ مندنا - آنکھ موبچنا - لوہو - اُس پاس (اُسکے پاس کی جگہ) - تھوڑ (جگہ) - بے وسواس (بےتامل) میں نالا (میں نے نالا) بسبب (باوجود اس کے) اگم تابی (بہت تابی) میاں وغیرہ وغیرہ اُن کے یہاں بھی ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی آخر کی ردیفیں آخر میں مرتب کی نہیں - اسی لئے ردیف با وغیرہ میں مذکورۂ بالا متروک الفاظ کم بلکہ بہت کم آئے ہیں اور زبان زیادہ صاف اور سلیس ہے - اس پر خصوصاً میر آزاد کا یہ مقولہ صادق آتا ہے - " اِن کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش نمائی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے -

میر سوز کا انداز بہت ملتا ہے ۔" فارسی ترکیبیں جا بجا دلکش پیرائے میں آئی جاتی ہیں ۔ مثلاً کم نما ۔ کم نگاہیاں ۔ پیش عشرت ۔ خزاں رسیدہ ۔ بوقلموں جلوہ ۔ عمل دوفنون ۔ آرے و نعم ۔ خوش دماغی ۔ خوش نگاہ ۔ واسد (عقدۂ دل کی) ۔ طرف غزالاں (مقابل غزالاں) ۔ کہیں کہیں (بطرز انشاء) کوئی عربی جملہ بھی بندھ گیا ہے ۔ " بیڑا ہی جگر تھا نہ حسن احرکم اللہ " جیسا کہ خود میر حسن نے لکھا ہے اُن سے اُن کے استاد میر صبا کی طرز تو نہ نبھ سکی تاہم بعض غزلیں اُن کے طرز میں ہیں ۔ اکثر کلام میر درد ۔ میرزا سودا اور میر تقی کے انداز پر ہے ۔ میر درد کے انداز میں جو غزلیں ہیں اُن کے اشعار کی تعداد بھی پانچ ، سات ہے ۔ سودا کی طرح میں زیادہ آمد ہے ۔ ایک ایک غزل سترہ سترہ شعر کی ہے ۔ اس پر بھی قلم کا حوصلہ نہ نکلا تو دو غزلہ سہ غزلہ چو غزلہ ہے ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو —

غزلیات میں اول غزل توحید میں ہے ۔ دوسری غزل نعت میں ۔ تیسری غزل نعت و منقبت میں —

نمونۂ حمد ۔

(حمد) مرضی ہو جہاں اُس کی وہی جا ہمیں بہتر
مشتاق دل اپنا نہیں کچھ باغ جناں کا

(نعت) ہے خاصہ و خلاصۂ کونین اُس کی ذات
اُس کے لئے ظہور ہے سب کائنات کا

(منقبت) سیراب مجھکو کیجیو محشر میں یا علی
امیدوار رہتا ہوں کوثر کے جام کا

تصوف -

یہ جو کچھہ قیل و قال ہے اپنا
وہم ہے اور خیال ہے اپنا

مرا ہے استقامت میں مثال شمع مر جانا
جہاں ثابت قدم رکھنا رہاں سر سے گزر جانا

ایک مجلس کے ہیں حسن و عشق اس میں عیب کیا
شمع گر تجھکو کیا تو مجھکو پروانہ کیا

طرفہ تر ہے کہ اپناہی تجانا اور تو بھی
اپنا اپنا کہہ کے مجھکو سب سے بیگانہ کیا

جانا تھا اُس کے کھوج میں میں بے خبر چلا
پارے اُسی نے لوٹ کے پوچھا کدھر چلا

کسی رنگ میں تو تجھے لینگے ہم
تو کب تک بھلا ہم سے پنہاں رہے گا

ہر ایک بدانت کی نہایت ہے ولیکن
اس عشق کے آغاز کا انجام نہ پایا

آساں نہ سمجھو تم تجوب سے پاک ہونا
اک عمر کھوکے ہم نے سیکھا ہے خاک ہونا

مجھے ہے بعد میں کام اپنے معشوق حقیقی سے
نہ سمجھو اور کچھہ اس گفتگو سے مدعا میرا

گر ہو حسن ؟ ' نہیں ؟ تو تیرے بھلے کو ورنہ
تجسس ہے اُس غنی کی مذکور کیا نہیں کا

شاہ ہوے علام کا بندہ
کون پوچھے ہے عاشقی میں ذات

توهي تو بولے هے پردے میں نہیں غیر کوئي
یار پہچانتے هیں یار کي آواز کي طرح

مجھے تو دید تھی منظور اے خدا تیری
نہ آیا تھا یہاں کچھہ میں در و دیوار کي خاطر

سرشتہ جس کے هاتھہ لگا عشق کا اُسے
تسبیح سے نہ شوق نہ زنار سے غرض

محشر کے حرف خوف کو بھولے هے سر بسر
آتا هے یاد جس کو مروت کا تیرے لفظ

حرف دوئي لکھوں میں کہاں اب کہ سرسر
هر لوح دلپہ ثبت هے وحدت کا تیرے لفظ

جس طرح سے شرر کے لیے سنگ هے وسیع
جلوہ کو تیرے میرا دل تنگ هے وسیع

پاني کي طرح پایا هے هر رنگ میں تجھے
یک رنگ بجھسا کون بھر رنگ هے وسیع

دوري میں زمزمے کے هے میرے جہاں تمام
از بسکہ میرا دامن آهنگ هے وسیع

هم بھی تب تک هیں یہاں جلوہ هے جب تک اُسکا
هستي سایہ بھي سچ پوچھو تو هے نور تلک

میں بھي ایک معني پیچیدہ عجب تھا کہ حسن
گفتگو میري نہ پہونچي کبھي تقریر تلک

آتا هے کیا نظر اسے شعلہ میں شمع کے
دیتا هے جان بوجھہ کے کیوں اپنا جي پتنگ

زندگی کا فلسفہ

سنتا ہے حسن نیکی ہی رہ جاتی ہے آخر
رہتا ہے نہ ایران نہ توران کسی کا

دھمکائے سے رقیبوں کے ڈرے ہیں کوئی ہم
ہمت جو ہو تو ایک کے آگے ہزار کیا

طول امل جہاں کا حسن حد سے ہے زیاد
ایک ایک اس کی راہ کا فرسنگ ہے وسیع

جب تلک زر ہے تو سب کوئی ہے ورنہ کوئی نہیں
سچ ہے مکھی بھی رہے ہے شکر و شیر ملک

ایک ہندو دوست کو کس محبت سے یاد کرتے ہیں —

یکنتھ ہو نصیب کہ تھا اُس کو سب سے اُنس
لالہ سروپ سنگھ بھی تھا زور یار پاس

صدمہ تھا ہجر کا کہ یہ تھا کیا غضب حسن
یوں دل جگر کو جس نے کیا میرے پاس پاش

آئی بھی رات روتی ہوئی شمع بزم میں
حال اُس کا پوچھ پوچھ صبا جان کھا گئی

جی اُس کی زلف سے نہ پھرا اور اس طرف
غم کی گھٹا تمام مرے دل پہ چھا گئی

تیر نگہ تو قہر غضب ہے کہ لاکھ میں
جس دل سے لاگ بھی اُسے پہچان لیگئی

دل دن کو چھین لے گئی مکھڑے کی یاد اور
راتوں کو نیند زلف پریشان لے گئی

نہ مینا ہے نہ مے ہے سب نہ اے ساقي تکلف ہے
اُسی کي داب باقي ایک اور باقي تکلف ہے
معسوق کا مشتاق بسر کون نہیں ہے
مارا ہے محبّوں کی محبت کے ستم نے
اگر جاؤں تو یہاں سے یا علي کہتا ہوا جاؤں
محبت میں علي کے تو اُٹھانا اے خدا میرے

رباعیات

ظاہر بھي توھي ہے اور پنہاں بھي تو ہے
معنے بھي توھي ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھہ سوا کوئي نہیں
یہاں بھی توھي ہے اور وہاں بھی تو ہے

کیا وحش و طیور و انس و جان عالم میں
جو ہیں سو حسن وہ روتے ہیں اس غم میں
روشن نہ سمجھہ ضریح پر قندیلیں
جلتے ہیں یہ دل حسن کے ماتم میں

دنیا کي نہ فکر میں نہ دین کے غم میں
شادي میں نہیں کسی کي نہ ماتم میں
کیا تجھکو بتائیں اپنا احوال حسن
رہتے ہیں سدا ہم اور ھي عالم میں

خط آویگا یا آپ وہ یار آجاوے
یا اُس کي خبرھي ایک بار آجاوے

اس سے بھي نہيں کام مجھے کچھہ لیکن
اس دل کو کسی طرح قرار آجاوے

ایک عمر کے بعد کل جو پایا دل کو
جي جانکے چھاتي سے لگایا دل کو
افسانۂ غم اپنا سنایا دل کو
کچھہ روئے آپ کچھہ رولایا دل کو

دل ہجر میں کس طرح بہل جاویگا
یہ بات غلط ہے کہ سنبھل جاویگا
گر یوں ھي قلق رہا کوئي دن تو حسن
گھبرا گھبرا کے جي نکل جاویگا

مثلثات

یہ نئي ہے مجھہ پر آفت یہ نیا ہے داغ دوري
شب از فراق منعم مکن از فغاں حضوری
چہ کنم دلے ندارم کہ فراق دیدہ باشد

مثال بلبل تصویر سب رہے بے خود
خزاں رسید و کسے آشنائے غیر نشد
بہار ہم چو غریباں دریں دیار گذشت

مرنے کے بعد بھي نہ گئي معري بات پیش
بر خاک رہ چو دید سرم زیر پائے خویش
پا بر سرم نہاد و نظر بار پس نکرد

گر عاشق صادق ھے تو کر سجدۂ یزداں
صبحے عجبی سر زد اراں چاک گریباں
بیدار شو اے گوشہ نشیں وقت نماز است

قصہ کو اپنے میں نے بہت کردیا ھے کم
تا آنکہ درد دل بتو بسیار گفتہ ام
نشنیدۂ ھنوز ز بسیار اند کے

دامن جھٹک کر مجھسے وہ جاتا رہا سرو سہي
اے آنکہ بندم مي دھي خاموش کیں دست تہي
کز دامنش کوتاہ شد سوے گریباں می رود

ڈھونڈ مارا دیر و کعبہ جہاں مارا دشت و باغ
خویش را ھر چند میجویم نمی یابم سراغ
آرزوے دل نمیدانم کجا دارد مرا

ھزار عقدے ھیں درپیش ایک ھو تو کہوں
زمانہ دشمن و من بے زباں و بخت زبوں
تو رحم کر نکتي کار مشکل افتاد است

نظر آتا تیرے جلوہ کا جب رنگ
دو عالم را نیک بار از دل تنگ
بروں کردم تا جائے تو باشد

آنے کی پھر امید یہاں اب نہیں رہی
منعم مکن ز گریۂ بسیار نستی
کز کوئے او بحسرت بسیار مي روم

جو کوسنے میں تیرے ہو شعا تو اور بھلا
نظیری از تو بجاں کندن است لب بکشا
بانعدو که بگوئی بسمر خورسند است
زمزمه هونتوسه آنکهوں میں نشه دل میں ترنگ
در بغل شیشهٔ و در دست قدح در برچنگ
چشم بددور که بسیار بسار آمدهٔ

(ترکیب تضمین ایجاد میرحسن)

مطلع پر دو مصرعے لگاتے ہیں - پھر حُسن مطلع - بعت الغزل پر بدستور ایک مصرعه -

نمونه

تضمین بر غزل صائب -
کل کے عالم بے تو کچھه مجھه میں نہیں چھوڑی تاب
باقي اب کیا ہے که جس کے لیے اے خانه خراب
دلربایانه دگر بر سر بار آمدهٔ
از دل ما چه بجا ماند که بار آمدهٔ

حسن مطلع -
اس نزاکت کو تھکانا ہے کہیں اے بد مست
از عرق زلف تو چوں رشتهٔ گوهر شده است
همه جا گر چه به سکین و بنار آمدهٔ

ماه ورد -
زمزمه هونتوسه آنکهوں میں نشه دل میں ترنگ
در بغل شیشه و در دست قدح در بر چنگ
چشم بددور که بسیار بسار آمدهٔ

بیت الغزل -

اس گھڑی آپ کو بھی غیر سمجھتا ہوں صنم
آبدر باس کہ من از سر جاں بر خیزم
چوں نغم خانۂ من بندہ نواز آمدۂ

ایضاً -

خرقۂ زہد کو دے شوق سے تو رنگ میں ڈوب
می بدہ می بستاں دست بزن پائے بکوب
در خراباتِ بہ از بہر بسار آمدۂ

ایضاً -

تو تو مت بیٹھ خنک بزمِ تو ہے صورت گرم
بگذر از بار بروں آئے ز بیراہن شرم
کہ عجب رنگ در آغوش بہار آمدۂ

ٹھہر جا آکے میرے سایۂ مژگاں میں ذرا
چوں نفس سوختگاں مدرسی اے باد صبا
میتواں یافت کزاں زلف دراز آمدۂ

قصاید

متن کی تفصیل آپ سن چکے ہیں - حاشیہ پر سات قصیدے ہیں - پہلا قصیدہ مسمی بہ لمعۂ نور منقبت میں ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی - کاروان مہتاب - آسمان مہتاب قافیہ و ردیف ہے - ایک ورق گم ہونے کی وجہ سے شروع سے ناقص ہے - دوسرا قصیدہ حضرت امام حسن کی منقبت میں ہے - نگارپا ' بہارپا ' قافیہ و ردیف ہے - تیسرا قصیدہ نواب آصف الدولہ کی مدح میں ہے - بوستان سخن و نکتہ دان سخن ردیف و قافیہ ہے - چوتھا نواب سالار جنگ کی مدح میں - شمشیر ' انجیر قافیہ ہے ردیف نہیں - پانچواں قصیدہ نواب آصف الدولہ کی مدح میں بے ردیف مقیم و نسیم قافیہ - چھٹا قصیدہ جواہر علیخاں کی مدح میں ہے - ہلال ' کمال قافیہ بے ردیف - ساتواں

نواب آدم علیخاں کی مدح میں تنگ، رنگ قافیہ ردیف ندارد ۔

انداز کلام

قصیدوں میں وہ زور کلام اور شکوہ الفاظ تو نہیں جو سودا اور ذوق کے یہاں ہے تاہم آمد ہے ۔ کلام صاف ہے ۔ عزلوں کے مقابلے میں متروک الفاظ قصیدوں میں کم ہیں ۔ مضمون بھی پیدا کرتے ہیں ۔ پہلے قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے :—

شکن سے زلف کے عارض نمود ہے ہر جا
ہیں ایک شب میں کئی بھر عاشقاں مہتاب

نواب آصف الدولہ کی مدح میں ۔—

ذکر سن سن تری ستاون کا ہے صدف گوش سامعان سخن

قصیدہ مدح سالار جنگ کی تشبیب میں —

کھنچا ہے حُسن کا اس کے ورق ورق پہ خیال
یہ دل ہے میرا کہ یا رب مُرقّعِ تصویر

مدح ۔

عرضکہ دیکھ کے ماہی پہ اُس کو کہتی ہے خلق
کہ جلوہ گر ہے یہ ابر سیہ میں ماہ منیر

ماہی کی تعریف —

ہے اُس کے ماہے پہ اس طرح جلوہ گر آنکس
کہ جیسے عکس مہ نو پڑے بچشمۂ قیر

گریز کا نمونہ ۔ بہاریہ تشبیب کے بعد —

گلشن ہستی میں اس طرح چمن عیش آباد
کس کی خاطر سے ہوا ہے یہ خداوند علیم
شاید اس باغ میں ہے آصف دوراں کا گزر
کہ وہ ہے ابن کریم ابن کریم ابن کریم

آصف‌الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم

نائب ظل خدا صاحب تاج و دیہیم

حضرت امام حسن کی منقبت کے قصیدہ میں دعائیہ مضمون ایسا ہاتھہ آیا ہے کہ مدح حسن کا حصہ ہو گیا —

از بس حسن ازل سے غلام حسن ہے تو

سر سبز رہ جہاں میں مرادیں ہزار یا

اور بعد اپنی عمر طبیعی کے ہند سے

جا جنۃ‌البقیع میں کنج مزار یا

مثنویاں

مثنویاں گیارہ ہیں - اول سحرالبیان - معروف بہ بدرمنیر - اس مثنوی کی بابت اپنا لکھا جا چکا ہے کہ اب کچھہ لکھنا عبث ہے - بقول پروفیسر آزاد بے نظیر اور بدرمنیر کا قصہ بے نظیر لکھا اس کی صفائی بیان اور لطف محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا اور ادا کی نزاکت اور جواب و سوال نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے -

دوسری مثنوی رموزالعارفین ہے - یہ مثنوی مولانائے روم کی بحر میں اور اُسی کے طرز میں تصوف میں ہے - جابجا مثنوی شریف کے اشعار تضمین کیے ہیں - بزرگان دین کی حکایتیں بیان کر کے نکات حقیقت سمجھائے ہیں - سنہ ۱۱۸۸ ہجری میں وفات سے تیرہ چودہ برس پہلے زاد آخرت اور گیارہ سُنّاب سمجھہ کر نظم کی ہے - چنانچہ دیباچہ میں لکھا ہے —

شاعری میں عمر کھوئی میں تمام

میں بے معنی کا کیا ہرگز نہ کام

اپنی اس بیہودگی سے ہوں خجل

شعر لکھنے سے بھرا ہے میرا دل

جي ميں هے وہ جو هوئے هيں نيک نام
کچھہ لکھوں ميں اُن بزرگوں کا کلام
جس کے سننے سے هو عقبیٰ کا حصول
کوئی دم ميں جاؤں اس دنيا کو بھول

گرچہ هيں يہ درد کی باتيں لکھيں
پر سر دستگي جوسی کا يہ کہيں
در بس هر گريہ آخر خندہ ايست
مرد آخر بيں مبارک بندہ ايست
عارفوں کے بس کہ هيں رمزيں لکھيں
نام اس کا هے رموزالعارفيں
جب بھرا دُر معانی سے يہ طشت
بھے هزار و يک صد و هشتاد و هشت
۱۱۸۸

حمد و نعت کے بعد چار بار و پنجتن کی منقبت هے - پھر وجہ تالیف - اس کے بعد شروع داستان کے عنوان سے آغاز کلام - اس عنوان کا پہلا شعر يہ هے :-

بشنويد اے دوستان ايں داستاں
جود حقيقت بعد جاں ماست آں

تيسري مثنوي جواهر علي خان کے قصر جواهر کی تعريف ميں هے - اس ميں مکان کے مختلف قطعات کا باغ کا فوج کا ذکر هے - ممدوح کي ثنا و صفت -

چوتھي مثنوی نواب آصف الدولہ بہادر کی شادي کی صفت ميں هے - نواب شجاع الدولہ کے عہد ميں لکھی گئي - علاوہ روشني وغيرہ

برات کے لوازم کے ذکر کے نواب شجاع الدولہ کی مدح ہے -

ساتھویں مثنوی '' ہجو حویلی میر حسن '' ہے - مکان کے ہر حصے کو دل کھولکر برا کہا ہے - اس مثنوی کی زبان اور طرز میر بھی میر کی مثنویوں سے ملتی جلتی ہے -

چھٹی مثنوی نواب آصف الدولہ کے باورچی خانہ کی تعریف میں ہے - مسمی بہ '' خوان نعمت '' دسترخوان کی مدح میں لکھتے ہیں :—

نہ تھا گوشہ کوئی لذت سے خالی
برنگ سر نعمت خان عالی

کھانوں کی نام بنام تعریف کی ہے جس سے اُس عہد کے کھانوں کے نام و اقسام معلوم ہوتے ہیں -

معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوست کو بطور نامہ منظوم یہ مثنوی بھیجی ہے اس لیے کہ جا بجا اُس کو دسترخوان کی نعمتوں کے محظوظ ہونے کی ترغیب دیتے جاتے ہیں -

ساتویں مثنوی فیض آباد کی تعریف میں ہے - اس کا باریکی نام گلزار ارم ؟ ہے گلزار کا املا دال سے کھٹکتا ہے -

اس میں ؟ ہندوستان؟ سے نکل کر یورپ جانے کا حال ہے - دلی سے چل کر کئی مہینے ڈیگ میں (ریاست بھرت پور) رہے ہیں - وہاں سے مدار صاحب کے جھڑیوں کے ساتھ مکن پور آئے ہیں - اس سلسلے میں جھڑیوں کا اُن کے رسوم کا میلے کا ذکر تفصیل سے ہے - جس و عشق کے جرچے برابر ہوتے جاتے ہیں - مکن پور سے لکھنؤ آتے ہیں - اور اس کی دل کھول کر ہجو کرتے ہیں - نواب آصف الدولہ اور اُن کی عمارت کی البتہ تعریف کی ہے —

رہے بت آصف‌الدولہ سلامت
کہ جس نے کی یہاں طرح اقامت
عمارت کی یہاں وہ اس نے بنیاد
کہ بطارہ سے جس کے ہو جہاں شاد
رہے قائم سدا یا رب یہ سردار
کہ بنگلہ لکھنؤ ہے جس سے گلزار

ایک جگہ عمارت کے بیان میں کہا ہے :—

نمونوں میں یہ ہے ہندوستان کے
وہی ہے یہ مرقع کا وہاں کے

لکھنؤ سے گھبرا کر فیض‌آباد آئے ہیں - شہر مذکور کی تعریف میں قلم توڑ دیے ہیں - فضارا پھر لکھنؤ پہنچ گئے -

یہ تھی معلوم مجھکو یہ جدائی
فضا پھر لکھنؤ میں مجھکو لائی
برا دن سر سے قسمت نے یہ ٹالا
مجھے جنت سے جوں آدم نکالا

فیض‌آباد دوبارہ جانے کی حسرت ہے اور دعا - اسی پر ختم کلام ہے - دلی کے چھوٹنے کا صدمہ دل پر برابر تھا - کہتے ہیں :—

اگرچہ اب تو وہ صحبت کہاں ہے
نہیں گو زخم پر اُس کا نشاں ہے
کرے ہے ذکر دلی کا کوئی جب
مری آنکھوں سے گرتا ہے لہو تب

شروع میں اپنے دو رفیقوں نورالله اور سیف‌الله کا ذکر کیا ہے - یہ مثنوی مخزن لاہور نے مثنوی شعرالعجم کے ساتھ چھاپ کر شائع کر دی ہے -

آٹھویں مثنوی جواہر علی خاں کی مدح اور تہنیت عید میں ہے اسی لیے اُس کا نام ' عید کی تہنیت ' رکھا ہے

کہ ہے عید کی تہنیت اس کا نام -

نویں ' دسویں ' گیارھویں ' مثنویاں چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں - نویں اور گیارھویں فحش ہے - دسویں مذاہبہ -

یہ مقالہ ہندستانی اکیڈیمی کی دوسری اردو کانفرنس منعقدہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں پڑھا گیا تھا - اس میں صرف حسن کی غزلوں کا انتخاب بھی شامل ہے' غزلیں چونکہ مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں اس لیے اس مقالہ میں سے بخوف طوالت اِس انتخاب کو حذف کر دیا گیا - (مرتب)

شاہ بیگم

[جے پور کی راج کماری - جہانگیر کی پہلی بی بی - خسرو کی ماں -]

(از مولوی سید مقبول احمد صمدانی صاحب "حباب جلیل")

عوامے عشق و شور جنوں ؟ ماجرائے عقل

افسانۂ تو ؟ قصۂ تو ؟ داستان تست

عصر جہانگیری کے تمام مورخ اِس بارے میں متفق ہیں کہ جہانگیر کی پہلی شادی پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہوئی ؟ اور بڑے اہتمام اور تُزک و احتشام کے ساتھ رچائی گئی تھی - حضرت تعصبات کے بیان میں بھی کچھ فرق نہیں کرتے - جو کچھ فرق ہے ؟ وہ طرز ادا ؟ سخن طرازی اور ایسا پرداری کا پایا جاتا ہے - ہر اہل قلم اپنے معاصر یا متقدم سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا اور ایک نقش رنگین آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتا ہے -

شرف الملک معتمد خاں ترک کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اُنتیسویں سال جلوس اکبری میں شاہزادہ کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو ۹۹۳ ہجری (۱۵۸۵ع) میں راجہ بھگوان داس کی بیٹی (مان سنگھ کی بہن) سے اس کی خواستگاری و نسبت کی گئی - راجہ نے بھی اس مرغوب در پیش و پیشکش کے تمام لوازم ختم کر ڈالے اور اس قرابت و شادی کو اپنے اسلاف و اخلاف کے اعزاز و افتخار کا وسیلہ سمجھا - تمام شاہزادوں اور بیگمات اور امرا و سرداران شاہی اور ملازمان خدمت کو ان کے شایان شان سامان ضیافت بھیجا - شاگرد پیشہ اور احدیوں (باقی گارد) کو تمام تمام سرانجا

(خلعت) پہنچے - اس تقریب کی عظمت و جلالت اور موزخ کی تحریر کا انداز شوکت خود اُسی کا مختصر نویس قلم ظاہر کرسکتا ہے -

''صبیۂ قدسیہ راجہ بھگوانداس را کہ از اعاظم امرائے این دولت ابد مقرون بود و در زمرۂ راجہائے نامدار بہ مزید شوکت و اعتبار اختصاص داشت ، بجہت آن حضرت خواستگاری نمودند و دولت خانۂ خاص و عام را آئین بستہ جشن بادشاہانہ ترتیب دادند حضرت عرس آشیانی بورود مقدم اقبال توام منزل راجہ را پایۂ آسمانی بخشیدند و آن نابوے حجلۂ عصمت و عفت را بگوہر یکتائی خلافت و سلطنت عقد ازدواج خجستہ اختتام (امتزاج ؟) بستہ بدولت سرائے جاوید آوردند -''

خلاصہ - ''راجہ بھگوانداس سلطنت کے بڑے امیروں میں سے تھا - نامور راجاؤں میں شمار ہوتا تھا - اس کی خدمت اور اُس کا اعتبار اوروں سے زیادہ تھا - راجا کی بیٹی جہانگیر کے لیے مانگی گئی - دولت خانہ خاص و عام کی آئینہ بندی کی گئی - بادشاہانہ جشن منایا گیا - خود اکبر نے راجہ کے گھر جا کر اُس کی عزت بڑھائی اور لڑکی کا بیاہ شاہزادہ سے کر کے اپنے یہاں لے آیا -''

اسی شادی کا تذکرہ خافی خان ، نظام الملکی ، ان الفاظ میں کرتے ہیں -

''چندے کہ بانوئے سال از بستو و نمائے بہال سر سوبت در گلشن جاہ و جلال گذشت ، صبیۂ راجہ بھگوانداس را کہ از راجہائے نامدار ہندوستان گفتہ می شد ، برائے صاحبزادۂ جوان بخت خواستگاری نمودند - و خزینہ بدولت و اقبال در حسن طوے بجانب راجہ مشرف ارزانی فرمودہ آن

بانوے حجلۂ عصمت را بعقد در آوردہ بدولت خانۂ اند بعود در آوردند ''

خلاصہ :- '' شاہزادے کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو راجہ بھگوانداس

جو ہندوستان کے نامی گرامی راجاؤں میں مانا جاتا تھا '

اُس کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ کی منگنی کی گئی - خود

بادشاہ سلامت اس شادی کے جشن میں راجہ کے گھر تشریف

لے گئے اور عقد کر کے لڑکی کو اپنے دولت خانہ پر لے آئے -''

خافی خان ایک مستند و محتاط مورخ ہیں مگر سال عقد کے بارے میں یا تو اُن کے قلم نے لغزش کی ہے یا شیخ عبدالقادر بدایونی کے خامۂ معجز نگار نے - خافی خان کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ اسی سال جلوس اکبری یعنی ۹۹۴ ھ میں شاہزادہ محمد سلیم کا جشن طوے راجہ بھگوانداس کی بیٹی سے (بسلسلۂ جشن نوروز عالم افروز) ہوا تھا کہ کابل سے میرزا محمد حکیم کے مرنے کی خبر پہونچی اور کنور مان سنگھ پسر راجہ بھگوانداس حکومت کابل پر مختار کیا گیا - ملائے بدایونی اس جشن کا ۹۹۳ ھ میں ہونا (یعنی سال مذکور کے قبل میں) بتاتے ہیں - مسٹر بیل نے بھی یہی لکھا ہے -

سنہ ۹۹۳ ھ کے حالات میں مُلا قاسم ' ہندو شاہ ' فرشتہ کا بیان ہے -

'' وہم دریں سال صبیۂ راجہ بھگوانداس را طوئے وجشن عظیم کردہ بعقد شاہزادہ محمد سلیم در آوردند - ''

شاہ نواز خان کہتے ہیں کہ سال بست و نہم دختر عمت سرشت راجہ را با شاہزادہ سلیم بموجب بیوگانی بستند -

یہ راجہ بھگوانداس کچھواہہ ' والی جے پور ' اکبر کا امیرالامرا ' بڑا مقرب و معتمد ' آزمودہ کار سپہ سالار ' اور مدبر و منتظم صوبہ دار تھا - بہت سے کارہائے نمایاں کیے اور بارہا شجاعت و بسالت کے جوہر دکھائے

تھے - اُس کی تعریف اِسی قدر کافی ہے کہ راجہ بھارامل کا بڑا بیٹا، اور مرزا راجہ مان سنگھہ فاتح مدواڑ و گورنر کابل و بہار کا نامور باپ تھا - [لالہ سجان راے ان دونوں نامون کو بالترتیب بھگونت داس اور بہاری مل لکھتے ہیں -]

شیخ عبدالقادر بداونی نے اس تعریف ساھانہ کی دھوم دھام اور آراستوں کے حالات کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھہ لکھے ہیں - بداونی نمبر بہادر شاھی کا بیان ہے کہ اکبر نے مصالح ملکی اور مہام سلطنت کے لحاظ سے سنہ ۹۶۳ ھجری میں تجویز کیا کہ شاھزادۂ ولیعہد (جہانگیر) کا عقد فرابت نامور خاندان کچھواھہ سے کیا جائے - یا جیسا کہ (قول علامۂ شبلی) بعض اھل راے کی روایت ہے ؟ راجہ بھگوانداس نے اپنی بیٹی دینا ؟ اور خود ؟ اپنی مرضی و خوشی سے منظور کیا تھا -

محبانا کیوں ہے ! میں ضامن - ادھر دیکھہ

شہیداں نگہ کا خون بہا کیا ! !

جوان دولت ؟ جوان بخت ؟ جوان سال شاھزادہ (سلیم) سولہ برس کا تھا - بادشاہ مع تمام امرا اور درباریوں اور خدم و حشم کے راجہ کے گھر گیا - مجلس عقد میں ایک طرف شرفائے اسلام، مفتی و قاضی رونق افزا تھے ؟ دوسری طرف ھندو عمائد ؟ پروھت ؟ برھمن اور منڈپ جلوہ افروز - پہلے مسلمانوں کے طریقہ پر نکاح ھوا - خطبہ پڑھا گیا - دو کرور ٹنکے (یا حسب تحریر مآثرالامرا ؟ دو کرور روپیہ) کا مہر باندھا گیا - پھر ھندوؤں کی ساری رسمیں انجام دی گئیں - پھیرے پڑے - ھَوَن ھوا - جملہ شاہ عروسی یعنی دلہن کے گھر سے دلہا کے عشرتکدہ تک خود بادشاہ سلامت (اکبر) عروسی محافہ (جھولہ یا پالکی ؟ پالکی) پر اُسرویاں نچھاور

کرتا لایا - پالکی کو ایک طرف بادشاہ کندھا دئے تھا ؟ دوسری جانب شہزادہ - راستہ بھر قیمتی اور پُر تکلف ریشمی کپڑوں کا فرش بچھا تھا - راجہ نے جہیز بھی دل کھول کر دیا - اصطبل کے اصطبل خالی کردئے - ان میں عراقی بھی تھے ؟ عربی بھی ؟ ترکی بھی ؟ کچھی بھی ؟ کہ اُس زمانہ میں گھوڑوں کی اچھی سی اچھی نسلیں بھی سمجھی جاتی تھیں - سو ہاتھی تھے - اور سیکڑوں لونڈی غلام - ہندوستانی بھی ؟ حبشی بھی ' خنثی و خرکس بھی - مرصع و مکلل آلات و زیورات ' سونے چاندی کے ظروف ' طرح طرح کے برتن اور اسباب - غرضکہ سب کچھ دیا اور بہت کچھ دیا - امرائے شاہی اور سرداران ہمراہی کو بھی حسب مرتبہ و حیثیت خلعت اور گھوڑے مع نیش قیمت زین اور جڑاؤ ساز و سامان کے عطا کیے -

شعرائے دولت نے مبارکبادیں نثر کیں - ابوالفیض فیضی نے قطعۂ تاریخ نذر دیا -

رفت عقد دُر پاس سلطان سلیم
کہ بود دہد سال امید را
ز دردِ آفتابِ دل
برائے سدہ ماہ و ناہید را (سنہ ۹۹۳ ھ)

ابوالفضل نے عرض کیا -

دین و دنیا را مبارکباد ' کین فرخندہ عقد
از برائے انتظام دہناء و دین بستہ اند
در نگارستانِ دولت نور چشمِ شاہ را
حجلۂ چون پردہائے دیدہ رنگین بستہ اند

شیریں زبان و شیوا بیان شبلی نے بھی اس تقریب کو تین سو برس بعد یاد کیا ہے - اُن کے دلاویز قطعہ کے بہت سے شعر زبانوں پر رہتے ہیں - (اول و آخر چھوڑ کر)

قرابت راجگان هند سے اکبر نے جب چاهي
کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرماندہِ جے پور نے نسبت کي خواهش کي
اگر چہ آپ بھي وہ صاحبِ دیهیم و افسر تھا
ولي عہدِ حکومت اور خود شاهنشہِ اکبر
گئے اجمیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا
اُدھر راجہ کی نورِ دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھي
اِدھر شہزادے در چترِ عروسي سایہ گستر تھا
دلھن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے
کہ کوسوں تک زمین پر فرش دیباے مشجر تھا
دلھن کی پالکی خود اپنے کندھے پر جو لائے تھے
وہ شاهنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

شاہ نواز خان نے مآثرالامرا میں اس تقریب کو تقریباً پوري تفصیل (مندرجہ بالا) کے ساتھ درج کیا ہے مگر جیسا کہ اُن کي اور بعض اور مسلمان مورخین کی روش ہے، اس وادي میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے ۔ لکھتے ہیں کہ

عرش آسیائی بفروغ قدوم، منزل راجہ را روشنی افزود ۔ اُو حسن خسروانہ ترتیب دادہ چہار عروس دلپسندش از نظر گزرانید ۔ کہ تفصیل آن متحمول بر مبالغہ مي‌شود ۔

آجکل کی دنیا شاید اس کو حکمت عملی یا مصلحت کوشي سے تعبیر کرے یا اکبر کی ہمت کبر و صلاح اندیش یالسي سے ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اکبر کا یا کسی اور بادشاہ کا بیٹے کے سگائی کے لیے، یا شادي بیاہ کے موقع پر، سمدھی کے یہاں جانا آئین شرافت اور دستور قرابت کا پہلا باب تھا، اور اب بھي ایشیائی ممالک کی رسوم و آداب میں اُسی قدر

ضروري و اهم سمجها جاتا هے ـ چنانچه اسي تقريب کے سال بهر بعد، یعني جب جهانگیر سترہ برس کا هوا، تو سنه ۹۹۴ھ میں اس سے بهی زیادہ رونق و التیام، کوکبۂ و احتشام، جماعت و انبوہ، فرو شکوہ، شوکت و شان اور آن بان کے ساتهه اس کا بهی شادي بیاہ کیا گیا ـ اور نه تنها اکبر بلکه تمام بیگمات و مستورات حرم سراے سلطانی، دلهن کے لینے کے لیے، اُس کے گهر گئیں ـ خافی خان لکهتے هیں —

دختر فرخندہ اختر راجه اودے سنگهه پسر راجه مال دیو (مرزبان مارواڑ) که در حسب و نسب و دولت موروثي بر همه راج هاے عالي تبار افتخار داشت؟ بعقد آن گوهر بحر سلطنت و جهانباني نیز در آوردہ خود بذات شریف و همه حجله نشینان سراچۂ عصمت؟ رونق افزاے خانه و کاشانۂ راجه گردیدند — و بحور رسمه و دستور سربر آرایان هند لوازم شادي بمقدم رسانیدند -

"راجه مال‌دیو کا بیٹا راجه اودے سنگهه (والی مارواڑ) حسب و نسب اور موروثی دولت میں تمام بلند مرتبه راجاؤں سے ممتاز و مفتخر تها - اُس کی لڑکی کے ساتهه شاهزادہ کا عقد هوا ـ بذات خود بادشاہ اور تمام بیبیاں اور بیگمیں؟ راجه کے یہاں گئیں اور هندستان کے بادشاهوں کے رسمه اور دستور کے مناسب لوازم شادی انجام پائے ـ"

سبلي کی تربت منور رهے، سچ فرمایا هے —

یهی هیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
که جن سے بوستان هند برسوں تک معطر تها

گذشته صحبت میں گذارش کر چکا هوں که ان مخلوط و مختلط قرابتوں کے متعلق دوست و دشمن سب یکساں راے رکهتے هیں -

رہا ہاشمی طریق عمل اور سلوک و مودت - اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ حق پسند و منصف مزاج دوست بھی اعتراض و حرف گیری سے معاف نہیں رکھتے - برملا سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں - مگر اس کا کیا علاج کہ ہر حال میں اپنے ' اپنے سمجھے جاتے ہیں - ان کے اقوال کی ' آپ کے یہاں وقعت نہیں - میرے نزدیک ضرورت نہیں - اس لئے صرف بعض مصلحت شناس و ناچیز انگریز مورخین کی تحریرات نقل کر دینا کافی ہوگا - مسٹر ایچ - جی - کین ؟ '' مغل ایمپایر '' میں لکھتے ہیں کہ '' اکبر نے وسط ایشیا سے تعلقات قرابت و ازدواج قطع کر دئے اور امبیر کے کچھواہہ خاندان سے شادی بیاہ کرکے اتحاد و یگانگی کی بنیاد قائم کی - اس نے ہندوؤں سے رسم و راہ پیدا کر کے اپنی رعایا کے لئے عمل و مواقعت کی ایک سیدھی راہ دکھا دی - '' دوسرے موقع پر کہتے ہیں کہ '' نہ تو اکبر نے ؟ نہ جہانگیر نے اپنی ہندو رانیوں یا بیگموں کو تبدیل مذہب کرایا - نہ اسلام اختیار کرنے کی ترغیب دی - '' ایچیسن ٹیکن صاحب ان بادشاہوں کی مذہبی رواداری ' رانیوں کی ہندوانہ پرستش اور آزادانہ عبادت گزاری کی تحسین کرنے اور محلات سلطانی میں ان کی ضروریات اور پوجا پات کے مناسب حال تعمیرات کا ذکر فرماتے ہیں - نامور میکس مولر نے اپنی نفیس تصنیف '' سائنس آف ریلیجن '' کے حصہ اول میں اس بارہ میں سیر حاصل بحث کی اور مشہور کتاب '' فرینڈس اینڈ فور '' (دوست و دشمن) سے اقتباسات و انتخابات دیے ہیں - کارپنٹ صاحب تو اس درجہ تک بڑھ کر کہہ گئے ہیں کہ '' جہانگیر اُن لوگوں کو پسند ہی نہیں کرتا ہے جو اپنا مذہب بدل دیتے ہیں - وہ اپنے خود ساختہ مذہب کے سوا کسی دوسرے دین کا پابند ہی نہیں ہے - یہی وجہ ہے کہ اُس کی سلطنت

میں تمام مذاہب کا یکساں احترام ہے۔" کین صاحب کہتے ہیں کہ "جہانگیر جب ولی عہد سلطنت تھا تو اکبر نے اُس کی ہندو رانیوں کے لئے فتحپور سیکری میں مکانات بنوا دیے تھے اور ٹیول فرگسن صاحب ان محلات پر ہندوانہ، خصوصاً جین وضع کی آرایش و تزئین کرائی تھی۔" مسٹر اسٹینلے لین پول اپنی تاریخ "قرون وسطیٰ کے ہندستان" میں راوی ہیں کہ اکبر کی جے پوری دلہن آزادی کے ساتھ اپنے مذہب و ملت کے تمام رسوم و ارکان ادا کرتی تھی اور ہندوؤں کی معبدہ قربانیاں بھی کرتی تھی۔ وینسنٹ اسمتھ صاحب کا قول ہے کہ مذہبی معاملات میں جہانگیر اپنے باپ ہی کی طرح رواداری برتتا تھا۔ مسٹر رھلیر بحوالہ منوکی لکھتے ہیں کہ عالمگیر کی ماتحت ایک راجپوتانی شاہزادی، اُس کی بہن اور جوائی کی بی بی تھی۔ حرم سرائے شاہی میں بڑا رسوخ اور اثر رکھتی تھی۔ محل کے اندر اپنے کمرے میں وہ خوشبوئیں جلاتی تھی۔ اس کا شوہر اگرچہ سخت پابند مذہب تھا، لیکن اُس کے دینی معاملات میں دست اندازی نہ ہوتا، دخل نہ دیتا تھا۔ مولف اُمرائے ہنود کا بیان ہے کہ آگرہ کے قلعہ کے محل میں ایک طرف مرکھیا اور دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک موجود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ محلات شاہی میں راجاؤں کی بیگموں کو اپنے مذہب کی رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ بالفاظ مہر بدایونی "راج کماریاں بیسوری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پات کرتی تھیں۔ تھاکرجی کو جل پھول چڑھاتی تھیں۔ تلک لگاتی تھیں۔ پرکرما کرتی تھیں۔ ہون کرتی تھیں۔" مسٹر کین شاہجہاں کے بارے میں بہت سی باتیں الفنسٹن صاحب سے اور کچھ اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ امر قابل تحریر ہے کہ شاہجہاں نے ہندو خواتین کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج اُٹھا دیا جو اُس کے پیشروؤں نے قائم کیا تھا"

رفع دخل — میں نہیں سمجھتا کہ ان دونوں صاحبوں کی تحریر کسی تحقیق یا اطلاع پر مبنی ہے ۔ ہندستان کی تاریخیں اس کے خلاف شہادت دیتی ہیں ۔ یہ سلسلہ جو اِن سے پہلی، جودھپوری اور اور راجاؤں کے دم قدم سے چلا تھا، فرخ سیر تک ختم نہیں ہوا ۔ سب سے اخیر راجپوتنی مہاراجہ جسونت سنگھ کی بیٹی تھی جو دلی کے لال قلعہ میں آ کر دلہن بنی ۔ اس سنہ طالع، سنہ قدم راجکماری کی شاندار آمد، سوہر کی معزولی و ہلاکت اور اِس کی ناشاد رہنائی کے بارے میں "حیات جلیل" کے بہت سے ورق سیاہ کر چکا ہوں ۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کے محل میں تاج ہندو راجاؤں نہیں اور جہانگیر کے یہاں تاب ۔ شاہجہانی چمن دیسی پھولوں کی بہار اور خوشبو سے ضرور خالی رہا ۔ لیکن اِس کے بھائی دروا، اِس کے دونوں بیٹوں، مراد اور سجاع، کی محلسراؤں میں راج دلاریاں راج کماریاں رونق افزا تھیں ۔ خود عالمگیر اورنگ زیب کی دو بیگمیں راجپوت تھیں ۔ ایک راجہ کشنوار (کشمیر) کی بیٹی یا (حسب روایت منتخب اللباب) رواسی، جس کے بطن سے بہادر شاہ تھا ۔ دوسری، اودے پوری، جس نے مرتے دم تک اپنے تاجدار سرتاج کا ساتھ دیا اور حق وفا ادا کیا ۔ اسی طرح اور بھتیجی شاہزادوں کو لیجئے ۔ دارا شکوہ کا فرزند سلیمان شکوہ، عالمگیر کے چاروں بیٹے، پوتے اور پر پوتے، سب اسی شاہانہ سوغات سے مستفید و فیض یاب تھے ۔ گورگانی یا صاحب قرانی شجرۂ نسب میں ایسی سات راجاؤں کے نام روشن نظر آتے ہیں، جنکے "بیٹے" بھی مُکت دھاری تھے اور "پوتے" بھی مکت دھاری ہوئے ۔

تاراج — جہانگیر کی اس تہائی شادی کے پہلے ہی سال ۹۹۴ ہجری میں شاہزادی سلطان النساء پیدا ہوئی جو سلطان بیگم بھی کہلاتی ہے ۔ دوسری برس، ۲۴ امرداد کو (بماہ رمضان سنہ ۹۹۵ ہجری = اگست

سنہ ۱۵۸۷ ع) بیٹےکی (لاہور میں) ولادت ہوئی - دادا جان (اکبر، عرش آشیان) نے سلطان خسرو نام رکھا - یہ بڑے لڑکے کا بڑا بیٹا تھا، اپنا پہلا دوا - بڑے حسن منائے - خوب خوشیاں کیں - فرشتہ کہتا ہے -

و درین سال سنہ ۹۹۶ ھجری والادت سلطان خسرو ولد شاہزادۂ عالمیان شاہزادۂ محمد سلیم از دختر راجہ بھگوانداس روے نمود - عرش آشیانی از طلوع اولین کوکب ؟ بدرہ‌ا‌خوشحال شدہ در آرائش جشن تا قصےالغایہ کوشید -

اس مبارک موقع پر شاہزادہ سلیم نے اس رانی یا بیگم کو "شاہ بیگم" کا خطاب دیا تھا - شاہ بیگم بڑی عقیل ؟ دانش مند ؟ زیرک و دور اندیش ، وفاکیش اور غیور بھی - اِس کو اپنے شوہر سے اُلفت نہیں، عشق تھا - شوہر کی محبت بھی جنون محبت تک پہونچی ہوئی تھی - جس کو دوسری بی‌بی (جودھ بائی ؟ دختر راجہ اودے سنگھہ) بھی کم نہ کر سکی - اور اُس کے حسن و جمال ؟ ناز و نیاز ؟ کرشمہ و انداز کے تمام حربے بیکار ثابت ہوئے - ع - ہم بھی دیکھیں کہ مچلتی ہیں نگاہیں کیونکر - حالانکہ دونوں کے سوانح، لطیفے اور نکتہ سنجیاں دیکھہ کر جسک مزاج و خشک دماغ ؟ معقول ؟؟ کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ جودھ بائی (جگت گوسائیں) وہ خوش سلیقہ و خوش مذاق ملکہ، وہ نگار آفرینیں، وہ محشر در آستیں تھی، جس کی چشمکوں اور حاضر جوابیوں نے فتنہ ادا، ناوک افگن، نور جہاں، بیگم کی خودبیں فہم و رسائی طبع ؟ نکتہ دانش حسن کو بھی ماند کر دیا تھا - جہانگیر کی ایک تیسری بیگم ؟؟ صاحب جمال ؟؟ اسم با مسمیٰ تھی - بڑے ناموں اور کار گزار ناب کی بیٹی تھی - اکبر نے سلیم کی شادی اس سے کر دی تھی، تا جیسا کہ دربار اکبری ؟ میں تحریر

---

۱ معقول — بات وہ جو ہے دانشوروں جنوں - در ۔ لوگوں میں ہو افسانہ — ؟

آرائش — مہارانی نفس، مضمون فرینی اور سحر کاری آج تھی روح کو تڑپا دیتی اور دل کو گرما دیتی ہے - ناز والو — کہاں ہو ؟ — تم ہی بتاؤ —

— ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھہ ہماری خبر نہیں آتی" —

ہے ''مینا بازار کی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خان کوکہ کے بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا ۔ غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی ۔ اکبر نے خود شادی کر دی''۔بہر کیف شوہر کی بڑی محبوب رفیق اور چہیتی بی بی تھی ۔ لیکن سیرت نگاروں سے پوچھیے ۔ شاہ بیگم کے سامنے صاحب جمال کی کیا حقیقت تھی ؟ ع

بزم جمال ' مرحبا ! پیکر نار ' آفریں ۔

[عذر—پردگیان عصمت و عفاف کے بارے میں میں خیال کی ادنیٰ سی جولانی یا قلم کی شوخی روا نہیں رکھتا لیکن یہ اظہار حقیقت حال تھا جو زبان قلم سے بے اختیار نکل گیا ۔ تہذیب جدید کی صبا پاشی یا دَور حاضر کے ادب پر محمول نہ کیا جائے ۔ ابھی آپ سنیں گے کہ خود جہانگیر شاہ بیگم سے (مومن کی زبان میں) کیا کہہ رہا ہے ۔

افسوس ! کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں '

وہ جس جس سے عشق ہو رسوا ' نہیں رہا ۔]

شاہ بیگم کا اندوہناک انجام ' یا اس تصویر کا دوسرا رخ تھی ' ملاحظہ طلب ہے ۔ وہ شاہزادہ (خسرو) ' جس کے ساتھ ساری چغتائی قوم کی امنگیں اور توقعات وابستہ تھیں جس کی آمد ' نشو و نما اور ترقی سے تیموری خاندان کو مسرت تھی ' جو ماں (شاہ بیگم) کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھا ' باپ سے بگڑ جاتا اور تھوڑی سی سمجھ یا کر سرکشی اختیار کرتا ہے ۔ دعوائے سلطنت ' اور اکبر کی جانشینی کے خیال خام میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ در گزر کرنے والے شفیق باپ پر جو کچھ گزری ' اُسی کا دل جانتا ہے ۔ یہاں اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ ماں عزیز بیٹے کی شوخیوں اور سیاسی غلط کاریوں سے تنگ آگئی

تھي - خسرو کو بغاوت و سرکسی سے روکتي اور حتي الوسع باز رکھنا چاھتي تھي ، مگر برگشتہ نصیب خسرو کب ماننے والا تھا - وہ جہانگیر کي بجاے تخت و تاج کا وارث اور حقیقۃً اھل اپنے ھي کو سمجھتا تھا - ماں کی کوفت اور سورش دل بڑھتي رھی - اُس نے عاجز آکر افیون کھالي اور جان دیدي -

جہانگیر لکھتا ھے :-

والدۂ اُوھم در ایام شاھزادگی از ناخوشی اطوار و اوضاع او ، و سلوک برادر خوردش مادھو سنگھہ تریاک خوردہ خود را کشت - از خوبی ھاے و نیک ذاتی اُو چہ نویسم - عقلے بہ کمال داشت - و اخلاص اُو بہ من در درجۂ بود کہ ھزار پسر و برادر را قربان یک موئے من مي کرد - مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت واُو را دلالت بہ اخلاص و محبت من مي کرد - چون دید کہ ھیچ فائدہ نہ دارد ، عاقبت با معلوم است کہ بکجا منجر خواھد شد ، از عبرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتاني است خاطر بر مرگ خود قرار دادہ - و چندین مرتبہ گاہ گاھے مزاج اُو در شورش می آمد - چنانچہ این حدیث میراني بود کہ پدران و برادران او ھمہ یکبار در دیوانگي خود ھا را طاھر می کردند و بعد از مدتے علاج پذیر می شدند - در ایامے کہ من بشکار متوجہ گشتہ بودم ، روز بیست و ششم ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ ھجري افیون بسیار در عین شورش دماغ خوردہ در اندک زمانے در گذشت - گویا کہ این احوال پسر بعداوت خود را بیشتر می دیدہ است - اول کدخدائی کہ در آغاز جواني و خورد سالي مرا دست داد بنت او بود - بعد از تولد خسرو اُو را شاہ بیگم خطاب دادہ بودم - چون بد سلوکي ھائے ورزید و برادر را نسبت بہ من نتوانست دید ، از سوجان در وقت دماغ پریشان شدن در گزشتہ ، خود را از پس کشت و اندوہ باز رھانید -

" میری شہزادگی کے زمانے میں خسرو کی ماں بھی خسرو کے
با پسندیدہ اطوار و وضع اور اپنے چھوٹے بھائی مادھو
سنگھہ کے برتاؤ کے سبب سے افیون کھا کر مر گئی
تھی - اس کی خوبیاں اور نیکیاں کیا لکھوں - اتنا
کی عقلمند بھی - میرے ساتھہ اُس کا خلوص اس
درجہ بڑھا ہوا تھا کہ میرے ایک ایک رونگٹے پر
ہزاروں بیٹے اور بھائی قربان کر دیتی - اس نے خسرو
کو بارہا لکھا اور محبت و اخلاص کی راہ دکھاتی
رہی - جب دیکھا کہ کچھہ فائدہ نہیں نکلتا - انجام
معلوم نہیں - کہاں تک پہونچے - تو غیرت کے
باعث، جو راجپوتوں کی طبیعت کا خاصہ، ہے اپنی جان
کھو دینے کی ٹھان لی - کبھی کبھی پہلے بھی اس کے مزاج
میں کئی مرتبہ سوزش سردار ہو چکی تھی - یہ
تو موروثی بات تھی - اس کے باپ دادا اور بھائی
سب نے ایک نہ ایک بار پاگل پن ظاہر کیا تھا اور
مدت کے بعد ختم ہوا تھا - جن دنوں میں شکار کے
لیے گیا ہوا تھا ۲۶ ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ ھ * کو عین
شورش دماغ میں اس نے بہت سی افیون کھا لی اور
تھوڑی دیر میں چل بسی - گویا کہ وہ اپنے بالائی بیٹے
کی حالت پہلے ہی سے دیکھہ رہی تھی - میری
پہلی شادی جو شروع جوانی یا لڑکپن میں مجھے
نصیب ہوئی، اسی کے ساتھہ ہوئی تھی -

---

* ۶ مئی سنہ ۱۶۰۵ ع - لیکن اگر سال وفات ۱۰۱۲ ہجری ہے تو انگریزی سنہ ۱۶۰۴ ع ہو گا -

[یاد ہیں اب تک وہ ایام فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آثار الفت کے مزے]

خسرو کے پیدا ہونے پر میں نے اُس کو "شاہ بیگم" خطاب دیا تھا - جب وہ اپنے بیٹے اور بھائی کی بد سلوکی میرے ساتھہ دیکھہ نہ سکی تو دماغ کی پریشانی کی حالت میں، اپنی جان کھو دی اور اپنے کو اس رنج و تکلیف سے چھڑا لیا -"

مادھو سنگھہ اور اُس کے خاندان والوں کے ذکر کی ضرورت نہیں اس سچی وفا شعار و غمگسار بیوی کی جدائی کا جو ماتم جہانگیر کے سادہ نگار قلم نے کیا ہے اُس کو نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس درد دل کے ظاہر کرنے کی قوت اور کون سا انشاپردار رکھتا ہے -

از قوت او بخاطر نقلے کہ داشتم، ایامے بر من گذشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نہ داشتم - چہار شبانہ روز کہ سی و دوپہر باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گشت - چوں این قصہ بہ والد بزرگوارم رسید - دلاسا نامہ در غایت شفقت و مرحمت بدیں مُرید قدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر داشتہ بودند ہماں طور بستہ بہ جہت من فرستادند - ایں عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی‌الجملہ قرارے و آرامے بخشید -

"اُس کے مر جانے پر، میرے دل کے لگاؤ کی وجہ سے مجھہ پر زمانہ گذر گیا - زندگی و حیات کی، کسی قسم کی، کوئی لذت میرے لئے باقی نہ تھی - چار رات دن جس کے بتیس پہر ہوتے ہیں، انتہا درجہ کا رنج اور تکلیف

رهي - کهانے پینے کی کوئي چیز منهه تک نه گئي - میرے بزرگ باپ نے جب یه قصه سنا تو بڑی شفقت و مهربانی کے ساتهه اس قدیمی ارادتمند کو دلاسے کا خط لکها - خلعت اور اپني برکت والي پگڑي سر سے جس طرح اُتاري تهي ' اُسي طرح بندهي هوئی میرے لئے بهیجي - میرے سوز وگداز کي آگ پر اس مهربانی سے پاني پڑ گیا اور اضطراب وبےچینی میں کم یا زیادہ قرار و آرام پهونچا - ''

یه خون کے آنسو جهانگیر کا قلم نهیں ' آنکهه نهیں ' دل بها رها هے - ایک ایسي عورت کے رنج میں ' جس کي جوانی ڈهل چکی تهي - دماغ کے پیچ و تاب نے اور بهي نڈهال کر دیا تها - گل چیں جمال ' هوس نیما جهانگیر تهي وهي هے ' جس کي بیس بیگموں کي فهرست مسٹر بلاک مین نے آئین اکبری کے ترجمه میں پیش کی هے - جو ساٹهه بیگم کي دائمی جدائي کے بعد بهی بهت سی بیویوں کا خاوند هے - جس کی نسبت کین صاحب کا قلم شوخی سے کام لے کر لکهتا هے که '' خود جهانگیر کو بهی همیشه یه خبر نه رهتی تهی که اُس کے کون سے بیٹے کي ماں کون هے '' جس کو فرنگستان کے اهل قلم مست آلست بتاتے هیں اور زید هزار شیوہ - جس کو طاعت حق میں سجدہ کے لیے سر جهکانا بهی گراں تها آج اپنی صنم پرستي کی بدولت گم صم هو رها هے اور نیم دیوانه - الله ری ' محبت کی فریبائیاں ! -

جهانگیر کے ایسے عیش پسند و عشرت کوش کا برابر چار سال دور بهوکا پیاسا رهنا ؟ اُس کے انتهائي رنج و قلق ' دل کي بیقراري اور بے چینی کي کیفیت کو اُسی کی زبان سے ادا کر گیا هے - لیکن شهنشاه اکبر بهی اس سانحه غم سے متاثر هوئے بغیر نه رہ سکا - دلبند فرزند کي نسلي

اور دلاسے کے لیے خط لکھا ۔ سر سے پگڑی اُتار کر جیسی بندھی ہوئی تھی ویسی ہی بھیجدی کہ زخم دل کے اندمال کے لیے بھی ایک مرہم تھا ۔

ایسی سلیقہ مند، وفا سرشت، نیک نہاد بیگم کی نیکیوں اور خوبیوں کا اعتراف، جو اُنیس (۱۹) بیس (۲۰) سال کی رفاقت ویکجائی کا نتیجہ تھا، اور شوہر کا اُس کو اور اُس کی محبت و اخلاص کو اسطرح یاد کرنا صنف نازک کے ہر فرد کے لیے قابل فخر اور موجب شرف ہے ۔ شاہ بیگم کا خیال جہانگیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوا ۔ ترک کے اوراق پر وہ بارہا اُس کا ماتم کرتا نظر آتا ہے ۔ آخر یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے ۔

اک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے، اک درد سا دل میں ہوتا ہے
میں راتوں کو رویا کرتا ہوں، جب سارا عالم سوتا ہے

یہی نہیں جہانگیر ہی نہیں بلکہ اور معاصر مورخ بھی اس کے اخلاق حسنہ، خصائل حمیدہ، پاکدامنی اور نیکنامی وغیرہ کو مد نظر رکھ کر ادب و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں ۔ مرزا ہادی ترک کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ایک خلعتسار کے بعد، جب جہانگیر الہ آباد وانس پہونچا تو اکبر نے اُس کے لیے خلعت و انعامات بھیجے ۔ ہر طرح کا سامان تسلی و دلداری کیا، تب وہ کچھ روز یہاں مطمئن و فارغ البال رہ کر بسر کر سکا تھا ۔

قضاراوالدۂ سلطان خسرو نقاب آرائے یہاں خانۂ عدم گشت ۔ تفصیل این اجمال آنکہ درینولا بہوسے در دماغ آن عفت سرشت بہم رسید و سودائے بر مزاج اُستیلا یافت و چون خسرو از تبراہ روی در ملازمت حضرت عرش آشیانی ہمواره بہ شکوۂ شاہنشاہی می پرداخت ۔ این عم سر بار آن گشت ۔ در روزے آنحضرت بشکار تشریف برده بودند پوشیده از پرستاران افیون خورده سر بہ بالین فنا نہاد ۔ و چون سر آمد زنگان حرم سرائے سلطنت بودہ اُنس و اُلفت تمام باو داشتند ۔ خاطر قدسی مظاہر ازین

سانحه به نهایت ملول و بغایت اندوهگین شد و بر دل مهر منزل این مصیبت سخت گرانی کرد ' و حضرت عرس آشیانی از استماع این حادثهٔ ناگزیر و آشفتگی ضمیر فیض پذیر فرمان از روئے کمال مهربانی و غمگساری فرستاده بسلی بخش خاطر عاطر شدند -

''اتفاقاً ' قضاے الٰهي سے خسرو کی ماں بے دنیا سے پردہ کیا - اندیوں ' اُس نیک بی‌بی کے دماغ میں خشکي پیدا هو گئی تھي - سودا مزاج پر غالب تھا - اُدھر خسرو کی بے راهی اور نافرمانی کی حالت یہ هو رهی تھی کہ اکبر کے حضور میں برابر جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا تھا - بیگم کو اس کا غم اور بڑھ گیا تھا - ایک روز جہانگیر شکار کو گیا هوا تھا ' بیگم بے لونڈی باندیوں سے چھنا کر افیون کھالی اور اپنے کو ختم کر دیا - حرم سراے شاهنشاهی کی بی‌بیوں میں یہ سب سے بلند مرتبہ والی تھی - جہانگیر کو اس سے نہایت الفت و محبت تھي - شاهزادہ کے دل پر اس سانحہ سے بڑا رنج و اندوہ هوا - یہ مصیبت بڑی بھاري تھی - اکبر کو اس حادثے اور جہانگیر کے قلق و تاسف کی اطلاع هوئي تو کمال مہرباني و غم خواري فرمائی - فرمان بھیجا اور جہانگیر کی دلداري کی - دلاسا دیا - ''

اسی واقعہ کی نسبت منتخب‌اللباب میں تحریر ہے -

درهمین آوان چون والدهٔ خسرو که همشیره راجه مان سنگهه می شد سوداے مزاج بهم رسانیده بود از اداهاے خارج و اطوار ناهموار خسرو نا خلف که سه سال از شاهزادهٔ عالی نژاد بلند اقبال محمد خرم کلان بود و نظر در عتابات وتوجهات جد بزرگوار و پدر نامدار که نسبت به

خسرو در حق آن عرۂ جاه و جلال زیادہ مبذول می گردید از راہ حسد برخود ہموار نمی نوانست بود و در خدمت پدر گستاخانہ و بے ادبانہ سلوک می نمود۔ و عندالفرصت بخدمت جد بزرگوار طریقۂ عماری از طرف شاہنشاہی بکار بردہ سعلہ اوروزی عناد می نمود - و مادر اُو در منع آن می کوشید و فائدہ نمی بخشید - علاوہ مرض سودا گردیدہ بود - درین آوان روزے خود را از عصۂ اطوار آن فرزند بد عاقبت از افیون مسموم ساخت - و برخاستہ رفتن عبداللہ خان و واقعۂ والدۂ خسرو معاً بعرض شاہزادۂ نامدار رسید و باعث الم خاطر گردید -

"اسی زمانے میں خسرو کی ماں کا مزاج سودائی ہو گیا تھا جو راجہ مان سنگھ کی بہن ہوتی تھی - نالائق خسرو شاہزادہ خورم سے تین سال بڑا تھا - مگر اس کے طور طریق کی کیفیت یہ تھی کہ اکبر ' جب خسرو کے معاملہ میں' شاہزادہ (جہانگیر) پر عتاب و توجہ زیادہ کرتا ' تو اُس کو بڑا رنج و حسد ہوتا تھا - باپ سے گستاخانہ اور بے ادبانہ برتاؤ کرتا - موقع پاتا تو دادا خان کے سامنے جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا اور دشمنی و عناد پھیلاتا - اُس کی ماں ہرچند بار رکھنے کی کوشش کرتی' فائدہ نہ ہوتا - اس کے سوا مرض سودا تو ہو ہی گیا تھا - انہیں دنوں کمبخت بیٹے کے اطوار سے غصہ ہوکر زہر (افیون) کھا لیا - عبداللہ خان کا اُٹھ کر چلا جانا اور خسرو کی ماں کا واقعہ' خسرو نے ایک ساتھ سنا تو بڑا رنج ہوا "۔

جیسا کہ جہانگیر کہتا ہے یہ سودا اور آشفتہ سری شاہ بیگم کا

خاندانی مرض تھا ۔ خود اُس کے نامور اور بہادر باپ امیرالامرا راجہ بھگوان داس میں، جب وہ صوبہ داری کابل پر ۹۹۴ ھ (۱۵۸۶ ع) میں متعین و سرفراز ہوا تو دیوانگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے ۔ حکیم نے نبض پر ہاتھ رکھا ۔ راجہ نے جھٹکا کھینچ کر اپنے مار لیا ۔ زندگی باقی تھی ۔ بادشاہی طبیبوں کے علاج و پرداخت سے کچھ دن بعد بمشکل شفایاب ہوا ۔

جب تک در و دیوار کی دنیا میں بنا ہے
افسانہ رہے گا مری شوریدہ سری کا

ہاں ۔۔ افیون کھا لینے ، یعنی اسطرح خود کشی کا خراب اور ناپاک عمل ہمارے ملک میں اگرچہ کم ہو چلا ہے ، مگر اب بھی باقی ہے ۔ بعض وقت طبقۂ ادنیٰ کی کوتاہ اندیش ، نادان عورتیں جب کسی صدمہ یا رنج کو برداشت نہیں کرسکتیں تو افیون کھا کر جان دے دیتی ہیں ۔ اسی کو آسان سمجھتی ہیں ۔ قدیم زمانے میں اس کا رواج اونچے اونچے حلقوں میں بھی تھا ۔ تین چار سو برس پیشتر کی متعدد مثالیں ، عہد جہانگیری کی تاریخوں میں ملتی ہیں ۔ سال سوم جلوس ، یعنی سنہ ۱۰۱۷ ھ (سنہ ۱۶۰۸ ع) کے واقعات میں لکھا ہے کہ جلال الدین مسعود پسر میر گیسو دراز نے جب انتقال کیا تو اُس کی ماں نے کمال دلبستگی و تعلق سے اُس کی حالت احتضار میں اُسی کے ہاتھ سے افیون کھالی اور بیٹے کے مرنے کے ایک دو گھڑی بعد خود بھی اس جہان سے چل بسی ۔ قریب ہی زمانہ میں لعل خاں شاہی کلاونت بھی دنیا سے رخصت ہوگیا ۔ اکبر اُس کی بڑی قدر کرتا تھا ۔ لعل نے بچپن سے اُس کے زیر نظر تربیت پائی تھی ۔ ملازم خدمت خاص تھا ۔ فن موسیقی خصوصاً ہندی گانے میں نظیر نہیں رکھتا تھا ۔ وہ پینسٹھ بلکہ ستّر برس کے سن

میں فوت ہوا ۔ کلاونت کی ایک کنور تھی ، جس کی دلفریب صورت کا وہ عاشق ، اور فسون ساز چشم کا مسحور تھا ۔ معمولاً اُسی کے ہاتھ سے افیون کھاتا تھا ۔ لعل خار کے مرنے پر اُس نے بھی افیون کھالی ، اور عدم کی راہ میں مالک کی رفاقت اختیار کی۔ جہانگیر کہتا ہے کہ مسلمانوں میں کسی عورت نے اس درجہ وفاداری کا حق کم ادا کیا ہوگا ۔ میر جلال کے سلسلہ میں بخشی معتمد خاں (مؤلف اقبالنامہ جہانگیری) کا بیان ہے کہ ہندستان کی یہ رسم تو بہت پرانی ہو چکی کہ شوہر کے مر جانے پر ہندؤں کی عورتیں خود کو آگ میں زندہ جلا دیتی اور اپنی جانِ عزیز اپنی محبت و وفاکیشی پر فدا کر دیتی ہیں ۔ بارہا ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دس بیس عورتیں خواہ بی بی رہی ہوں خواہ باندی ، آگ میں خود گُھس گئی ہیں اور پورے استقلال کے ساتھ اپنے کو جلا دیا ہے ۔ مگر بیٹے کی جدائی میں ماں کی یہ کیفیت اس سے پہلے نہیں سنی گئی ۔ جہانگیر بھی تورک میں لکھتا ہے کہ ماؤں سے خواہ مسلمان ہوں خواہ ہندو ، ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا ۔

شاہ بیگم کے مرنے کے بارے میں ، یہ تو وہ مسلمہ اور متفقہ بیان تھا ، جو بلا اختلاف الفاظ تمام ہندو اور مسلمان مورخوں اور اُن کے پیرو جن انگریزوں نے کیا ہے ۔ مگر یا اس ہمہ ایک اور روایت بھی ہے جو بداہۃً لغو اور یا قابل الذہاب ، یا کسی افسانہ کی توتی ہوئی کڑی معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن ایک ذمہ‌دار و نامور اہل قلم کے قلم سے نکلی ہے اِس لیے یہاں اُس کا نقل کرنا ناگزیر ہے ۔ سر ولیم سلی مین اپنی دلچسپ کتاب "سیاحت و تذکار" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں ۔

"جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کی آنکھیں باپ کے حکم سے

نکلوالی گئی تھیں، کیونکہ وہ بغاوت پر بغاوت کیا کرتا تھا ۔ بغاوت کی ترغیب دینے والے دو سبب تھے ۔ ایک خود اُس کی خواہش کہ ماں کے قتل کا انتقام لوں ۔ دوسرے، اُس (ماں) کے بھائی، ہندو شاہزادہ مان سنگھہ اور خسرو کے خسر خان اعظم، اکبر کے وزیر اعظم، کی یہ آرزو کہ اپنے عزیز کو تخت پر دیکھیں ۔ نور جہاں نے خسرو کی ماں یعنی راجہ مان سنگھہ کی بہن کو بلایا تھا کہ ہمارے یہاں آ کر ایک کنوئیں میں جو ہماری محلسرا کے صحن میں ہے، چاندنی رات میں میرے ساتھہ جھانکو ۔ جب وہ جھانکنے لگی تو اُس کو کنوئیں کے اندر ڈھکیل دیا ۔ نورجہاں نے جب دیکھا کہ اس نے ہاتھہ پاؤں مارنا چھوڑ دئے ہیں تو شور و غل کیا ۔ اور بات بنائی کہ رانی اوفاقیہ گر پڑی ہے ۔''

ڈاکٹر ویسنٹ اسمتھہ ساورف تین و محتاط تاریخ نویس اس پر حاشیہ لکھہ کر اپنا خیال ظاہر کرتا ہے :—

'' ممکن ہے کہ یہ حکایت صحیح ہو ۔ مگر اس قسم کا الزام قطعاً نا ممکن‌الاثبات ہے اور محلات کی فضا میں سو و سما دا جانے والا ۔''

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے رد و قبول میں بعض یوروپین مورخ ایک روس خاص، یا اُن کی اصطلاح میں ایک '' اُصول '' رکھتے ہیں ۔ اُن کا دستور ہے کہ مسلمان بادشاہوں اور بیگموں کی نسبت کیسی ہی بے بنیاد و بیہودہ بات بنائی یا سنائی جائے تو اُس کو باور یا بیان کرنے میں تامل نہیں کرتے ۔ ممکن ہے کہ یہ آپ ہی کی طبع زاد ہو ۔ مختلف و موافق تمام روایتوں کے مطابق والدۂ خسرو نے آخر سنہ ۱۰۱۲ ھ یعنی مئی سنہ ۱۶۰۴ ع میں افیون کھا کر جان دی تھی ۔ سر تامس ہربرٹ، بیل اور ولاک‌مین اس بارے میں متفق‌اللسان ہیں کہ شمسی حساب سے نور جہاں چونتیس (۳۴) سال کی تھی جب سنہ ۱۶۱۰ ع میں سلطنت شاہی یعنی جہانگیر کے عقد میں آئی تھی ۔ ظاہر ہے کہ

اُس کے بعد مہرالنساء کو نور محل اور نورجہاں بننے میں بھی کچھ زمانہ لگا ہوگا - وہ سنہ ۱۶۰۴ع میں شیر افگن کی بی‌بی تھی - بنگالہ میں رہی ہوگی - تو نورجہاں اور شاہ بیگم کی یکجائی اور خوش رفاقت و عناد کو کون ہوش‌مند باور کرے گا !!!

جو تمھاری طرح، تم سے، کوئی جھوٹھی بات کہتا
تمھیں منصفی سے کہدو، تمھیں اعتبار ہوتا

خلوص و وفا کی پیکر، بے چین اور درد مند دل والی بیگم آج اِلہ‌آباد کے خسرو باغ میں ایک وسیع و سہ منزلہ مقبرہ میں راحت و سکون کی نیند سو رہی ہے - [یہ خسرو باغ کا تیسرا مقبرہ ہے] - اصل تربت نیچے والے درجہ میں زمین پر مع اپنی سیف اور صندوقچیوں کے ابنت چونے کی بے تکلف تعمیر ہے - کبھی چاروں طرف سے بند تھی اور مسدود، جیسا کہ مسٹر نیل نے مفتاح‌التواریخ میں لکھا ہے - منافذ اور جھنجریوں سے روشنی کا بقدر قلیل انتظام رہا ہوگا - مگر اب یہ کیفیت باقی نہیں - غالباً اصلی حالت میں تبدیل کردی گئی ہے - ممکن ہے کہ کبھی اس پر نقش و نگار یا رنگینیاں رہی ہوں مگر اس وقت تو سوا سفیدی اور چونے کی تہوں کے کچھ نظر نہیں آتا - بگڑی ہوئی سی حالت ہے - مقبرہ کا دوسرا درجہ خالی، پست اور سادہ ہے - تیسری منزل یعنی بالائی حصہ نسبتاً مختصر ہے، جس پر ایک خوش وضع و خوش نما قبہ سایہ افگن ہے - اسی جگہ (چھت کی بلندی پر) سنگ مرمر کی نقلی یا مصنوعی قبر مع مشجر (تختہ) اور لوح مزار کے باقی ہے - یہ پورا حصہ نفیس اور نازک گُل‌کاری اور نیل بوٹیوں سے مزّین ہے - تعویذ کے دائیں بائیں پہلو میں یہ رباعی جلی حروف میں ناگیرہ نستعلیق میں منقوش ہے —

بیگم که ز عصمت رخ رحمت آراست

اقلیم عدم ز نور عزت آراست

سبحان الله، رهے کمال عفت

کز حسن عمل چهرهٔ جنت آراست

تعویذ بر حسب معمول قلمدان بنا هے -

لوح مزار، شاهزادی کے شایان شان، خوب بلند هے - اس پر یه کتبه هے :—

آئینه اکبر

چوں چرخِ فلک ز گردسِ خود آسعت

در زیر زمیں آئینهٔ مه بنهفت

تاریخِ وفاتِ شاه بیگم جُستم

از عیب مَلَک بخلد شد بیگم گفت

[سنه ۱۰۱۲ھ]

لکاتبه عبدالله، مشکیں قلم، جهانگیر ساهی -

'' بخلد شد بیگم '' سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے هیں جو سنگ نالین پر مرقوم هے - مسٹر بیل اپنی اوریئنٹل بیاگرفی کل ڈکشنری میں ۱۰۱۲ ھ = ۱۶۰۳ع لکھتے هیں - برک میں سال وفات ۱۰۱۳ دیا هے - ممکن هے که تائب کی غلطی هو -

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پُری رهی، اُسی طرح آج بھی هے - اُس کی آغوش میں پانچ بچے کھیل رهے اور قبر کے پہلوؤں اور نچلی حصوں کو آباد کیے هوئے هیں -

شاہ بیگم کا اصلی نام مجھے تحقیق نہ ہو سکا - مقامی و زبانی روایات '' دریبا '' اور '' جودھا بائی '' بتاتی ہیں - جیسا کہ تمام مورخین کو تسلیم ہے ' جودھابائی ' یا ' جودہ بائی ' اُس کی چھوٹی سَوت یعنی جہانگیر کی دوسری بی بی ' ملکۂ جہاں حکمت گوشائیں عرف تال متی کا نام تھا - شاہ بیگم نہ جودہ بائی تھی نہ جودھپور کی - اس لئے یہ ممکن ہے کہ اُس کا نام '' دریبا '' رہا ہو ' مگر کسی پرانی تاریخ میں معتبر نظر سے نہیں گزرا - تاریخ جہانگیر میں پروفیسر بینی پرشاد نے '' مان بائی '' لکھا ہے - اُن کا ماخذ یا سند معلوم نہیں - مگر ؟ مسلّم ہے کہ ان کی دور رس نظر راجستان کی ہندی تاریخوں اور نسب ناموں سے بہت سے نادر جواہر پارے نکال کر لائی ہے جن کی چمک دمک ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے ؟ اور جن سے ہم ایسے بے مایہ اب تک محروم تھے - مرید پر آں ؟ مان سنگھ (بھائی) اور مان بائی و (بہن) کے ناموں کی یکسانی اس کو فردیں قیاس و قابل قبول بناتی ہے ؟ بقر آسان -

صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کا مآثر الامرا (جلد دوم ' صفحہ ۱۸۱) میں یہ لکھنا کہ '' سلطان خسرو اودے سنگھ عرف موٹہ راجہ کی دن سنی نامی لڑکی کے بطن سے متولد ہوا تھا '' ایک فاش غلطی ہے - ' مان سنی ' یعنی ' تال متی ' کی کمانت کی عالم آشکارا حرامی ہے - وہی اُودے سنگھ فرمانروائے مارواڑ کی بیٹی تھی - جس سے خسرو نہیں ' خرم پیدا ہوا تھا - معاف رکھئے سوانح نویسوں ' اور اُس مشہور و بے بس بندے ' سلیم کو جو کہنے کو اُس وقت بھی ولی عہد اور کسور ہند کا آئندہ شہنشاہ تھا جس کو عہد شباب میں مصاحب کوسی ' ہرس رائی اور ہوا پرستی کا الزام بار وا عیار ناحق لگاتے ہیں - جو جمعہ بیچارہ و مجبور ' محض

معذور تھا - جس کی عافیت اور اُتھنی جوانی بلکہ زندگی ہر سال مصالح ملکی، تعدیلات سیاسی و انتظامی، تدابیر مملکت و جہانداری کی قربان گاہوں پر نذر چڑھائی جاتی تھی - جس کو ایسے بے ترس و ناخدا شناس باپ کی حکمت عملی، مرضی و خواہش پر روز روز تصدّق ہوتا پڑتا تھا - جس کے لیے کم عمری و حداثت سن میں بھی خود کام امرائے دولت کے عجز و تبار، اعاظم سلطنت کی جاہ طلبی اور تمایشِ اقتدار پر بی بیوں کی بھرتی جاری رہتی تھی - جو تخت و تاج اور کامل اقتدار و اختیار پا کر ایک، اور صرف ایک، نور جہاں کا ہو کر رہا - لیکن ایام شاہزادگی میں اُسی کی سستاں عسرت میں ساب (نو صرف) راتیاں داخل کی گئی تھیں - ان کا پتہ چلانا، نام و نشان بتانا کیا آسان بات ہے ؟ - تنہا صمصام الدولہ اور مستقر تبل ہی نہیں بلکہ بہت سے لکھنے والے ایسی ہی غلط فہمی و غلط انکاری کا شکار ہوئے ہیں - کاش! تاریخ کے کسی ہوشیار مطالعہ کرنے والے کو توفیق رفیق ہو اور دودمان گورگان کی حرم عسوۂ و تار، سرا پردۂ خلوت و ناموس میں تاریابی - تاکہ اِن دُرون پردہ و محرمان دار سلطنت، راج راجیوں کا تذکرہ لکھے اور معمولی معمولی غلطیوں کا ازالہ کر دے -

مرنے کے وقت بیگم کی عمر تینتیس (۳۳) سال کے قریب تھی - اونیس سال دلدار و دلنواز خاوند کی خدمت گزاری و اطاعت و رفاقت میں گزارے - آج وہ اپنے شوہر کے قرب ظاہری سے محروم اور اُس کی آخری آرامگاہ سے منزلوں دور ہے - مگر اُس کی بے حس روح کو تسکین و تسلی ہے کہ خسرو باغ کی یہ ڈھائی گز زمین اس کی ابدی خواب و راحت کے لیے اُسی کے عمگسار سرتاج نے پسند کی تھی - اُسی کے تار تردار ہاتھوں سے وہ سپرد خاک ہوئی -

نگارندۂ سطور، عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے حسین و دلکش مرقد پر پہنچا گیا، اور زبان حال سے کسی کی عظمت و بے خبری کا شکوہ سنج پایا ہے -

بر مزار ما غریباں، نے چراغے نے گُلے،
بے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اِنتقاد ادب

(از ڈاکٹر چند عسرت ، ایم ، اے ، یل ، ٹی)

ادب کیا ہے ؟

دنیا میں اختلاف وتنوع کی انتہا نہیں ہے ۔ کہیں دریا ، کہیں صحرا ، کہیں پہاڑ ، کہیں میدان ۔ مگر پھر بھی انسان جس ماحول میں رہتا ہے اُس کو دیکھتے دیکھتے اُس کا جی اُکتا جاتا ہے ۔ اُس کے لیے دنیا پرانی ہو جاتی ہے ۔ آفتاب روز اُسی طرح مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ہے ۔ گھاس پر روز شبنم پڑتی ہے ۔ دنیا کے کاروبار ایک ہی طرح سے چلتے رہتے ہیں ۔ اِن چیزوں کو ایک ہی صورت میں کہاں تک دیکھا جائے ۔ عرصہ انسان کا بسانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے ۔ اور وہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے کنارہ کش ہو یا اُن میں کوئی نئی روح پھونک کر اِن کو نیا کر دے ۔ بس یہیں سے ادب یا شاعری کا آغاز ہوتا ہے ۔

افلاطون کے ذہن میں شعرا کی ضرورت نہ رہی ہو مگر حقیقتاً دنیا کو نیا بنانے میں کوئی اور ہستی اِتنا کام نہیں دے سکتی ۔ شاعر یا ادیب معمولی چیزوں میں ایک دلکشی پیدا کرکے اُن کو نیا کر دیتا ہے یا دنیا کو ایک نیا زاویۂ نگاہ دیتا ہے جس سے دنیا کی ہیئت بدل جاتی ہے ۔ سب چیزیں نئی ہو جاتی ہیں اور بہت دن کے لیے دنیا پھر دلچسپ ہو جاتی ہے اور جب یہ دلچسپی ختم ہونے لگتی ہے تو پھر کوئی دوسرا شاعر یا ادیب پیدا ہو جاتا ہے

اور دنیا کو از سر نو دلچسپ بنا دیتا ہے - سچ تو یہ ہے کہ واجب مطلق ؟ قادر مطلق ہونے کے با وجود دنیا کو صرف خلق کرتا ہے - لیکن یہ کام شاعر یا ادیب کا ہے کہ دنیا کے معیار زندگی میں توسیع کرتا رہے اور اُس کو ایک تازہ حیات بخشتا رہے - در حقیقت اگر امرت کا کہیں وجود ہے تو وہ ادب ہی میں ہے ویدک میں کایا کلپ کا بیان ملتا ہے جس سے بڈھوں کو دوبارہ جوان بنایا جاتا ہے - موجودہ ڈاکٹری میں بھی جراحی عملوں کے ذریعہ سفاب واپس بلایا جا رہا ہے - مگر ویدک ؟ طب ؟ ڈاکٹری بہت محدود ہیں - یہ متعدد انسانوں کو دوبارہ جوان بنا سکتی ہیں - لیکن یہ زور ادب یا شاعری ہی میں ہے کہ تمام انسانوں کو ' نہیں نہیں ' تمام کون و مکان کو نیا کر دے -

نئی زندگی بخشنے میں ادیب و انبیا مشترک ہیں - حقیقت تو یہ ہے کہ انبیا سب سے بڑے شاعر یا ادیب ہوئے ہیں - زمانۂ جاہلیت میں عرب کی حالت ناگفتہ بہ تھی مگر محمد صاحب کے آتے ہی عرب کے زمین و آسمان تک بدل جاتے ہیں - عرب کے باشندے انسان نما حیوان سے انسان بن جاتے ہیں - بھگوان بدھ کی پیدائش سے پہلے ہندستان میں کتنی قربانیاں کتنی لڑائیاں تھیں مگر بدھ مت کے پھیلنے کے بعد جب سنگھستھنر ہندستان آیا تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ لوگ قتل کا استعمال ہی نہیں جانتے کیونکہ چوروں کا کہیں نام و نشان نہ تھا - بدھ مت نے انسانوں کو فرشتہ خصلت کر دیا تھا - ہر طرف امن چین تھا - مکاری ؟ دغا بازی ؟ چوری ' ڈاکا سب افسانہ ہو گئے تھے - جنگلوں میں بندی نظر نہیں آتے تھے - انسانوں کے لئے کون کہے جانوروں تک کے لئے استعمال تھے - سچ پوچھئے تو اگر روئے زمین پر کبھی جنت اُتری ہے - تو وہ بدھ مت ہی کے ذریعہ

ادبی ہے ۔ المختصر انبیا سب سے بڑے ادیب ہوتے ہیں ۔ در اصل وید ، دھمند ، انجیل ، قرآن وغیرہ سے بہتر ادب کسی اور کتاب میں ملنا نا ممکن ہے ۔

مختلف سائنس اور علوم کے ماہرین ؟ مختصر یہ کہ تمام وہ لوگ جن میں تخلیق و جدّت کا مادہ ہے دنیا کو نئی زندگی دینے میں شریک رہتے ہیں ۔ جب کوئی سائنس داں کوئی معرکۃالآرا ایجاد کرتا ہے تو دنیا کی کایا پلٹ کر دیتا ہے ۔ اِسی طرح جب کوئی فلسفی کوئی نیا فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو دنیا بالکل بدل جاتی ہے ۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ ادیب اور سائنس داں یا فلسفی میں مابہ‌الامتیاز چیز کیا ہے ؟ ادیب سائنس داں ۔ فلسفی سب الفاظ سے مافی‌الضمیر کو ادا کرتے ہیں ۔ مگر ادیب و غیر ادیب کی طرز جدا جدا ہوتی ہے ۔ ادیبانہ کی طرز تحریر نہایت خوبصورت و دلکش ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کو (قطع نظر نفس مضمون) ایک خاص مسرت بخشتی ہے ۔ یہی خوبصورتی یا مسرت ادب کو غیر ادب سے ممتاز کرتی ہے ۔ اگر سائنس فلسفہ ، یا تاریخ اس طرز یا اس اسلوب (Style) سے لکھے جائیں کہ اُن میں ایک خوبصورتی آجائے تو بے شک ان کا شمار بھی ادب میں ہونے لگےگا ۔ آب حیات آزاد ۔ شعرالعجم شبلی وغیرہ ادب کی بہترین مثالیں ہیں ۔

ایک خاص طرز تحریر جو ادب کی جان ہے ایک خاص شخصیت کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ اس لئے ادب کی تعریف (Self expression) '' اظہار نفس '' کی گئی ہے مگر ادب میں محض اظہار نہیں ہوتا بلکہ اپنے زور کا اظہار ہوتا ہے کہ اُسے کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے تشبیہ دے سکتے ہیں ۔ ادیب کے خیالات و جذبات میں ایک ایسا طوفان اُٹھتا ہے کہ جس کو وہ دبا نہیں سکتا بلکہ اس کے اظہار

پر مجبور ہوتا ہے - یا یوں کہیے کہ اُس کے خیالات و جذبات خود بخود باہر نکلتے ہیں اور اس طرح نکلتے ہیں کہ سامع کے قلب پر چھا جاتے ہیں - '' آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد '' - اس لیے میرے خیال میں انگریزی کی تعریف (Self expression) '' اظہار نفس '' کو (Self assertion) '' اقتدار نفس '' ہونا چاہیے - یعنی اظہار ایسا ہونا چاہیے ' کہ جو ادیب کی شخصیت کا سکّہ دوسروں پر بٹھادے - اور اُس کے خیالات و جذبات سامع کے دل پر قبضہ کرلیں ورنہ اظہار تو انسان معمولی سے معمولی بات چیت میں بھی کرتا ہے - جس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں - اب ادب کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہہ خیالات و جذبات کا ایک ایسا اظہار ہے جو لوگوں کے دلوں پر ثبت ہو جائے اور جس کی طرز تحریر ایک خاص خوبصورتی و دلکشی لیے ہوئے سب سے جداگانہ ہو -

نقل ادب

انسانوں میں سب سے زبردست رجحان نقل کرنے کا ہوتا ہے - جہاں کوئی بڑا ادیب پیدا ہوا اور اُس کی طرز تحریر کے ڈنکے پٹنے لگے وہیں سہرت و ہر دلعزیزی کی طمع سینکڑوں کا دماغ خراب کر دیتی ہے - یہ لوگ اُسی طرز تحریر میں لکھنے لگتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کریں جنھیں اُس اصلی ادیب نے استعمال کیا ہے - اس نقل ادب میں جسم ہی جسم ہوتا ہے - روح ندارد ہوتی ہے - نقّالوں کے پاس روح کہاں ؟ کیونکہ ادب کے ادب میں جو روح ہوتی ہے اُس سے یہ لوگ بے بہرہ و نا آشنا ہوتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ الفاظ و طرز تحریر ہی روح ہیں - اُن کی مثال ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے بہت خوب دی تھی - انھوں کہا تھا کہ کسی بیوقوف نے کبھی دریا نہیں دیکھا تھا مگر کسی طرح اُس کو معلوم ہوا کہ دریا ایک گہری چوڑی نالی میں بہتا ہے - اُس کے کنارے پر ریت ہوتی ہے

اور اُس میں سیپ ؟ گھونگھے ؟ مینڈک ؟ مچھلیاں اور کچھوے وغیرہ پائے جاتے ہیں - بیوقوف نے ایک گہری چوڑی پالی کھود کر اُسے پانی سے لبریز کر دیا - کناروں پر ریت ڈالدی - پھر اس میں کچھ سیپ ؟ گھونگھے ؟ مینڈک ؟ مچھلیاں اور کچھوے لاکر ڈالدیے - اور سب کو اپنا دریا دکھا کر داد چاہنے لگا - ایسے بیوقوف کی عقل پر کون تاسف نہ کریگا - اگر ایک خود پرست شاعر صاحب یہ فرمائیں کہ جو ٹیگور انگریزی یا بنگلہ میں کہتے ہیں وہ میں اردو میں کہتا ہوں - پھر لوگ مجھے ٹیگور کے برابر کیوں نہیں سمجھتے تو بقول ہمارے اُن دوست کے اُن سے جاکے کوئی کہدے کہ تم میں اور ٹیگور میں وہی فرق ہے جو محمد اور مسیلمۂ کذاب میں تھا اور تمہارے کلام اور گیتا نجلی میں وہی فرق ہے جو قرآن اور نقلی قرآن میں ہے - خیر یہ تو ایک افراط کی مثال تھی - مگر اُن لوگوں کی تعداد بے شمار ہے جو مشہور ادیبوں کی طرز تحریر اور الفاظ سے اپنا ایک نیا بھان متی کا تماشہ تیار کرتے ہیں - موجودہ ہندی شاعری میں ٹیگور نے قریب قریب تمام کھڑی بولی لکھنے والوں کا دماغ خراب کر رکھا ہے - ان کی شاعری میں ہر بندی ہی یعنی "سار دل" کمین در کمین (कमन प्रकमन) یعنی "لرس و ارتعاش" - اسیم اور انت (असीम और अनंत) یعنی "بے حد ولا متناہی" وغیرہ وغیرہ الفاظ کی بھر مار ہے - خواہ مخواہ معنی کو مُبہم کرنیکی عادت پیدا ہو چلی ہے تا کہ ٹیگور کے مسٹیسزم (mysticism) یعنی تصوف سے جس کو ہندی میں چھایا واد یا رہسیواد (छायावाद या रहस्यावाद) کہتے ہیں سُر مل جائے - اسی طرح اردو میں بھی چند خاص شاعروں کی نقل میں عام شاعروں کا رنگ بدل گیا ہے اور وہ بھی تصوف یا فلسفہ کہنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے شعر میں معنے پیدا ہوں یا نہ ہوں - اِن نقالوں کے دل میں ادب کی روح نہیں ہوتی مگر یہ اسے کو ادب سمجھتے ہیں -

شاعر یا ادیب ایک الہامی جذبے سے بے اختیار ہو کے کچھہ لکھتا ہے ؟ وہی اصلی ادب ہے - اس لیے کسی شاعر کے مصرعے پر یا کسی سمیلن کی سمسیا پر کچھہ لکھنا ہرگز اصلی ادب نہیں بلکہ نقل ادب ہے - کسی صلہ یا انعام کے لالچ میں یا کسی اور غرض سے کچھہ لکھنا بھی مشکل سے ادب کہلانے کا مستحق ہے - مشاعرے کے متعلق میرے ایک دوست نے ایک مرتبہ کتنا سچ کہا تھا کہ مشاعرہ چھوٹی جماعتوں کی مضمون نگاری (Composition) ہے جس میں کچھہ الفاظ دئے جاتے ہیں جنھیں طلبا صحیح طور سے جملوں میں استعمال کریں - مشاعرے میں بھی جب کوئی مصرعہ نکالتا ہے تو پہلے اس کے قوافی لکھے جاتے ہیں اور انہیں قافیوں کو خوبصورتی سے ایک مخصوص بحر میں نظم کر دینا ہی بہترین شاعری ہے - مشاعرے میں جو تعریفیں ہوتی ہیں وہ بھی اسی نکتہ کی جانب دلالت کرتی ہیں - مثلاً اہاہاہا - آپنے تو یہ قافیہ اتنا کر لیا ہے '' - '' آپنے اس لفظ سے کیا فائدہ اُٹھایا ہے '' '' اس شعر میں ردیف کتنی مضبوط لگی ہے '' '' اس شعر میں ردیف نے کیا مزہ دیا ہے '' - '' اس میں آپنے قافیہ کہاں سے تلاش کیا ہے '' - '' کیا زبان ہے '' - '' کیا زور مزہ ہے '' '' کیا محاورہ صرف کیا ہے '' - وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں ثابت کرتی ہیں کہ مشاعرہ والی شاعری کی بنیاد محض لفظ پر ہے اور خیالات اور جذبات سے اِسے کم تعلق ہے یہاں ایک لطیفہ یاد آیا - ایک مرتبہ ایک مشاعرے کے لئے مصرعہ دیا گیا اور اسمیں مرحوم استاد امیر مینائی قافیہ پیمائی کر رہے تھے - ایک قافیہ بہت پھوندا تھا مگر اس کے بھی باندھنے کے لئے غلطاں و پیچاں تھے - ایک شاگرد نے پوچھا حضور کس فکر سے پریشان ہیں ؟ استاد نے بتلایا کہ اس قافیے کے باندھنے کی فکر میں ہوں - شاگرد نے عرض کیا - کیا اس قافیے کے بھی لکھنے کی ضرورت ہے - استاد نے فرمایا '' بے شک - کیونکہ کبھی نہ کبھی

یہ سند کے لیے کام آئے گا " اردو غزلوں کے شعروں کا حسن و قبح قوافی کے بندش جانے پر منحصر ہے ۔ جس کا بہترین ثبوت رسالہ " معیار " ہے جو اہل زبانوں کے مرکز لکھنؤ کی سب سے بڑی ادبی انجمن کا ماہانہ رسالہ ہے ۔ اس مشاعرے میں پڑھی ہوئی غزلیں قافیے کے بعائل سے چھاپی جاتی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ فلاں قافیے کو فلاں نے بہترین طریقے سے باندھا ہے ۔ اردو شاعری کی اب تک بہت سطحی رہ جانے کی وجہ بہت کچھ یہی ہے کہ اردو شاعری کا انحصار زیادہ تر غزلوں پر رہا ۔ اور غزلوں کا مشاعرے پر ۔ اور مشاعرے کا قافیہ پیمائی ؟ زبان و محاورہ اہاہاہا اور واہ وا پر ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں انعقاد شعر کا معیار اب تک زبان و محاورہ ہی رہا ۔ مشاعرے والی شاعری کے لیے ممکن ہے کہ یہ محک ٹھیک ہو مگر حقیقی و وجدانی غزلوں کو جن کا مشاعرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اس پر کسنا نہایت بے انصافی ہے مگر تنقید نگاروں کی کور سوادی سے چاروں طرف یہی ہنگامہ برپا ہے ۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندی میں بھی مشاعرے کی ہنگامہ آرائی ترقی کر رہی ہے جو نائکہ بھید اور النکاروں سے بے روح کی ہوئی ہندی شاعری کو اور بھی مردہ ، بے کیف اور رسمی بنا رہی ہے ۔

سطور بالا سے میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مشاعرے اور کب سمیلن بند کر دیے جائیں ؟ کیونکہ ان سے فوائد بھی ہیں ؟ ان سے اظہار خیال کو تقویت پہنچتی ہے اور عوام میں شعر و ادب کا چرچا پھیلتا ہے ۔ اس لیے اگر مشاعرے لاہور کی طرح ہونے لگیں تو اس صوبے میں بھی مشاعرے سے نقصان نہ ہو ۔ وہاں کے مشاعروں میں کوئی مصرعہ نہیں دیا جاتا بلکہ شاعر اپنی کسی نظم کو سنا دیتا ہے ۔ غزل کی بھی قید نہیں ہے ۔ رباعی ہو چاہے مسدس ۔ غزل ہو چاہے قصیدہ ۔ نظم ہو چاہے قطعہ ۔

شاعر جو چاہے سنائے - اِس کا مطلب یہ ہے کے شاعر پر جب کسی جذبے کا اثر ہو تو وہ اپنے جذبے کے موافق کوئی بحر اور ردیف و قافیہ منتخب کر کے کچھ لکھ ڈالے اور محفوظ رکھے - اور جب مشاعرہ ہو تو پڑھ دے - اس میں مشاعرے کے تمام فواید موجود ہیں مگر اس کے عیوب سے بہت کچھ کنارہ کشی ہو جاتی ہے -

اقبال کا ایک فارسی شعر ہے -

آیا تنقید کی ضرورت ہے ؟

"گفتند جہانِ من آیا نو می سازد

گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن - "

اسی شعر کی بنا پر جب متقدمین دنیا کو ایک ہی صورت میں دیکھتے دیکھتے تنگ آگئے تو انھوں نے اس سے بھاگنے کی کوشش کی ؟ تخیل کے گھوڑے دوڑائے اور اپنی تیزی سے دوڑائے کہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ گئے - دیو - پریاں - دیوی - دیوتا - غرضکہ غیر معمولی طاقت وقدرت رکھنے والی ہستیوں کی لٹریچر میں بھرمار ہوگئی - ایک زمانے تک یہ غیر حقیقی ادب لوگوں کے دماغ پر مسلط رہا - اس کے بعد لوگوں کی طبیعت اس سے بھی گھبرائی اور اپنی ہی دنیا کی چیزیں نئی معلوم ہونے لگیں - کلاسیسزم (Classicism) نے پلٹا کھایا اور رومانٹسزم (Romanticism) کا دور دورہ ہوا - اس طرح کبھی رسمیات یا غیر حقیقی چیزوں کا بول بالا رہتا ہے اور کبھی روحانی اور حقیقی چیزیں اپنا تسلط جما لیتی ہیں - دنیا میں اسی طرح انقلابات ہوا کرتے ہیں - جس سے ادب پر کبھی کوئی رنگ چھایا رہتا ہے کبھی کوئی رنگ - ملک کے ترقی اور تنزل کا بھی ادب پر اثر پڑتا ہے کیونکہ افراد کا دماغ زمانے کے رنگ سے تشکیل پاتا ہے اور انفرادی شخصیت کا اظہار ہی ادب ہے - اسی سے ادب کا معیار کبھی کچھ رہتا ہے کبھی کچھ - مختلف ازمنہ کی

تنقیدوں میں زمین و آسمان کا فرق رہتا ہے ۔ مثلاً ایک زمانہ تھا جب لوگ ناسخ یا امانت کے شعر پر سر دُھنتے تھے مگر آج عموماً لوگ اُسے بے کیف سمجھتے ہیں ۔ مختلف زمانوں کی تنقیدوں کو کون کہے ایک ہی زمانے کے ناقدوں میں اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حق بجانب کون ہے ۔ مختلف زمانے کی تنقیدوں میں زمانے کی اُلٹ پھیر کی وجہ سے اختلاف رہتا ہے اور ایک ہی زمانے کی تنقیدوں میں انفرادی پسند و ناپسند کے باعث؟ انفرادی اختلاف خیالات و ساخت دماغ کے اختلاف کے باعث پیدا ہوتا ہے ۔ مغربی ایک دوست نے ایک مرتبہ نقد و تبصرہ پر ایک لطیف بات کہی تھی کہ اگر کسی ناقد نے کلام کی اصلیت کو دکھایا تو کیا کہنا اور اگر ایسا نہ کر سکا تو وہ کم سے کم اسے کو دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اور یہ بھی حالی اور لطف نہیں ۔ صحیح ناقد چاہے جتنے منصفانہ طور سے تبصرہ کرے لیکن وہ اپنے سے کہاں بھاگ سکتا ہے ؟ وہ کلام زیر تنقید میں اکثر اوقات اپنے ہی خیالات کا عکس دیکھتا ہے اور یہ بات اپنی صحیح ہے کہ ایک ادیب نے جل کے کہا ہے کہ "اگر تمہیں عقلمندی چاہیے تو شیکسپیر کے پاس جاؤ اور اگر بیوقوفی کی ضرورت ہو تو اُس کے شارحین کے پاس ۔"

اب اِس حالت میں کہ تنقیدوں کا کوئی قطعی فیصلہ یا نتیجہ نہیں نکلتا تو کیا تنقید بے کار ہے ؟ کیا اس کی ضرورت ہی نہیں ہے ؟ اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ملکوں یا ایک ہی ملک میں تمام رہنے والوں کا ایک ہی پوشاک پر اتفاق نہیں ہے تو کیا پوشاک فضول ہے ؟ نہیں پوشاک کی ضرورت مسلّم ہے ۔ مگر مختلف ملکوں میں سردی گرمی کے اختلاف سے یا انفرادی پسند اور ناپسند سے فیشن اور پوشش میں اتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح

تنقیدوں میں لاکھہ اختلاف ہو تاہم وہ مفید اور ضرور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں ان کا رواج ہے -

اول تو یہی غلط ہے کہ تنقیدوں کا کبھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوتا - جمہوریت کی طرح اس میں بھی کثرت رائے بڑی چیز ہوتی ہے - مثلاً اگر ایک کتاب کے دس ناقد ہیں اور اگر ان میں سے آٹھہ گو جزئیات و تفصیلات تنقید میں ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں مگر اس بات پر متفق ہیں کہ تصنیف وقیع ہے تو اس کی وقعت میں شک نہ کرنا چاہیے - باقی دو جو کتاب کو بالکل ردی سمجھتے ہیں اُن کی رائے بہت وقیع نہیں سمجھی جا سکتی - اور اگر جہاں تین کی جائے تو شاید کوئی نہ کوئی وجہ مثل تعصب ، دشمنی - پارٹی بندی یا انفرادی حسد وغیرہ نکل آئے گی - مثال کے لیے کلام غالب کو لے لیجئے - ہر زمانے کے ناقدوں نے بہ متفقہ طور سے تسلیم کیا ہے کہ غالب کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے - گو بہت سے لوگوں کو کلام میں فارسی الفاظ و تراکیب کی زیادتی پسند نہیں ہے -

اس کے علاوہ تنقید سے اور کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں - پہلا فائدہ تو یہی ہے کہ اگر ناقد قابل ہو تو اس کی تنقید بجائے خود ایک نفس نیا لٹریچر ہوتی ہے - مثال کے لئے آزاد ، شبلی وغیرہ کافی ہیں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قابل ناقد ہمیں بتلاتا ہے کہ کسی بڑے مصنف کو کس طرح پڑھنا چاہیے - اُس کی گہرائیوں تک کس طرح پہنچنا چاہیے - ہڈسن - سینٹسبری - برنڈلے وغیرہ کی تنقیدیں ہمیں سکھاتی ہیں کہ شیکسپیر کو اس طرح مطالعہ (study) کرنا چاہیے - ناقد ہمارا رہنما ہوتا ہے وہ ایک راستہ بتانے والے کھمبے (finger post) کی طرح ہوتا ہے جو بتاتا ہے

کہ ادھر جاؤ - تیسرا فائدہ یہ ہے کہ تنقید عقل و ذکاوت میں تیزی اور گہرائی پیدا کرتی ہے - جس سے ہمارا ذوق ادب بلند ہوتا ہے اور ہم میں ادبی نکات کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے - اس کے علاوہ دنیا میں ہزاروں کتابیں ہیں اور انسان کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ سب کو پڑھے مگر باخبر (up-to-date) رہنے کے لیے ضرورت ہے کہ سب کے متعلق کچھ نہ کچھ جانتا ہو - اس لیے وہ چند کتابیں جن سے اُسے خاص دلچسپی ہے ؟ پڑھتا ہے اور باقی کتابوں کو معتبر ناقدوں کے ذریعہ پتہ لیتا ہے -

ناقد اور ادیب میں جنگ

سوسائٹی انفرادیت کی روادار نہیں ہو سکتی - وہ چاہتی ہے کہ کسی کو کوئی خصوصیت نہ ملے - جس کا مقام ذرا بھی الگ ہوتا ہے اس کو گھسیٹ کر سب لوگوں کے ساتھ ملانے کی کوشش کرتی ہے - یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی ہر جدّت کو بدعت سمجھتی ہے - یہ بڑی قدامت پسند ہوتی ہے - جن چیزوں سے یہ مانوس و آشنا ہوتی ہے وہی اُس کے لیے معیار کا کام دیتی ہیں ؟ اور اُنہیں سے ملتی جلتی چیزوں کو قبول کرتی ہے اور اُس سے خلاف چیزوں کو روک دیتی ہے - یہی وجہ ہے کہ ادب سے تنقید ہمیشہ پیچھے رہتی ہے اور اِسی لیے ناقد اور جدّت پسند ادیب میں ایک ابدی جنگ رہتی ہے - اگر ادیب کی شخصیت معمولی ہوتی ہے اور وہ اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتا ہے تو ناقد اُس کو دبا دیتے ہیں لیکن اگر اُس کی شخصیت زبردست ہوتی ہے اور زمانہ بھی اُس کے موافق ہوتا ہے تو وہ ناقدوں پر فتح پاتا ہے اور نقد ہی کا معیار بدل جاتا ہے - غالب اپنے زمانے سے بہت آگے تھا لیکن اُس وقت زمانے نے اُس کی قدر نہ کی - مگر حالی و آزاد باوجود خلاف آہنگی نقد و تبصرہ ناقدوں پر فتح پا گئے - سبب یہ تھا کہ

زمانہ آزاد و حالی کے موافق تھا - انگریزی تعلیم کا کافی اثر ہو چکا تھا اور چونکہ حالی و آزاد کا رنگ انگریزی ادب سے ملتا تھا اس لیے وہ چھا گیا اور اب اُس کا رواج عام ہے -

تنقید کا معیار

تنقید کا مادہ نقد ہے جس کے معنی پرکھنے کے ہیں - اب دیکھنا یہ ہے کہ کس قسم کی محک ہونی چاہیے - محک جو ناقدوں کے پاس ہوتی ہے وہ قدما کے کارناموں سے بنتی ہے - اسی بات سے ناقد اپنے زمانے کے تصانیف کو ناپتا ہے مگر ناپتے وقت بڑی ہوشیاری اور خبرداری چاہیے ورنہ بڑی خرابی پیدا ہو سکتی ہے - اگر قدما کے تصنیفی کارناموں کی مطابقت کی جائے گی تو یقیناً وہ ہرگز نہ ہو سکے گی - کیونکہ ہر زمانے کا رنگ کچھ نہ کچھ یقیناً جداگانہ ہوتا ہے اور اگر پرانے نمونوں سے مطابقت کُلی نہ ہونے کی وجہ سے موجودہ ادب کو ناقص کہا جائے تو یہ بڑی بے انصافی ہو گی اور اگر ناقد کی انفرادی پسند اور ناپسند کو معیار قرار دیا گیا تو بھی نقد منصفانہ نہیں کہا جا سکتا - اس لیے ناقد میں ایک خاص لیاقت کی ضرورت ہے -

اوصاف نقد

نقد و تبصرہ کے لیے انگریزی میں الفاظ کریٹی‌سزم (Criticism) ریویو (Review) اور ہندی میں آلوچنا - سمالوچنا - اپودرشن وغیرہ مستعمل ہیں - کریٹی‌سزم کے معنی وہی ہیں جو نقد کے ہیں یعنی پرکھنے کے اور ریویو کے معنی پھر سے دیکھنا ہے - تبصرہ کے معنی مختصر دیکھنے کے ہیں ہندی کے لفظ اپودرشن کے ٹھیک وہی معنی ہیں جو انگریزی میں ریویو کے ہیں - کیونکہ اپو کے معنی نقد ہے اور درشن کے معنی دیکھنا ہے - آلوچنا اور سمالوچنا کو بھی دیکھنے سے تعلق ہے - لوچنا کے معنی دیکھنے کے ہیں اور آ کے معنی سب طرف سے ہر پہلو سے -

اسی آلوچنا کے پہلے لفظ سم لگانے سے سمالوچنا بنا ہے - سم کے معنی راست - درست - منصفانہ وغیرہ کے ہیں - پہلی بات جس پر نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ سنسکرت میں تنقید کے لیے کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کے معنے پرکھنے کے ہوں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندؤں کے نقطۂ نظر سے تنقید کا مقصد کھوٹا اور کھرا بتانا یعنی تحسین و تنقیص کرنا اُتنا نہیں ہے جتنا کہ کسی ادیب کو اچھی طرح سمجھنا ہے - اب لفظ اتو درشن پر پھر نگاہ ڈالیے - اس کے معنے پیچھے دیکھنے کے ہیں - یعنی ادیب نے جس زاویۂ نگاہ سے چیزوں کو دیکھا ہے اُن پر اُسی زاویۂ نگاہ سے نگاہ کی جائے - اس کے یہ معنے ہوئے کہ ادیب کو کماحقہٗ سمجھنا ہی تنقید کا مقصد ہے - آلوچنا کے معنے ہیں سب طرف سے دیکھنا یعنی ایسا دیکھنا کہ کوئی نقطہ یا کوئی چیز و نظر انداز نہ ہو اور اُس کی نگاہ سے ادب کی کوئی اصلیت پوشیدہ نہ رہ جائے - سمالوچنا میں اتنا مفہوم اور زیادہ ہے کہ اس طرح سے دیکھیے کہ کوئی بے عنوانی نہونے پائے - دیکھنا راست درست یعنی ہر لحاظ سے منصفانہ ہو - پس ناقد کے یہی اوصاف ہیں کہ اچھی طرح دیکھے اور انصاف سے دیکھے - دیکھنے میں جلد بازی نہ کرے - بلکہ نہایت صبر سے کام لے -

جب ناقد کو غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے تو چاہیے کہ اُس کے آنکھیں ہوں جن کی روشنی بہت تیز ہو تاکہ وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز دیکھ سکے اور دور تک دیکھ سکے - آنکھ ہونے سے یہ مُراد ہے کہ ناقد میں تنقید کرنے کا قدرتی مادہ موجود ہو - اگر اس قدرتی جوہر کی کمی ہے تو علم و فضل سے اچھا ناقد بننا نہایت دشوار ہے - یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بہت کم پڑھے لکھے لوگ اچھا تبصرہ کر جاتے ہیں اور اکثر پڑھے لکھے لوگ باوجود گرانباری علم و فضل

اتنا کامیاب نہیں ہوتے - اس جوہر لطیف کے پتہ لگنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی - جس میں یہ جوہر ہوگا اُس کی پہلی تنقید اُس سے کہیں بہتر ہوگی - جیسے اس جوہر سے محروم شخص نے عمر بھر کی مشق کے بعد لکھا ہو - دو ہی تین تنقیدوں میں خود ناقد کو پتہ چل جائیگا کہ گویا یہ چیز میری روح میں مضمر تھی - اور جس میں یہ جوہر نہوگا اُسے بھی جلد معلوم ہو جائیگا کہ میں کسی اور کام کے لیے بنایا گیا ہوں - ایسے شخص کو تنقید سے ہاتھ اُٹھا لینا چاہیے -

اب جسے قدرت کی طرف سے آنکھیں ملی ہوں اُسے چاہیے کہ سُرمے اور کاجل سے اپنی آنکھوں کی روشنی تیز کرے - یعنی علم و فن سے قدرتی مادہ کو چمکائے - اس سے یہ مطلب ہے کہ ناقد فن تنقید سے محض علمی طور سے واقف نہ ہو بلکہ عملی طور سے قدما کے شاہکار ناموں کو پڑھ گیا ہو - ادب کے جتنے شاہکار مل سکے ہوں سب کا با قاعدہ مطالعہ کر چکا ہو - یوں تو جتنی ہی بڑی یافتہ زبانوں سے ناقد واقف ہو اتنا ہی اچھا ہے مگر کم از کم اس کو اپنی زبان اور ایک دوسری زبان جو اُس کے زمانہ میں معراج ترقی پر ہو جاننا لازمی ہے - اگر وہ محض اپنی زبان جانتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ اُس کی نگاہ محدود ہو اور تنقید ناقص - زبان اردو میں ہندی فارسی دو جزو اعظم ہیں اس لیے اردو کے ناقد کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندی فارسی اچھی طرح جانتا ہو - اس کے علاوہ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ یورپ کی بہترین زبانوں میں سے کسی ایک کو مثلاً انگریزی ، فرانسیسی ، یا جرمن کو بھی جانتا ہو - تنقیدات کا یہ بہت بڑا دھوکا ہے کہ آدمی جب ایک سمت میں فائل ہوتا ہے تو وہ اپنے کو ہر چیز میں فائل سمجھتا ہے اور ہر چیز پر رائے دینے کا حق رکھنے کی کوشش کرتا ہے -

ایک وکیل صاحب ہیں جن کو ادب سے بہت کم لگاؤ ہے ۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے میرے ایک دوست سے ایک شعر کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی جو اتنی ہی لغو تھی جتنی کہ ایسے شخص سے امید کی جاسکتی تھی ۔ مگر اس کی صحت پر بڑے شد و مد سے بحث کر رہے تھے ۔ میرے دوست نے اُن سے پوچھا کیوں وکیل صاحب اگر آپ سے کسی قانون کے بارہ کوئی غیر قانونی آدمی بحث کرنے لگے تو آپ اُسے کیا سمجھیں گے ۔ وکیل صاحب نے جواب دیا کہ میں اُسے اول درجہ کا احمق سمجھونگا ۔ اس پر میرے دوست مُسکرائے اور بحث ختم ہوگئی ۔ الغرض جس میں تنقید کرنے کی اہلیت نہو اس کو چاہیے کہ اس وادی میں قدم نہ رکھے ۔

جب آنکھ بھی ہو اور اُس کی روشنی بھی کافی تیز ہو چکی ہو تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آنکھ میں کوئی عیب یا بیماری تو نہیں ہے ، جس سے کچھ کا کچھ دکھائی دینے لگتا ہو جیسے احول ایک چیز کو دو دیکھتا ہے یا پیدکی آنکھوں کے امراض تعصب ، دشمنی یا رتی بندی وغیرہ ہیں ۔ اگر یہ امراض ہوئے تو ادیب کا حُسن بھی اُسے عیب معلوم ہونے لگے گا ۔ چند حضرات لکھنؤ کا دعویٰ ہے کہ کسی غیر لکھنوی کو زبان نہیں آسکتی ۔ یا بعض اصحاب کا اعلان ہے کہ کسی ہندو کو اردو آہی نہیں سکتی ۔ یہ تعصب کی مثالیں ہیں ۔ مگر آج کل اردو میں جو رسالے نکل رہے ہیں اُن کو دیکھنے سے عجیب تماشا دکھائی دیتا ہے ۔ " مبصر " ناقب صاحب لکھنوی کی غلطیاں اور خامیاں دکھلاتا ہے ۔ " جام جہاں نما " میں کبھی لکھنوی حضرات کی غلطیاں طشت از بام کی جاتی ہیں ۔ جناب بہار فتحپوری کی غلطیاں " مبصر " میں اُجاگر کی جاتی ہیں ۔ اس لیے میری رائے ناقص میں یہ بات آتی ہے کہ اُردو ایک ایسی زبان ہے ،

جو نہ ہندوؤں کو آسکتی ہے اور نہ مسلمانوں کو نہ لکھنوی کو اور نہ غیر لکھنوی کو ۔ خیر یہ لطیفہ تو بیچ میں آگیا تھا ۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ جب کسی فرد یا جماعت کے خلاف کوئی رائے قائم کرلی جائیگی تو خوامخواہ عیوب و نقایص اور خامیاں دکھائی دینے لگیں گی دشمنی کی مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔ پارٹی بندی یہ ہے کہ ناقد کو کسی خاص پارٹی یا اسکول کا حامی نہ ہونا چاہیے ورنہ وہ دوسرے اسکول یا پارٹی کے محاسن کو نہ دیکھ سکے گا ۔ المختصر تنقید کے لیے ناقد کو پہلے خود اپنا ناقد ہونا چاہیے ۔

غرض کہ جب آنکھ تیز ہو اور اس میں کوئی بیماری بھی نہ ہو تو چاہیے کہ تنقید کرے وقت ناقد خوردبین اور دوربین کا استعمال کرے تاکہ جزئیات تک سے واقفیت ہوجائے اور کوئی ضروری بات نظر انداز نہ ہونے پائے ۔ اپنی انفرادی پسند اور ناپسند سے کنارہ کش ہونا دوربین ہے اور ادیب کے ساتھ انتہائی ہمدردی خوردبین ہے ۔ اگر ناقد ان دونوں چیزوں سے کام لے تو یقیناً اس کی تنقید صحیح ہوگی ۔ الفاظ ریویو اور ایوریشن صاف طور سے بتلاتے ہیں کہ جس طرح ادیب نے چیزوں کو دیکھا ہے اُسی طرح تم بھی تنقید کرتے وقت اُن چیزوں کو اُسی زاویۂ نگاہ سے دیکھو ۔ اور یہ کب ممکن ہو سکتا ہے جب کہ ناقد اپنی انفرادی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھدے اور ادیب کے ساتھ نہایت ہمدردی دکھائے ۔ ناقد کو چاہیے کہ ادیب کی تصنیف پڑھتے وقت اپنے کو ادیب کی پوزیشن میں ڈالدے ۔ یعنی اپنی شخصیت کو ادیب کی شخصیت میں محو کردے اور اُس کو وہی باتیں پسند یا ناپسند ہوں جو ادیب کو پسند یا ناپسند ہوں ۔

فراهمي مواد ذهني

جب تنقید کا اصلي مقصد ادب کو کما حقه سمجھنا ھے تو دیکھنا چاھیے که ناقد پہلے کن کن چیزوں کو جمع کرے جن سے ادب کي ساخت دماغ کو سمجھه سکے ، جو مصنف پر تنقید کا اصلي منبع ھے - اس کے لیے سب سے پہلے ادب کے تمام تصنیفات یہاں تک که مراسلات تک کو جمع کرے کیونکه یه سب چیزیں ایک ھی دماغ کا نتیجه ھوتی ھیں - اسی لیے ان چیزوں کي مدد سے اس کے دماغ کا صحیح رجحان اور اس کے صحیح خیالات کا پته چلتا ھے - دوسرے یه که ادیب کی متعدد سوانحعمري حاصل کرے اور ان اُمور پر غور کرے اور ان شخصیتوں کا پته لگائے جن سے ادیب کے دماغ کي تشکیل میں مدد ملی ھے - تیسرے یه دیکھے که ناقد کس قوم یا ملت کا ھے - وه قوم یا ملت کہاں تک ترقی کر چکي ھے اور اس قوم یا ملت کے کیا خصوصیات ھیں کیونکه اِن چیزوں کا بھي دماغ پر اچھا خاصه اثر پڑتا ھے - چوتھے یه که اُس زمانے کی تاریخ اور اس زمانے کے ادب کا گہرا مطالعه کرے کیونکه کوئي ہستي اپنے زمانے کی تحریکوں اور خیالوں سے بچ نہیں سکتی اور پانچویں اگر ممکن ھو تو اُس زمانے کي تاریخ ادب کا بھی مطالعه کرے کیونکه ایک مشہور ادیب ادبی تاریخ کي ایک کڑی ھوتا ھے - وه اپنے پیشروؤں سے اثر قبول کرتا ھے اور اس کا اثر آئنده نسلوں پر پڑتا ھے -

اصلي ادیب کي پہچان

ادب دو قسم کے ھوتے ھیں ایک تو وه جو دنیا کو ایک نیا زاویۂ نگاه دیتے ھیں جیسے کالیداس ، ورڈسورتھ ، ٹیگور وغیره - دوسرے وه جو وقتی حُسن کو پیشگی عطا کرتے ھیں یا دنیا کي معمولي سی معمولي چیزوں میں ایک

حُسن دیکھتے ھیں جس پر عوام کی نگاہ نہیں جاتی اور اسی حُسن کی تصویر کھینچ کر وہ دنیا کو نیا بنانے کی کوشش کرتے ھیں - دنیا کے تمام نیچرل شعرا کا اسی طبقہ میں شمار ھے - بطیر اکثر آبادی نے دنیا کی معمولی سے معمولی چیزوں میں ایک حُسن دیکھا جسے اور لوگ نہیں دیکھہ سکتے تھے - اُس نے اسی حُسن کی مرقع نگاریاں کی ھیں - وقتی خوبصورتی بھی دنیا کے لیے نئی چیز ھوتی ھے جو قدرت کی طرف سے ھمیں ملتی ھے - اگر اس کا فوٹو ذریعہ ادب ھمیشہ کے لیے ھمارے درمیان نہ رہ جائے تو دنیا کی یکسانیت سے ھم بہت جلد اُکتا جائیں - سیکڑوں حسن قدرت کی طرف سے آتے ھیں - سچے ادیب اس کو ادب کا آب حیات پلا کر زندگی دوام بخش دیتے ھیں - قدرتی مناظر کے علاوہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں سیکڑوں تصویریں وفا کی ، محبت کی ، غرور کی ، غصہ کی اور نہیں معلوم کتنے جذبات کی سامنے آتی ھیں - سچے ادیب ان کو شعر میں ، ناول میں ، قصوں میں ، ڈراموں میں بیان کر کے امر کر دیتے ھیں - رامائن کیا ھے ؟ انسانی زندگی و جذبات کے مختلف مرقعوں کا ایک مجموعہ ھے جس کو والمیک اور تلسی داس جیسا جاودانی دے گئے ھیں - شکسپیر ، فردوسی ، آنس وغیرہ بھی اسی قسم کے ادیب ھوگئے ھیں -

پہلی قسم کے شعرا یا ادیب جو دنیا کو ایک نیا زاویۂ نگاہ دیتے ھیں اور دوسری قسم کے ادیب جو وقتی حُسن کو ھمیشگی عطا کرتے یا معمولی چیزوں میں کوئی حسن دیکھہ کر اس کا فوٹو کھینچتے ھیں - اِن دونوں میں فرق یہ ھے کہ پہلا ایسے پڑھنے والوں کو اس دنیا سے اُٹھا کر اپنے ساتھہ دوسری دنیا میں لے جاتا ھے -

اور دوسرا خود پڑھنے والوں کے پاس آتا ہے - پہلا غیر محسوس یا غیر مرئی چیزوں کا پرستار ہوتا ہے اور دوسرا اسی دنیا کی محسوس اور مرئی چیزوں کا عاشق ہوتا ہے - ٹیگور - میرا - کبیر - پہلی قسم میں آتے ہیں اور ایبس - وردسی وغیرہ دوسری میں -

تنقید کا مقصد جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ادیب کو سمجھنا ہے اس لیے مواد تنقید فراہم کرنے کے بعد کتاب ادیب کا گہرا مطالعہ کرے اور جہاں کہیں کوئی غلطی یا خامی یا نقصان نظر آئے اُس سے بد ظن نہو - جہاں تک ہوسکے ان کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرے اور جس طرح ملزم کو شک کا فائدہ ملتا ہے اسی طرح کم از کم ادیب کو بھی ملنا چاہیے - اس طرح گہرا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چل جائیگا کہ کون اصلی ادیب ہے اور کون نقلی - اور بس یہی منتہائے تنقید ہے اور یہی اس کی آخری منزل -

دونوں قسم کے ادیب کی پہچان ان کی کامیابی ہے - کامیابی کے یہ معنے ہیں کہ باوجود خلاف تنقیدوں کے بھی ادیب ہر دلعزیز ہونے لگے - محض عوام میں نہیں بلکہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی - ادیب کے الفاظ اور طرز تحریر کی نقل ہونے لگے - ٹیگور کے اصلی شاعر ہونے کی یہی دلیل ہے کہ ہندی میں خاص طور سے اور اردو میں کم و بیش ٹیگورین طرز غالب آرہی ہے - مگر اس کسوٹی پر ادیب کو کسنے کے لیے بہت وقت چاہیے - اس لیے ایک دوسری پہچان بھی ہے وہ یہ کے جن چیزوں کا ادیب بیان کرتا ہے اُن کا اُس کی زندگی پر کوئی اثر ہے کہ نہیں - اگر اثر ہے تو وہ اصلی ہے ورنہ نقلی - ورڈسورتھ نے اگر کوئل پر نظم لکھی تو واقعی کوئل کی آواز اس کو ایک جذبے سے بیقرار کر دیتی تھی - اگر اُس نے ڈیفوڈلز (ایک پھول) پر کچھ لکھا تو وہ واقعی پھولوں کو دیکھ کر مست ہو جاتا تھا - لیکن کیا اردو غزل گویوں نے کبھی اُس

بیخودی کا خواب بھی دیکھا ہے جس کا بیان وہ بڑے شوق سے کیا کرتے ہیں - بہت سے ایسے شعراء ہیں جن کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ جبر ان کے مذہب کے منافی ہے مگر غزل میں وہ تصوف کا بیان کرتے ہیں یہ سب بھی شاعر ہیں - جتنے بھی شاعر اُردو میں ہوئے ہیں اُتنے دنیا کے کسی اور ادب میں نہیں ہوئے ہیں - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کے اردو شاعری کی ابتدا ہی فارسی شاعری کی نقل سے ہوئی - علم عروض - علم معنی علم بیان وغیرہ فارسی سے عاریت لیے گئے - تشبیہات تلمیحات - وغیرہ سب فارس یا عرب کے ہیں - لیلی مجنوں - شیریں ؟ فرہاد ؟ گل ؟ بلبل ؟ نرگس و سمسان وغیرہ اس کی بین مثالیں ہیں مگر ولی دکنی کے وقت سے یا یوں کہئے کہ جب اردو شاعری دلی میں پہنچی تو فقرا اور اولیا کی برکت سے اس میں تصوف کی چاشنی مل گئی جس کی وجہ سے اس میں ایک روح آگئی تھی مگر جب یہ لکھنؤ میں پہونچی تو لفظی تکلفات و رعایات میں اُلجھ کر اپنی رسمی اور لکیر کی فقیر بن گئی کہ اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب سکرتری انجمن ترقی اردو کا قول بہت صحیح معلوم ہوتا ہے ؟ انہوں نے شاید کچھ لوگوں میں فرمایا کہ اردو میں دیوان لکھنا کچھ مشکل نہیں - دو دیوان کوئی دیکھے تو تیسرا نہایت کامیابی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے - میرے ایک اور درست کا قول ہے کہ " اگر میں چند الفاظ ار قبل گل ؟ بلبل - آشیاں ؟ قفس ؟ صیاد ؟ زندان ؟ زنجیر ؟ صحرا ؟ وحشت ؟ بیماری ؟ جنازہ ؟ مرقد ؟ ہجر اور وصل وغیرہ وغیرہ لکھ دوں تو اُردو میں بڑے سے بڑے استاد کا مضمون ان کے باہر نہیں جا سکتا - " اس قول میں بھی بہت کچھ صداقت ہے - اردو شاعری کے رسمی رہ جانے کا دوسرا سبب مشاعرہ ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے - تیسرا

سب رسم اُستادی و شاگردی ہے اِس کی نظیر دنیا کے پردے میں ملنا محال ہے - کسی اور زبان میں یہ طریقہ نہیں پایا جاتا - یہاں تک کہ ہندی اور فارسی میں جس سے کہ اردو کا خمیر طیار ہوا ہے یہ رسم معقود ہے - کہا گیا ہے "الشعراء تلامذ الرحمان" - مگر یہاں اُردو میں دیکھئے کتنے لوگ خدائی کا دعوی کر رہے ہیں - اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُستاد کے رنگ کی وراثت شاگردوں کو ملتی ہے اور ایک خاص لکیر کا سلسلۂ نامتناہی چلتا ہے جس کے سیکڑوں ہزاروں فقیر پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں - ناسخ میں جو روکھا پھیکا پن اور بے کیفی ہے جو لفظوں کی رعایت ہے اس کا عکس خواجہ وزیر ؟ اور رشک وغیرہ میں کیسا نمایاں ہے - اس میں شاگردوں کی انفرادیت کا خواہ مخواہ خون ہوتا ہے - شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہوتی ہے جو اس مرض کا شکار نہیں ہوتی اور اپنا ایک علیحدہ رنگ قائم رکھتی ہے - سب یہ ہے کہ شاگرد کے لیے اُستاد آئیڈیل ہوتا ہے - اس لیے سا دو نادر کوئی ایسا ناخلف شاگرد ہوتا ہے جو استاد کے رنگ سے رو گردانی کرتا ہو - شاگردی کا مرض اردو میں اتنا عام ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جسے یہ چھوت نہ لگی ہو - تعجب تو یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان جو یونیورسٹی سے اعلیٰ ڈگری لے کے نکلتے ہیں اور جو کم و بیش نورمین لٹریچر سے آشنا ہوتے ہیں اُن پر بھی یہ جادو چل جاتا ہے اور اکثر اوقات وہ کسی نرالے دھرالے فارسی عربی پڑھے ہوئے مولوی کے شاگرد ہو جاتے ہیں جس کا دماغ اتنا محدود ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زندہ ہوتے ہوئے بھی اُس کو نہ مطالعۂ سترھویں یا اٹھارھویں صدی کا آدمی کہہ سکتے ہیں - ایسا اُستاد اعلیٰ تعلیم یافتہ شاگرد کے خیالات کو سمجھنے ہی نہیں سکتا اصلاح بھلا کیا دیگا - کیا کرے چارونا چار اُس کو زبان و محاورہ کے دام میں پھنسا کے مرعوب

کیے رہتا ہے - میری رائے میں اول استاد نہ رکھے اور اگر ضرورت ہی ہو تو کسی ایسے شخص کو استاد بنائے جو شعر نہ کہتا ہو اُس سے عروض و قافیہ وغیرہ پڑھ لے مگر اصلاح نہ لے اور اصلاح بھی لے تو یوں کہ استاد محض غلطیوں کو بتا دے اور شاگرد اس کو خود درست کرے - استاد اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا کیونکہ کوئی استاد ؟ شاگرد کے دماغ اور خیالات کو بدل نہیں سکتا - استاد کی مثال میرے ایک دوست نے دزی سے دی ہے اور وہ بہت درست ہے کیونکہ دزی تراش خراش کر سکتا ہے مگر کپڑے کی ماہیت نہیں بدل سکتا - اردو تنقید میں جو زبان و محاورہ کا اتنا طومار ہے وہ اسی رسم استادی کی بدولت ہے کیونکہ لے دے کے یہی چیز ہے جس پر ان کے قصر اُستادی کی بنیاد ہے - اس لیے اگر زبان و محاورہ کی دھر پکڑ اردو سے رخصت ہو جائے تو کتنے استادوں کی استادی تسریف لے جائے - کتنے زبان کے مرکزوں کی مرکزیت رفو چکر ہو جائے - اہل زبان و زبان داں کا اختیار خدا جانے اُڑ کے کہاں پہونچے - زبان و محاورہ کی گرفت اردو کے لیے مخصوص ہے - کسی یورپین یا ایسائی زبان میں یہ حماقت نہیں کہ شاعر کو زبان و محاورہ کی غلطیوں کا مجرم ٹھہرایا جائے اور صرف اِس جرم کی بنا پر اُس کی تمام شاعری پر پانی پھیر دیا جائے شاید اُنھیں حماقتوں نے اقبال ایسے شاعر کو اُردو کی گود سے چھین لیا - اقبال نے اُردو شاعری سے توبہ کرلی ہے کیوں کہ یہ برابر کہا جاتا تھا اور اب بھی کہا جاتا ہے کہ پنجابیوں کو اُردو نہیں آ سکتی گو کہ حالی کی پیشین گوئی کہ اُردو دلی اور لکھنؤ سے اُٹھ کر پنجاب پہونچ جائیگی ' بالکل صحیح اُتر رہی ہے - وہ فارسی شاعر جس نے کہا تھا کہ " شعر مرا

مدرسہ کہ ردُ ؟؟ تنقید کے صحیح معنے اور زبان و محاورہ کی غلطیوں کا صحیح مقام جانتا تھا - سچ ہے زبان و محاورہ کی غلطیوں کی گرفت مدرسہ میں ہونی چاہیے جہاں طلبا کو زبان سکھائی جاتی ہے نہ کہ تنقید میں جس کا منشا ادیب کو کماحقہ سمجھنا ہے -

شاعر یا ادیب کا کام دنیا کو نیا کرنا ہے - اِس لیے وہ ایک نیا رنگ پیش کرتا ہے اور ایک نئی طرز تحریر کی بنا ڈالتا ہے - الفاظ کو نئے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور نئے محاوروں کی تخلیق کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ورڈ سورتھ - شیلی اور ٹیگور وغیرہ کے یہاں بے شمار الفاظ ہیں جن کو اِن شعرا نے اپنے کسی خاص معنے میں استعمال کیا ہے - کیسی غلطی اور کتنی بے انصافی ہے کہ شاعری کو پہلے سے بندھے تنگے الفاظ و محاورہ کی ناپ سے ناپا جائے - یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں کی تنقید میں زبان و محاورہ کی غلطیاں نہیں دکھائی جاتیں - بلکہ ناقد ادیب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے الفاظ کو نوٹ میں ظاہر کر دیتا ہے جن کو ادیب نے خلاف رواج اپنے کسی خاص معنے میں استعمال کیا ہے - کیونکہ یہ تو ہر شاعر کا قدرتی حق اور طُرۂ امتیاز ہے - مگر اُردو میں جہاں اور تماشے ہیں وہاں یہ بھی ہے - اُردو میں ایک بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اگر پرانی باتوں کو لکھو تو اعتراض ہو کہ اِس میں نیا کیا ہے ؟ اساتذہ یہ سب کچھ کہہ گئے ہیں چھوڑ کیا گئے ہیں ؟ اور اگر کوئی جدّت کی جائے تو کہا جائے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کیونکہ سلف سے آج تک کسی اُستاد نے ایسا لکھا ہی نہیں - مثال کے لیے ایک شعر پیش کرنا چاہتا ہوں - شاعر

نے ایک نظم نعت میں لکھی ہے جس میں سجدہ کا ذکر ہے - شریعت میں نبی کے لیے سجدہ کا حکم نہیں ہے جیسا کہ اسی نظم کے ایک شعر سے ظاہر ہے :-

"جلوں میں جان جریں کو نثار کر ڈالوں
نہیں ہے اہل شریعت جبیں کو اذن سجود"

مگر آگے چل کے جب نبی نے خود شاعر کا مدعا پوچھا تو نظم کے آخری دو بیت شعر یوں ہیں —

کہا اس ادا سے مرا اُس نے مدعا پوچھا
ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود
ذرا خبر نہ رہی ہوش و عقل و ایمان کی
نہ شعر پڑھ کے وہیں ڈالدی جبینِ سجود
چو بعد خاک شدن با زباں بود یا سود
نہ بود خاک سوم ننگرم چہ خواہد بود

جب شاعر کی یہ حالت ہوئی کہ عقل و ہوش و ایمان کی ذرا بھی خبر نہ رہی تو وہ قیود شریعت سے آزاد ہو گیا اور اِس لیے اب جبین سجود کا ڈالنا جائز ہو گیا - مگر سنئے اس پر لائق ناقد نے اعتراض کیا ہے کہ جبیں ڈالنا محاورہ نہیں ہے جبیں رکھنا یا جھکانا صحیح ہے کیونکہ آج تک کسی اُستاد نے جبیں ڈالنا نہیں لکھا - ناقد ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں - انگریزی تعلیم سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں - مگر اُردو میں زبان و محاورہ کا ایسا حال بگڑا ہوا ہے کہ اُس سے بچنا مشکل ہے - اِس حمّام میں سب ننگے نظر آتے ہیں - جو نازک فرق جبیں رکھنے اور جبیں ڈالنے میں ہے وہ ناقد کے فہم سے یا تو بالا تر ہے یا وہ جان بوجھ کر کسی وجہ سے اُس پر نگاہ ڈالنا

نہیں جاھتا - جبیں رکھنے کے معنے سمجھ بوجھ کر کسی مقام پر سر جھکنا ھے - اِس میں ارادے کا اچھا خاصہ رنگ ھے اور جبیں ڈالدینے میں ایک بیخودی ایک اضطراری کیفیت ھے جو عقل و ھوش سے بے نیاز ھے - اب بتائیے یہاں کون لفظ موزوں ھے میرے خیال میں اگر یہاں جبیں رکھ دینا یا جھکا دینا جیسا کہ ناقد نے اصلاح دی ھے بنا دیا جائے تو شعر چوپٹ ھو جائے - نہیں ' نہیں ' پوری نظم بے معنی ھو جائے اور نعت کی شان جاتی رھے - " ندیں جو اھل شریعت جبیں کو اذن سجود " اور " زرا خبر نہ رھی ھوش و عقل انساں کی " وغیرہ وغیرہ کی چول نہ بیٹھے مگر جاھے زمین اُلٹ جائے اور چاھے آسمان درھم برھم ھو جائے - یہ کیونکر ھو سکتا ھے کہ جبیں رکھنے یا جھکانے کے بجائے جبیں ڈالدینا لکھا جائے - کیونکہ ایسا تو کسی اُستاد نے لکھا ھی نہیں - جس ادب میں اتنی غلامی موجود ھو وہ بھلا کیا ترقی کر سکتا ھے - اردو ادیبوں کو اِس شاعر کا ممنون ھونا چاھیے اور خود اُردو ادب کو اِس پر نثار کرنا چاھیے کہ ایک اضطراری حالت میں سجدہ کرنے کے لیے بلکہ سجدہ ھو جانے کے لیے اُردو میں کوئی لفظ نہیں تھا - اِس شاعر نے اُسے عطا کیا - یہی نئے محاورہ کی تخلیق ھے جو ایک زندہ زبان کے لیے لازمی ھے - محاورے آسمان سے تو اُترے نہیں ' انسانوں ھی نے اُنہیں بنایا ھے - اِن کی تخلیق یوں ھوتی ھے کہ کبھی کوئی ترکیب ابتدا عوام کی جانب سے نکلتی ھے مگر وہ اتنی خوبصورت و دلکش ھوتی ھے کہ خواص تک میں مقبول ھو جاتی ھے اور کبھی خواص سے نکلتی ھے اور عوام میں پھیل جاتی ھے - ھمیشہ اِن کی تخلیق ھوتی رھنا چاھیے اور ھرکس و ناکس کو اختیار ھے

کہ وہ نئے محاوروں کی تطبیق کرے - یہ بات دوسری ہے کہ جس میں جان ہوگی وہ سب کے زبانوں پر چڑھ جائیگا اور اُس کا استعمال عام ہو جائیگا اور جو ردّی ہوگا اُسے خود کوئی نہیں پوچھے گا یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ معنی بمنزلۂ جسم ہے اور الفاظ و محاورہ بمنزلۂ پوشاک - اگر شیروانی فٹ نہیں آتی تو اُسے یہاں وہاں سے کھول کر ٹھیک کر دو اور کسی طرح درست نہیں ہوتی تو خیرباد کہو - لیکن یہ کہاں کا دستور ہے کہ شیروانی کو ہاتھ نہ لگاؤ بلکہ ایک بغلی کو دبا دو جس سے شیروانی فٹ ہو جائے - زبان محض خیالات کے اظہار کا آلہ ہے - وہ زبان مردہ ہے جس میں نئے نئے الفاظ و محاورہ کی تطبیق روز بروز نہ ہو رہی ہو - مگر اردو میں زبان کے ٹھیکے دار جو کچھ اساتذہ لکھ گئے ہیں بس اُسی سے زبان کو محدود رکھنا چاہتے ہیں - اگر ایسا ہوا تو اردو ترقی نہیں کر سکتی اور چند ہی روز میں مثل سنسکرت ایک مردہ زبان ہو جائیگی - سنسکرت کے گرامر بنانے والوں نے بھی یہی غلطی کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت ایک مردہ زبان ہو گئی - اسباب کا یہ سب سے زبردست اصول ہے جس سے کوئی زبان مستثنیٰ نہیں ہو سکتی - جو محاورے آج کل رائج ہیں اُن کی تطبیق برائے اساتذہ نے اپنے زمانے میں کی تھی اگر اُن کے عہد میں آج کل کی طرح کوئی اُن سے معترض ہوتا ، کہ آپ نے یہ محاورہ کس طرح نظم کیا - اس طرح تو قدما میں سے کسی نے لکھا ہی نہیں - تو آج زبان کی کیا حالت ہوتی - یقیناً زبان کی ترقی رک گئی ہوتی - اسی طرح اگر آج اسی طرح کے اعتراض کیے جاتے ہیں تو اس کے صاف معنے یہی ہیں کہ آیندہ ترقی کے راستے مسدود کیے جا رہے ہیں - اگر اردو اخباروں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے تا کہ دس برس کے اندر اندر

کتنے نئے لفظ مستعمل ہوگئے ہیں، مگر اُن کے لیے کوئی شور نہیں مچاتا۔ ہاں اگر نظم میں کوئی جدّت کرے تو بے شک وہ گردن زدنی ہے -

خیر یہ تو غیر متعلق بحث تھی - میں کہہ رہا تھا کہ جس شاعر کی زندگی میں اُن باتوں کا اثر نہ ہو جن کا ذکر وہ اپنی شاعری میں کرتا ہے تو فوراً ناقد کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اصلی شاعر نہیں ہے - اگر کسی شاعر یا ادیب کی طرز تحریر سب سے الگ جھلک نہیں ہے اور وہ ادب کو نئے معنے اور نئے لفظ نہیں دیتا تو سمجھ لو کہ وہ نقال ہے - اس لیے اگر کوئی شاعر اپنے استاد کے رنگ میں کہتا ہے یا کسی غزل یا دیوان کا جواب لکھتا ہے ؟ یا کسی کتاب کا نظم میں ترجمہ کرتا ہے تو پہچان لو کہ وہ غیر شاعر ہے - اسی طرح اگر کوئی مشاعرہ، دربار ؟ نام نمود یا انعام پانے کے لیے یا کسی اور غرض سے شعر کہتا ہے تو اُس کے شاعر ہونے پر ایمان نہ لانا چاہیے، کیونکہ شعر ایک جذبہ ہے جو خود اُبلتا ہے -

یہاں پر یہ بھی جان لینا بیجا نہ ہوگا کہ معدودے چند لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بغیر تجربہ یا محسوس کی ہوئی چیزوں کو اس طرح لکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں گویا اُن کے اوپر بیتی ہوئی داستان ہے - جیسے حضرت ریاض جنھوں نے شاید عمر بھر کبھی شراب نہیں پی مگر ان کے خمریات اپنے معرکۃالآرا ہیں کہ اگر ان کو کوئی نہ جانتا ہو تو شاید اُسے یقین آجائے کہ وہ بڑے میخوار ہیں - جن لوگوں میں ایسی صلاحیت موجود ہوتی ہے اُنھیں آرٹسٹ کہنا چاہیے - منظوم ترجمہ کرنے والے کو بھی آرٹسٹ ہی کہنا چاہیے - مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اور آرٹسٹ کا اجتماع ایک ہی شخصیت میں ہوجاتا ہے اور ایسے شخص کی شاعری میں چار چاند لگ جاتے ہیں -

اوپر جو دو قسم کے شاعر بتلائے گئے ہیں ان میں سے دوسری قسم والوں

کو آرٹسٹ ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اُنھیں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے خود آنا پڑتا ہے - اُن کی شاعری پہلی قسم کے شعر کی طرح انفرادی نہیں ہوتی - یہ نیچر کی یا انسانی جذبات و واقعات یا مغبرات زمانہ کی تصویریں کھینچتے ہیں - اس لیے اگر یہ بکے آرٹسٹ نہیں ہیں تو اُن کی مصوری ناقص رہ جائیگی -

گو کہ آرٹسٹ سچے شاعر کی نقل کر لیتا ہے اور اِس کمال سے کہ سمجھ کرنا مشکل ہو جاتا ہے مگر جیسا کہ ایک شخص کا قول ہے کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب فن تنقید اتنا ترقی کر جائے گا کہ آرٹسٹ دھوکا نہ دے سکے گا - مگر اِس زمانے میں بھی اگر غور کیا جائے تو بھی (بہزار دقت) پتہ چل ہی جاتا ہے کہ کون آپ بیتی کہتا ہے اور کون جگ بیتی -

آیا تنقید میں موازنہ کی ضرورت ہے ؟

تنقید میں موازنہ کی ضرورت ہے ؟ کیونکہ تنقید کی غرض ادب کی شخصیت کو کما حقہ سمجھنا ہے اور شخصیت اچھی طرح نمایاں نہیں ہوتی جب تک کہ اُسی قسم کے دوسرے ادیبوں سے مقابلہ و موازنہ نہ کیا جائے - خیالات میں بھی موازنہ ہونا چاہئے اور طرز تحریر میں بھی تاکہ معلوم ہو کہ اس کے خیالات میں اوروں سے کیا امتیاز ہے - اور وہ کون کون سے الفاظ و محاورہ ہیں ، جن کی اُس نے تخلیق کی اور وہ کون کون الفاظ ہیں جن کو اُس نے کسی خاص معنے میں استعمال کیا - لیکن اس موازنہ میں بڑے چھوٹے کا خیال نہ ہونا چاہیے - اس بات کی کوشش ہونا چاہیے کہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دی جائے یا ایک کو دوسرے سے برتر ثابت کیا جائے - ہندی میں میں دو اور تمہاری کے جھگڑے کے سلسلے میں جو ابھی تک کچھ نہ کچھ جاری ہے

موازنے کا (جس کو ہندی میں تُلنا تمک سما لوچنا کہتے ہیں)
جیسا غلط استعمال کیا گیا ہے وہ بیان سے باہر ہے ۔ تنقید میں
ہرگز یہ غیر تنقیدی مظاہرہ ہونا چاہئے ۔ اردو میں بھی یہ زہر
سرایت کیے ہوئے ہے ۔ تنقید کا مقصد یہ ہے کہ پہلے طے کر لیا
جائے کہ ادیب ادیب ہے یا زنّال ۔ اس کے بعد سمجھنے سمجھانے
کی بہترین کوشش کی جائے کیونکہ بہترین ناقد بہترین شارح
ہوتا ہے ۔ اس کے بعد ناقد بذریعہ موازنہ و مقابلہ ادیب کی خصوصیات
جو خیالات و جذبات سے متعلق ہیں اور جو طرز تحریر سے وابستہ
ہیں ، دونوں کو نمایاں طور سے پیش کرے ۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے
نقطۂ نظر سے بھی موازنہ کی ضرورت ہے ۔ ناقد کے پاس ادبیات کو
پرکھنے کی کسوٹی صرف قدما کا بہترین کارنامہ ہے ، مگر جیسا کہ
لکھا گیا ہے اس قسم کے موازنہ میں بڑی ہوشیاری و خبرداری
چاہیے ۔ ادیب قدما کے کارناموں میں مقید نہیں رہ سکتا کیونکہ اگر
ایسا کرے تو وہ اصلی ادیب نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے کہ جدّت ہی
اصلی ادیب کی پہچان ہے ۔ قدما کے نمونوں کی ظاہری باتوں اور جزئیات
و تفصیلات سے موازنہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اُن کی جو اسرت یعنی
روح ہے اُس سے مقابلہ کرنا چاہیے ۔ مثلاً مرثیہ میں ساقی نامہ کہنے
کا رواج ہے ۔ تو اب اگر کوئی مرثیہ لکھے اور اس میں ساقی نامہ نظر انداز
کر دے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مرثیہ ؟ مرثیے کے معیار سے گرگیا ۔
یا انیس نے ساقی نامہ نہیں کہا تو اُن کے مرثیوں میں اس کی وجہ
سے کوئی خامی ہے ۔ یا حالی نے جو غالب کا مرثیہ لکھا ہے اس میں
نہ چہرہ ، نہ گھوڑا ، نہ تلوار ، نہ رخصت ، نہ جنگ ۔ یعنی مرثیہ
کی مسلّمہ چیزوں میں سے کچھ نہیں ہے ، مگر یہ کون کہہ سکتا ہے
کہ وہ مرثیہ نہیں ہے ۔

نقائص تنقید

جب تنقید کے معنی چیزوں کو اُسی نگاہ سے دیکھنا ہے جس سے کہ ادیب نے دیکھا ہے تو تنقید کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ناقد تصنیف پر تنقید میں اپنے خیالات بڑھانے کی کوشش کرے - تلسی داس کی سیدھی سیدھی چوپائیوں میں آج کل جتنے معنے پیدا کئے جا رہے ہیں وہ یقیناً تلسی داس کے بھی دماغ میں نہ رہے ہوں گے - رامائن ایک داستان ہے جس میں تسلسل کے اعتبار سے چوپائیوں کے ایک اور صرف ایک معنے ہیں مگر ناقدوں اور شارحوں کی موشگافیوں کو کوئی کیا کہے - دوسرا نقص یہ ہے کہ تنقید ذاتی اغراض سے وابستہ ہو - مثلاً نام و نمود کے لیے - اپنے کو ناقد یا شارح ثابت کرنے کے لیے ؟ اپنا رعب بٹھانے کے لیے ' اپنے کو دوسروں سے بہتر ثابت کرنے کے لیے ' دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے ' مخصوص اغراض کرنے کا سوں پورا کرنے کے لیے ' اپنے اسکول یا مذاق یا پارٹی کا وقار قائم رکھنے کے لیے ' وغیرہ وغیرہ ' ہزاروں اقسام کے اغراض ہو سکتے ہیں - تیسرا نقص مذکورۂ بالا '' آنکھوں کی بیماری '' سے پیدا ہوتا ہے - اگر تعصب ' تاریک ' دشمنی ' پارٹی بندی وغیرہ کا چشمہ لگا ہوا ہے - تو یقیناً تنقید صحیح نہیں ہو سکتی -

تاریخ تنقید ادب اردو

اردو میں یورپین زبانوں کی طرح کسی ادیب یا شاعر پر ایک پوری کتاب لکھنے کا رواج نہیں تھا - تاریخ تنقید میں جو کچھ ملتا ہے وہ کچھ لوگوں کی تصانیف یا تذکرے ہیں ' جن میں معاصرین یا بعض قدیم شعرا کے نہایت مختصر حالات ہیں اور ایک آدھ جملے تنقید پر ہیں جن سے کسی شاعر کی خصوصیات کا کل یہ معلوم کیا جا سکتی ہیں اور آخر میں کلام کا کچھ انتخاب ہے - یورپ و ہند کے تمام تذکرے فارسی

میں ہیں اور بعض اوقات تذکرہ نویس اُس شاعر کی اچھی طرح خبر لیتا ہے، جس سے اُسے کوئی نقص یا عناد ہے، مثلاً میر تقی، میر شاہ حاتم استاد رفیع السودا کے بارے میں جن کا سبھی تذکرہ نویسوں نے ادب کیا ہے، لکھتے ہیں "مرد جاہل و متکبر" مگر عموماً تذکرہ نویس کسی کو برا کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور سب کی کچھ نہ کچھ تعریف ہی کرتے تھے - اس رنگ میں پہلی دہلی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے "گلشن بے خار" میں کی جس کی تتمہ رام بابو سکسینہ اپنی ہسٹری آف اردو لٹریچر میں لکھتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک یہ وہ تذکرہ ہے جس میں انصاف و آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے" مگر اب بھی تنقید کا منتہیٰ تحسین و تنقیص ہی رہا - پھر حال قدما سے لیکر مولانا آزاد تک کم و بیش یہی رنگ رہا - اسے دور اول کہہ سکتے ہیں - آزاد نے دوسرا دور شروع کیا - شعرا کے حالات جہاں تک مل سکے بہم پہنچائے - شاعر در زمانے اور شخصیتوں کا اثر بھی کچھ نہ کچھ دکھایا اور زبان کا آغاز اور اس کی ارتقائی منزلوں کو بھی خوبی سے بیان کیا - مگر آزاد کہیں کہیں حادثۂ انصاف سے ہٹ گئے ہیں جیسے ذوق و غالب کے معاملے میں اور انہوں نے بہت سے بے بنیاد قصے اور کہانیوں کو اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے - اس دوسرے دور میں خلوۂ خضر - گل رعنا - خمخانۂ جاوید - شعر الہند وغیرہ اچھی اچھی کتابیں نکلیں - مگر اس کام کو رام بابو سکسینہ نے سب سے بہتر کر دکھایا -

منفرد شعرا کے تذکرے کے دور میں لکھنے کی ابتدا مولانا حالی نے ڈالی، "یادگار غالب" اور "حیات سعدی" نوجوانوں کو ایک نیا راستہ دکھایا مگر [illegible] میں اور

غلطیوں اور خامیوں کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے - اس
کے بعد مرزا احسان احمد بی اے بل بل بی ے "داغ جگر" پر ایک
ایک مبسوط مقدمہ لکھا جس میں واہ وا کی کثرت ہے پھر
دو سبکڑوں مقدمے لکھے گئے "جس میں" داغ جگر" کی
طرح شاعر کی خصوصیات کے عنوان قائم کیے گئے اور بہت سے سخن
ان کی تحت میں دیے گئے - بہت سے شعروں کی شرح کی گئی
اور اُن کی خوبیاں وضاحت سے بیان کی گئیں - اس کے بعد تنقید
کی جو لہر چلی تو اب جسے دیکھو وہ دوسرے کو کھائے جاتا ہے -
ایک صاحب لکھنوی اور غیر لکھنوی کی بحث چھڑے ہوئے ہیں
دوسرے صاحب تمام شارحین غالب سے اُلجھے ہوئے ہیں
بہر حال وہ ہنگامہ برپا ہے جس کا جواب کسی اور ادب
میں ملنا نا ممکن ہے؟ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے
بھی ہیں جو نہایت غیر منصفانہ طور سے اس پر تلے ہوئے
ہیں کہ اردو میں جتنی خرابیاں ہیں سب کو بجا ثابت کریں -

مگر تجسس و تفحص سے ہٹ کے شاعر کی ساخت دماغ کو
سمجھنے میں اُس کے خیالات و جذبات کے منبع کی تلاش کرنے میں
ابھی تک بہترین کوشش نہیں ہوئی ہے - جس میں انفرادیت پسندی
کو بالائے طاق رکھکر انتہائی ہمدردی کے ساتھ اس طرح
تصرہ کیا گیا ہو کہ ادب کے زمانے کی تاریخ کی کافی چھان بین
کی گئی ہو اور ہمعصر شعرا و ادبا کے اشعار و تصانیف سے زمانے کی
پسند کو نمایاں کیا گیا ہو اور جو انفرادیت ادب کو کسی خاص
قوم یا ملت میں پیدا ہونے کی وجہ سے ملی ہو اس پر بھی
کافی روشنی ڈالی گئی ہو اور جن جن تجربوں یا ہستیوں نے
ادیب کے دماغ کی تشکیل میں مدد دی ہو اُن کے اثرات کا دورا دورا

تجربہ کیا گیا ہو - یعنی ادیب کے نفسیات (psy chology) کی انصاف کے ساتھ پوری تحقیق و تدقیق کی گئی ہو اور ادب کی مختلف خصوصیات کا منبع و ماخذ بتایا گیا ہو - مگر ساتھ ہی ساتھ واہ بہ آہ ، تحسین اور تفریس سے مبّرا و منزّہ ہو - گذشتہ سال ایک آدھ جگہ ایسی تنقیدوں کی جھلک دکھائی دی ہے - یہاں سے تنقید کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کی قسمت آئندہ کے ہاتھ میں ہے مگر اختتام مضمون پر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر اردو تنقید کو تنقید کا درجہ حاصل کرنا ہے تو چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جو یورپین طرز تنقید سے تجربی واقف ہوں اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور جہاں ایسا ہوا وہاں اُن نا اہلوں کا گروہ جو موجودہ اردو پر خواہ مخواہ قابض ہے خود بخود غائب ہو جائیگا - مجھے امید ہے کہ اکیڈمی بھی اردو کی اس اہم تدبیر حامی کی طرف توجہ کریگی -

ضلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاحیں

(از پروفیسر محمد نعیم الرحمان ، ایم - اے)

(۲)

ت

تاپ — امث - ستون کے نیچے (فرش پر یا اُس کے قریب) گول یا چوکور کرسی ، جو باقی ستون سے باہر کو نکلی رہتی ہے - اگر اوپر پہنچ کر ستون پھر اسی طرح کی چنائی میں ختم ہو ، تو اُسے بھی تاپ کہتے ہیں - ان دونوں میں فرق کرنے کے لیے " نیچے کی تاپ " اور " اوپر کی (یا اوپر والی) تاپ " بولا جاتا ہے -

تاکی — یا تاکی (نون غنہ سے) - امث - - لوہے کی ایک موٹی سی مضبوط سیخ ، جس کا ایک سرا پتلا ہوا اور دھار دار ہوتا ہے - اس سے دیوار یا سخت زمین یا فرش کھودنے اور چنائی کو توڑنے کا کام لیا جاتا ہے - اگر چھوٹی ہو تو اُسے چھینی کہتے ہیں -

تیپ — امث - (یائے معروف سے) - دوسرا نام ہے (۱) پیتن ، اور (۲) مکھائی کا - دیکھو پیتن ، مکھائی -

تمک (کنی کی) — امث - (یائے مجہول سے - بغ تبکا — تکنا ، تمکنا) کنی (عد) کا نیچے کا حصہ جو رکھنے میں زمین پر لگتا (تکنا) ہے -

تھ

تھاتھہ—اسم ۔ بانس یا لوہے کا پنجر، جافری (جعفری) ۔ دیکھو جافری ۔

تھڑیا—اسم ۔ (تھہ کے زبر سے ۔ دیہاتی بولی تھڑا، تھڑی۔ تھڑنا = کھڑا ہونا ۔ لہذا تھڑیا = کھڑی ہوئی، کھڑی) ۔ باڑ میں وہ بانس یا ٹلیاں جو زمین پر عمودوار کھڑی کی جاتی ہیں اور جن سے اور بانس زمین کے متوازی باندھ کر باڑ بنائی جاتی ہے ۔ دیکھو باڑ ۔

تھیّا—اسم ۔ (تھ کے زبر، اور ی کے تشدید سے) ۔ دیوار کی چنائی میں اینٹوں کا ردّا رکھتے ہوئے دونوں طرف کی انتہا پر نئے ردّے کی اونچائی اور سیدھ کا اندازہ درست رکھنے کے لیے دونوں طرف ایک ایک اینٹ چن (جوڑ) کر اور ایک اینٹ پر سوت کا ایک آدھ حکّر لپیٹ کر دوسری اینٹ سے دبا دیتے ہیں کہ سوت ہلنے اور ڈھیلا ہونے نہ پائے ۔ یہ اینٹیں تھیا یا تھیہا کہلاتی ہیں ۔

تھیہا—اسم ۔ وہ پتھر جو تعمیر (مثلاً کمرے) کے کونے یا راوٹے میں لگایا جاتا ہے ۔

تھیہا—اسم ۔ (یائے معروف سے) ۔ وہی ہے جو تھیا ہے، حد۔

ج

جافری—اسم ۔ (جعفری) ۔ جال، جنگلا یا پنجر جو بانس یا لکڑی یا لوہے کی چھڑیوں یا چھڑوں کو اس طرح اوپر نیچے رکھ کر بناتے ہیں کہ ان کے بیچ بیچ میں لوری شکل کے خانے بنتے چلے جاتے ہیں ۔ اسی قسم کا جال یا جنگلا جو

اینٹوں کی چنائی سے ' یا پتھر کو برابر کر یا سیمنٹ کو سانچے میں ڈھال کر بنایا جاتا ہے - اس کو تھاتھہ یا تھاتھر بھی کہتے ہیں -

جام—اسم - کسی وزنی چیز کو اُٹھانے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سرکانے اور ہٹا کر رکھنے کا آلہ ' جو عموماً ایک لمبی اور موٹی سی سیخ کی شکل کا ہوتا ہے -

جُت—اسم - (ج کے بیس سے) راجوں' معماروں کی جوڑی ؛ دو راج جو ایک وقت میں کسی عمارت پر ایک ہی جگہ کام کر رہے ہوں -

جُڑائی—اسم - (ج کے بیس سے - جوڑنا ' جوڑ) - تعمیری کام ' جس میں اینٹوں یا پتھر کے ٹکڑوں کو برابر برابر رکھ کر مٹی ' چونا' سیمنٹ وغیرہ سے جوڑ کر تیار کیا جائے - اسے ''چنائی'' بھی کہتے ہیں - جڑائی یا چنائی کرنا یا جوڑنا مصدر ہے -

جہرَبند—اسم - (پارسی مجہول' اور ب کے زیر سے) = زہر بند' جد -

چھ

چھارا—اسم - وہ خشک چونا ' یا چونا اور بالو ملا ہوا ' یا سیمنٹ ' جو گیلی گِتی کے اوپر اس غرض سے چھڑکا جاتا ہے کہ وہ گِتی کی ضرورت سے زیادہ نمی کو جذب کر لے اور گِتی میں جوڑ کی (یا سیمنٹ کے فرش میں سیمنٹ کی) کسی کو بھی دور کر دے - چھارے کو بچھا یا چھڑ دینے کے بعد گِتی پھر سے کوٹ دی جاتی ہے -

چھاپ—اسم - (ہندی عامہ سے) (۱) لکڑی ' لوہے یا پتھر کا

وہ سائبان جو کھڑکی یا دروازے پر باہر کی طرف اس
غرض سے لگایا جاتا ہے کہ بارش کی بوچھاڑ یا دھوپ
کھڑکی (یا دروازے) سے ہو کر اندر تک نہ پہنچ سکے۔
(۲) عموماً کسی بام کا سائبان، جو کھڑکی یا دروازے
پر باہر کی طرف لگایا جائے۔

چھجی—اسم۔ (چھجے سے بگڑ کر) (۱) دیوار میں یا دیوار
اور زمین کے درمیان میں خالی شگاف یا خالی جگہ،
عام اس سے کہ وہ شگاف باریک ہو یا فراخ۔ لیکن اگر
شگاف بہت زیادہ کشادہ ہو تو اُسے چھجی نہیں کہتے۔
(۲) کارنس میں یا جہاں
کہیں گولے، بتے وغیرہ کے
درمیانی فاصلے میں بالکل
سیدھی یا ایسی معمولی دیوار
کی چنائی ہو، اس حصے
کو بھی چھجی کہتے ہیں۔
اس شکل میں دونوں گولوں
کے اندر چھجیاں ہیں۔

چ

چاٹی۔ اسم (کنچی، تالی) ذات میں سب سے اوپر پہنچ
کر بالکل درمیان کی انتہا جس پر ساری ذات کا بوجھ پڑ کر
ٹکا رہتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا یہ نام بھی ہوا ہے،
گویا یہ کنجی ہے کہ اگر اس کو ہٹا لیا جائے تو باقی تمام
ذات بھی کھل کے الگ ہو جائیگی۔ انگریزی میں بھی اِس

کو "کی سٹون" (Keystone = کنجی کا پتھر) کہتے ہیں -
اس کا دوسرا تلفظ چابھی ہے -

چابھی - اسم - دوسرا تلفظ ہے چابی کا ، جد -

چالی—اسم - (چلنا ، حال) - کئی بانس (جو عموماً زیادہ موٹے نہیں ہوتے) برابر برابر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھ کر رسی سے باندھ دیئے جاتے ہیں -- جوڑائی کے لیے کوئی خاص مقدار یا حد مقرر نہیں ہے ؛ ضرورت کے مطابق ہوتی ہے - بے طور لحک کے روکنے کے لیے دونوں سروں پر اور درمیان میں نیچے کی طرف ایک ایک بانس آڑے رکھ کر باندھ دیتے ہیں - اس طرح جو ایک تختہ سا بن جاتا ہے ، اُسے چالی کہتے ہیں - اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اُسے داڑ پر رکھ کر راج اُس پر بیٹھ کر کام کرتا ہے ، اور اُسی پر اینٹ ، چونا اور سب مسالا بھی رکھتا ہے - اس کے علاوہ کسی گہرے اور زیادہ چوڑے گڑھے پر ، یا عمارت کی دو دیواروں کے سروں پر ، جہاں سے گذرنا مشکل ہو ، چالی کو رکھ کر اُس سے پل کی طرح کام لیتے ہیں -

چَتّا—اسم - (چ کے زبر ، اور ت کی تشدید سے) زمین پر اینٹوں کا (بغیر مسالے کے چنا ہوا) وہ فرش جو اس غرض سے بنایا جاتا ہے کہ اُس پر اینٹ یا پتھر کی گٹی کو چونے میں ملاکر سانا اور تعمیری کام کے لیے تیار کیا جائے -

چَدّری (ذات) - اسم - (چدر=چادر) - ذات کی ایک قسم ہے ، جسے "بند دار ذات" بھی کہتے ہیں - دیکھو ذات -

چُکّے دار (ذات) - اسم - (چ کے پیش ، اور ک کی تشدید سے)

ڈاٹ کی وہ قسم ، جسے "محراب دار ڈاٹ" بھی کہتے ہیں - دیکھو ڈاٹ -

جَسما—امذ - (ج کے زبر سے - انگریزی چسم Chasm ؛ فارسی چسمہ) - (۱) لداؤ کی چھت کی ڈاٹ یا پُل کی ڈاٹ کی گہرائی - (۲) چھت کی کڑیوں یا شہتیروں کے درمیان کا فاصلہ -

چلاکی—امث - (ج کے زبر سے - بعض لوگ الف سے پہلے نون غنہ بھی پیدا کرکے بولتے ہیں) - ڈاٹ بنانے کے لیے میانے (دیکھو میانا) میں جو کھونٹی لگا کر دائرے کا خط (اصطلاح میں فلکا) بناتے ہیں ، اُس مرکزی کھونٹی سے ڈاٹ کی سچی چڑائی کی اوپر والی آخری انتہا تک جتنی دوری (نصف قطر) ہوتی ہے ، اُسے چلاکی کہتے ہیں -

چِمنی—امث - (ج کے زیر سے - انگریزی چمنی Chimney) - دودکش کا وہ حصہ جو چھت کے اوپر نظر آتا ہے -

چِنائی—امث - (ج کے زیر سے) - مترادف ہے چڑائی کا ، جد -

چُنَہا—امذ - (ج کے پیش اور نون کے زبر سے - چونا ؛ چونا ہار ، چونے والا) - چونا لانے والا مزدور ؛ وہ مزدور جو راج کو چونا لا لاکر دیتا ہے -

چِنیا—امث - (چ کے زیر سے) - ایک قسم کی چنائی ، جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں (۱) دیوار یا ستون میں سامنے کی طرف پتھر کے "گولے" کے اوپر ، یا اوپر اور نیچے دونوں طرف ، پتھر یا اینٹوں کی چنائی - گولا آگے کو نکلا رہتا ہے ، اور چنیا اُس کے اوپر (یا اوپر اور نیچے دونوں طرف) پیچھے کو ہٹتی رہتی ہے - چنیا کے اوپر پھر معمولی

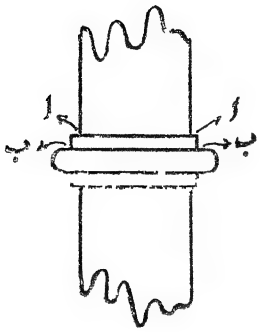

چنائی شروع ہو جاتی ہے -
اِس شکل میں ا جو ستون
کا ایک رخ ہے ا، الف ب جنبا
ہے، جو کولے کے اوپر ہے -
(۲) دوسری صورت جنبا کی ذیل کی شکل
سے ظاہر ہے - اس میں بھی الف
ب جنبا ہے - اسی کو "ابرو کی
کور" بھی کہتے ہیں —

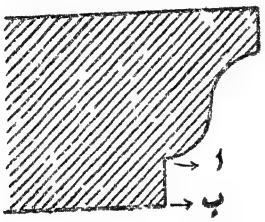

- خوتر — اسم - ا ح کے پیش، اور ب کے زبر سے) دیکھو بھولن -
خورس — صفت - ا ح اور ر کے زبر سے ا - ہموار، جس کی سطح سب
برابر ہو - "خورس کرنا" = ہموار، برابر کرنا -
خوری — اسم - (فارسی معروف سے) - لوہار کے ایک پتھر میں ایذت
یا دنبہ کی جوف دار جنائی - خاص کر کارس (کاس)
والے میں کام آتی ہے - ذیل کی شکل میں الف، ب،
ج خوری ہے —

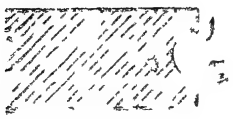

چوڑی عام طور پر ڈھائي یا تین انچ میں بنائي جاتي ھے - اگر اس سے چھوٹي بنائی جائے تو اُسے "کنکي" کہتے ھیں -

چوکھٹا—اسم - (چ کے زبر سے) - وہ چوکھونٹي سي چنائي جس میں اوپر کي طرف دو قائمہ زاویے ب ھوتے ھیں ؟ اور جو ذات کے اوپر بنائي جاتي ھے - اِس شکل میں الف ، ب ، ج ، د چوکھٹا ھے -

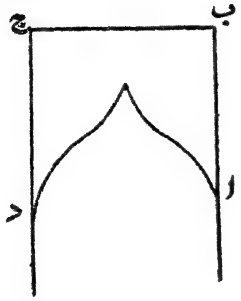

چُّولا—اسم - (چ اور و کے زبر اور ل کي تشدید سے) - چار آدمي (راج) جو ایک ھي وقت میں ایک جگہ مل کر کام کررھے ھوں -

چھکا—اسم - (چ کے زبر سے) - کھپروں یا اینٹ کي پھري کا وہ ردّا جو پتھر کی چھت تیار کرنے میں کسنے کے اُوپر رکھا جاتا ھے - پتھر کی چھت تیار کرنے کا بہترین طریقہ یہ ھے کہ پہلے سب سے نیچے لوھے یا مضبوط لکڑي کے شہتیر رکھتے ھیں - اُس کے اوپر پتھر کے چوکے رکھنے کے بعد کچھہ مٹّي لادي جاتي ھے ؟ جو زیادہ سے زیادہ دو تین انچ موٹي تہہ میں دي جاتي ھے اور کسنا کہلاتي ھے - اس مٹّی کے اوپر چھکا دیا جاتا ھے - پھر چھکے کے بعد گٹّي کوٹ کر آخر میں چونے کا استر دے کر ختم کرتے ھیں -

چ

چھاوني—اسم - (ھندی ' چھانا ؟ چھایا) - وہ چیز (مثلاً کھپریل ؟ سریت وغیرہ) جس کو چھت کے اوپر ڈال کر چھت تیارکي جائے -

چَھجلي—امث - (چھه کے ربر ؛ اور ج کے پیش یا سکون سے -

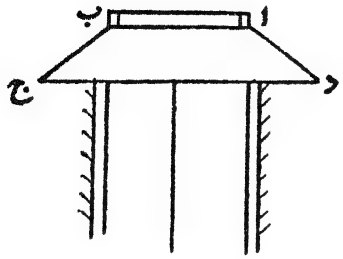

هندي چھاج کي مصغر صورت) وہ چھجا جو دروازے یا کھڑکي کے اوپر پتھر میں (یا اینٹوں سے) بنا کر لگایا (اصطلاح میں "لٹکایا") جاتا ھے - اس شکل میں الف ؛ ب ؛ ج ؛ د چھجلي ھے -

چھاس—یا چھانس— صف ؛ امث - (چھ کے ربر سے) - چھ ضلعوں یا پہلوں والي شکل -

چھیني— امث - (پہلي ی مجہول) - چھوٹي تاکی - دیکھو تاکی -

د — دھ

داغ بیل—امث - (یاے مجہول سے - فارسي داغ بیل ؛ داغ بلچہ) - ھر وہ نشان یا خط جو بیل کو نمایاں اور سیدھا کرنے کے لیے بنایا جائے ؛ عام اس سے کہ وہ زمین پر ؛ مکان کی بنیاد کي کھدائی سے پہلے ھو ؛ تعمیر کے دوران میں کسي قسم کي سیدھه درست کرنے وغیرہ کي غرض سے بنایا جائے -

داگ بیل—امث - بگڑا ھوا تلفظ ھے داغ بیل کا ؛ جد -

دانتوا—امذ - (نون غنہ سے - دانت ؛ دانتا ؛ دانتو) - چنائي یا پتھر میں وہ گڑھي ھوئي چنائی جو سامنے سے بالکل دانتوں کی شکل میں نظر آتي ھے - یہ عموماً سجاوٹ کے طور پر بنایا جاتا ھے کبھي اکیلا ؛ اور کبھي اور قسم کي

سجاوٹی چنائي (مثلاً پٹا ، چوڑی وغیرہ) کے ساتھ ملا کر ۔
شکل یہ ہے ۔

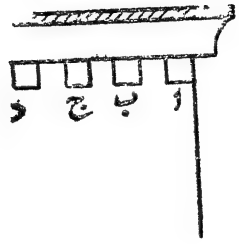

اس میں الف ، ب ، ج ، د دانتوا ہے ۔

در (دیتي کا)—امذ ۔(د کے زبر سے فارسي در ، دروازہ) ۔ دیکھو پیتي ۔

دَرَج—امث ۔ (د اور ر کے زبر سے ۔ فارسي درر کي بگڑي ہوئي صورت) دیکھو درر ۔

درر—امث ۔ (د کے زبر سے ۔ فارسی درر) چنائی میں وہ مقام جہاں دو اینٹیں ملتی ہیں ، دو اینٹوں کے ملنے کي جگہ پر دونوں کے درمیان کي درر ، دونوں کے بیچ کا شگاف ۔ اس کو "مکھائی" اور "تیپ" بھی کہتے ہیں ۔

دَریسي کرنا—مصدر ۔ (دریسی ، دال پر زبر ، اور ر کے بعد یاے مجہول ۔ انگریزي ڈریسنگ ، dressing) ۔ زمین کو برابر ، ہموار ، مسطح کرنا ۔ چورس کرنا اور سیتر کرنا بھي کہتے ہیں ۔

دوگا—امذ ۔ (واو مجہول سے) ۔ چونا ، سفیدی ، سیمنٹ کا گاڑھا گاڑھا گھولن ، محلول ، جو استرکاري میں پلستر کے اوپر لگا کر گھوٹنے کے لیے بنایا جاتا ہے ۔

دویم—صف - (واو مجہول، م پر زبر - فارسی : دوم، دویم) - اینٹ کی صفت - دوسرے درجے، دوسرے نمبر کی اینٹ -

دِھري—امث - (د کے زبر اور ہ کے سکون سے - تغ: دھلي، دھلیز) - دھلي، دھلیر، دروازے، کھڑکي اور روشندان میں اندر کي طرف نیچے کي چوکھٹ کے سامنے کا فرشي حصہ - اسے ڈیہر بھی کہتے ھیں -

دھانگر—امذ - (نون غنہ سے) - باڑ میں وہ بانس جو تھڑیا (جد) کو باندھنے کر مضبوط کردینے کے لیے سامنے زمین اور دیوار کے متوازی لگایا جاتا ھے - اس کو بینڈرا بھي کہتے ھیں -

دُھرمت—امذ - (دھ اور م کے پیش سے) - لوھے کا ایک نہایت وزني گول تاب کا اوزار، جس کے اوپر ایک گہرا سا گھر بنا ھوتا ھے جس میں بانس یا لکڑی کا ایک لمبا سا دستہ لگا کر زمین یا کنکر، گٹی وغیرہ کو کوٹ اور پیٹ کر برابر اور مضبوط کرتے ھیں -

ڈ

ڈاٹ—امث - (۱) لداؤ کی چھت بنانے کے لیے جو چنائي کي جاتی ھے، جسے نیچے فرش پر کھڑے ھوکر دیکھنے سے پوري چھت ایک محراب کی صورت میں نظر آتي ھے - (۲) محراب، (کھڑکی یا در کے لیے) دروازے کي ساخت، بناوٹ - عام طور پر اس کی یہ قسمیں بنائي جاتي ھیں - (۱) بیضاوی (بیضاوی - بیضوي)، جس کي اوپر کي وضع بیضوی (انڈے کي وضع کي، لمبائی کے ساتھ گول ھوتی ھے -

ذیل کي شکلوں میں الف چھت کي اور ب دروازے کي ذات ھے ۔

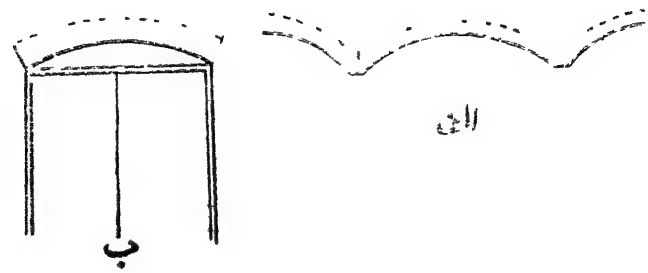

(ب) پیالے دار ' جس میں تین یا زیادہ پیالوں کي سي شکلیں بنائي جاتی ھیں - یہ پیالے بعداد میں طاق ھوتے ھیں ۔ ذات میں جتنے پیالے ھوتے ھیں اتنے ھي پیالے والي ذات کہلاتی ھے ۔ تین اور پانچ پیالے والي ذاتوں کي شکلیں یہ ھیں :—

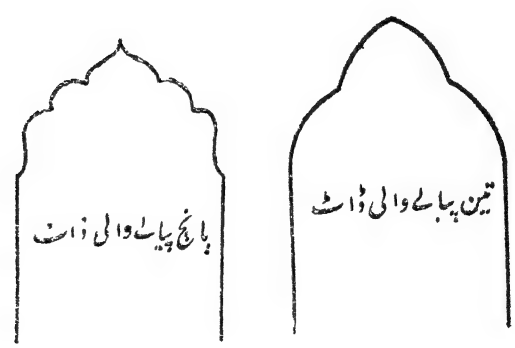

(ج) چکے دار ' جس میں اوپر چوٹی کی طرف ایک نوک سي نکلي ھوتي ھے اور دونوں طرف سے ڈھال کم ھوتا ھے ۔ اِس کا دوسرا نام " محراب دار ذات " ھے ۔

شکل یہ ھے ---

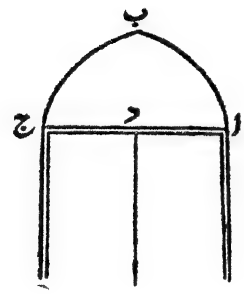

(د) سلگمي (شلغمی) ؛ یعني وہ ذات جس کی شکل شلغم (شلجم) کي سي ھوتي ھے -

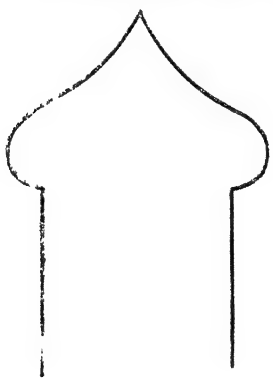

(ہ) گول ذات ؛ جس کي اُوپر کی وضع ایک نصف دائرے کي سي ھوتي ھے -

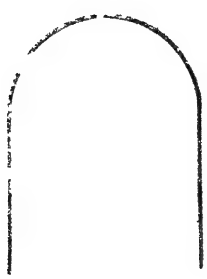

اس ذات کے بنانے میں اگر صرف ایک کھڑي اینٹ لگائی

جائے تو اُسے ''گھیرے دار ڈاٹ'' کہتے ہیں ؛ اور اگر ڈیڑھ اینٹ (یعنی ایک اینٹ کھڑی اور ایک پڑی) لگائی جائے تو اُسے ''چدری'' یا ''ڈنڈدار'' ڈاٹ کہتے ہیں -

(و) گُھڑنال (گھ کے پیش سے - گھوڑا × نال) ؛ جس کی وضع گھوڑے کے نال کی سی ہوتی ہے . -

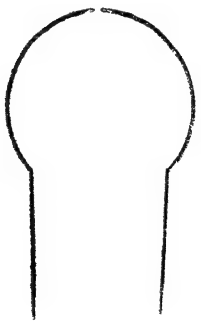

ڈاڑھا—امذ - (بغ ڈاڑھہ ؛ ڈاڑھی) - ایک دیوار کو چنتے ہوئے جب ایسی جگہ پہنچتے ہیں ؛ جہاں اُس سے دوسری دیوار (مقابل سے ؛ یا ایک پہلو سے ، زاویہ قائمہ پر یا کسی زاویے پر) آ کر ملے ، تو اُس دیوار کے لیے اینٹیں آگے پیچھے گھٹا بڑھا کر چنی جاتی ہیں - اِس طرح دوسری دیوار کی اینٹوں کے لیے جو حق چھوڑا جاتا ہے وہ ڈاڑھا کہلاتا ہے - اِس کی دو قسمیں ہیں . (ا) سندوکچی (سندوقچی) ، جس کے دو نظارے یہ ہیں :—

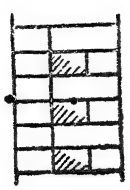

(الف) سامنے سے ، اس شکل میں تاریک حصے وہ گھر ہیں جو دوسری دیوار کی اینٹوں کے لیے چھوڑے گئے ہیں -

(ب) ایک پہلو سے - اس میں جو جگہیں خالی اور روشن ہیں وہ دوسری دیوار کی اینٹوں کے لیے چھوڑی گئی ہیں ۔—

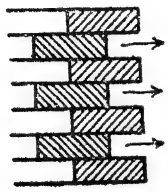

(۲) ہتتا ، جس میں اینٹیں چنائی کے وقت ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہتتی ہوئی لگائی جاتی ہیں - اس کی صورت (ایک پہلو سے) یہ ہے : -

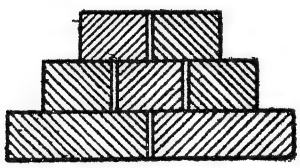

ڈاٹری—امث - (نون غنہ سے) - وہی ہے جو ڈنڈی ہے ، جد -

ڈنڈی— امث - (ڈ کے زبر سے) - یا ڈاٹری - چنائی کا وہ حصہ ، جو ایک ستون میں اُس کی نیچے کی تاپ (جد) سے اوپر کی تاپ تک کے درمیان میں ہوتی ہے -

ڈنس—امذ - (ڈ کے زبر اور ن کے سکون سے) - گنیا (حد) کے مثلث میں وتر (یعنی زاویہ قائمہ کے مقابل کا ضلع) اور باقی دونوں ضلعوں میں کوئی سا ایک ضلع - وتر اور ایک ضلع ملا کر " ڈنس " کہے جاتے ہیں -

ڈوری—امث - (واو مجہول سے) - ڈوری (عموماً سوت کی) ، جس سے دیوار یا فرش وغیرہ کی سطح کے ہموار اور برابر ہونے کو جانچتے ہیں ، یا اینٹوں کی چنائی کی قطار کو ہموار اور سیدھا رکھنے کے لیے یا نشان بنانے کے لیے کام میں لاتے ہیں -

ڈیہر۔۔امث (یای مجہول ، اور ہ کے زبر سے) - دوسرا نام ہے دھری کا ، جد -

ڈھ

ڈھال۔۔امذ - سطح کا آہستہ آہستہ نیچے کی طرف مائل ہونا ؛ ڈھلوان ، سلامی سطح - اسی معنی میں "ترماہٹ" بھی بولتے ہیں -

ڈھاہ۔۔امذ - (ڈھہنا - گرنا ، ٹوٹ کر گر پڑنا) - مٹی کا وہ ٹکڑ جو زمین کھودے ہوئے ، یا کھدی ہوئی زمین میں چنائی کرتے ہوئے ، زمین میں سے ٹوٹ کر گر پڑتا ہے -

ڈھولا۔۔امذ - (واو مجہول سے) - اینٹوں کا وہ ڈھانچ جو ڈاٹ بنانے کے لیے (عام اس سے کہ وہ ڈاٹ صرف دروازہ یا کھڑکی بنانے کے لیے ہو یا پوری چھت کے لیے) فرش سے لے کر ڈاٹ کے مقام تک کھڑا کرتے ہیں - جو اینٹیں اس کام میں لائی جاتی ہیں اُن کو "بقلی اینٹیں" اور ڈھولے کی چڑائی کو "بقلی چڑائی" کہتے ہیں -

ر

راج۔۔امذ - معمار ، کاریگر ، جو چنائی وغیرہ کا تعمیری کام کرتا ہے -

رَدا۔۔امذ - (ر کے زبر ، اور د کی تشدید سے) - چنائی میں ساتھ ساتھ رکھی ہوئی اینٹوں کی ایک قطار ، ایسی اینٹوں کی ایک تہ - ردّا بنانے کے کام کو ردا لگانا ، رکھنا اور جمانا کہتے ہیں -

رَنگت۔۔امث - (ر کے زبر ، نون غنہ ، اور گ کے زبر سے - ہندی رنگت ، رنگ ، رنگنا - فارسی رنگ) - بنیاد میں گنّی

وغیرہ گُت جانے کے بعد جب دیوار کی چنائی شروع کی جاتی ہے ، تو سب سے پہلا رُدّا نہایت احتیاط کے ساتھ اونچ نیچ کی ہمواری ، قطار کی سیدھ ، راویوں کا ٹھیک ٹھیک گُنیا میں (یا خاص مطلوبہ راویئے میں) ہونا وغیرہ دیکھ کر رکھتے ہیں ، کیونکہ اس پہلے ہی رُدّے پر باقی تمام دیوار کی درستی منحصر ہوتی ہے - اس پہلے رُدّے کو " رنگت " اور اس کام کو " رنگت کرنا " کہتے ہیں - رنگت کے درست طور پر سر انجام ہونے کو " رنگ جانا " یا " رنگت پوری ہو جانا " کہا جاتا ہے - کہتے ہیں · اس عمارت کی رنگت پوری ہو گئی ، یا : یہ عمارت رنگ گئی -

روڑا—امذ - (واو مجہول سے) - اینٹ یا پتھر کا ٹکڑا ، خواہ وہ کسی شکل اور کسی راویئے میں ٹوٹا ہو - اُسے کنکر بھی کہتے ہیں - دیکھو بھڑکی -

روسا—امذ - (واو معروف سے) - بان کی شکل کا لکڑی کا ایک آلہ جس سے ریر بند (جد) کا کام لیا جاتا ہے - فرق صرف یہ ہے کہ ریر بند زیادہ لمبے چوڑے رقبے کی سطح پر کام میں آتا ہے ، اُس سے کم رقبے کے لیے " گنکا " (جد) اور چھوٹے سے رقبے کے لیے روسا استعمال ہوتا ہے - بان کے اپراوے (یعنی اوپر کے حصے) میں لکڑی کو کچھ اُبھار کر چھوٹی سی دستی بنا دیتے ہیں - اس بان کا طول زیادہ سے زیادہ سات آٹھ انچ اور عرض چار پانچ انچ ہوتا ہے - دیکھو ریر بند ، گنکا -

ز

زیر بند—امذ - (یای مجہول سے) - لکڑی کا ایک تختہ جس کی زیادہ سے زیادہ پیمائش طول میں چار فٹ ' عرض میں ڈیڑھ سے دو انچ اور موٹائی میں پون انچ ہوتی ہے - ایک طرف سے اُسے پوری صفائی کے ساتھ ہموار کر کے بنایا جاتا ہے - دیوار یا فرش پر استرکاری کرنے میں زیر بند کو چونے (یا مٹی) کے پلستر پر پھیر کر اُسے ہموار اور صاف کیا جاتا ہے - زیر بند عموماً بڑے رقبے کی سطح پر استعمال ہوتا ہے - اس سے چھوٹی سطح کے لیے جو چھوٹا زیر بند استعمال ہوتا ہے اُسے "گٹکا" اور اس سے بھی چھوٹے زیر بند کو "روسا" کہتے ہیں - دیکھو گٹکا ' روسا -

س

ساج—امث - (ہندی . سجنا ' سجانا ' سجاوٹ) - سجاوٹ ' زیبائش ' آرائش کا کام ' خواہ وہ کسی قسم کا ہو ابنت کی تعمیر میں ' یا پتھر گڑھ کر ' چلیا ' چوڑی ' پٹے وغیرہ کی شکل میں ' یا مختلف قسم کے نقش و نگار وغیرہ کی صورت میں -

ساھُل—امذ - (ہ کے نیس سے - عربی : شاکُول . ترکی : شاقول) - لوہے یا پتھر کا ایک گولا (یا کسی اور وضع کا ' لیکن لازمی طور اُس کا پیندا سیدھے سے گول ہوتا ہے) ، جس کے ایک طرف ایک کُندا لگا ہوتا ہے ' جس میں سوت کی ڈوری باندھ دی جاتی ہے - اس سے دو کام لیے جاتے ہیں :

(۱) دیوار کي چنائي کی سیدھه آزمانا اور درست کرنا ،
(۲) میانه (حد) دریافت کرنا ۔

سَتّل—امث ۔ (س کے زبر ، اور ب کے زبر اور تشدید سے) ۔ وهی چیز هے جو گدالا هے ، حد ۔

ستماس—یا ستماس (نون منه سے) ۔ صف ۔ سات ضلعوں ، پهلوں والي شکل ۔

سِدّهي—امث ۔ (س کے زبر اور د ه کي تشدید سے) ۔ دوسرا اور کم استعمال تلفظ هے " سیڑهي " کا ، جد ۔

سرخي ڈالنا یا چهوڑنا ۔ مصدر ۔ بیل کا نشان بنانے کے لیے گُنّي هوئي اینٹوں کي سرخی یا لال مٹّي چهڑکنا یا ڈالنا ۔

سَلگَمي ڈات—امث ۔ (س اور گ کے زبر سے) ۔ دیکهو شلغمي ڈات ۔

سمتر—یا سمتهر ۔ صف ۔ (س اور ب یا ه کے زبر سے) ۔ هموار ، برابر ۔ " سمتر (سمتهر) کرنا " : سیدها ، برابر ، هموار کرنا ۔ " چورس کرنا " اور " دریسي کرنا " بهي اسی معني میں بولے جاتے هیں ۔

سَندلا—امذ ۔ (س کے زبر سے) ۔ وه چوبا جو بیٹن کرنے میں چنائي کي دررروں کے اندر بهرا جاتا هے ۔

سندوکچي ۔ یا سندکچی—امث ۔ (س کے زبر ، اور واو معروف یا محض د کے پیش سے ۔ فارسی صندوقچه سے هندي مصغر ۔ مونث صندوقچي) ۔ ایک قسم هے ڈاڑها کي ، جد ۔

سیڑهي—امث ۔ (یاي معروف سے) ۔ بانس یا لکڑي کي بنی هوئي سیڑهي جس سے تعمیر کے کام میں مدد لي جاتي

ھے ۔ اس کا ایک اور (کم استعمال) تلفظ سدھي بھي ھے ۔

سینکا—امذ ۔ (یاي مجہول ؟ اور نون غنہ سے) ۔ دیوار یا ستون کي اُبھري اور دبی ھوئي تحریروں یا پتریوں کي چنائی میں وہ حصہ جو اوپر اُبھرا رھتا ھے ۔ دیکھو کھارا ۔

سیم—صف ' امذ ۔ (یاي مجہول ۔ فارسی سوم ' سویم = تیسرا ' تیسري) ۔ اینٹ کي صفت ھے ؟ اور بطور اسم کے بھی مستعمل ھے . تیسرے نمبر ' درجے کي اینٹ ۔

ش

شلغمی دات—امذ ۔ دات کي ایک قسم ھے جس کي شکل شلغم (شلجم) کي سی ھوتي ھے ۔ دیکھو دات ۔

ف

فصیل—امث ۔ (ف کے زبر ' اور یاي مجہول سے ۔ عربي فصیل) ۔ (۱) کوئي ڈھلوان ' سلامي چنائي ۔ (۲) سلامی ' ڈھلوان ' نرم چنائي — خواہ وہ پوري دیوار کي صورت میں ھو ' یا کسی دیوار کو مدد پہنچا کر مضبوط کرنے کی غرض سے بنائی گئي ھو ۔ اس کو پھسیل بھي کہتے ھیں ۔

فِلکا—امذ ۔ (ف کے زیر سے) ۔ محراب کی دات بنانے کے لیے میانے میں کھونٹي لگاکر ڈھولے کے اوپر گولائی نکالنے کے لیے رسي (سوت) کو گھماکر دائرے کا نشان بنایا جاتا ھے تا کہ اس نشان کے ساتھ ساتھ چنائي کي جائے ۔ اس نشان کو فِلکا کہتے ھیں ۔

ک

کارَبل—اسم - (ب کے زبر سے - انگریزی · کوربل Corbel) - وہ چنائی جو کھڑکی کے اوپر ، باہر کی طرف ، اور گلس (جد) کے نیچے تریا کی جگہ بنائی جاتی ہے - اِس شکل میں الف سے ب تک کاربل ہے -

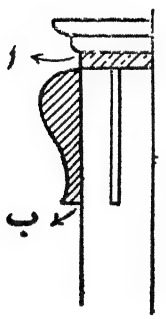

کانپھہ — اسم - (نون غنہ سے) - وہ سمبدی (جوڑنے کی) جو رکھے رکھے ہوا لگ کر جم گئی ہو ، جمی ہوئی سمبدی -

کانٹا پکڑنا— مصدر - اینٹ اور چونے (یا سمینٹ) کے ملاپ کے بعد چونے یا سیمنٹ کا اینٹ یا اینٹوں کے اندر تک پہنچ کر جم جانا ؛ چونے یا سیمنٹ کا اینٹوں کو اپنی پوری طاقت سے پکڑ لینا -

کانِس—اسم - (ن کے زبر سے - انگریزی کورنس Cornice عربی . قرناس ؟) - دیوار کی کنگنی ؛ چنائی کا وہ حصہ جو دیوار کے بالکل آخر میں اُوپر کی طرف سے دیوار سے باہر کو نکال کر بنایا جاتا ہے - اس میں یا تو صرف "پٹا" دیتے ہیں ؟ یا پھنا ؟ پٹا ؟ چوڑی ؟ گولا ؛ یہ سب ، یا اِن میں سے دو ایک ملا کر بنائے جاتے ہیں - اس سے دیوار کی مضبوطی اور خوبصورتی دونوں مقصد حاصل ہوتے ہیں -

کَبسا—امذ - (ک کے زبر سے) - مٹی کی وہ تہ جو پتھر کی چھت بنانے میں پتھر کے اُوپر دی جاتی ہے - یہ عموماً زیادہ سے زیادہ دو یا ڈھائی انچ ہوتی ہے ؛ اور اُس کی غایت یہ ہوتی ہے کہ چھت مضبوط بھی ہو جائے اور چھت کے نیچے (کمروں ؛ دالانوں وغیرہ میں) گرمی کا اثر بھی زیادہ نہ ہونے پائے - دیکھو چھکا -

کَبھا—امذ - (ک کے زبر سے) - اصل میں کھا (یا کھہ) ؛ حد -

کَتّل—امث - (ک کے زبر ؛ ت کی تشدید اور زبر سے - ہندی : کتّر) - اینٹ یا پتھر کا ٹکڑا ؛ خواہ وہ کسی شکل پر اور کسی زاویے میں ٹوٹا ہوا ہو - اُسے روڑا بھی کہتے ہیں - دیکھو بھرکی -

کُتکی—امث - (ک کے پیش سے) - چھوٹی چوڑی ' وہ چوڑی جو صرف ایک انچ میں بنائی جائے - دیکھو چوڑی -

کَتُوا—امث ؛ صف - (ک کے زبر اور ت کے پیش سے) - ایک قسم ہے پیتل کی ؛ جد -

کَچھ—امذ - ک کے زبر سے - تغ پنجابی ؛ کچھہ=بغل) - دو دیواروں کے ملنے کی جگہ ' دو دیواروں کے درمیان کا زاویہ ؛ گوشۂ دیوار ' عموماً . ہر زاویہ خواہ وہ کتنے ہی درجے کا ہو - "کچھ کی اینٹ" وہ اینٹ جو کچھ میں لگی ہو یا اُس میں لگانے کے لیے بنائی یا گڑھی جائے -

کرسی—امث - بلندی ؛ اونچائی کی وہ مقدار جو زمین کی سطح اور کسی تعمیر (مثلاً چبوترے) کی سطح یا عمارت کے فرش کے درمیان میں ہو ؛ سطح زمین سے عمارت

کے فرش تک کا فاصلہ ، بنیاد سے لے کر تعمیر کے فرش تک کی بلندی کا فاصلہ ۔

کَرّی—امث ، صف ۔ (ک کے زبر ، اور ر کی تشدید سے ۔ حقیقی معنی : سخت ، مضبوط) ۔ اینٹ کی صفت چنائی میں اینٹ کا غلطی سے اس طرح لگ جانا کہ وہ بیل سے باہر ہو ، اور اس طرح ساہل (شاقول) کے لحاظ سے غلط لگ گئی ہو ۔ اگر وہ اچھی طرح نمایاں طور پر باہر تک نکل آئی ہو ، تو اُسے اینٹ کا " لٹکنا " اور اسی طرح لگانے کو " لٹکانا " کہتے ہیں ۔ دیکھو لٹکانا ۔

کسکا—امذ ۔ (ک کے زبر سے ۔ بغ کھسکنا ، کھسکا ہوا) ۔ چنائی میں اینٹوں (یا پتھروں) کے ردّوں میں اپنے سے نیچے کے ردے کے مقابل میں اندر کی طرف ہونا ۔ اس قسم کا ہر ایک ردّا ایک " کسکا " کہلاتا ہے ۔ شکل یہ ہے ۔

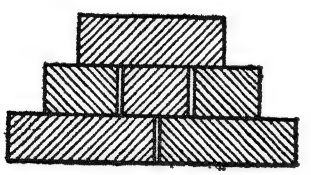

کفا—امذ ۔ (ک کے زبر سے ۔ فارسی کفہ ، کف=ہتھیلی ، ہاتھ) ۔ مسالے (یعنی مٹی ، چونے یا سیمنٹ) کی وہ مقدار جو چنائی کرتے وقت اینٹوں کو جوڑنے کے لیے ان کے پہلوؤں پر لگائی جاتی ہے ۔ اگر پورے پہلو پر اچھی طرح مسالا لگایا جائے تو اُسے " بھرپور کفا " کہتے ہیں ۔

کگار—امذ - (ک کے زبر سے - تغ کگر) - گڑھے یا کھدی
ہوئی زمین کا کنارہ اُوپر کی طرف سے - "کگار گرنا"؟ ۔
کگار کا ڈھہ جانا ؟ گر پڑنا -

کَلَم—امث - (ک اور ل کے زبر سے - عربی قلم) - قلم
کی شکل کی نہایت ہی باریک کام کرنے والی کنی ؟
جس سے باریک باریک پھول پتی وغیرہ بنائے جاتے ہیں -
یہ کنی کی سب چھوٹی اور بارک قسم ہے - اس کی
خود بھی کئی صورتیں ہوتی ہیں ؟ جیسی جیسی
جگہوں پر اس کو برتنے کی ضرورت ہوتی ہے اُسی لحاظ سے
اُس کی شکل اور بناوٹ میں فرق ہوتا ہے - دیکھو
کنی ، مچھولا ؟ پہلا -

کنکر—امث - (ک کے زبر ' اور نون غنہ سے) - (۱) اینٹوں کے
ٹکڑے ' ریزے - اسے کنکریٹ اور گٹی بھی کہتے ہیں - (۲)
مٹی کی کنکریں جو قدرتی عمل سے زمین کے اندر بنتی
رہتی ہیں اور مصنوعی طور پر بھی بنائی جاتی ہیں -

کنکریٹ—امث - (یائی مجہول سے ' کنکر کے تلفظ سے - انگریزی
کونکریٹ concrete) (۱) کنکر ' گٹی ' روڑا ' روڑی ' اینٹوں
کے ٹکڑے ' ریزے - (۲) گٹی اور چونا ملا ہوا - (۳) سیمنٹ
اور پتھر کے باریک باریک ریزوں سے جو مسالا تیار کیا
جاتا ہے -

کَنّی—امث - (ک کے زبر ' نون کی تشدید ' اور یائی مجہول
سے - مغربی اضلاع اور پنجاب میں اسے کرنی کہتے ہیں '
جو غالباً سنسکرت कर्णिका=کانکھہ ' سے ماخوذ ہے) - لوہے کا
ایک آلہ جس کی شکل ایک لمبوترے یا چوڑے پان

کي سي هوتي هے - اس کے ایک طرف لکڑي کا ایک سلامي سا دستہ لگا هوتا هے، جس کا باهر کا سرا موتا هوتا هے اور جو سرا کَنّي کي نوک میں لگا هوتا هے وہ پتلا هوتا هے - یہ آلہ فرش یا دیوار وغیرہ پر مٹي، چونے، سیمنٹ سے استرکاري (پلستر) کرنے یا حجائي میں مسالا لگانے کے کام آتا هے - چھوٹي کني کو "مچھولا" کہتے هیں، اُس سے چھوٹي کو "نہلا" اور سب سے چھوٹي اور باریک قسم کو "کلم" (قلم) -

گُنیا—امث - (ک کے پیش سے - کونا کی مصغر صورت) - لوهے یا تس کا بنا هوا کھپرا، جس کي شکل آٹھ کے هندسے کي سي هوتي هے (۸) اور جسے کھپریل کي چھاؤني میں سب سے اوپر دونوں طرف کے چھتوں کے ملنے کے مقام پر اس غرض سے رکھا جاتا هے کہ وہ پن چبر کا کام دے اور پاني کو دونوں طرف بہا کر اندر کي طرف ٹپکنے سے روک دے - یہي کام مٹي کے بنے هوئے "منگراوے" سے بھي لیا جاتا هے - گُنیا کا ایک اور استعمال یہ هے کہ اُسے (کھپریل کی چھت میں) اُلٹا کر کے (۷) اوپر سے نیچے تک اُس کونے میں بچھاتے هوئے چلے آتے هیں، جو دو طرف کی کھپریلوں سے مل کر پیدا هوتا هے - اس سے یہ هوتا هے کہ دونوں طرف سے جو پاني بہ کر آتا هے وہ اس گُنیا میں سے هوتا هوا نیچے جا گرتا هے اور چھت پر اثر نہیں هونے پاتا - دیکھو کھپرا، منگراوا -

پری—امث - (راو مچھول سے) - دیوار میں چنائي کا وہ حصہ جو کھڑکي یا دروازے میں نیچے کي طرف چوکھٹ کے آگے اور

نیچے کھلا ہوا رہ جاتا ہے - یہ نام صرف نیچے کے حصے ' یعنی فرش' کی ایسی چنائی کے لیے ہے - اس کے مقابل میں اوپر کی طرف کی چنائی کو "تھائی" کہتے ہیں -

کو تھائی —امث - (واو مجہول سے) - گرتر (گاڈر)' شہتیر کو درست اور سیدھا کر کے اُس کی صحیح جگہ پر جما کر رکھ دینے کو "کو تھائی کرنا" اور اس کی درست نشست کو "کوتھائی" کہتے ہیں -

کور (ایڑ کی)—امث - دیکھو چنیا (۲)' ایڑ -

گُونچی—امث - (واو معروف اور نون غنہ سے) - مونجھ کا بنا ہوا گول برش جس سے دیوار (وغیرہ) پر سفیدی (ٹاعی) کی جاتی ہے یا کوئی رنگ پھیرا جاتا ہے -

کھ

کھارا—امث - بعض وقت دیوار یا ستون کی چنائی اس طرح کی جاتی ہے کہ اُس میں کچھ حصہ بتری (حد) کی شکل میں باہر کو اُبھرا ہوا ہوتا ہے' اور کچھ حصہ اندر کو دبا ہوا - ایسی چنائی میں دبے ہوئے حصے کو "کھارا" اور اُبھرے ہوئے کو "سنڈکا" کہتے ہیں - یہ اُبھار اور دباؤ ہر وضع سے ہوسکتا ہے' خواہ اوپر سے نیچے کو ہو' خواہ دائیں سے بائیں کو (یعنی رمیں کے متوازی)' یا ترچھی قطاروں میں ہو - غرض ایسی چنائی سے یہ ہوتی ہے کہ دیوار (یا ستون) خوبصورت نظر آئے - یہ چنائی اینٹوں اور پتھروں دونوں کو کھارے اور سینکے میں باری باری دے کر بھی بناتے ہیں' اور صرف اینٹ یا صرف پتھر سے بھی - اسی طرح یہ بھی کرتے ہیں

کہ کھارے اور سینکے میں ایک پر استرکاري کردي اور دوسرے کو صرف پٹن کر کے چھوڑدیا - عرض کہ اس کي مختلف صورتیں اور وضعیں ہوسکتي ہیں -

کھانچ—امذ - (نون غنہ سے) - اینٹ کے ایک حصے میں وہ گہرائي یا گھر جو اُسے اندر کي طرف سے کھود (گڑھ) کر بناتے ہیں - دیکھو برھا؟ پتا - پتے میں اگر کھانچ دے دیا جائے تو وہ برھا ہو جاتا ہے - کھانچ کي شکل یہ ہے -

کھپرا—امذ - (کھ کے زبر سے) - کھپریل کی چھت کے چھانے کے لیے مٹي کے بنے ہوئے چوکور اور نصف دائرے کي شکل کے لمبوترے ٹکڑے کام میں لائے جاتے ہیں - چوکور ٹکڑا "کھپرا" کہلاتا ہے - یا تو وہ صحیح مستطیل شکل کا ہوتا ہے یا اُس کے عرضی ضلعوں میں سے ایک چھوٹا اور ایک بڑا ہوتا ہے؟ اور اس کے طولانی ضلعوں کے کنارے آدھ یا پون انچ کی اونچائی میں کھڑے ہوئے ہوتے ہیں - دوسرا ٹکڑا "نریا" کہلاتا ہے؟ اور ایک کُھلي ہوئی (نصف دائرے کی) شکل کی نالی کی طرح کا ہوتا ہے - چھاؤنی چھاتے وقت پہلے تو نیچے تہ میں کھپرے اس طرح ساتھ ساتھ رکھتے ہیں کہ اُن کي اُبھري ہوئی کوریں ایک دوسرے سے ملی رہیں؟ پھر اُن کے اوپر نریا کو اس طرح بچھاتے ہیں کہ ہر ایک نریا اندر (جوف) کي طرف سے دو دو کھپروں کے اُبھرے ہوئے کناروں کو ڈھک دے - اسی طرح پوری چھت پر کھپرا اور نریا بچھا کر چھاؤنی پوری کردی جاتي ہے - کھپریل کي شکل؟ اگر اسے ایک طرف سے دیکھا جائے تو؟ عموماً ایک

پھیلے ہوئے آٹھ کے ہندسے کی سی ہوتي ہے -

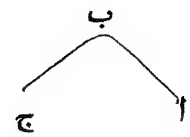

اس میں ب کے مقام پر پہنچ کر پاني کو اندر ٹپکنے سے روکنے کے لیے ایک اور مٹي کا کھپرا پن چیر (حد) کے طور پر رکھا جاتا ہے - اُسے "منگراوا" کہتے ہیں - کبھی کبھی زیادہ مضبوطی کے خیال سے لوہے کا منگراوا رکھتے ہیں جسے کنیا کہتے ہیں -

کھپریل—امث - (کھ اور ر کے زبر سے) - وہ چھت جو کھپروں سے تیار کی جائے - دیکھو کھپرا -

کھرنجا—امذ - (کھ اور ر کے زبر سے) - دیکھو کھرنجا -

کھرنجا—امذ (کھ اور ر کے زبر سے) - کھری اینٹ کی چنائی، وہ فرش جو کھری اینٹ کی چنائی سے تیار کیا گیا ہو -

کُھرَھي (اینٹ)—صف ؟ امث - (کھ کے پیش اور ر کے زبر سے) - ٹوٹي ہوئي اینٹ، ایسي اینٹ جس کا کوئي کونا جھڑا ہوا ہو یا کوئي کور ٹوٹي ہوئي ہو - اسے "بھرکي" بھي کہتے ہیں -

کھنج منج—صف - (کھ اور م کے زبر سے - تغ فارسي ؟ کج مج ؟ کز مژ=ٹیڑھا) فرش پر بچھائي ہوئي گئي میں، یا چنائي میں اونچ نیچ ؟ ٹیڑھ میڑھ کي مجموعي صورت -

کھنڈا— امذ - (کھ کے زبر سے) - پتري اینٹ کا وہ آدھا حصہ،

جو اُس کے طول میں سے اس طرح کاٹ کر نکالا جائے کہ اُس کو چوڑائی میں سے آدھم آدھ کر دے -

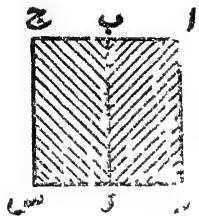

اس شکل میں "اب ء د" اور "ب ء س ج" دونوں کھنڈے ھیں -

کھونٹي—امث - (واو معروف سے) - یہ دوسرا ملعط ھے کھونٹي کا ؟ جد -

کھونٹي—امث - (واو معروف ؟ اور نون غنہ سے) - (۱) مایخ ؟ کھونٹي ؟ جو عموماً بانس کي کھپچی کي بني ھوئی ھوتي ھے ؟ اور کسي بیل (خط) کے مبانے (مرکز ؟ درمیاني مقام) کا نشان لگانے یا فلنا (جد) بنانے کے کام آتی ھے - (۲) بڑیا میں جھاپ کے رکنے اور تکنے کے لیے جو داب رکھے جاتے ھیں ؟ وہ بھي کھونٹي کہلاتے ھیں -

گ

گڈر—امذ - (ڈ کے زبر سے انگریزی · گرڈر Girder) - شہتیر ؟ عموماً لوھے کا شہتیر -

گُٹکا—امذ - (گ کے پیش سے) - چھوٹا زیر بند - دیکھو زیر بند -

گِٹّي—امث - (گ کے زبر ؟ اور ت کي تشدید سے) - پتھر یا اینٹوں کے ٹکڑے - اگر یہ ٹکڑے بڑے بڑے ھوں تو اُنھیں "بڑي گٹّي" اور چھوٹے چھوٹے ھوں تو "چھوٹي گِٹّي" کہتے

ہیں - اینٹوں کے ٹکڑوں کو کنکر ، کنکریٹ اور بڑیل بھی کہتے ہیں -

گدالا—امذ - (گ کے زبر سے) - لوہے کی ایک گول سیخ ، جو تین چار فٹ تک لمبی اور ڈیڑھ سے دو انچ تک موٹی ہوتی ہے - اس کو دیوار میں سے اینٹ نکالنے ، دیوار میں سوراخ کرنے اور اسی قسم کے اور کام کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں -

گرا—امذ - (گ کے پیش ، اور ر کی تشدید سے) - وہ رسی جس سے پاڑ کے مختلف حصے باندھے جاتے ہیں -

گلتا—امذ - (گ کے زبر سے) - کارنس کی تمام اونچ نیچ کی تفصیل کا کوئی حصہ ، مثلاً : صرف ایڑ یا صرف چوڑی یا صرف تھنا ، بھی "گلتا" کہا جا سکتا ہے -

گنیا—امث - (گ کے پیش سے - فارسی گونیا ؟) - صحیح زاویہ قائمہ کی شکل میں بنا ہوا لکڑی یا لوہے کا کونا ، جس سے تعمیر کے قائمہ زاویوں ، یا فرش یا دیوار کی سطح کی ہمواری کو جانچتے ہیں ، اور اُس کے اندازے سے زاویے اور سطح کی غلطی کو درست کرتے ہیں - گُنیا یا تو محض ایک کونے کی شکل میں ہوتی ہے ، یا دونوں بازوؤں کو مضبوط اور سیدھا رکھنے کی غرض سے دونوں کے درمیان میں ایک اور ٹکڑا (لکڑی یا لوہے کا) لگا دیا جاتا ہے ، جس سے اس کی شکل ایک قائم‌الزاویہ مثلث کی ہو جاتی ہے - زاویہ قائمہ کی بالکل صحیح حالت کو ، یا سطح کی ہمواری کو "گُنیا میں ہونا" کہتے ہیں -

گول—امث - (واو مجہول سے) - آدمیوں (مزدوروں ، کاریگروں) کا

ایک گروہ (عموماً تین یا چار سے زیادہ کا) جو ایک ہی وقت میں کسی ایک کام کے کرنے پر لگا ہوا ہو -

گولا—امذ - (واو مجہول سے - ہندی گول ' گولائی ' گولا) - اینٹ یا پتھر کی وہ چنائی جو فرش کے کنارے پر (باہر کی طرف) ؛ یا دیوار یا ستون یا کارنس میں ؛ آگے کو نکلی ہوئی ہوتی ہے اور سامنے سے گول نظر آتی ہے - یہ ضرورت اور مقام کی مناسبت سے چھوٹا اور بڑا ہو سکتا ہے . -

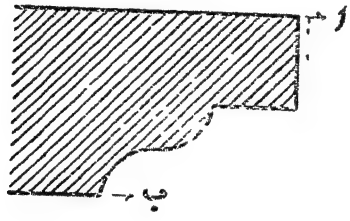

گولا دو قسم کا ہوتا ہے (۱) ادھا گولا ؛ جو بہت چھوٹا ہوتا ہے اور اپنی ہستی کو پوری طرح جتلا نہیں سکتا - (۲) متن کا گولا ؛ جو خاصا بڑا ہوتا ہے ؛ اور اگر اینٹ میں بنایا جائے تو ایک پوری اینٹ میں سے بنایا جاتا ہے - شکل یوں ہے -

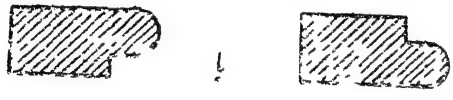

گول ذات—امث - ذات کی ایک قسم - دیکھو ذات (۸) -

گونا—امذ - (واو معروف سے) - دیوار کی جڑ میں ' فرش اور دیوار یا چھت اور دیوار کے درمیان میں ' جوڑ یا سیمنٹ کی وہ تہ جو اس غرض سے دی جاتی ہے کہ دیوار کی جڑ میں پانی نہ مرے - یہ تہ تین طرح کی ہو سکتی ہے ' (ا) سلامی شکل میں ؛ (ب) مجوف ؛ یعنی اندر کو گھسی

ہوئي ؛ اور (ج) منحدب ' یعني باہر کی طرف اُبھري ہوئي -

گَہَل—امث - (گ اور ہ کے زبر سے) - ایڑ کا ایک حصہ دیکھو ایڑ (۲) -

گَیْنتا—امذ - (گ کے زبر ' اور نون غنہ سے) - لوہے کا ایک اوزار جس میں دو بازو ہوتے ہیں ' جو ۱۲۰ یا ۱۴۰ درجے کے زاویے پر ملتے ہیں - زاویے کے مقام پر ایک سوراخ ہوتا ہے جس میں لکڑي کا ایک لمبا سا دستہ لگا ہوتا ہے - ایک بازو آخر میں نوکدار ہوتا ہے ' اور دوسرے کے آخر میں ایک چپٹی سي دھار ہوتی ہے - اس اوزار سے سخت ' پختہ یا کنکریلي زمین کو کھودنے کا کام لیا جاتا ہے - شکل یہ ہے -

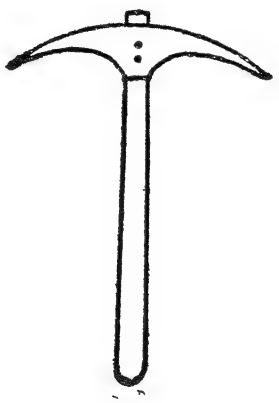

گھ

گھاتا—امذ - (بغ : گھاتی ' گھات) - بانسوں کو ملا ملا کر رکھ کے بنایا ہوا ایک عارضي پل ' جس پر چالي (جد) رکھ کر فرش سے چھت پر جانے آنے کا کام لیا جاتا ہے -

گھیرے دار دَات—امث - دَات کي ایک قسم - دیکھو دَات (۸) -

ل

لپواں—ا ؛ صف - (ل کے زیر سے - هندي : لیپنا ؛ لیپ) - ایک قسم هے پیتن کي - دیکھو پیتن (۱) -

لتکانا—مصدر - اینٹ (یا پتھر) کی چنائي میں اینٹ کے متعلق بولا جاتا هے - اینٹ کو دیوار میں اس طرح چننا کہ وہ اپنے سے نیچے والے ردّے کي اینٹوں کے لحاظ سے دیوار کے باهر کو نکلی هوئی رهے - اس انداز سے اینٹ لگانے کو '' لتکانا '' یا '' لتکا کے لگانا '' کہتے هیں اور ایسے ردّے یا اینٹ کے بارے میں کہتے هیں کہ '' لتک رها (رهي) هے '' - دیکھو کري -

لرَجھر—صف - (ل اور جھ کے زبر سے) - دیوار کي چنائي کے بعد اگر ایک طرف سے دیکھنے پر چنائی ایسی نظر آئے کہ اس کي کچھ اینٹیں باهر کو نکل آئي هیں اور کچھ اندر کو دھنسي هوئی سی هیں ' تو چنائي کے اس آگے پیچھے اور ناهموار هونے کي حالت کو '' لرجھر '' کہتے هیں -

لونا—امذ - (واو مجہول سے - هندي لون ' لونا) - نمک ' کھار ' ریہ ' جو پرانی یا خراب مسالے کي بني هوئي دیوار یا ایسے فرش کي چنائی میں پیدا هو کر اُسے کمزور اور خراب کر دیتا هے -

م

ماروارتي—امث - (۱) اینٹ یا پتھر کي وہ چنائي ' یا (۲) لکڑي کا وہ کام ' جو دیوار یا ستون یا اور کسي قسم کے تعمیري کام میں باهر کو نکلي (نکلا) رهے -

مَتَن کا گولا—امذ - (م اور ت کے زبر سے - عربي متن ' م کے زبر اور ت کے سکون سے) - گولے کي ایک قسم - دیکھو گولا -

متھالا—امذ - (م کے زبر سے) - چھت کي اوپر والي سطح - '' چھت کا متھالا '' کہتے ھیں - دیکھو اُبراوا -

مجھولا—امذ (واو مجہول سے - ھندي . منجھلا—سنسکرت : مدھي मध्य ' درمیانہ ' بیچ کا) - درمیانہ درجے کي ' بیچ کے قد کی ' چھوٹي کني ' وہ چھوٹي کني جو تاریک جگھوں میں استرکاري کرنے یا پیٹن بنانے کے کام آتي ھے - دیکھو کَنی -

محراب دار ڈات—امث - ڈات کی ایک قسم ھے ' جسے '' چکے دار ڈات '' بھي کہتے ھیں - دیکھو ڈات (ج) -

مزدور—امذ - (م کے زبر ' اور واو معروف سے - فارسي : مزدور ' اُجرت پر کام کرنے والا) - وہ شخص جو راج کے کام کے سوا اور سب کام کرتا ھے (مثلاً اینٹ ' پتھر ' چونا وغیرہ تعمیري مسالے کا لانا ' لے جانا ' ڈھونا ' اُٹھانا ' رکھنا وغیرہ) اور راج کو تعمیر میں مدد دیتا ھے - دیکھو بیلدار -

مُکھائي—امذ - (م کے پیش سے - ھندي مُکھہ ' مُنہ) - وہ درز جو پتھر یا اینٹ کي چنائي میں اینٹوں کے درمیان میں ھوتي ھے - اسی کو '' درز '' اور '' تیپ '' بھي کہتے ھیں -

ملبا—امذ - (م کے زبر سے) - ملبا ؛ گري ھوئي تعمیر کا مسالا ' اینٹ ' پتھر ' چونا ' کنکر ' مٹي ' تعمیر کے مسالے کے ریزے ' ٹکڑے ' گرے پڑے احراء—عام اس سے کہ وہ پرانے اور گرے ھوئے مکان وغیرہ کے ھوں یا نئي تعمیر میں کام کرتے وقت پیدا ھوں -

مُنڈیر—امث - (م کے پیش ' نون غنہ ' اور یاي مجہول سے) - منڈیر ' دیوار کا سر جو چھت (یا فرش) زرا اوپر کو نکلا رہتا ھے -

منگراوا—امذ (م کے زبر ' اور نون غنہ سے) - مٹي کا بنا ہوا آٹھ کے ھندسے کي شکل کا کھپرا ' جسے کھپریل کي چھاؤني میں پن چیر (جد) کے طور پر سب سے اوپر رکھتے ھیں - یہي کام اسي شکل کے لوھے کے طرف سے بھی لیا جاتا ھے ' جسے گُنیا کہتے ھیں - دیکھو کھپرا -

مُہَنّت—امذ - (م کے پیش ' ہ کے زبر ' اور ب کي تشدید اور زبر سے) - وہ پتلے پتلے بانس یا بانس کي موٹي موٹي کھپچّیاں ' جو کھپریل کی چھت میں کھپروں کو گرنے سے روکنے کے لیے کھپروں کے آخر میں الوتیوں کے پاس لگا کر بندھنوں سے باندھ دیے جاتے ھیں -

مُہري—امث (م کے پیش سے) - موري ' نالي -

میانہ—امذ - (م کے زیر سے - فارسي : میان ' میانہ) - (۱) کسي چیز ' یا تعمیر کے کسي حصے ' کا بالکل درمیاني حصہ ' بیچ ' مرکز - (۲) ڈیڑھ یا دو اینٹ کي چوڑائي کا ایک چھوٹا سا مکعب چبوترہ ' جو عمارت کي تعمیر شروع کرنے سے پہلے ' داغ بیل ڈالنے کے بعد ' دیواروں کے آثار میں بالکل صحیح نصف کے مقام کا اندازہ قائم کرنے اور رکھنے کے لیے بنایا جاتا ھے - (۳) ایک کھونٹي (جد) ' جو اسي غرض سے زمین میں گاڑي جاتي ھے -

ن

ناس—امث - (سنسکرت ناسکا नासिका ' ناک) - بوري چنائي

کي یا ایک اینٹ کي کور ' یا اس کا کنارہ ' کگر - اسے ناسک بھي کہتے ھیں -

ناسک—امث - (س کے زیر سے) - وھي ھے جو '' ناس '' ھے ' حد -

نرماھت—امث - (ن اور ہ کے زبر سے - فارسي : نرم) - ڈھال ' ڈھلوان ' ڈھلاؤ ' سطح کا سلامي ھونا -

نربا—امث - (ن کے زبر سے - ھندی : نالي ' نال—موري) - کھپریل کي چھت چھانے کے لیے مٹي کا وہ ظرف جو ایک طرف سے کُھلي ھوئی نالی کی شکل کا ھوتا ھے اور کھپروں کے نیچے بچھایا جاتا ھے - دیکھو کھپرا -

نِستَر—امذ - (ن کے زیر اور ت کے زبر سے) - کتکی اور پٹري (حد) بنانے کے لیے لکڑي کي ایک پٹری یا پٹي - اس کے استعمال کا طریقہ یہ ھے کہ جس مقام پر کتکي یا پٹري بنانا مقصود ھو وھاں نیل کا داغ ڈال کر نستر کو اس خط پر سیدھا رکھتے ھیں ؛ اور اس کے اُوپر یا (نیچے) مسالے (چونے یا سیمنٹ) کی تہ جما دیتے ھیں - تہ جم جانے پر نستر کو آھستہ سے ایک آڑا جھٹکا دے کر ھٹا لیتے ھیں - اِس طرح کتکی (یا پٹري) کے اُوپر اور نیچے کي سطح صاف اور سیدھي بنتی ھے -

نسیني—امث - (پہلے ن پر زبر , پہلي ي معروف اور شاذ طور پر مجہول) - بانس کي سیڑھی -

نقلي اینٹیں—امث - وہ اینٹیں ؛ جو نقلي (جد) میں لگائی جاتي ھیں - دیکھو ڈھولا -

نقلی جڑائي—امث - وہ جڑائي (چنائي) جو ڈھولا بنانے میں کام آتي ھے - دیکھو ڈھولا -

نکل—امث - (=عربي . نقل) - وهي چيز هے جس کو "تمنچا"
اور "بکّا ڈھولا" کہتے هیں دیکھو تمنچا -

نکلي اینٹیں—دیکھو نقلی اینٹیں -

نکلي جڑائی—دیکھو نقلي جڑائي -

نَہلا—امذ - (ن کے زبر سے) - بہت چھوٹی سي کنی ؟ جس
کا زیادہ سے زیادہ عرض آدھ انچ کا هوتا هے ؟ اور جو
بہت باریک جگہوں میں چوبے یا سمینٹ سے کام بنانے یا پیٹن
کرنے کے لیے برتي جاتي هے - یہ کنی مجھولے سے چھوٹي
هوتي هے - دیکھو کني ؟ مجھولا -

نیو—امث - (ي عموماً مجہول ؟ کبھي کبھي معروف) - نیو ؟
بنیاد ؟ بناء -

ہ

ہتنا—امذ - (ہ کے زبر سے هندي هتنا) - ایک قسم هے ڈاڑھا کي ' حد -

ہول پاس—امذ -(انگریزی Hole pass ?) - لوهے کے بنے هوئے
پارو جو ضرورت اور تناسب کے لحاظ سے چھوٹے اور بڑے
هوتے هیں ' اور کرسي یا دروازے کي چوکھٹ میں دونوں
پٹیوں کے باهر کي طرف لگائے جاتے هیں - ان کو چنائي
کے اندر غرق کردیا جاتا هے - غرض اِس سے یہ هوتي هے
کہ چوکھٹ چنائي سے الگ نہ هوے پائے اور مضبوط رهے -

"ہندستان" بغیر واؤ کے صحیح ہے۔

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' ایم اے-پی-ایچ-ڈی)

(۲)

رسالۂ "ہندستانی" کی پچھلی اشاعت میں اِس مبحث پر ایک مستقل مضمون شائع ہوچکا ہے*' مگر وہ گرمیوں کی چھٹی میں لکھا گیا تھا اور اُس وقت بعض ضروری کتابیں مل نہ سکیں کہ اُن کا حوالہ دیا جاتا ۔ اُس کی تلافی اِن صفحوں میں کی جاتی ہے ۔

مسعود سعد سلمان لاہوری† کے تین شعر لکھے گئے تھے' اب اُسی شاعر کے دو شعر اور حاضر ہیں —

(۱) نہ نست ہر کہ او را خیال و ہندیشید

کہ من بقلعۂ سو سالم او بہ ہندستان ‡

(۲) سہ ہفتہ بیش نہ بودم بہ ملکِ ہندستان

و گرچہ بود بخوبی چو روے حور العین ۔§

امیر خسرو دہلوی کے دو شعر "دول رانی خضر خان" میں سے نقل

---

* مضمون کے پہلے حصے (ص ۳۶۳—۳۷۱) میں کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں اُن کی تصحیح یہاں کی جاتی ہے —ص ۳۵۶' س ۲۱ "ٹولکسوری" صحیح نہیں ' "مطبوعۂ لکھنئو" چاہیے تھا - ص ۳۵۸' س ۱۶ "ہر یک" ' ص ۳۶۰' س ۵ : "حو انتخاب" اور ص۳۶۸' س ۱۴ "کتاب کی کتابت" چاہیے -

† مسعود کا آبائی وطن ہمدان تھا ' مگر وہ لاہور میں پیدا ہوا - (دیکھو رایل ایشیاٹک سوسائٹی ' لنڈن ' کا رسالہ بابت سنہ ۱۹۰۵ ع ' ص ۷۰۱ اور اُس کے آگے) -

‡ ایضاً ' ص ۷۲۵ -

§ "آتشکدۂ آذر" (طبع بمبئی) ص ۱۶۵ -

کیے گئے تھے ، یہاں دو شعر اور لکھے جاتے ہیں ؛ ایک "قرانِ السعدین" سے دوسرا "ہشت بہشت" سے :—

(۱) صفتِ بیرۂ بتول کہ بزدِ ہمہ حلق
بہ از آن نیست زبانے بہ ہمہ ہندستان - *

(۲) بود فرماندھے بہ ہندستان
شہر و کشور بہ عدلِ او بستان - †

اِن کے علاوہ اور اُستادوں کا کلام بھی "ہندستان" کی صحت کا شاہد ہے —

۱ - محمد ابن عمر فرقدی کا شعر ہے —

باغ می ماند بہ ہندستان زانبوھیء زاغ
وآب ماند تیغِ ہندی را کہ مالی بر قسان - ‡

۲ - شیخ فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ "لسان الغیب" میں فرماتے ہیں —

مِلک ہندستان و ترکستان رمیں
رفتہ چون اہلِ خطا از سوے چین - §

---

* "قران السعدین" (طبع علی گڑھ) کے متن کے صفحہ ۱۸۵ پر یہ عنوان کا شعر ہے-
† "ہشت بہشت" (طبع علی گڑھ) ، متن ، ص ۹۶ -
‡ عوفی ، "لباب الالباب" (طبع یورپ)، ج ۲ ، ص ۳۱۶ -
§ "شعرالعجم" (مطبوعۂ اعظم گڑھ) ، ج ۲ ، ص ۱۰ - "شعرالعجم" کے کاتب کا اِس شعر میں "ہندستاں" کو واو کے ساتھ لکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں - اِسی جلد کے صفحہ ۲۸۳ پر خواجہ حافظ سبزواری کے اِس مصرعے "ترسم آں قوم کہ بر دود کشاں می خندند" میں اصلاح دے کر حضرت کاتب نے "خندند" کو "خواندند" بنا دیا ہے- واقعی جاے اُستاد، خالی بھی تھی -

۳ - مولاناجلال‌الدین رومي کي مثنوي میں بھي ''هندستان''
(بلا واو) کئي جگه دکھائي دیا .—

(دفتر ۱)
(۱) چون که بارگاں سفر را سار کرد
سوے هندستان شدن آغاز کرد -
(۲) چون که دراقصاے هندستان رسید
درنیابان طوطیے چندے بدید -

(دفتر ۲)
(۳) قاصدے دانا ز دیوانِ ادب
سوے هندستان روان کرد از طلب
(۴) سالها مي گشت آن قاصد ازو
گِردِ هندستان برائے جست و جو

۴ - مولانا عبدالرحمن جامي کي ''یوسف زلیخا'' بھي
''هندستان'' سے خالي نہیں .—

چو ماتم دار گشت از نا امیدي
چرا رفت از سپاهي در سپیدي
ز هندستان مگر بودش نمونه
که باشد کارِ هندو بار گونه *

۵ - سلیم طهراني (متوفي سنه ۱۰۵۷ ھ) —

(۱) نعیش آبادِ هندستان غمِ پیري نه مي باشد
که مو نتواند از شرمِ کمرها شد سفید اینجا - †

---

* '' یوسف زلیخا '' نولکشوري (سنه ۱۲۸۶ هجري) ص ۲۰۶ -

† '' تذکرۂ حسیني '' تالیف میر حسین دوست سنبهلي (نولکشوري سنه ۱۸۷۵ ع
ص ۱۵۶ -

(۲) نیست در ایران زمین سامانِ تحصیلِ کمال
تا نیامد سوی هندستان، حنا رنگین نه شد - *

(۳) کی ز حسن سعی در ایران توان شد کامیاب
هر کرا طاؤس باید رنجِ هندستان کشد - †

۶ - میر رضی دانش مشهدی (متوفی سنه ۱۰۷۶ ھ) نے هندستان آنے کے شوق میں کہا ہے :—

راہِ دورِ هنـــــد پا بستِ وطـــــن دارد مرا
چون حنا شب درمیان رفتن به هندستان خوش است - ‡

۷ - ملا عبدالرزاق فیاض، لاهیجی الاصل قمی الوطن، مصنف "گوهر مراد" کا شعر ہے —

سوی زلفش می کشد آشفته سامانی مرا
می کند تکلیفِ هندستان پریشانی مرا §

۸ - شیخ ناصر علی سرهندی (متوفی سنه ۱۱۰۸ھ) کی ایک غزل کا مقطع ہے —

این غزل، ناصر علی، اعجازِ هندستانِ ماست
صائب اینجا می‌نهد بر خاک تا محشر جبین - ||

---

* "مآثر الکرام"، ج ۲ ("سرو آزاد") تالیف میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۶۶ -!

† "ارمغان" مولفۂ استادی مولانا محمد عبدالغنی خاں مرحوم (مطبوعۂ آگرہ)، ج ۴، ص ۱۸۵ -

‡ مآثرالکرام"، ج ۲، ص ۸۷ - فیاض، ملا صدرا کے شاگرد اور داماد تھے اور ملا محسن فیض کے همسبق اور همزلف - علاوہ "گوهر مراد" کے "سرمایۂ ایمان" بھی اُن کی ایک مشہور تصنیف ہے -

§ "مآثرالکرام"، ج ۲، ص ۱۱۴ -

|| "دیوان ناصر علی" (مطبوعۂ مطبع مرتضوی) ص ۹۵ -

۹ - امین رازی نے "ہفت اقلیم" میں ہندستان کی تعریف میں تین شعر دیے ہیں، جن میں سے پہلا شعر یہ ہے —

اے خوشا فصل دے نہ ہندستان

کہ شود خانہ و چمن بستان - *

اِس قدر کثرت سے شعر اِس لیے سند میں دیے گئے ہیں کہ اطمینان ہو جائے کہ ہر طبقے اور ہر زمانے کے فارسی شاعروں نے "ہندستان" (بلا واو) کہا ہے اور بے تکلف اور ہر ممکن پہلو سے استعمال کیا ہے - ضرورتِ شعر کو اِس میں اصلا دخل نہیں -

"ہندستانی" (بلا واو) -

جو شواہد اب تک دیے گئے سب لفظِ "ہندستان" کے ہیں - "ہندستانی" (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) شعرا کے کلام میں کم ملتا ہے، لیکن اِس کے اسباب اور ہیں، یہ نہیں کہ وہ غلط ہے - جب "ہندستان" صحیح ہے تو "ہندستانی" کیوں کر غلط ہو سکتا ہے؟ اِتمامِ حجت کے لیے ایک شعر کافی ہوگا - حضرت امیر خسرو، "طوطیِ ہندستان" اپنے "ہندستانی" ہونے پر فخر کرتے ہیں - فرمایا ہے —

تُرکِ ہندستانیم، من ہندوی گویم جواب

شکرِ مصری ندارم، کز عرب گویم سخن - †

---

* "میخانہ" تصنیف ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی، مرتبہ پروفیسر محمد شفیع (لاہور سنہ ۱۹۲۶ع)، صفحہ "ص" -

† "اورینٹل کالج میگزین" لاہور بابت نومبر سنہ ۱۹۲۹ع ص ۳۳ -

ایک اور فارسی فرہنگ سے اِستدلال -

پچھلے مضمون میں "فرہنگ جہانگیری" و "برہان قاطع" اور "بہار عجم" سے استدلال کیا گیا تھا - یہ تینوں فرہنگیں مستند ہیں ' مگر جس طرح ہر انسانی کام میں کچھہ نہ کچھہ کسر رہ جایا کرتی ہے اِن کتابوں میں بھی کہیں کہیں کوئی بات اصلاح کے قابل ہے - "فرہنگ جہانگیری" کی فرو گذاشتوں کی تلافی کی غرض سے "فرہنگِ رشیدی" تصنیف ہوئی - * "برہان قاطع" پر غالب نے اعتراضوں بلکہ خردہ گیریوں کی بوچھار کی ' کتنے جواب اور جواب‌الجواب لکھے گئے - خیر اِس بحث کا یہ مقام نہیں کہ غالب اور غالب کے جلنہ دار اِس مباحثے میں کس حد تک حق بجانب تھے - جب خان آرزو (صاحب "جہانگیری") اور محمد حسین برہان تبریزی اِس رد سے نہ بچے تو بیچارے تیک چند بہار ' کہ ہندستان کی خاک سے تھے ' کس شمار قطار میں ہیں ؟ اِس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی فرہنگ سے بھی استدلال کر لیا جائے ' جس کے مصنف کے قدم ہندستان کی خاک سے آلودہ نہ ہوئے ہوں ؛ وہ فرہنگ "انجمن آرائے ناصری" ہے - ناصرالدین شاہ قاجار کے عہد میں رضا قلی خاں ہدایت (صاحب تذکرۂ "مجمع‌الفصحا") نے یہ کوشش کی کہ تکسالی فارسی کا ایک لغت ترتیب دے - اِسی کوشش کا نتیجہ ہے "فرہنگ انجمن آرائے ناصری" - † کتاب کے طویل مقدمے میں مصنف نے اپنے پیش رو

---

* "فرہنگ رشیدی" زیر بحث لفظ کے متعلق "فرہنگ جہانگیری" سے مطلق کوئی اختلاف ظاہر نہیں کرتی -

† طہران میں علی قلی خاں کے چھاپے خانے میں سنہ ۱۲۸۸ ہجری میں چھپی - دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف سنہ ۱۲۸۶ ھ میں ہوئی -

لغت نویسوں کی غلطیاں چن چن کر گنائی ہیں اور فرہنگ کے متن میں بھی جا بہ جا اوروں کی لغزشوں کا ذکر کیا ہے ۔ رضا قلی خاں کی کتاب اِس لحاظ سے زیادہ مستند خیال کی جا سکتی ہے کہ اُس کے پیش نظر متقدمین ، متوسطین اور متاخرین کی تصنیفوں کا بیش قرار ذخیرہ تھا اور اُس نے ایران میں بیٹھ کر فارسی کا لغت لکھا ، جو اُس کی زندگی ہی میں چھپ بھی گیا ۔

خود فرہنگ کے متن میں مصنف نے "ہندوستان" یا "ہندستان" کو مستقل لفظ کی حیثیت سے نہیں قائم کیا ہے ، البتہ "ہند سان" کو مستقل جگہ دی ہے ۔ مگر اُس کی تشریح لفظ بہ لفظ وہی ہے جو "جہانگیری" میں ہے ۔ اُس کے علاوہ لفظ "ہند" کے ذیل میں "ہندوستان" ضمناً آگیا ہے ۔ وہ عبارت یہ ہے :—

"و اہالی ایران آن ولایت را ہند و ہندوستان ولے اہل ہند ہر ولایتی را بنام آن بار خوانند چرا کہ ہند چہار قسمت شدہ و ہر قسمتی را نامے است چنانکہ اول ہند . . دویم دکن الخ ۔"

اِس کا مطلب یہ ہے کہ "ایران والے تو تمام ملک کو "ہند" اور "ہندوستان" کہتے ہیں مگر خود اہل ہند ، صرف شمالی ہند کو "ہند" کہتے ہیں اور ملک کے باقی حصوں کو اُن کے مخصوص ناموں سے یاد کرتے ہیں ، جیسے "دکن" [بنگال] وغیرہ ۔" * اِس بات کا فرہنگ کے متن میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ "ہندستان" "ہندوستان" کا مخفف ہے ۔ یہ غالباً اِس لیے کہ کتاب کے مقدمے

---

* کچھ "ہند" ہی میں میر نہیں لوگ جب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا "دکن" تمام ۔ (میر)

میں مصنف اِس بات کو شرح و بسط سے بیان کر چکا ہے - " ناصری " کے طویل مقدمے کو مصنف نے کئی حصوں میں تسیم کیا ہے اور ہر حصے کا نام " آرائش " رکھا ہے اِس طرح پر بارہ " آرائشیں " سجائی ہیں جن میں زبان اور لغت سے متعلق اکثر مفید مطالب بیان کیے ہیں - چنانچہ " آرائشِ دہم " میں " مصطلحات ضروریۂ علم صرف و نحو " سے بحث کی ہے - اِس " آرائش " کے آغاز سے پانچویں صفحے * پر پہلے اِدغام کی تعریف کی ہے پھر لکھا ہے :—

"بہر کیف چوں تغییر بادغام در فارسی کمتر آمدہ زیرا کہ خود تشدید درین زبان بہ ندرت وارد است بنا بر آن بیشتر در چنین صورتہا حرف اول را کہ ہمجنس ثانی یا قریب المخرج این باشد حذف نمودہ اند . و ظاہر آنست کہ حصولِ تخفیف نسبت بادغام در حذف زیادہ بود و حذف عبارتست از دور کردن حرفے از لفظے ؟ مفرد باشد یا مرکب ، و غرض از آن یا تخفیفِ لفظ بود یا بنائے کلمہ و یا ضرورتِ دیگر - در صورتِ تخفیف لفظ محذوف عنہ بمخفف تعبیر کردہ شود و وقوع آن برابر است کہ در صدرِ لفظ باشد یا در وسط یا در آخرش پس حذفِ یک حرف از صدر چنانکہ بلفظِ شیب از نشیب . . . و حذفِ یک حرف از وسط چنانکہ بلفظِ از از اگر و برون از بیرون و بد از بُود † و چار از چہار

---

* صفحوں کے ہندسے ساری کتاب میں کہیں نہیں ہیں - پرانے دستور کے مطابق " ترک " کے لفظ ورق کے ختم پر لکھ دیے ہیں جن سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ عبارت کا سلسلہ درست ہے -

* کتاب میں اِس جگہ " بودہ " ہے جو غالباً کتابت کا سہو ہے -

و رانیدن از روانیدن و زنهار از زینهار و ستدن از ستادن و فرخت از فروخت و کاشے از کاشکے و که از کاه ـ همچنین بغداد از باعداد و پرستان از پریستان و چرا از چه را و دشمن از دشت من و دشنام بمعنی بدنام و شاباش از شادباش و کرا از که را و ورا از وی را و هندستان از هندوستان و نا خدا از نا و خدا ـ و حذفِ یک حرف از آخر چنانکه نلمط بو از بود و رمند از رمنده و سیا از سیاه . . و گوا و گیا از گواه و گیاه و پادشا از پادشاه . . . . و شکرخند از شکرخنده و نادهند از نادهنده ـ دستور: لیکن حذفِ ها از لفظِ سیاه موجبِ مزیتِ فصاحتِ است و از گواه و گیاه و پادشاه مُخلِّ فصاحت باشد ـ ''

اِس فارسی عبارت میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں اُن کا فقرہ وار خلاصہ ' اُردو میں ' یہ ہے :ـــ

(۱) اِدعام فارسی میں کم آتا ہے اور جود تشدید ہی شاد و نادر آتی ہے ـ بخلاف اِس کے حذف (فارسی میں) زیادہ آتا ہے ـ

(۲) تخفیف کا فائدہ اِدعام سے زیادہ حذف سے حاصل ہوتا ہے ـ

[یعنی '' تخفیف '' فارسی میں ایک اہم چیز ہے ـ]

(۳) حذف کہتے ہیں کسی لفظ کے شروع ' بیچ یا آخر سے ایک حرف کے دور کر دینے کو ـ

(۴) کسی حرف کو اِس طرح دور کر دینے سے غرض یا تو '' تخفیفِ لفظ '' ہوتی ہے یا '' بنائے کلمہ '' یا '' ضرورتِ دیگر '' ـ

["ضرورتِ دیگر" میں ضرورتِ شعری بھی آگئی - "تخفیفِ لفظ" اُس سے الگ ایک چیز ٹھہری - *]

(۵) جس لفظ میں تخفیف واقع ہوئی ہو اُسے "مخفف" کہتے ہیں ، چاہے تخفیف لفظ کے شروع میں ہوئی ہو یا بیچ یا آخر میں -

"تخفیف" کی مثالیں :—

(الف) شروع سے ایک حرف کا حذف ، جیسے "نشیب" سے "شیب" ... وغیرہ

(ب) بیچ سے ایک حرف کا حذف ، جیسے —

"ار" ("اگر" سے) ، "برون" ، "بُد" ، "چار" وغیرہ -

اِسی طرح "باعداد" سے "بغداد" ، "پریستان" سے "پرستان" ، "چہرا" سے "چرا" ، "دشت من" سے "دشمن" اور "دشت نام" سے "دشنام" ، "کہ را" سے "کرا" ، "وے را" سے "ورا" ، "ہندوستان" سے "ہندستان" ، "نا و خدا" سے "نا خدا" -

---

* صاحب "برہان" نے لکھا تھا ' فرد بر وزن کرد مخفف فیرد است یعنی ذی ارزد - "میرزا غالب" ، قاطع پر بوں تنبیہ کرتے ہیں "دانستہ شد کہ ہیچ نداند ... و فرد را مخفف دکا داد گویند ، کہ فیرد لغتے مستقل باشد - واینکہ در تقطیع سرو فرد بجائے فیرد آرند ضرورت سرو ست نہ تخفیف - ماهم بگریم کدام کس از بلغا درنثر بجائے فیرد ' فرد آوردہ است - " (قاطع برہان " طبع اول ' ص ۷۰ = طبع دوم ' ص ۱۱۶ -)

صاحب "قاطع القاطع" نے غالب کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ ' خصوصاً رضا قلی خاں کے بیان کے مقابلے میں ' کوئی چیز نہیں — ضرورت شعری کی بحث میں جس چیز کو تخفیف کہتے ہیں وہ "تخفیفِ مشدد" ہے اور وہ اِس بحث سے تعلق نہیں رکھتی —

[اِن مثالوں سے ثابت ہو گیا کہ '' ہندستان '' کی وہی حالت ہے جو '' بغداد '' ، '' پرستان '' ، '' دشمن '' ، '' ناخدا '' وغیرہ کی ہے ، اور یہ سب وہ لفظ ہیں جو نظم اور نثر دونوں میں بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں -]

(ح) اخیر حرف کا حذف ، جیسے :—

'' بود '' سے '' بو '' ، '' رمندہ '' سے '' رمند '' ، '' سیاہ '' سے '' سیا '' ، '' گواہ '' اور '' گباہ '' سے '' گوا '' اور '' گیا '' ، '' پادشاہ '' سے '' پادشا '' وغیرہ -

(۹) فائدہ — لیکن لفظِ '' سیاہ '' سے ہ کا حذف کر دینا فصاحت کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے اور '' گواہ '' ، '' گیاہ '' ، '' پادشاہ '' سے [ہ کو] حذف کرنا فصاحت میں خلل ڈالتا ہے -

[اِس فقرے سے یہ پوری طرح ثابت ہوگیا کہ '' ہندستان '' میں و کا حذف '' محلّ فصاحت '' نہیں - کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح مصنف نے '' گوا '' وغیرہ کی نسبت لکھا ہے '' ہندستان '' کی نسبت بھی لکھہ دیتا -]

'' ہندستان '' عربی اور ترکی میں -

عربی میں '' ہندستان '' کے لیے '' ہند '' آتا ہے ، مگر اِسے ہندستان کا اعتبار کہنے یا ایران کے لہجے کی دلکشی کہ ایک عرب مصنف نے بھی اپنی کتاب میں اِس لفظ کو جگہ دی - شمس الدین ابو عبداللہ محمد انصاری دمشقی (متوفی سنہ ۷۲۷ھ) کی کتاب '' نخبۃ الدھر فی عجائب البر والبحر '' کی ایک فصل کے عنوان

---

* اِسے ایک معروف مستشرق م-ا-ف میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے پہلے پہل سنہ ۱۸۶۶ ع میں پیرس برگ سے شائع کیا - دُبارا سنہ ۱۹۲۳ ع میں لائپسک سے شائع ہوئی مگر یہ دوسرا چھاپا پہلے کی عکسی نقل ہے -

میں "ہندستان" آیا ہے اور بغیر واو کے ہے - پھر چند ہی سطروں کے بعد یہ لفظ ملتے ہیں :—

"بلاد ہندستان و معناہ بالعربیہ بلاد ہند..."

(ص ۱۸۰) -

یہاں بھی "ہندستان" میں واو نہیں ہے - اِس سے سوا اِس کے اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مصنف نے جس طرح ابرانیوں کو بولتے سنا تھا اُسی طرح لکھا -

ترکی میں، مثل فارسی کے، "ہند" اور "ہندستان" دونوں لفظ استعمال ہوے ہیں اور "ہندستان" بغیر واو کے بولا اور لکھا جاتا ہے - ردھاؤس (Redhouse) کا ترکی لغت مستند مانا جاتا ہے - اُس کا انگریزی ترکی حصہ میرے پیش نظر ہے، جس میں India کے سامنے لکھا ہے —

"ہند ہندستان"—(ص ۴۰۳)،

اور Hindoo کے سامنے ہے —

"(۱) ہندی ہندستانلو † (۲) ہندستان آدمیلرینہ مخصوص و منسوب" ‡

(ص ۴۰۰) -

غرض کہ ابرانیوں کا اثر جہاں کہیں پہنچا، "ہندستان" (بلا واو) بھی ساتھ ہی ساتھ لگا چلا گیا - پھر بھلا خود ہندستان کیوں کر بچ جاتا ؟

---

* مطبوعۂ قسطنطنیہ سنہ ۱۸۷۷ ع -

† "لو" کے معنے ہیں "والا" -

‡ یعنی "ہندستان کے آدمیوں کے ساتھ مخصوص و منسوب" -

اُردو میں ۔

جیسا کہ پہلے حصے میں کہا جا چکا ہے اردو میں '' ہندستان '' (بلا واؤ) بولا جاتا ہے ' لکھنے میں بھی لوگ واؤ کو حذف کر دیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر چند کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے ' جو ہیں تو فارسی مگر جن کی کتابت اور تصحیح اردو بولنے والوں کے ہاتھوں ہوئی ہے :—

(۱) '' عباب اللغات '' (نولکشوری سنہ ۱۸۹۰ع) کے صفحہ ۱۵۷ پر '' ہندستان '' بغیر واؤ کے ہے باقی ہر جگہ واؤ کے ساتھ ۔ اسی کتاب کے اُس نسخے میں ' جو سنہ ۱۸۸۷ع میں اُسی چھاپے خانے میں چھپا تھا ' اِس مقام (یعنی ص ۱۳۷) پر اور اُس کے علاوہ صفحہ ۱۵۷ پر بھی '' ہندستان '' میں واؤ نہیں ہے ۔ سنہ ۱۲۸۳ ہجری میں تک چند بہار کے بونے دھرم چند نے '' بہار عجم '' چھپوائی تو اُس کے حاشیے پر بھی '' عباث اللغات '' چھپی ' جس کی دوسری جلد کے صفحہ ۷۵۹ کے حاشیے پر '' ہندستان '' جلی قلم سے لکھا ہوا ملتا ہے اور اُس میں واؤ نہیں ہے ۔ '' عباث '' کا ایک اور نسخہ بھی نظر سے گذرا ۔ یہ سنہ ۱۲۷۲ ہجری میں علی بخش خاں کے '' مطبع علوی '' لکھنؤ میں ' مولوی معشوق علی کی تصحیح سے چھپا تھا اور بہت صحیح ہے ۔ اِس کے صفحہ ۱۵۴ پر ایک بار ' صفحہ ۵۵۴ پر ایک بار جلی قلم سے اور پانچ بار معمولی قلم سے اور صفحہ ۵۵۹ پر ایک جگہ ' کل آٹھ بار '' ہندستان '' بغیر واؤ کے ہے اور صرف دو جگہ (ص ۱۷۷ اور ص ۵۵۵ پر) ایک ایک بار واؤ کے ساتھ ۔

---

*دھلی میں مفید محمد سعادت علی خاں مدرس دھلی کالج کے '' مطبع سراجی '' میں چھپی ۔

(۲) سنہ ۱۲۶۸ھ میں " سلطان المطابع " لکھنؤ میں وارستہ کی " مصطلحات " اور اُس کے حاشیے پر " بہار عجم " کا خلاصہ چھپا تھا - اِس کی تصحیح مولوی جمیل احمد نے کی تھی - مصحح کی نسبت خاتمے کی عبارت میں بہت سے ایسے توصیفی لفظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ وہ اُس زمانے کے بڑے سر برآوردہ علما میں شمار ہوتے تھے - اِس کتاب کے صفحہ ۴۰۰ کے حاشیے پر جلی قلم سے لکھا ہوا " ہندستانی " دکھائی دیا جس میں واو نہیں -

اِن مثالوں سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ آج سے پچاس ساٹھ برس اُدھر " ہندستان " یا " ہندستانی " ہمیشہ بغیر واو کے لکھا جاتا تھا - لیکن یہ ضرور یقین ہوتا ہے کہ کاتب جن کی زبان اُردو تھی اور جو برابر " ہندستان " بولتے اور سنتے رہتے تھے اپنے تلفظ کے مطابق لکھ بھی دیا کرتے تھے اور مصحح جو اکثر فارسی کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے اُسے روا رکھتے تھے - اِس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ " ہندستان " کا بغیر واو کے لکھنا بھی صحیح ہے -

خیر ، یہ تو کاتبوں اور مصححوں کا ذکر تھا - وہ حضرات بھی جو زبان کے محقق ہیں " ہندستان " کو صحیح جانتے ہیں - مولانا محمد حسین آزاد کے متعلق اِس مضمون کے پہلے حصے میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ وہ " ہندستان کو " فصیح سمجھتے تھے - ایک اور سند بھی حاضر ہے :—

صاحب " نورالبلغاب " اپنی کتاب میں لفظ کی دونوں صورتوں کو اِس طرح اعراب کے ساتھ درج کرتے ہیں —

" ہِنْدُوسْتان - ہِنْدُسْتان - (ف) مذکر - مشہور ملک . . .. ہندی - (ف) صفت - ہند سے

منسوب ـ هندُستان کا رهنے والا . ... ؟؟ *

؟؟ نوراللغات ؟؟ میں اکثر لفظوں کي سند میں اُستادوں کے شعر یا مستند نثر نگاروں کے فقرے نقل کیے گئے هیں لیکن اِس مقام پر کوئي سند نهیں دي گئي ' عالباً اِس لیے که اردو میں ؟؟ هندستان ؟؟ برابر بولا جاتا هے ؟ مصنف نے شاهد کي ضرورت نه جاني ـ پهر بهي اِس شبهے کي گنجائش رہ جاتي هے که شائد مستند شاعروں کے کلام میں ؟؟ هندستان ؟؟ (بلا واو) آیا هي نه هو ـ ایسا نهیں هے ؟ ملاحظه هو ـــ

۱ ـ ملا وجهي نے ؟ جو گولکنڈے کے شاعروں میں بهت مستاز تهے ؟ اپني ایک مثنوي میں ؟؟ هندستان ؟؟ فعولن کے وزن پر (یعني لفظ کے پهلے ن کو جو ساکن هے نون غنه کر کے) نظم کیا هے† اور اِس طرح لفظ بحر متقارب میں سما گیا ـــ

نه پهنچے نه پهنچیا هے گن گیان میں

سو طوطي مُنج ایسا هندستان میں ـ ‡

بعضوں کے خیال میں شائد یه سند کافي نه ٹهیرے ؟ اِس لیے که مُلّا وجهي تو بهت پرانے زمانے کے دکهني شاعر هیں ' بعد کے جن لوگوں نے زبان کے بهت سے اجزا کو ؟؟ متروک ؟؟ گردان کر زبان کو ؟؟ صاف ؟؟ کر دیا هے ؟ اُن کے کلام سے سند چاهیے ـ

۲ ـ مرزا سودا کے اُستاد ؟ شاه حاتم نے واقعی زبان میں بڑي

---

* ؟؟ نوراللغات ؟؟ ج ۴ ' ص ۹۹۲ ـ

† دکن کے لهجے میں ں ' ۂ اور ي کو مخلوط بولنا آج بهي بهت عام هے اور پرانے اساتذہ بول چال کے مطابق لفظوں کو نظم کیا کرتے تهے ـ

‡ ڈاکٹر محي الدین زور کي تصنیف ؟؟ اردو شهپارے ؟؟ ، ص ۹۳ ـ وجهي کا زمانه گیارهویں صدي هجري کا نصف اول هے ـ

اصلاح کی ؛ کہ دلی کے شرفا کی بول چال کو شعر کی زبان قرار دیا - چنانچہ اپنے متعلق خود ہی فرماتے ہیں:-

"و الفاظ عربی و فارسی ؛ کہ قریب الفہم و کثیرالاستعمال باشند ؛ و روزمرۂ دہلی ؛ کہ معززانِ ہند و فصیحانِ زند در محاورہ آرند ، منظور دارد .. ..
زبان ہندی بھاکھا را موقوف کردہ مختص روزمرہ را ، کہ عام فہم و خاص پسند باشد ، اختیار نمود" *

اِن کے شعر میں بھی "ہندستان" بغیر واو کے موجود ہے -

اشک خون آلود میرے اِس قدر جاری ہیں آج
جا بجا لعلوں سے ہندستاں بدخساں ہوگا - †

مگر کہنے والے اِن کی نسبت بھی کہہ گذریں گے کہ اِن کی زبان بھی پرائی ہے - [لکھنئو] والے یہ بھی کہہ بیٹھیں تو عجب نہیں کہ "دلی میں بولتے ہوں گے" - پس ایک ایسے شاعر کے کلام سے سند لانا مناسب ہوگا جو بعد کے سخنوروں میں زبان کا بڑا مصلح مانا جاتا ہے -

۳ - شیخ ناسخ لکھنوی کے فارسی کلام ‡ سے قطع نظر ، اُن کے اردو کلام میں بھی "ہندستان" آتا ہے —

(۱) ہے ہمارے کفر کا باعث وہی ہندو پسر
دھوم جس کے حُسن کی ہے سارے ہندستان میں

---

* "آب حیات" آزاد (لاہور سنہ ۱۹۱۷ ع) ، ص ۱۱۵ -

† "گلشن ہند" مرزا علی لطف (لاہور و حیدرآباد سنہ ۱۹۰۶ ع) ، ص ۸۱ -

‡ جیسے رشک سلطان جہاں بادشہ "ہندستاں" - ("دیوان ناسخ" نولکشوری سنہ ۱۹۲۳ ، ج ۲ ، ص ۳۳۰) -

مقطع میں شاعر غزل کی زمین کی سختی کی شکایت اور اپنی فکر کی رسائی کی تحسین یوں کرتا ہے —

یہ زمین اچھی نہ تھی ناسخ و لیکن فکر نے
حسن پیدا کر دیا ہے نون کے اعلان میں *

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ غزل خاص توجہ سے کہی گئی اور قافیے کے لفظ خاص اہتمام سے رکھے گئے ہیں - اُنھیں لفظوں میں '' ہندستان '' بھی ہے -

جرأت کے مرنے کی جو تاریخ ناسخ نے کہی یہ ہے :—

(۲) جب میاں جرأت کا باغ دھر سے
گلشنِ فردوس کو جانا ہوا '
مصرعۂ تاریخ ناسخ نے کہا .
ہائے ! ہندستان کا شاعر مُوا - †

ناسخ کے نولکشوری دیوان میں '' ہندستان '' ہر جگہ واو کے ساتھ لکھا ہے اور اگر واو کو تاریخ کے مادے میں شامل کر لیجیے تو تاریخ ۱۲۳۱ ہجری ٹھہرتی ہے مگر جرأت کی وفات سنہ ۱۲۲۵ ہجری میں ہوئی - ‡ پس واو کاتب کے تصرف پر مبنی ہے - یہی حال سودا کی وفات کی تاریخ کا ہے .—

از وحشت آبادِ دنیا - رفت بخلد رفیعِ سودا
گفتم سالِ وفاتش ناسخ - ساعرِ ہندستان ' واویلا ! §

یہاں کاتب نے ایک اور ستم کیا ہے کہ مصرعۂ تاریخ کے نیچے '' ۱۲۰۹ ''

---

* '' دیوان ناسخ '' ج ۲ ' ص ۱۴۶ -
† ایضاً ' ص ۳۴۵ -
‡ '' آب حیات '' ' ص ۲۳۹ - (یہاں بھی واو کا دمدار کاتب ہی ہے -)
§ '' دیوان ناسخ '' ج ۲ ' ص ۳۴۴ -

لکھ دیا ہے ، حالانکہ رآ کو شامل کرکے بھی مصرعے سے صرف ۱۲۰۱ نکلتے ہیں ، مگر واو یہاں بھی زائد ہے ، اِس لیے کہ سودا کی وفات کا سال '' ۱۲۰۱ '' نہیں ہے - بلکہ ۱۱۹۵ ہجری ہے - * پس سوا اِس کے کہ واو کو خارج کیجیے صحیح سال نہیں نکل سکتا - اِس سے بڑھ کے کیا ثبوت اِس بات کا ہو سکتا ہے کہ ناسخ نے اپنے اِن سب شعروں میں '' ہندستان '' بغیر واو کے لکھا تھا -

خلاصہ یہ کہ ''ہندستان'' بغیر واو کے صحیح بھی ہے اور فصیح بھی -

---

*'' گلشن ہند '' ص ۱۰۴ اور '' آب حیات '' ص ۱۵۱ اور حاشیہ -

اداریہ

اکتوبر کی موجودہ اشاعت میں ابتدائی تین مضامین وہ ہیں جو اکیڈیمی کی گذشتہ ادبی کانفرنس میں موصول ہوئے تھے - چوتھا مضمون "صلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاح" پروفیسر نعیم الرحمان صاحب کے مضمون کا بقیہ حصہ ہے - ہم نے خیال کیا کہ "ہندستانی" کا پہلا سال ختم ہو رہا ہے، جو مضامین طویل ہیں اُن کا سلسلہ اسی سال ختم کر دینا چاہیے تاکہ "ہندستانی" کی پہلی جلد اپنے مقام پر بالکل مکمل ہو، اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ موصوف کا پورا مضمون اسی نمبر میں دے کر یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے -

---

"ہندستانی" کے جولائی نمبر میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ آیندہ نمبر میں ہم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ایک مقالہ لفظ تماشی پر پیش کرینگے لیکن لفظ "ہندستانی" پر موصوف کے مضمون کا ایک حصہ جولائی کے "ہندستانی" میں دیا جا چکا ہے - اُس کا بقیہ حصہ ہمیں اِسی نمبر میں ختم کر دینا چاہیے تھا اس لیے ظاہر ہے کہ "تماشی" والے مضمون کے لیے کہاں گنجائش نکل سکتی تھی، بہر صورت "تماشی" پر موعودہ مضمون اب آیندہ نمبر میں پیش کیا جاسکتا ہے -

---

لفظ "ہندستانی" اور "تماشی" کی موافقت اور مخالفت ہمارے نزدیک چنداں قابل اعتنا نہیں، اگر "ہندستانی" کو "ہندوستانی" اور "تماشی" کو "سہ ماہی" لکھا جاتا جب بھی

کوئي قباحت نہ تھي اور اب اگر "ہندستاني" اور "تماهي" لکھتے ہیں تو اس پر بھي قیامت برپا کرنے کا کوئي موقع نہیں ہے - زندہ زبانوں کے جذب و قبول اور ان کي وسعتوں اور ہمہ گیریوں کا اگر لحاظ کیا جاے تو یہ اُمور قطعاً قابل توجہ نہیں رہ جاتے - چنانچہ ہم ڈاکٹر صدیقي صاحب کے مضامین اس غرض سے ہرگز نہیں شایع کر رہے ہیں کہ ان سے "ہندستاني" اور "تماهي" کا جواز ثابت ہوتا ہے اور یہ ایک بہت بڑي ضرورت ہے ، بلکہ اس لیے کہ بقول عارف رومي - ع

لیک کار از کار خیزد در جہاں

ڈاکٹر صدیقي صاحب نے "ہندستاني" اور "تماهي" کے سلسلے میں جس تحقیق و تلاش سے کام لیا ہے ، اور جتنے جیسے قابل قدر مسائل پر روشني ڈالي ہے وہ بجاے خود ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور اگر "ہندستاني" اور "تماهي" کي بحث پر روي کار نہ آئي ہوتي تو شاید ہم ان گرانقدر معلومات وافادات سے کلیۃً محروم رہ گئے ہوتے ، تاہم لفظ "تماهي" کي بحث کے بعد انشاء اللہ ہم اس سلسلے کو قطعاً ختم کر دینگے -

---

"ہندستاني" کے حوالئي نمبر میں لفظ "سنہرا" اور "سنہري" کے متعلق ایک مضمون "ادبي استفسار" کے عنوان سے شایع ہوا تھا - اس کے جواب میں ہماري اکیڈمي کے معزز ممبر مرزا محمد عسکري صاحب کا ایک مضمون اُس وقت موصول ہوا جب کہ ایڈیٹوریل بورڈ کي میٹنگ ہو چکي تھي اور اکتوبر نمبر کے لیے مضامین پریس میں دیے جا چکے تھے اس لیے افسوس ہے کہ اس مضمون کے لیے ہم گنجائش نہ نکال سکے لیکن اُس خیال سے کہ اگر یہ مضمون کسي

آیندہ اشاعت میں نکلا تو "استفسار" اور جواب میں ایک طویل وقفہ ہو جائیگا اس لیے مختصراً ہم جناب مرزا صاحب کے مضمون کا خلاصہ یہاں پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں —

آپ نے اپنے ابتدائی حصۂ مضمون میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ "بعض لغات نویس اس لفظ کی حقیقت سے کماحقہ واقف نہیں ہیں، انہوں نے صرف لغت سابقہ کے معنی نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے" اس کے بعد آپ نے ان لفظوں کے محل استعمال کی تحقیق فرمائی ہے، چنانچہ آپ کے نزدیک "سنہری" ان چیزوں کو کہنا چاہیے جو ایسے تاروں یا پتر سی بنی ہوں جن پر سونے کا ملمع ہو، خالص سونے کی چیزوں کو "سنہری" نہیں بلکہ "طلائی" کہنا چاہیے دوسرے معنی سنہری کے ایک خاص رنگ کے ہیں جو زرد رنگ کی ایک قسم ہے یعنی جس میں زردی کے ساتھ ہلکی سی سرخی بھی شامل ہو، آپ کے نزدیک یہ معنی صرف کپڑوں کے لیے مخصوص ہیں اور اس معنی میں "طلائی" "سنہری" کا مرادف نہیں ہو سکتا۔ "مصنف سرمایہ زبان اردو اور ان کی تقلید میں صاحب نوراللغات نے غضب کیا کہ صاف صاف لکھ دیا کہ نام ایک رنگ کا جس کو طلائی بھی کہتے ہیں"۔

خیر! یہ باتیں اصل مبحث سے چنداں تعلق نہیں رکھتیں، سوال لفظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق تھا، اس کے بارے میں مرزا صاحب کی رائے یہ ہے کہ لفظ "سنہری" کی "ی" یائے نسبت ہے اور اسی سبب سے مذکر الفاظ کے لیے "سنہرا" اور اماله کی صورت میں "سنہرے" کا استعمال جائز ہے، آپ جلال لکھنوی کی اس تحقیق سے متفق نہیں ہیں کہ —

"شیخ ناسخ فرماتے ہیں —

وصف جب میں نے کیے تیرے سنہرے رنگ کے
خود بخود ہر صفحۂ دیوان مذہّب ہو گیا

یہاں لفظ سنہرے کو بائے مجہول کے ساتھ یعنی امالہ سنہرا پڑھنا خطا ہے اس واسطے کہ '' سنہری '' نام ایک رنگ کا ہے ' پس اس رنگ کی طرف خواہ شے مونث منسوب ہو خواہ شے مذکر' بہر طور اُس کو بائے معروف کے ساتھ پڑھینگے ' قیاس ہر رنگ ' اگرئی ' بسنتی چمپئی کے '' (سرمایہ زبان اردو)

آخر میں '' سنہری '' اور '' سنہرے '' کی تذکیر و تانیث کے بارے میں آپ کی تحقیق یہ ہے کہ ,, (کم از کم لکھنئو میں) مذکر الفاظ کے لیے '' سنہرا '' اور '' سنہری '' دونوں مستعمل ہیں مثلاً لچکہ ' حوزہ ' رنگ ' کلس اور برج وغیرہ مگر مؤنث الفاظ کے لیے مثلاً ' بنت ' چٹکی ' بیل ' گھڑی ' زنجیر وغیرہ کے لیے '' سنہری '' بولتے ہیں ' '' سنہرا '' قطعاً غلط ہے ' چنانچہ اِس قاعدہ کے ماتحت الفاظ مستنسرہ یعنی '' موقع '' اور '' بچّھو '' کے لیے چونکہ دونوں مذکر ہیں آپ کی رائے میں '' سنہرا '' اور سنہری '' دونوں بولنا جائز ہے آخر میں آپ نے یہ بھی لکھہ دیا ہے کہ '' یہ لکھنؤ کی بول چال ہے ممکن ہے دہلی میں کچھہ فرق ہو '' ۔

اکیڈیمی نے اُردو اور ہندی شعبوں کی جانب سے یہ اعلان کیا تھا کہ یونیورسٹی کے اُن طلبا کو جو ڈراما ' افسانہ ' نظم ' طنزیات اور انتقاد ادب کے ذیل میں سب سے بہتر چیز پیش کرینگے سو سو روپیہ کا انعام دیگی ' ان مضامین کے بارے میں انعامی کمیٹی نے اب اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے ' چنانچہ شعبۂ اردو میں مسٹر مقبول حسین خاں بی ۔ اے مسلم ہوسٹل الہ آباد کو '

اُن کے ڈرامے "شہید مغرب" پر اور مسٹر محمد عظیم الحق بی - اے ، کرائیسٹ چرچ کالج ، کانپور کو اُن کے مضمون "اقبال کا فلسفۂ موت" پر سو سو روپے کے انعامات دیے گئے -

اسی طرح شعبۂ ہندی میں تین انعامات ، انتقاد ادب ، افسانے اور نظم پر دیے گئے ، ہندی میں "طنزیات ، افسانے اور ڈرامے ، اور اردو میں طنزیات اور نظم کے سلسلے میں کوئی چیز قابل انعام نہیں معلوم ہوئی -

اُردو اور ہندی ادب کی خدمت و ترقی کے سلسلے میں اکیڈیمی کا یہ طریق کار طلباء کی حوصلہ افزائی کا باعث ہے اور اس طرح بعید نہیں کہ ہم چند ہی دنوں میں بہت اچھے اچھے لکھنے والے اس صوبے میں طیار کر لیں -

---

آنجہانی بابو کرشن بلدیو ورما ہماری اکیڈیمی کی مجلس عامّہ اور مجلس عاملہ کے ایک سر گرم ممبر تھے ، آپ کی اچانک موت سے نہ صرف اکیڈیمی بلکہ ہندی کے عام ادبی حلقوں کو سخت دلی صدمہ پہونچا ہے ، اکیڈیمی کی گذشتہ کونسل کے موقع پر ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ نے بہ حیثیت پریسڈنٹ آپ کے انتقال پر اظہار تاسف فرمایا وقت یہ طے کیا تھا کہ رائے صاحب بابو شیام سندر داس ایک مقالے کی صورت میں آپ کے سوانح حیات کاونسل کی آیندہ نشست میں پیش فرمائینگے ، ہمیں اُمید ہے کہ رائے صاحب حسب وعدہ یہ خدمت انجام دیکر اکیڈیمی کے ممبروں کو ممنون اور بابو کرشن بلدیو ورما کے کار ناموں کو زندہ جاوید بنائینگے

رسید کتب :-

مثنوي ناسخ — مرتبۂ حبیب‌الله خان عضنفر ایم-اے ریسرچ اسکلر، الہ‌آباد یونیورسٹي، مطبوعہ کتابستان، الہ‌آباد قیمت ۲ آنہ -

نقش ونگار — از خلیل احمد قدوائي بي-اے، مطبوعہ مسلم یونیورسٹي علي گڑھ - قیمت ۱ روپیہ -

انتخاب حسرت — از خلیل احمد قدوائي بی-اے مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دھلی -

یورپین شعرائے اردو — مولفہ مولوی سردار علی صاحب سلسلہ مطبوعات کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد، دکن -

نفسیات تعلیمي — مصنفۂ محمد عثمان بي-اے (علیگ) تي-ڈي (لندن آکسفورڈ) ویس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن -

اُردو گلستاں — مترجمۂ مولوي محمد خلیل‌الرحمن صاحب سابق مالک و ایڈیٹر اخبار الخلیل، بجنور، ملنے کا پتہ دفتر اردو گلستاں، بجنور (یو، پی) قیمت ۱ روپیہ ۴ آنہ -

آخری نبی — از الیاس احمد مجیدي-مؤ-فرخ‌آباد، ملنے کا پتہ- "سرکار کا دربار" نام دلي، حیدرآباد دکن، قیمت ۴ آنہ

آں حضرت — ایضاً ایضاً قیمت ۶ آنہ

سرکار کا دربار — ایضاً ایضاً قیمت ۱۰ آنہ